

مکمل اور طویل ترین حیرت انگیز داستان



رولو کا

2



تحریر: اے وحید

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف مکمل سلسلہ اور طویل ترین داستان حیرت

قسط نمبر 12 سے قسط نمبر 23 تک

نمبر ②

رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

تحریر: اے وحید

ڈرڈائجسٹ کی پیشکش

کتاب مارکیٹ نیو اورڈ بازار کراچی

Ph:32744391

جملہ حقوق بحق ڈرپبلی کیشنز محفوظ ہیں

نام کتاب	رولو کا نمبر ②
تحریر	اے وحید
ناشر	ڈرپبلی کیشنز
پرٹر	خالد پرنٹرز
قیمت	150/-

اسٹاکسٹ

رشید نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ فریئر روڈ کراچی + ذرباغ نیوز ایجنسی چوک یادگار پشاور (سرحد)

گلزار نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ لاہور + اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

مہران نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ حیدر آباد + الفتح نیوز ایجنسی مہران مرکز سکھر

ویلم بک پورٹ اردو بازار کراچی + کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی

روبی پبلی کیشنز الحمد مارکیٹ لاہور + انصاری بک اسٹال ریگل روڈ فیصل آباد

ریلوے بک اسٹال فیصل آباد + ریلوے بک اسٹال روہڑی

رولوکا

ہیاء کرچمل کے ایک گاؤں اناؤ میں گئی تھی۔ لڑکی بہت حسین تھی۔ دولہا اس کو وداع کر کے اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ عین گاؤں کے قریب ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ کئی آدمی جو بارات کے ساتھ تھے مارے گئے۔ دولہا بھی سخت زخمی ہو گیا۔ سب جہیز اور ہتھیار لے کر چمپل گھاٹی میں روپوش ہو گئے۔ پولیس کو رپورٹ ہوئی ضرور مگر پولیس نہ سامان برآمد کر سکی اور نہ ہی دہن کو واپس لاسکی دلی میں اس حادثے کی اطلاع جب پہنچی تو لڑکی کے ماں باپ سخت پریشان ہوئے۔ باپ کو تو اتنا صدمہ ہوا کہ اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ اس کو میرے پاس لایا گیا تو مجھے سب ماجرا پتہ چلا میں نے رولوکا سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی، اور اس طرح ہم دہن کے باپ کے ساتھ چمپل کوروانہ ہو گئے۔

ہندوستان کا ایک علاقہ ایسا ہے جس کو ڈاکوؤں کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ہر دور میں ڈاکو پیدا ہوتے رہے ہیں اور کئی بھی علاقے کے ڈاکو یہاں پر پناہ مل جاتی ہے۔ ہر دور کی سرکار جانتی ہے مگر پھر بھی یہ لوگ یہیں پر رہتے ہیں اور پولیس ان کا کچھ لگاؤ نہیں سکتی۔ ان کے علاقے پر انگریزوں نے بھاری بھی کر دی تھی مگر پھر بھی یہی جگہ ان کا ٹھکانہ بنی ہوئی ہے۔ بہت مشہور ڈاکو یہاں گزرے ہیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

اور غریب ان کو پناہ دیا کرتے تھے۔ شاید یہ سچ ہو۔ یہ علاقہ چمپل وادی کا علاقہ ہے۔ یہاں پر ایک وادی بھی ہے اس کا نام بھی دریائے چمپل ہے۔ آبادی دور دور ہے اور ریت کے ٹیلوں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

پہاڑ بھی بہت ہیں اور ان پہاڑوں میں ہزاروں غار پانی نے بنا دیے ہیں۔ دریائے چمپل جب چلتا ہے تو پہاڑوں تک آ جاتا ہے اور ان غاروں کے راستے پانی نہیں دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ پہاڑوں کے اندر اسی کشادہ جھیلیں موجود ہیں کہ ہزاروں لوگ رہ سکتے ہیں۔ پہاڑ کے چاروں طرف پانی نظر آتا ہے مگر ڈاکو جانتے ہیں کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے اور وہ گھوڑے سمیت اپنی جگہ چلا جاتا ہے۔ تلاش کرنے والا سوچ بھی نہیں سکتا کہ پانی کے اندر بھی راستے ہیں۔ اندر والا پھر والے کو بڑی آسانی سے نشانہ بنالیتا ہے۔ ہمارا یہ سفر ایک بلاوے پر تھا اور یہ پہلی دفعہ تھا کہ ہم کسی کے بلانے پر گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک لڑکی دلی سے

اناؤ زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا۔ ساری آبادی کسانوں پر مشتمل تھی۔ دہن کے باپ کا نام خیراتی تھا۔ وہ ہم کو لے کر سیدھا اپنے محلہ پہنچا۔ میں نے اندازہ لگالیا وہ لوگ زیادہ خوش حال نہیں تھے۔ دولہا کا نام بشیرہ تھا اور دہن شدو بھی مشاہدہ تھی۔ ہمارے لئے ان لوگوں نے کھیر مل میں چار پائیاں ڈال دیں اور ان پر صاف بستر بھی بچھا دیئے۔ اس گاؤں سے چار پانچ کوس پر چمپل گھاٹی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ اتنا خطرناک ہے کہ لوگ سوائے اپنے کام کے ٹھکانے کے کہیں اور نہیں جاتے۔ ایک تو ڈاکوؤں کا ڈر اور دوسرا ڈر پولیس کا رہتا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیتی ہے اور غریب لوگوں کو بلاوجہ پریشان بھی کرتی ہے۔

جملہ حقوق بحق ڈریپلی کیشنز محفوظ ہیں

نام کتاب	رولو کا نمبر ②
تحریر	اے وحید
ناشر	ڈریپلی کیشنز
پرنٹر	خالد پرنٹرز
قیمت	150/-

اسٹاکسٹ

رشید نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ فریئر روڈ کراچی + زر باغ نیوز ایجنسی چوک یادگار پشاور (سرحد)

گلزار نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ لاہور + اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

مہران نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ حیدر آباد + الفتح نیوز ایجنسی مہران مرکز سکھر

ویکم بک پورٹ اردو بازار کراچی + کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی

روبی پبلی کیشنز الحمد مارکیٹ لاہور + انصاری بک اسٹال ریگل روڈ فیصل آباد

ریلوے بک اسٹال فیصل آباد + ریلوے بک اسٹال روہڑی

رولوکا

بیپاہ کر جمیل کے ایک گاؤں اناؤ میں گئی تھی۔ لڑکی بہت حسین تھی۔ دولہا اس کو دودھ کرا کے اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ عین گاؤں کے قریب ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر ڈیا۔ کئی آدمی جو بارات کے ساتھ تھے مارے گئے۔ دولہا بھی سخت زخمی ہو ڈاکو سب جہیز اور دلہن لے کر جمیل گھاٹی میں روپوش ہو گئے۔ پولیس کو رپورٹ ہوئی ضرور مگر پولیس نہ سامان برآمد کر سکی اور نہ ہی دلہن کو واپس لاسکی دلی میں اس حادثے کی اطلاع جب پہنچی تو لڑکی کے ماں باپ سخت پریشان ہوئے باپ کو تو اتنا صدمہ ہوا کہ اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ اس کو میرے پاس لایا گیا تو مجھے سب ماجرا پتہ چلا میں نے رولوکا سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی، اور اس طرح ہم دلہن کے باپ کے ساتھ جمیل کو روانہ ہو گئے۔

اناؤ زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا۔ ساری آبادی کسانوں پر مشتمل تھی۔ دلہن کے باپ کا نام خیراتی تھا۔ وہ ہم کو لے کر سیدھا اپنے سمدھیانے پہنچا۔ میں نے اندازہ کر لیا وہ لوگ زیادہ خوش حال نہیں تھے۔ دولہا کا نام بشیرہ تھا اور دلہن شدو یعنی شاہدہ تھی۔ ہمارے لئے ان لوگوں نے کھیریل میں چار پائیاں ڈال دیں اور ان پر صاف بستر بھی بچھادیئے۔ اس گاؤں سے چار پانچ کوس پر جمیل گھاٹی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ اتنا خطرناک ہے کہ لوگ سوائے اپنے کام کے ٹھکانے کے کہیں اونٹ نہیں جاتے۔ ایک تو ڈاکوؤں کا ڈر اور دوسرا ڈر پولیس کا رہتا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیتی ہے اور غریب لوگوں کو بلاوجہ پریشان بھی کرتی ہے۔

ہندوستان کا ایک علاقہ ایسا ہے جس کو ڈاکوؤں کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ہر دور میں ڈاکو پیدا ہوتے رہے ہیں اور کسی بھی علاقے کے ڈاکو کو یہاں پر پناہ مل جاتی ہے۔ ہر دور کی سرکار جانتی ہے مگر پھر بھی یہ لوگ یہیں پر رہتے ہیں اور پولیس ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی..... ان کے علاقے پر انگریزوں نے بمباری بھی کر دی تھی مگر پھر بھی یہی جگہ ان کا ٹھکانہ بنی ہوئی ہے۔ بہت مشہور ڈاکو یہاں گزرے ہیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

اور غریب ان کو پناہ دیا کرتے تھے۔ شاید یہ سچ ہو۔ یہ علاقہ جمیل وادی کا علاقہ ہے۔ یہاں پر ایک دریا بھی ہے اس کا نام بھی دریائے جمیل ہے۔ آبادی دور دور ہے اور ریت کے ٹیلوں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

پہاڑ بھی بہت ہیں اور ان پہاڑوں میں ہزاروں غار پانی نے بنا دیئے ہیں۔ دریائے جمیل جب چڑھتا ہے تو پہاڑوں تک آ جاتا ہے اور ان غاروں کے راستے پانی کہیں دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ پہاڑوں کے اندر اتنی کشادہ جگہیں موجود ہیں کہ ہزاروں لوگ رہ سکتے ہیں۔ پہاڑ کے چاروں طرف پانی نظر آتا ہے مگر ڈاکو جانتے ہیں کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے اور وہ گھوڑے سمیت اپنی جگہ چلا جاتا ہے۔ تلاش کرنے والا سوچ بھی نہیں سکتا کہ پانی کے اندر بھی راستے ہیں۔ اندر والا بہر حال کو بڑی آسانی سے نشانہ بنالیتا ہے۔ ہمارا یہ سفر ایک بلاوے پر تھا اور یہ پہلی دفعہ تھا کہ ہم کسی کے بلانے پر گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک لڑکی دلی سے

گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ گھوڑا چوکیدار کی طرح اس کے قریب ہی کھڑا ہوا وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ جہاں جا رہا تھا اب وہاں جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی بندوق زمین میں لٹک رہی تھی اور گھوڑا دور تھا اور پستول گھوڑے کی لات نے پانی میں کم کر دیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں کے بعد کھڑ ہوا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی گھوڑا خاموش کھڑا رہا پھر وہ اس پر سوار بھی ہو گیا اور گھوڑا پھر پانی میں اتر گیا۔ یہ سب گھوڑے نے میری ہدایت پر کیا گھوڑا تھیرتا ہوا پہاڑوں کی طرف چلا میں ان کے ساتھ تھا۔ میں پہاڑ کی جڑ پر پہنچ کر وہ پانی کے اندر اتر اور پھر باہر آیا اب وہ غار کے منہ پر تھا۔ اس غار کے اندر بھی پانی تھا مگر جوں جوں اندر گئے پانی کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا اور سوکھی زمین آگئی۔ سوار بڑی مشکلوں سے گھوڑے سے اتر۔ اس کے اترتے ہی ایک طرف سے ایک آدمی نمودار ہوا اور گرجتی آواز میں بولا۔

”تم گئے نہیں دھرمو.....؟“

”میری حالت دیکھ رہے ہو اس حالت میں جاتا تو پکڑا ہی جاتا۔“ دھرمو نے کہا۔

”ارے بول تو کیا ہوا تو اتنا کمزور تو نہیں تھا کہ پٹ کے چلا آیا۔“ وہ بولا۔

”ارے کا کا بھیا پٹ کے نہیں آیا ہوں یہ حرامی نے میری یہ حالت کر دی ہے گولی مار دے اس کو۔“ دھرمو بولا۔

”ارے یہ تو تیرا من پسند گھوڑا ہے بے قابو ہو گیا۔“ کا کا نے پوچھا۔

”ارے کا کا پوچھو ہو۔ ایسا ویسا بے قابو پھر ایک دم سیدھا بھی ہو گیا اور واپس لے آیا۔“ دھرمو نے کہا۔

”ارے کیا بات کرے ہو ایک ایک کی گز گیا اور پھر واپس بھی لے آیا سچ بتا کوئی چلتر مت کریو۔ سردار کو پتہ چل گیا تو ایک منٹ میں تم دونوں کو گولی مار دے گا۔“ کا کا بھیا بولا۔

”میں کا چلتر کروں گا۔ تو یقین کر میں نے جو کہا ہے وہی ہوا ہے۔“ دھرمو نے کہا۔

”اچھا چل..... سردار کے پاس چل..... وہی فیصلہ

دوسرے روز روٹو لکانے مجھے اشارہ کیا اور چلا گیا۔ وہ گھر سے نکلا یہ سب نے دیکھا مگر دروازے کے باہر کوئی نہ دیکھ سکا۔ میں نے خیراتی کو بتادیا کہ کام شروع ہو گیا ہے۔ میرا دوست گیا ہے کچھ خیر خبر لے کر آئے گا۔

خیراتی یہ سن کر حیرت سے بولا۔ ”ارے بھیا خالی ہاتھ ڈاکوؤں کی کچھاریں کیا چلے گی۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو..... اس کے پاس بہت ہتھیار ہیں۔“ میں نے کہا۔ خیراتی نے گردن ہلائی اور خاموش ہو گیا۔

”یہ علاقہ اتنا ڈر اور خوف میں ڈوبا ہوا تھا کہ گاؤں والوں کو ہر اجنبی آدمی ڈاکو نظر آتا تھا۔ آبادی بھی دور دور تھی اور کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا تھا کیونکہ ڈاکو پھر اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ میں آگے بڑھتا گیا اور دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ دریا کے دوسری طرف پہاڑی سلسلہ تھا اور دریا چڑھا ہوا اس پہاڑی سلسلے کو گھریں مار رہا تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ پانی کی وجہ سے کوئی غار یا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور دریا پر نظریں رکھیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار پہاڑ کی جڑ سے نکلا اور دریا پار کرنے لگا۔ وہ مجھے چونکہ نہیں دیکھ سکا تھا اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے گھوڑے کو کنٹرول کر رہا تھا اور گھوڑا ابھی اس کا عادی لگتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے دریا کے باہر آ گیا اس کے باہر آتے ہی اس کا گھوڑا اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ میرے کنٹرول میں تھا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر گھوڑے نے اس کو زمین پر گرا دیا۔ وہ پھر اٹھا اور سوار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سوار اتنا غصہ میں آ گیا کہ پیٹی سے پستول نکال کر فائر کرنا چاہتا تھا کہ گھوڑے نے دونوں اگلی ٹانگیں اس کے سینے پر اتنی زور سے ماریں کہ وہ الٹ کر زمین پر اتنی زور سے گرا کہ چند منٹ تو یہ لگا کہ شاید مر ہی گیا ہو۔ مگر وہ بڑا ڈھیٹ تھا مرا نہیں تھا چوٹ تو اس کو کمراری آئی تھی۔ کچھ دیر وہ پڑا

کرے گا۔

گھوڑے کو گولی مار دے۔“

یہ سنتے ہی کا کا بھیا اور دھر مو واپس پلٹ گئے۔ ان کے واپس ہوتے ہی میں نمودار ہو گیا۔ میں ایک بوڑھے کسان کے روپ میں سردار کے سامنے کھڑا تھا۔ سردار نے اور اس کے ساتھیوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تو کون ہے رے اور یہاں تک کیسے آ گیا۔“

میں نے بہت کمزور آواز میں کہا۔ ”میں ان دونوں کے ساتھ آیا تھا۔“

”ارے میں پوچھتا ہوں تو اڈے کے اندر کس طرح آ گیا؟“ سردار بولا۔

”جس طرح دھر مو آیا اسی طرح میں بھی آ گیا۔“ میں نے کہا۔

”تجھے دھر مو ساتھ لگا کر لایا ہے۔“ سردار نے غصے سے کہا۔

”نہیں دھر مو کو پتہ نہیں ہے وہ بے تصور ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں آیا ہے بڑھے۔ تجھے پتہ نہیں ہے تو موت کی وادی میں آ گیا ہے۔ یہ میرا گھمکانہ ہے ڈاکو شاد دلال کا اڈا ہے۔ دور دور پرے لگے ہیں اور تو منہ اٹھا کر چلا آیا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے۔ مگر میرا آنا ضروری تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”زندگی بہت ضروری چیز ہے۔ مانا کہ تو اپنی عمر گزار چکا ہے مگر پھر بھی موت سے کون دل لگی کرتا ہے مجھے تو کوئی پاگل لگتا ہے۔“ سردار نے کہا۔

”طاقت کا فائدہ بہت برا ہے۔ دنیا کے سارے نشوں سے یہ بدتر ہے۔ میں تیرے اڈے پر موجود ہوں ہر طرف تیری راج دھانی ہے تیرے ایک اشارے پر میرے بدن میں سوراخ ہو سکتے ہیں۔ مگر تو بھول رہا ہے کہ میں تیرے پھرے داروں کے سامنے سے گزر کر تیرے آدمیوں کے ساتھ آیا ہوں۔ اگر تو بھول گیا ہے تو میں یاد کار دوں کہ دنیا

اور وہ دونوں اندر کی طرف چلے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی تھا دو تین میڑمی میڑمی سرنگوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک کشادہ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ اندر کافی کشادہ جگہ موجود تھی یہاں پر بھی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا۔ اس کے سامنے کے رخ پر لکڑی کی کرسیاں بڑی تھیں ان کرسیوں پر دو تین آدمی بیٹھے تھے اور تخت پر ایک نہایت رعب دار شخص پیر لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس شخص کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک نڈر اور بہادر شخص ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور کڑک کر بولا۔

”دھر مو تو ابھی تک گیا نہیں.....؟“

دھر مو نے اپنی حالت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”گیا تھا سردار۔ میرا گھوڑا پانی سے پارا ترے ہی بگڑ گیا۔ میں نے لاکھ جتن کر کے پر وہ میدان ہاندا ہوا اور دونوں لاکھ میرے سینے پر دے مار دیں۔ سردار میری حالت اس نے بہت خراب کر دی اب بتاؤ میں اس حالت میں کیسے جاتا۔ میرا تو واپس آنا بھی مشکل تھا۔ پھر یو گھوڑا مجھے واپس لے آیا۔“

”تیری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں دھر مو..... سچ بتا ہوا کیا ہے؟“ سردار نے کہا۔

”میری بات کا یقین کرو سردار۔ میں تمہارے حکم پر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ دھر مو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”تو اگر سچا ہے تو بھی کچھ نہ کچھ پھیر ضرور ہے۔ ارے تیرا گھوڑا تیری دھانی کر دے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو بتا بھوندو تجھے کیا لگتا ہے۔“ سردار نے کرسی پر بیٹھے ایک شخص سے پوچھا۔

”سردار بات گلے سے اتر نہیں رہی..... پر دھر مو پرانا ساتھی ہے آ زایا ہوا جوان ہے اس پر شک کس طرح کروں۔ میں نے اس میں کھوٹ نہیں پایا ہے۔“ بھوندو نے رائے دی۔

”تیری وجہ سے سارا پروگرام خراب ہو گیا۔ اب نہ جانے کب موقع ملے گا۔ مگر خیر تو جا، دوا دارو کرو رن اس

”تمہاری راج دھانی میں یہ ظلم کی واردات ہوئی اور تم بے خبر رہے تم اندازہ کرو کتنے دن یہ راج پاٹ تم چلا سکو گے۔ یہ ظلم کسی نے کیا ہو پڑے گا تمہارے کھاتے ہیں تم یہ جانتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”ڈال دو میرے کھاتے میں ایک ہزار قش ڈال دو۔ دو ہزار ڈال کے ڈال دو مگر میں کسی ناری کو اٹھاؤں اس کو بے عزت کروں یہ میرے کھاتے سے نکال دو۔ میں دھرتی کے اندر سے بھی اس کو پکڑ کر تمہارے سامنے کھڑا کر دوں گا۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر کسی عورت ذات کی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ میں ڈاکو ہوں۔ سونا چاندی لوٹتا ہوں کسی کی عزت نہیں لوٹی۔“ سردار نے غصے سے کہا۔

”تم کچھڑ کے اندر کھڑے ہو کر صفائی مت دکھاؤ۔ میں اس پر یقین نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو بڑے میاں جو خود اسی تیر کا گھائل ہو وہ اس دکھ کو جانتا ہے مجھ پر بھی ایسا ہی ظلم ہوا تھا اور اسی کے کارن میں یہاں پر ہوں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ لڑکی جہاں پر جس کے پاس بھی ہوئی میں برآمد کروں گا اور ظالم کو سخت سزا دوں گا۔“ سردار نے کہا۔

”تم جیسے کر ڈیل چھ فٹے جوان پر یہ ظلم ہوا سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔

”میری داستان بھی وہی ہے جو اس گھلائی میں ہر آنے والے ڈاکو کی ہے۔ کوئی خوشی سے اس جگہ نہیں آتا۔ کون فقر توں کا کاروبار کرتا ہے کیونکہ ڈاکو نام ہی نفرت ہے ہر ڈاکو ظالم ہے جس اور سانج کا باغی کہا جاتا ہے مگر وہ اس منزل پر کیوں آتا ہے جو لوگ اس کو اس آگ میں ڈالنے والے ہوتے ہیں ان سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں بھی ایک مظلوم ذات کا فرد ہوں ہم لوگ پشت ہاپشت سے ظلم برداشت کرتے آئے ہیں۔ ہماری ہر اچھی چیز دوسرے ہتھیا لیتے ہیں۔ اپنی طاقت سے چھین لیتے ہیں۔ ہم اپنی زبان سے شکوہ نہیں کر سکتے۔ کرتے ہیں تو زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ میں بھی تھا کروں کی جوتیوں میں جوان ہوا اور ان کی جوتیاں بنانے لگا۔ میرا باپ بھی یہی کرتا تھا۔ اس کا باپ

میں ہزاروں شادو لال گزرے ہیں مگر اب کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ تیری طاقت اور جوانی بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے جو ذات رہنے والی ہے وہی مجھے یہاں تک لائی ہے میں جس کام سے آیا ہوں وہ کر کے جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

چند منٹ سردار شادو لال خاموش گردن جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تیری کچھ باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اپنا کام بتا۔“

”اناؤ گاؤں میں ایک آدمی رہتا ہے۔ اس نے اپنی لڑکی شادو عرف شاہدہ کی شادی کر دی۔ اس کے دولہا کا نام بشیرہ ہے۔ وہ دلہن تیرے علاقے میں آگئی مگر آتے ہی تیرے آدمی اس کو اٹھا کر لے گئے۔ سب کا خیال ہے وہ چمیل گھائی کے ڈاکو تھے اور تو ان کا سردار ہے تو بتا میں اس غریب کسان خیراتی کی فریاد کہاں لے کر جاتا کیا پولیس اس کی مدد کر سکتی تھی تو میں تیرے پاس چلا آیا۔“ میں نے کہا۔

سردار یہ سن کر غصے میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا۔ ”بھوندو دوڑ کر جا اور پتہ کر یہ حرکت کس نے کی ہے اور سن چھوڑی کو بھی میرے پاس لے کر آتا۔“

بھوندو تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ سردار نے مجھ سے خطاب ہو کر کہا۔ ”اگر یہ حرکت میرے کسی آدمی نے کی ہے تو تمہاری نظروں کے سامنے اس کی دونوں ٹانگیں چیر دوں گا۔“

اس منٹ کے بعد بھوندو واپس آ گیا اور بولا۔

”سردار اذے پر تو کوئی عورت نہیں ہے اور نہ ہی اس واردات کا کسی کو پتہ ہے۔“

”اچھا۔ مگر میں خود پتہ کرتا ہوں۔“ میری طرف اشارہ کر کے وہ بولا۔ ”آؤ بڑے میاں میرے ساتھ تم بھی اپنا اطمینان کرلو۔“ اور ہم سب سردار کے ساتھ چل پڑے سردار ہر سرنگ میں گیا۔ ہر طرف اس کے آدمی موجود تھے۔ کھانے پک رہے تھے ہتھیار صاف کئے جا رہے تھے پورے اڈے پر کی عورت کا وجود نہیں تھا۔ اور پھر ہم واپس اسی جگہ آ گئے جہاں سے ہم گئے تھے۔

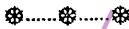
”تم نے دیکھ لیا بڑے میاں اب بھی الزام دو گے۔“ سردار نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”لڑکی کا پیٹ نہیں چلا۔“
 ”ڈاکو شادو لال کا شبہ تھا کروں پر ہے۔ وہ ان کو
 چیک کرے گا اور میں اس کو چیک کروں گا۔“ رولو کا نے کہا۔
 ”کیا تم کو شادو لال پر بھروسہ نہیں ہے۔“ میں
 نے کہا۔

”بات بھروسے کی نہیں ہے۔ مجھے اس نے جو کہا
 ہے میں نے اس پر پوری طرح یقین نہیں کیا ہے یہ بھی
 ہو سکتا ہے وہ کسی اپنے پیارے کو بچانے کو مجھے گول مول
 کر رہا ہو۔“ رولو کا نے کہا۔

”کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔
 ”سب کچھ ہو سکتا ہے وہ ایک ڈاکو ہے وہ ہر طرف
 دیکھ رہا ہوگا۔ اس کو اپنے گردہ کو قائم اور اپنے وقاداروں کا خیال
 بھی رکھنا ہوگا اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گردہ کی مالا ٹوٹ
 جائے گی اور ہر دانہ نکھر جائے گا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
 ”تم اس کی سچائی کو برکھ رہو۔“ میں نے کہا۔

”تلاش کرنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ پر چور اپنی
 کچھ نہ کچھ نشانیاں ضرور چھوڑ جاتا ہے ضرورت صرف ان کو
 دیکھنے کی ہوتی ہے۔ اگر تھا کروں کی یہ واردات ہے تو وہ بھی
 زیادہ دور نہیں ہیں۔ مگر میں ایک ڈاکو کے کردار کا جائزہ لینا
 چاہتا ہوں۔ اس کی شرافت کو جانچنا چاہتا ہوں۔ وہ کل سنے
 تلاش شروع کرے گا اور میں اس کے ساتھ رہ کر بھی اس
 سے الگ رہوں گا.....“



”شادو لال نے ایک کسان کا بیٹس بھرا اور گھوڑے
 پر اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ دریاے تمیل پار کرنے کے بعد اس
 نے گھوڑا اچھوڑ دیا۔ گھوڑا دوڑتا ہوا واپس چلا گیا اور شادو لال
 پیدل جنوب کی طرف۔ چلتا گیا۔ پھر ایک تیل گاڑی روک کر
 اس پر سوار ہو گیا۔ اس گاڑی ایک بڑے گاؤں کی طرف تھا وہ
 تیل گاڑی اسی گاؤں کو جا رہی تھی۔ شادو نے گاڑی بان سے
 پوچھ لیا تھا۔ گاؤں آ گیا تو گاڑی بان سے پوچھا۔

”اب کہاں سمیا آگے کس سے سمینٹ کرتا ہے۔“

شادو گاڑی سے کود پڑا اور بولا۔ ”تم اب جاؤ میں خود

بھی یہی کرتا تھا ہماری گردن تو کبھی ابھی ہی نہیں آسمان تو ہم
 نے دیکھا ہی نہیں ہمیشہ زمین کو دیکھا پھر اسی زمین پر میں
 نے باپ کی لاش کو پڑے دیکھا اسی زمین پر میں نے اپنی
 بہنوں کو بے عزت ہوتے دیکھا اور پھر میں نے اٹھ کر پہلی
 بار آسمان کو دیکھا اور پھر نکل کر اس گھاٹی تک آ گیا جہاں پر نہ
 کوئی ذات ہے نہ برادری سب برابر ہیں سب کا ایک نام
 ہے وہ ہے ڈاکو۔“ سردار خاموش ہو گیا۔

”تم پر جس نے ظلم کیا تھا اس سے بدلہ لیتے سب
 نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”میں بھی سب کو اپنا نشانہ نہیں بنانا میں صرف
 ٹھا کروں کا دشمن ہوں۔“ سردار نے کہا۔

”تم اس لڑکی کو اب کہاں تلاش کرو گے؟“ میں نے
 پوچھا۔
 ”ٹھا کروں کے نئی نسل کے لڑکے اپنے پرکھوں سے
 بھی آگے چلے گئے ہیں یہ کام صرف ان ہی کا ہے۔“ سردار
 نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم تلاش کرو۔ میں پھر آ کر پتہ کروں
 گا۔“ میں نے کہا۔
 ”بات ادھوری چھوڑ کر تم نہیں جاؤ گے تم یہ بتاؤ مجھ
 تک کس طرح آئے ہو۔“ سردار نے کہا۔
 ”میں جس طرح واپس جاؤں گا اسی طرح آیا تھا۔“
 میں نے کہا۔

”دیکھو بڑے میاں میں نے تم سے وعدہ کیا ہے
 میں تمہارا کام جان لڑاکے کروں گا مگر مجھے اپنی کمزوری کا بھی
 تو پتہ چلنا چاہئے تاکہ میں آئندہ کو ہوشیار ہو جاؤں۔“ سردار
 نے کہا۔

”تم بہت ہوشیار آدمی ہو۔ مگر جو راز کی باتیں ہیں
 ان کو جاننے کی کریڈٹ کر دو تم مجھے نہ جانے سے روک سکتے
 ہو اور نہ دوبارہ آنے سے روکو گے۔“ میں نے یہ کہا اور
 دروازے سے نکل کر روپوش ہو گیا۔ پورے غار میں ہانپل ج
 گئی اور ایمر جنسی نافذ ہو گئی مگر میں چلا آیا۔“

رولو کا نے رات کو واپس آ کر مجھے اپنی روداد سنائی تو

ہی پتہ کر لوں گا۔“ اور گاڑی والا چلا گیا۔

شادو نے ٹھا کر پر تاب سنگھ کی حویلی کا رخ کیا ہی تھا کہ میں ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ”ارے تم مجھ سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کون گاڑی سے آئے۔“

”میں بھی اسی طرح آیا ہوں جس طرح تم آئے ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھا کر پر تاب سنگھ کو تم جانتے ہو۔“ شادو نے پوچھا۔

”نہیں میں نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر میں جانتا ہوں۔ وہ بظاہر تو بڑا نیک نام ہے غریب کسانوں کا خیال بھی کرتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے مگر اندر سے یہ کیا ہے اس کا پتہ نہیں ہے۔“ شادو نے کہا۔

”ابھی پتہ کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اب ہم حویلی کے سامنے آ چکے تھے۔ شادو نے دروازے پر کھڑے ایک لٹھ بند سے کہا۔ ”بات سن لالہ ہمیں ٹھا کر سے ملانا ہے۔ ذرا اندر خیر کر دو۔“

اس لٹھ بند جوان نے سر سے ہیر تک مجھے اور شادو کو دیکھا اور بولا۔ ”کون کام سے آئے ہو اور کا کام ہے۔ یہ بتاؤ۔“ میں جلدی سے اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔

”ٹھا کر سے بول اناؤ سے آئے ہیں۔“

قدیم زمانے کی آرام دہ کرسیاں دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں اور ان کی پالش چمک رہی تھی فرش پر قالین پڑا تھا ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا اس کے پائے گول تھے اور کسی ماہر کاریگری کی ہنرمندی کا زندہ ثبوت ہے۔ تخت پر بھی ایک سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے گاؤ تھکے اس کے کنارے لگے ہوئے تھے اور ان ہی کے سہارے ایک شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی چہرے پر رعب و دبہہ تھا بیٹھا تھا۔ کمرے میں وہ اکیلا تھا یہ بات میرے لئے اور شادو کے لئے ضرور حیرت کی تھی۔

اس نے ایک نظر شادو کی طرف ڈالی پھر مجھے دیکھا اور رعب دار آواز میں بولا۔ ”آؤ شادو میرے پاس بیٹھو۔“ شادو نے چونک کر اس کو دیکھا تو وہ مسکرا کر پھر بولا۔

”پویشان مت ہو شادو۔ تم میرے پاس آئے ہو میرے مہمان ہو تمہاری عزت مجھ پر فرض ہے۔“

اب شادو پہلے جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ بولا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”تمہارے سوال کے کئی جوابات میرے پاس ہیں مگر میں صرف یہ کہوں گا کہ شادو ڈاکو اتنا گستاخ آدمی نہیں ہے کہ اس کو میں نہ پہچان سکوں۔ تم نے بے شک اچھا بہروپ بھرا ہے مگر میری نظریں اندر تک دیکھتی ہیں تم مان لو کہ تم شادو ہی ہو۔“ ٹھا کر پر تاب سنگھ اطمینان سے بولا۔

”چلو میں مانے لیتا ہوں تم نے مجھے خوب پہچانا مگر میں اس وقت تمہارے پاس ڈاکو بن کر نہیں آیا ہوں۔“ شادو نے جواب دیا۔

”ڈاکو بن کر میرے پاس کبھی آنا بھی نہیں..... میں تمہاری ہر ضرورت دیے ہی پوری کرنے کو تیار ہوں اور اگر ڈاکو بن کر آؤ گے تو مجھے کمزور نہیں پاؤ گے۔“ اور پھر ہنس کر بولا۔ ”تم نے اپنے ساتھی کا پرستہ نہیں کر لیا۔“

”یہ میرے ایک بہت قریبی مترہیں اناؤ سے آئے ہیں۔ ان کے کارن ہی مجھے یہ بہروپ بھرنایا ہے۔ ان کی ہی ایک ضرورت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔“ شادو نے کہا۔

”اگر ضرورت میں پوری کر سکا؟ تو ضرور کروں گا۔ کسی ڈر خوف سے نہیں بلکہ اس لئے کہ تم لوگ چل کر میرے پاس آئے ہو۔ میں خاندانی ٹھاکر ہوں۔ اپنے مہمانوں کے لئے سب کچھ کروں گا بولو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”ایک کنیا اتناؤ کی بیاہ کر چمیل کے علاقے میں آئی اور کسی نے اس کو وہیں سے اٹھایا اور الزام میرے سر آ گیا۔ تم بچہ نہیں جانتے ہو کہ نہیں میں ڈاکے ضرور مارتا ہوں مگر کسی عورت کی بے عزتی نہیں کرتا۔ کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ مگر الزام مجھ پر ہی آ گیا ہے میں اس داغ کو دھونا چاہتا ہوں وہ کنیا جب تک نہیں ملے گی میں سکون سے نہیں رہوں گا۔“ شادو نے کہا۔

”اور تم میرے پاس چلے آئے۔ میں اتنا گرا ہوا ہوں کہ لڑکیاں اٹھواؤں گا۔ میرے سات گاؤں ہیں ان میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لڑکیاں رہتی ہیں میں نے کسی پر آج تک میلی نظر نہیں ڈالی اور تم میرے پاس چلے آئے۔ شادو تم میرے مہمان ہو تم نے بہت بڑی گالی مجھے دے دی ہے۔“ ٹھاکر غصے سے سرخ ہو گیا۔

میں نے پہلی بار زبان کھولی اور کہا۔ ”ٹھاکر صاحب آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ پتہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ نے یہ کام کیا ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہو۔۔۔۔۔ کسی سے کچھ سنا ہو ڈھونڈنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ لڑکی سے لڑکی ملاتے چلے جائیں۔۔۔۔۔ اگر آپ کچھ جانتے ہیں یا آپ کچھ اندازے لگا سکتے ہیں تو بتائیں ہم آپ پر شک نہیں کر رہے ہیں۔“

ٹھاکر نے سکون سے میری بات سنی تو اس کے چہرے کی رنگت معمول پر آئی اور اس نے کہا۔ ”ہاں یہ بات آپ نے قاعدے کی کی ہے آپ کا کیا نام ہے؟“

”میرا نام حکیم کامل خان ہے دلی میں مہذب کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا میرا اندازہ ٹھیک ہی ہوگا ایسا کام صرف ایک شخص کرتا ہے وہ ہے تو میرا رشتہ دار مگر میں اس سے نہیں ملتا اور نہ ملنے کی وجہ

اس کا گنہہ کردار ہے مجھے اپنا دشمن نہر ایک سمجھتا ہے۔ میں اس کا نام کسی دشمنی کی وجہ سے نہیں لے رہا، بلکہ اس کے گھٹاؤ نے کردار کی وجہ سے لے رہا ہوں۔ یہاں سے میں کوں دور ایک علاقہ ہے چتر والی۔۔۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ اس کا زمین دار ٹھاکر دھرم داس ہے۔ نام تو اس کا دھرم داس ہے مگر دھرم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس نے ٹھاکروں کے نام کو بیٹہ لگا دیا ہے۔ مجھے شبہ ہے اس کے کارندوں کی نظر میں کنیا آگئی ہوگی اور وہ دھرم داس کو خوش کرنے اور انعام حاصل کرنے کو اٹھالے گئے ہوں گے۔“

ٹھاکر نے بتایا۔ تو میں نے کہا۔ ”آپ صرف یہ کام کر دیں کہ ہمیں اس کا پتہ بتا دیں۔“

”ہمیں صرف اتنا کافی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو وہاں پہنچاؤں گا اور جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو پوری کر دوں گا۔ یہ کر کے میں آپ پر یا شادو پر احسان نہیں کروں گا میرا بھی تو کچھ فرض ہے۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”ہمیں ٹھاکر صاحب آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میں آپ کی دشمنی کو اور بڑھا نا نہیں چاہتا ہم خود جائیں گے اپنے طریقہ پر جائیں گے آپ صرف پتہ بتا دیں۔“ شادو نے کہا۔

”میں آپ کا کام آسان کرنا چاہتا تھا کیونکہ تم جس کے پاس جا رہے ہو وہ ایک مشکل آدمی ہے۔ اس کو تم نہیں جانتے۔ وہ تمہاری مشکلات بڑھا سکتا ہے۔ علاقہ بھی اس کا ہوگا ہر طرف اس کے آدمی ہوں گے اس کے علاوہ بھی ایک مدد اور اس کو حاصل ہے اور وہ ہے اس کا گرو۔ وہ ہر اچھے برے کام میں اس کی مدد کرتا ہے۔ کچھ ٹوٹے ٹوٹکے کرنے کا ماہر ہے۔ اسی پر دھرم داس پھولتا ہے۔ آپ دونوں کے لئے گھوڑوں کا تو بندوبست میں کر سکتا ہوں۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”شادو کے لئے بندوبست کر دیں اگر یہ پسند کریں تو میں گھوڑا سواری نہیں کرتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں بوڑھا آدمی ہوں میں اپنے طریقہ پر چتر والی گاؤں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”میں بھی گھوڑے پر نہیں جاؤں گا آپ کو پتہ ہے

میں ایک بدنام آدمی ہوں چھپتا چھپاتا ہی جانا ہوگا۔“ شادو نے کہا تو ٹھاکر نے کہا۔

”مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگ میری کسی قسم کی مدد لینا نہیں چاہتے۔“

”ٹھاکر صاحب آپ ناراض نہ ہوں جب بھی آپ کی ضرورت پڑی ہم آپ کو ضرور یاد کریں گے۔ آپ کے اخلاق اور صاف گوئی کے تو ہم قائل ہو گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

چتر والی گاؤں کہنے کو میں کون تھا مگر راستہ بہت خراب تھا ٹی اور پتھر کے ٹیلے جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ٹیڑھا میڑھا کچا راستہ بنا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں پانی اور کچر بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان جھاڑیوں میں مختلف قسم کے حشرات الارض چھپے ہوئے تھے۔

شادو نے ایک بتل گاڑی حاصل کر لی تھی اس نے اپنا حلیہ مکمل طور پر دیہاتی بنایا ہوا تھا۔ وہی گاڑی چلا رہا تھا۔ چتر والی گاؤں ابھی دور تھا کہ اچانک ایک طرف سے دو بھیڑیے نمودار ہوئے اور بیلوں کے سامنے آ گئے بتل ڈر کے کھڑے ہو گئے اور گاڑی سے آزادی کی خاطر زور کرنے لگے۔ جھکنا مجھے بھی لگا میں نے سامنے نظر ڈالی تو دونوں بھیڑیے نظر آ گئے۔ میں گاڑی پر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ اٹھاتے ہی دونوں بھیڑیے ایک طرف چل دیئے۔ شادو نے حیرت سے ان کو دیکھا اور پھر بولا۔

”آئے تو بڑے غصے میں تھے مگر چلے کیوں گئے شاید پھر آئیں گے زیادہ تعداد میں۔“

میں نے کہا۔ ”تم اپنا سفر جلدی رکھو وہ اب نہیں آئیں گے۔“

”حیرت کی بات ہے میں نے اب غور کیا آپ کے کھڑے ہوتے ہی وہ خاموشی سے چلے گئے۔“ شادو نے کہا۔

”شریف بھیڑیے تھے اس لئے شرافت سے چلے گئے۔“ میں نے اس کو کہا۔

”حکیم صاحب آپ نہ بتائیں آپ کی مرضی مگر میرے حلق سے یہ بات اتر نہیں رہی کہ وہ آپ کو دیکھتے ہی کیوں چلے گئے۔ آپ کے لئے یہ بات معمولی ہوگی میرے لئے اس لئے حیرت انگیز ہے کہ میرا واسطہ ان سے پڑنا رہتا ہے۔ یہ اتنی آسانی سے ٹلنے والے نہیں ہوتے۔“ شادو نے کہا۔

”تم نے زندگی کی جو کتاب پڑھی ہے اس میں یہ سبق نہیں تھا اور بھی بہت سے سبق تم کو نئے لکھیں گے جوں جوں عمر کی رسی دراز ہوگی نئی باتیں نئے لوگ نئے تجربات آتے جائیں گے۔ دنیا کی کسی درس گاہ میں جو نہیں پڑھایا جاتا وہ زندگی خود پڑھاتی ہے اور آدمی مرتے دم تک پڑھتا رہتا ہے۔ موت بھی ایک سبق پڑھاتی ہے۔ اس لئے تعجب کا اظہار نہ کرو۔ تم نے ایک قدم نیکی کی طرف اٹھایا ہے تمہاری مدد ہوگی اس پر تعجب مت کرو شکر کرو رب کائنات کا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”میں زیادہ سمجھ دار پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں آپ کی رخصتمیری باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں ان کو سمجھنا چاہتا ہوں۔“ شادو نے کہا۔

”قصور تیرا بھی نہیں ہے۔ جہاں انسان کے اندر بہت سے جذبے ہیں وہیں پرایک جذبہ جنس کا بھی ہے۔ وہی جذبہ کرید کرنا ہے اور آدمی ہر بات فوراً سمجھ لینا چاہتا ہے۔ مگر یاد رکھو بلا وہی کی مہوج نقصان بھی کر دیتی ہے ہر کام کا وقت ہوتا ہے صبح آپ ناشتہ کرتے ہیں رات کا نہیں کھاتے اس لئے کدات آئی ہی نہیں۔ جو سامنے ہے بے شک اسی پر غور کرنا چاہئے جب بتانے کا وقت آئے گا تو تمہارے دل میں خود بات اتر جائے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں میں اب تک آپ کو نہیں سمجھ سکا۔“ شادو نے کہا۔

”میں صرف تم سے یہ کہوں گا کہ تم اپنی سوچ کو غلط رخ پر مت موڑو اس سے بہت سے سوال پیدا ہوں گے۔ بہت سی غلط فہمیاں گندگی کے پہاڑ کھڑے کر دیں گی۔ انسان کوئی ہو ہر ایک کی حقیقتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ تم

والی ہے۔ کہاں سے آئے ہو بھلا۔
”بڑی دور سے آئے ہیں بھلا۔ جل پانی ملے گا۔“

شادو نے پوچھا۔

”کاہنہ نہ ملے گا۔ آ جاؤ گاڑی دھورے کھڑی کرو

جوڑی کھول دو ان کا بھی دانہ پانی کرلو۔“

شادو گاڑی سے اتر گیا اور بولا۔ ”آ جاؤ حکیم

صاحب۔“

میں بھی گاڑی سے اتر پڑا۔ شادو نے بیلوں کو گاڑی

سے الگ کر دیا۔ گاڑی دیوار کے سامنے کھڑی کر دی۔ دھوتی

پوش نے بیلوں کو ایک تانے کے پاس کھڑا کر دیا اور اس میں

چارہ ڈال دیا۔ نسل دن بھر کے بھوکے تھے کھانے لگے۔ اس

سے فارغ ہو کر دھوتی پوش ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ ”آؤ

اندر آ جاؤ۔“ چھپر بہت بڑا تھا ہم چھپر کے دوسرے کنارے

کی طرف چلے۔ اسی چھپر کے نیچے دو چار پائیاں پڑی تھیں

ان کے پاس کچھ کرودہ بولا۔ بیٹھو بھا اور میدان کی طرف چلا

گیا۔ اس میدان کے پار ایک اور چھپر پڑا تھا وہاں پر بھی

ایک لائین چل رہی تھی۔ درمیانی میدان اندھیرے میں ڈوبا

ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ

میں پانی کا ڈول اور ایک ہاتھ میں حقہ پکڑا ہوا تھا۔

”لو بھاپیلے منہ ہاتھ دھولو جب تک میں حقہ تازہ

کر لوں جو گرم گرم روٹی ڈال رہی ہے۔“

شادو نے کہا۔ ”حقہ تو تم تازہ نہ ہی کرو بھلا ہم

دونوں یہ شوق نہیں کرتے تم نے اپنا نام بتایا نہ تم نے ہمارا

پوچھا۔“

”میرا نام رادھے ہے اب تم بتانے دیو۔“ وہ بولا۔

”میں شادو لال ہوں یہ حکیم کمال ہیں۔“ شادو نے کہا۔

”حکیم کا دوادار کرے ہیں یہ۔“ وہ بولا۔

”ہاں وہ بھی کرتا ہوں کیا کوئی بیمار ہے۔“ میں نے

پوچھا۔

”ارے بھائیار ایسا بیمار۔ بہت وید کے دکھایا پر

ٹھیک نہ ہوا اب تو ہم اسید ہی چھوڑ چکے ہیں مرنا تو اس کو

ہے۔“ وہ اداسی سے بولا۔

صرف ایک بات ذہن میں بٹھالو کہ میں تمہارا دوست

ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ میرے دوست

ہو۔“ شادو نے کہا۔

”چتر والی کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک گاؤں نظر آ رہا ہے وہی شاید چتر والی ہے۔“

شادو نے جواب دیا۔

”میں تم سے ایک درخواست کروں مانو گے۔“ میں

نے پوچھا۔

”آپ حکم کریں درخواست کر کے شرمندہ نہ

کریں۔“ شادو نے جواب دیا۔

”حالات کچھ بھی ہوں تم ہتھیار استعمال نہیں کرو

گے اور اگر تم کو کوئی پہچان بھی لے تب بھی خود کو ظاہر نہیں کرو

گے۔ تمہارے اندر جو ڈاکو شادو ہے وہ بے شک بہت بڑا

ہے بہادر ہے مگر میں اس کو استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ میرے

ساتھ جو سادہ سادہ پہنائی جو ان ہے وہ میرے لئے بہت

لاٹین ہے۔“ میں نے کہا۔

شادو چند منٹ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”حالانکہ آپ

کی بات میں نہیں سمجھ سکا ہوں مگر میرا وعدہ ہے کہ ڈاکو شادو

اندر ہی رہے گا اور گاؤں کا یہ سیدھا شریف شادو آپ کے

ساتھ رہے گا۔۔۔۔۔ اگر جان بھی جاتی ہوگی تو بھی ڈاکو اندر ہی

رہے گا۔“ شادو نے کہا۔

”تو پھر تم یقین کرو کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا۔

”شام ہوگئی تھی چتر والی گاؤں بھی قریب آ گیا تھا۔

ہم جس طرف سے گاؤں آئے تھے وہاں پر جو سب سے پہلا

گھر ہمیں ملا وہ بہت بڑا تھا۔ کچا مکان تھا باہر ہی ایک پھولس کا

چھپر پڑا ہوا تھا اور کچھ جانور اس کے اندر کھڑے تھے اور ایک

لائین درمیان میں الگ رہی تھی مگر اس کی روشنی بہت کم تھی اور

ایک دھوتی پوش آدمی باہر کھڑا تھا۔ شادو نے اس کے قریب

گاڑی روک دی اور پوچھا۔ ”یہ کونسا کام ہے بھلا۔“

دھوتی پوش گاڑی کے قریب آ گیا اور بولا۔ ”چتر

”وہ کون ہے بھائی اور کیا بیماری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کاپہ بیمار کی کا۔ بس کھات پر پڑا ہے۔ وہ ہمارا ہوتا ہے نہ بولے ہے نہ کھڑا ہو سکے ہے تین مہینے ہو گئے۔ دور اور دھورے کے سب وید دیکھ چکے دو ابھی دے چکے۔ پروہ نہ اٹھا۔“ رادھے نے رونے والے انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ ”تم ایسا کرو پہلے مجھے مریض دکھاؤ۔“

”روٹی پانی کرلو پھر دکھا دیں گے۔“ رادھے بولا۔

”نہیں ہم اگر ذرا دور میں روٹی کھالیں گے تو کیا فرق پڑے گا مریض پہلے دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

رادھے نے ممنونیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”آؤ پھر۔۔۔۔۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میدان کے اس پار چھپر میں وہ چلا گیا یہ چھپر بھی بہت جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ اس کے ایک طرف ایک عورت روٹیاں پکارتی تھی اور دوسرے کنارے کے ساتھ ایک چار پائی پر ایک بوڑھا آدمی لیٹا تھا۔ یہاں پر اندھیرا تھا۔

میں نے اشارہ کیا تو رادھے لائین اتار کر لے آیا۔ بوڑھا بہت کمزور تھا۔ بلکہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کو کہا جائے تو بھی غلط نہیں ہوگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اس کا مرض نظر آ گیا۔ میں نے رادھے کو کہا

پانی لاؤ۔ رادھے ایک گلاس پانی لے آیا۔ میں نے وہ پانی کا گلاس بوڑھے کے منہ سے لگا دیا۔

بوڑھا پانی پینے لگا اور پورا گلاس اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ میں اس کے سر ہانے کھڑا رہا بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ”تھو رادھے بھوک لگی ہے۔“

رادھے نے اپنے باپ کی آواز سن کر حیرت سے اچھل پڑا۔ ”ابھی لایا باپو۔“ اور دوڑ کر ایک باجر سے روٹی پر ساگ دکھ کر لے آیا اور بولا۔ ”لے لے لے لے۔“

میں نے بوڑھے کو سہارا دیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ میں روٹی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے نوالے تو ذکر

کھانے لگا اور کچھ ہی دیر میں پوری روٹی کھا گیا۔ رادھے نے خوشی سے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہو گیا یقین نہیں آ رہا۔“

”تیرے سامنے پانی بیا روٹی کھائی اور اٹھ کر بیٹھا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے کوئی دوا دارو دی نہ کچھ کیا۔ ٹھیک کیسے ہوا ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ رادھے بولا۔

”تم زیادہ نہ سوچو۔ یہ اب ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ دوڑ کر اپنی جورو کے پاس گیا اور اس کو یہ خوش خبری سنا آیا اور باپ سے پوچھا۔

”باپو تم اب ٹھیک ہو، کوئی تکلیف تو نہیں۔۔۔۔۔؟“

بوڑھے نے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ تو فکر نہ کریے دونوں کون ہیں۔“

”ارے باپو یہ بگوان نے ہمارے گھر اتارے ہیں۔ آتے ہی تم ٹھیک ہو گئے۔ میرے تو اب دن پھر جائیں گے آتے ہی چسکا رہ گیا۔ سویرے گاؤں والے نیشن گے تو اترج کریں گے۔“

”تم دو چار دن کسی کون بتاؤ کہ تمہارا باپو ٹھیک ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات خوشی کی ہے، کا ہے نہ بتاؤں۔ سب سے پہلے تو چھوڑا چھوڑی آؤت ہوں گے۔ ددا کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“ رادھے نے کہا۔

”یہ چھوڑا چھوڑی تمہارے ہیں۔“ شادو نے پوچھا۔

”ہاں جی چھوڑا بڑا ہے اور چھوڑی ابھی چھوٹی ہے۔ دادا کی بڑی لاڈلی ہے دونوں کھیت پر ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔ ددا کو پہلا چھوڑا دیکھ کے نہال ہو جاویں گے۔“ رادھے خوشی سے بولا۔

”اور ایک بات اور یہ کسی کو نہ بتانا کہ باپو ٹھیک کیسے ہو گیا اگر بتاؤ گے تو پھر بیمار پڑ جائے گا۔“ میں نے آخری بات صرف اس کو ڈرانے کو کہی تھی۔

”جو پوچھیں گے کا دوائی دی کون وید کی دوائی دی تو سب کو تو تال دوں گا۔ اگر زمیندار نے پوچھا تو پھر

بتانا ہی پڑے گا بڑے چکر میں پڑ جاؤں گا۔“ رادھے فکر مندی سے بولا۔

”تم فکر نہ کرو رادھے۔ ہم دونوں تمہارے پاس ہیں زمیندار پوچھے تو ہم دونوں کو پیش کر دیتا۔“ میں نے کہا۔ وہ یہ سن کر بولا۔ ”ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ بات یہ ہے کہ زمیندار آدمی ذرا نیڑھا ہے بال کی کھال نکالے ہے تم سامنے ہو گے تو میری بھی ڈھارس ہوگی۔“ رادھے نے کہا۔

”اب تم روٹی کھاؤ۔“ اور رادھے گاؤں کا جو بہترین کھانا تھا لے آیا میں نے اور شادو نے ڈٹ کر کھایا اور سو گئے۔ مگر میں کچھ دیر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ بیماری گئی نہیں صرف بدن سے نکلی ہے رات میں ضرور آئے گی اور اپنی جگہ جانے کی کوشش کرے گی۔ لوٹا چھاری اور اس کی ساری قوم صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ لڑائیاں کرادے۔ بیماریاں پھیلا دے، ناچاتی پیدا کر دے۔ بھائیوں کو دشمن بنادے اور دوستوں کو قاتل بنادے۔ لوٹا چھاری سفلی کا ایک خطرناک بیر ہے مگر خطرناک ان کے لئے جو اس کی اصلیت کو نہیں سمجھتے۔ میرا واسطہ کسی دفعہ اس سے پڑ چکا تھا میں بوڑھے کی عجیب بیماری کا سن کر ہی سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اس کے قریب جانے سے پہلے ہی پوری تیاری کر لی تھی۔ لوٹا چھاری یا اس کی کوئی نسل یہ کوشش کرتی ہے کہ مریض کے جسم میں پانی نہ جانے دیا جائے۔ اس طرح وہ مریض کو کمزور سے کمزور تر کرتی ہے اور مریض پانی کی کمی سے مر جاتا ہے وہ چونکہ خود اس کو ہلاک نہیں کر سکتی اس لئے حالات اس قسم کے پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خود بخود مر جاتا ہے۔ میں مریض کے قریب ہی تھا۔ مگر چارپائی پر لیٹا ہوا سب نگارہ کر رہا تھا۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی صرف دس بجے تھے مگر ہر طرف اندھیرا تھا۔ جھینگروں کے بولنے کی آواز کبھی کبھی آ جاتی تھی۔ چارپائی کے چاروں طرف ایک ہیو لے کی شکل میں وہ چکر لگا رہی تھی۔ اس کو بڑھے کے بدن میں جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سارے راستوں پر پہرہ لگا دیا تھا۔

آخر وہ تھک کر چلی گئی۔ میں جانتا تھا وہ اب بھی نہیں گئی تھی وہ صرف بھلا وہ دے رہی تھی کچھ ہی دیر میں وہ پھر آ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور مریض کی چارپائی کے قریب جانے کو کھڑا ہو گیا۔ وہ بھولا میری طرف مڑ گیا۔ اس کی کوئی شکل نہیں تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے منمنائی آواز میں کہا۔ ”گا ہے اپنی موت کو بلاوے ہے مجھے کام کرنے دے نہیں تو مارا جائے گا۔“

”تیرا کام ختم ہو گیا اب تو جاو پھر اس گھر میں مت آنا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تیرا کہا مانوں گی۔ میری ماما جی جیوت ہیں ان کا کہا پتھر پے لیکر ہے۔ یہ بڑھامرے گا تو جاؤں گی اور تو سن پلے باندھ لے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کا بھی بڑھے کے بعد حساب لوں گی۔ بچے گا تو بھی نہیں۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”تو کون ہے بڑی تیز بول رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کون ہوں سنے گا تو موت نکل جاوے گا۔ میں لوٹا چھاری کی سوویں اولاد ہوں۔ بڑی لاڈلی ہوں مہتاری کی۔ وہ اگر سن پائی تو تیرا ستیا تاس کر دے گی۔“ وہ بولی۔ ”بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی اپنی مہتاری کو ذرا بلاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں ہی بہت ہوں ابھی تیری بڑی جوڑ ہلا دوں گی۔“ وہ نفرت بھری آواز میں بولی۔

”تو ذرا اوپر دیکھ۔“ میں نے کہا اس نے چونک کر اوپر دیکھا اور بس اتنی دیر میں میرے کارندے نے اس کو قابو کر لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ میں نے کہا۔ ”دیکھ کیا اب بھی تیری مہتاری آئے گی.....؟“

”اس کو مت بلانا میں چلی جاؤں گی.....“ وہ جلدی سے بولی۔

”جانا تو تجھے ہے۔ یہ بتا کیوں آئی اور کس کے حکم پر آئی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”میں گرو منا چھارے کے حکم پر آئی تھی۔“

”اب تو جانے کی نہیں میں تجھے ایسی جگہ پہنچائے دیتا

ہوں جہاں تو اپنے کرموں کا پھل پائے گی۔“ میں نے کہا۔
”مجھے چھوڑو میں نے تیرا کیا لگاڑا ہے۔“ وہ
گڑگڑا کر بولی۔

”تو پھر کسی کو بیدار کرے گی پھر کوئی رگڑ رگڑ کر مرے
گا تو پھر کہے گی میں نے کیا کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”تو میں کب مرضی سے کرتی ہوں گرو کہتا ہے میں تو
اس کے بس میں ہوں۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تو تو جتا.....“ اور میرے اشارے
پر کارندے نے اس کی گردن ٹاپ لی اور ہوا ہو گیا۔ یہ سارا
ڈرامہ ہوا اور ختم بھی ہو گیا اور سب سوتے رہے کسی کو کانوں
کا خبر نہیں ہوئی۔

صبح سب سے پہلے بڑے میاں بیدار ہوئے اور اٹھ
کر بیٹھ گئے۔ گاؤں میں لوگ جلدی اگر سوتے ہیں تو صبح
جلدی اٹھ بھی جاتے ہیں سورج کے نکلنے سے پہلے ان کے
بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں راوہے اور اس
کی گھر والی بھی بیدار ہو گئے اور دونوں بچے بھی اٹھ گئے۔
ناشتے کے بعد میں نے راوہے سے کہا۔ ”اب تم
ہم دونوں کو لے کر زمیندار کے پاس چلو۔ ہمیں اس سے کچھ
کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرا جان ضروری ہے کا بڑا میٹرھا آ دی ہے کوئی ذرا
سا بھی مٹنا ہو گیا تو میرا دشمن ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔
”تو پھر تم مت جاؤ۔“ شادو نے کہا۔ ”تم اس کا گھر
بتاؤ۔“

”جو سب سے اونچی اور بڑھیا حویلی نظر آئے وہی
گھر ہے۔“ راوہے نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو اور نگر نہ کرو، ہم پھر آئیں
گے۔“ میں نے کہا۔

چتر والی گاؤں اچھا بڑا گاؤں تھا۔ ہم دونوں نکل
پڑے۔ ایک آدمی سے زمیندار کی حویلی کا پتہ کیا۔ تو اس نے
پہلے حیرت سے ہمیں دیکھا اور پھر جلدی سے بتا کر آگے
بڑھ گیا۔ اب ہم حویلی کے سامنے تھے۔ یہ واقعی اس گاؤں کا
بہترین مکان تھا۔ بڑا اونچا دروازہ تھا دروازے کے دونوں

طرف دو بڑی بڑی مورتیاں دیوار میں بنی ہوئی تھیں حویلی
بہت پرانی تھی مگر بڑی مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ بڑے
دروازے میں ایک چھوٹا دروازہ بھی لگا ہوا تھا اور اس کے
سامنے ایک آدمی کان سے اونچا لٹھ لئے کھڑا تھا۔ سر پر پیلا
صافہ اور کان میں بالی ڈالی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیر کا مضبوط اور
چاک و چوبند نظر آتا تھا۔

شادو اور میں اس کے قریب چلے گئے۔ شادو نے کہا
”ٹھا کر دھرم داس زمیندار سے ملنا ہے۔ کہاں ہیں وہ.....“
اس نے سر سے پیر تک ہم دونوں کو دیکھا اور بولا۔
”کا کام ہے اور کہاں سے آئے ہو پہلے یہ بتلاؤ۔“
”اناؤ سے آئے ہیں۔ بہت ضروری کام ہے ان کو
خبر کر دو۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا کرتے ہیں ان کو خبر۔“ اور وہ چھوٹا دروازہ
کھول کر اندر چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد آ کر بولا۔ ”آ جاؤ میرے
ساتھ۔“ ہم لوگ بھی اسی چھوٹے دروازے سے اندر داخل
ہو گئے۔ اس دروازے کے اندر کی طرف بھی ایک آدمی کھڑا
تھا۔ مگر اس نے ہم سے کچھ نہیں کہا۔

دروازے کے سامنے کھلا میدان تھا۔ دائیں بائیں
حویلی کی اونچی دیوار نظر آتی تھی۔ یہ حویلی قلعہ کی طرز پر بنائی
گئی تھی۔ رہائشی کمرے میدان کے سامنے تھے مگر ان کے
سامنے ایک باڑ لگی ہوئی تھی اور وہ باڑ کروندے کی تھی۔

کروندے کی جھاڑی میں بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں
اور اس میں ایک چھوٹا سا پھل بھی لگتا ہے جو کچا ہونے پر ہرا
اور پکنے پر پیلا اور سرخ رنگ کا ہو جاتا ہے یہ پھل ترش ہوتا
ہے اس کو اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ باڑ اتنی چوڑی تھی کہ
انسان تو انسان بلٹی بھی پار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے پوری باڑ
پار کر کے ہم بائیں حصہ کی طرف آئے۔ ایک دروازے کے
سامنے وہ کھڑا ہو گیا اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔
آواز آئی ”اندر آ جا۔“

اس نے ہم کو اشارہ کیا اور ہم اندر چلے گئے۔ حویلی کا
یہ کمرہ بہت بڑا تھا۔ دیواروں پر جانوروں کے سر لگے ہوئے

”اور ہمارا پرستے بھی تم کو مل گیا تم اب خود کو آزاد
مت سمجھنا تم دونوں ہماری قید میں ہو۔ زیادہ اچھل کود کرو
گے تو مارے جاؤ گے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”زیادہ مغروریت کی بات مت کر رکھا کر۔ ایسا نہ ہو
کہ تو دھوکے میں مارا جائے۔ تیرا گرونا کہاں ہے۔ اس کو
بلا تو اسی پر اکرنا ہے نا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”تو میرے گرد کی بات کیسے جانتا ہے۔“ وہ بولا۔

”تو نے شادو کے بارے میں کہا۔ ہم کیوں آئے

ہیں۔ یہ تجھے پتہ ہے میں تو حیران نہیں ہوا تو پھر تو کیوں

حیران ہو رہا ہے۔ تیرے جس کان میں یہ سب باتیں آ رہی

ہیں اب وہ کان بند ہوا۔ تو مجھے قید کر رہا تھا مگر تو خود اپنے گم

میں قید ہو گیا۔ یہ تیرے گرد بیٹھے آدمی بڑے جیالے ہیں تجھ

پر جان بچھاؤ کرنے والے ہیں، مگر بچارے تیری وجہ سے

مارے گئے اب یہ تیرے نہیں ہیں۔“

وہ گھبرا کر بولا۔ ”گرد کچھ بتاؤ یہ کیا بکواس کر رہا

ہے۔“

میں اور شادو خاموش کھڑے رہے وہ گرد کو پکارا

مگر کان بند ہو گئے۔ آخر چیخ کر مجھ سے بولا۔ ”تو کوا

ہے؟“

”تیری بہت سنی ہے اب تو میری سن اور جواب

دے اس کمرے میں تیری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ یہ باز

اچھی طرح سمجھ لے۔“ میں نے کہا۔

اس نے صرف بے بسی سے میری طرف دیکھا مگر

بولا کچھ نہیں تو میں نے پھر کہا۔ ”تیرا گرو اندر آ سکتا ہے نہ کوئی

اور۔ میرے ہر سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیتا جانے دے گا تو

الٹا لٹکا دوں گا کیونکہ تیرا کردار تجھ پر رحم نہیں کرنے دے گا۔“

وہ خاموش رہا۔ تو میں نے کہا۔ ”ایک لڑکی دلی سے

بیاہ کر جمیل اتنا ڈاکو بھی اتنا ڈاکو ہے اس کو کسی نے انگو

کر لیا۔ کئی آدمی مارے گئے اور کچھ بری طرح گھاسل ہوئے

سب نے کہا جمیل کے ڈاکوؤں کا کام ہے۔ جمیل کو

گھائیوں میں شادو لال کا راج ہے۔ تیرے سامنے شادو

لال کھڑا ہے اس کے حکم کے بغیر وہاں کچھ نہیں ہوتا۔ اس

تھے۔ فرش پر قالین پڑا تھا اور ایک بہت بڑا چھپر کھٹ پڑا تھا

اس کی جھالیں سنہری رنگ کی تھیں۔ بڑے بڑے گاؤں تھیں

پڑے تھے ان کے سہارے ایک شخص بیٹھا تھا اس کے دونوں

طرف کرسیوں پر دو آدمی اور بیٹھے تھے۔ جو شخص چھپر کھٹ پر

گاؤں تھیں کے سہارے بیٹھا تھا وہی دھرم داس تھا۔ اس کی

موتچھیں بڑی بڑی اور رنگ کالا تھا۔ میں نے ایک نظر میں

اندازہ کر لیا کہ آدمی نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ اس کے

چہرے سے عیاں تھی اور آنکھیں عیاری اور مکاری کا پتہ

دے رہی تھیں۔ اس کے اطراف جو دونوں تھے وہ بھی اسی

تھیل کے چنے بٹے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم ہی زمیندار ہو.....؟“

”آنکھیں کھول کر دیکھ تیری آنکھوں میں کیا موتیا

اتر آیا ہے کہ پوچھ رہا ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”پوچھ لینا بھی تو اچھا ہے میں نے کیا برائی کر دی

کہ تم غصہ ہو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”ہاں ہم ہی دھرم داس ہیں پتہ چل گیا اب چنوں

میں ڈنڈوت کر لے۔“ وہ غور سے بولا۔

”ہم ڈنڈوت کرنے نہیں آئے ایک کام سے آئے

ہیں۔“

”جو ڈنڈوت نہ کرے ہم اس کا کام نہیں کرتے اگر

ڈنڈوت راضی سے نہیں کرو گے تو غیر راضی کرنا پڑے گا۔ یہ

ہمارا دستور ہے ہم ٹھا کر ہیں۔“

”اور ہم کسی دستور کے پابند نہیں ہیں ہم جو پوچھنے

پتہ کرنے آئے ہیں تم بولو پوچھیں۔“ میں نے کہا۔

”ہم جاننے ہیں تم کیا پوچھنے آئے ہو مگر جواب اسی

وقت ملے گا جب تم ہمارے سامنے ڈنڈوت کرو گے۔ تم منہ

اٹھا کر چلے آئے ہو اور اس ڈاکو کو بھی اپنی مدد کو لے آئے ہو

مگر کان کھول کر سن لو نہ تم کچھ کر سکو گے اور نہ یہ ڈاکو کچھ

کر سکے گا تم سمجھتے تھے ہم نرے زمیندار ہی ہیں۔“ وہ غور

سے بولا۔

”اچھا ہوا تم پہچان گئے پرستے نہیں کرنا پڑے گا۔“

شادو نے کہا۔

کے پورے اڈے پر عورت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس علاقے میں صرف تو ہی ایسا ہے جو یہ ذلیل کام کر سکتا ہے۔ کسی قسم کا جھوٹ فریب مت کرنا تا وہ لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا ناک کے نتھنے پھول چک رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ کچھ دیر شوں شوں کرتا رہا مگر بولا کچھ نہیں تو میں نے پھر کہا۔ ”یہ بیل کی طرح شوں شوں مت کر میری بات کا جواب دے۔ بھول جا اس بات کو کہ تو کہاں کا زمیندار ہے۔ تو اس کمرے کا قیدی ہے تیری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جا رہی اور سن تیرا گورو کمرے کے دروازے پر موجود ہے وہ اندر آنے کی ہلکی نہیں رکھتا اور تو باہر جانے سے مجبور ہے اور تو زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا تو فر فر بولے گا۔ مجھے اس کام پر مجبور نہ کر جو میرا پسندیدہ نہیں ہے۔ جلدی بول۔“

میں نے بات ختم کی تو وہ ذرا کسمسایا۔ زبان ہونٹوں پر پھیر رہا تھا پھر بولا۔ ”وہ لڑکی حویلی میں موجود ہے میرے آدی اٹھا کر لائے تھے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”اور تو نے ان کو انعام و اکرام سے نوازا ہوگا۔“ شادو نے نفرت سے کہا۔

ٹھا کرنے قہر آلود نگاہوں سے شادو کو دیکھا اور بولا۔

”تو تو چپ ہی رہ لگا بھگت میں سب جانوں تجھے۔“

”ٹھا کرتا شادو کی جوتیوں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہو۔ تم ٹھا کر ہو بڑی ذات پر اتراتے ہو اپنے اوچھے کردار کو نہیں دیکھتے۔ تم جو گری ہوئی انسانیت سوز شرمناک حرکتیں کرتے ہو شادو وہ نہیں کرتا۔ شادو تم جیسے کم ظرف و دلت مندوں کو لوٹتا ہے کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ ہر عورت کی عزت کرتا ہے اس کو میلی نظر سے نہیں دیکھتا تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری ذلالت عروج پر ہے تو اس کی شرافت ایک مقام رکھتی ہے۔ اس لڑکی کو بلاؤ۔ آواز دو تمہارے اس مٹی کے مادھو کو۔ یہ لے کر آئے گا۔“ میں نے رسی پر بیٹھے آدی کی طرف اشارہ کیا۔

ٹھا کرنے کہا۔ ”شکر چھوری کو لے آ.....“

شکر جیسے نیند سے جاگا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دوڑتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا اور پانچ منٹ کے بعد وہ ایک لڑکی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہوگی وہ دلہن کے لباس میں ہی تھی مگر وہ لباس ٹخنوں سے بھرا ہوا تھا میلا پچھلا تھا اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ صاف نظر آتی تھی۔ وہ چاروں طرف حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شادو نے اس کو ایک نظر دیکھا اور اس کا خود پر قابو نہ رہا وہ غصہ اور نفرت بھری آواز میں بولا۔ ”حکیم صاحب میری بندش کھول دیں میں اس ذلیل ٹھا کر کی اولاد سے حساب کرنا چاہتا ہوں۔ میری برداشت کی حد ختم ہونے والی ہے۔ میرا دماغ کہتا ہے یہ انسان نہیں بھیڑیا ہے بھیڑیا۔ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے وہ میں جانتا ہوں۔“

”سکون سے رہو شادو۔ یہ ذلیل اس لائق نہیں ہے کہ تم اس پر ہاتھ اٹھاؤ اس کا شکر کیا ہونے والا ہے تم خود دیکھ لیتا۔ ٹھا کر اب یہ بتا تیرے اس ذلیل کام میں کون کون شامل ہے اور لڑکی کو اٹھا کر کون لایا تھا۔ سب کو بلا لے تاکہ سب کا حساب کتاب ایک جیسا ہونا انصافی کسی کے ساتھ نہ ہو۔“ ٹھا کر خاموش کھڑا رہا۔

میں نے جوت کی طرف دیکھا میرے ساتھ ٹھا کر نے بھی نظریں اٹھائیں اور چیخ کر بولا۔ ”بلاتا ہوں سب کو بلاتا ہوں۔“ اور ایک ایک کر کے چھ کڑیل جوان جن کے جسموں پر چرچی کی تپیں چڑھی ہوئی تھیں کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان کو اشارہ کیا۔ وہ منٹ کے ہزارویں حصے میں ہوا میں تیرتا ہوا آیا اور ایک جوان کی آنکھیں نکال کر کھا گیا۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو گیا تکلیف کے مارے وہ زمین پر گر پڑا۔ یہ کام اتنی جلدی ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ الودھ پھرا اور دو سراسر زمین پر گر گیا اس طرح الو سب کو اندھا کر گیا سب قرش پر پڑے بلبلارہے تھے۔ ٹھا کر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا

کتنی جلدی اور اتنا بھیاں تک انتقام ان سب سے لیا جائے گا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنانا سب کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے سے باہر والوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ٹھا کر دو دیکھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا مگر آواز نہیں نکلی رہی تھی۔ اس کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ سب کو اذیتیں دینے والا جو زمین پر خود کو خدا سمجھتا تھا آج اس کو پتہ چلا کہ اس کی کیا حیثیت ہے وہ کتنا طاقتور ہے جس طاقت پر وہ غرور کرتا تھا وہ اندھی ہو گئی تھی اور زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

میں اس کے قریب گیا اور اس کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا: ”ان کے علاوہ اور کتنے ظالم ہیں وہ بھی بتادے نہیں بتائے گا تو بھی میں تلاش کر لوں گا۔“

”بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

اور اس آدمی اور آئے۔ وہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان سب کو بھی وہی سزا دی گئی۔ شادو اس پر خوش نہیں تھا وہ ان سب کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو کہا: ”موت تو کوئی سزا نہیں ہے یہ تو زندگی کی تکلیف دہ حالات سے چھٹکارے کا نام ہے۔ سزا یہ ہے کہ وہ زندہ رہے اور ساری زندگی ندامت کے آنسو بہاتا رہے جو دکھ لوگوں کو اس نے دیئے ہیں اٹھاتا رہے۔“

شادو میری بات سے مطمئن ہو گیا۔ کمرے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ ہر طرف ٹھا کر کے جیا لے پڑے تھے۔ وہ سب اندھے تھے۔ ٹھا کر ابھی ٹھیک تھا۔ اس کی ساری اکڑوں ختم ہو گئی تھی وہ ہاتھ باندھ کر میرے اور شادو کے سامنے کھڑا تھا۔ ”اب تو بھی اپنی سزا بتادے۔“ میں نے کہا۔ ”میں توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دے میری سب زمین گھر روپیہ پیسہ مجھ سے لے لے مجھے معاف کر دے۔ میں بھگوان کے نام پر تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں۔“ وہ جیروں میں گر پڑا۔

شادو نے پکڑ کر اس کو پھر کھڑا کر دیا اور کہا: ”تو آدمی نہیں ہے۔ تو سانپ ہے جس کی فطرت ہے کاٹنا۔ تو کوئی فطرت سے باز نہیں آئے گا۔“

”میرا سب کچھ تم لے لو تم زمینداری کرو میں تمہاری غلامی کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ بولا۔

”مجھے تیری زمینداری نہیں چاہئے۔“ شادو نے گرج کر کہا۔

”اب تو اپنے گرو کو آواز دے وہ کمرے کے باہر کھڑا ہے۔“

اس نے آواز دی۔ ”گرو جی اندر آ جاؤ۔“ ایک موٹا تازہ آدمی جو دھولی اور بڈی میں ملبوس تھا اندر آ گیا اندر آ کر اس نے وہ نظارہ دیکھا کہ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ٹھا کر کے علاوہ سب پڑے تھے اور کمرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ ”ارے ٹھا کر یہ سب کیا ہے۔ کا ہوا ان سب کو۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”اس سے کیا پوچھتا ہے بد بخت۔“ میں نے کہا۔ گرو نے میری طرف دیکھا اس کو ایک کمزور سا بوڑھا سانسے نظر آیا۔

”تو تو ہے آفت کی پڑیا۔ تو نے ان سب کو کشت دیا ہے۔“

”ہاں میں نے ان کو ان کے انجام تک پہنچایا ہے اور اب تیرا نمبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرا رستہ نہ روک لیتا تو۔۔۔ تو ایسا کبھی نہ کر پاتا پاپی۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تو ایسا کر اپنی حسرت پوری کر لے۔۔۔ میں تیرے گناہ سامنے کھڑا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تو حیراؤہ کروں گا کہ تو یاد کرے گا۔“ وہ بولا۔ اب ٹھا کر کے چہرے پر کچھ رونق آ گئی تھی۔

”ٹھا کر کو غلط راستہ دکھانے والا تو ہی تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے دھرم میں جو ٹھیک تھا۔۔۔ میں نے وہی کیا ہے۔“ وہ بولا۔

”تیرا دھرم کیا ہے پاپی۔“ شادو نے پوچھا۔

”تو کس منہ سے بات کرتا ہے۔ شرم کر ڈا کو دنیا کو لوٹا ہے ان کے مال پر عیش کرتا ہے اور مجھے پاپی کہتا ہے۔“

گرونے جواب دیا۔

”تیرا دھرم وہی ہے جو شیطان کا دھرم ہے مگر یاد رکھ تو چاہے جو کر لے پھر بھی انسانوں کو ختم نہیں کر سکتا نیکی کی ہمیشہ جیت ہوتی رہے گی۔“ میں نے کہا۔

”میں تیرے کس بل سب نکال دوں گا۔“ وہ بولا۔
”تو اپنے چیلے کو بچا کیونکہ اس کی سزا کا وقت قریب آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ منہ ہی منہ میں بد بدایا اور ہاتھ اوپر کر دیے۔ ایک بہت بھاری تلوار اس کے ہاتھ میں آگئی مگر وہ تلوار اتنی بھاری ہوگئی کہ وہ اس کو پکڑتے ہی گر پڑا۔ مگر گرتے ہی اس نے لوٹ لگائی اور ایک چیل کی شکل اختیار کر کے باہر کی طرف پرواز کر گیا۔ میں اگر اشارہ کرتا تو اس کے پیچھے ضرور جاتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کتنی دور جاسکتا ہے اس کے جانے کے بعد ٹھا کر بھی اندھوں میں شامل ہو گیا۔

”تیری زندگی کی یہ ضمانت ہے کہ تو آئندہ کسی انسان کو نہیں ستائے گا۔ ہر عورت کو اپنی ماں بہن سمجھے گا۔ اس کے خلاف تو نے کچھ کیا تو یاد رکھ مجھے یہ پتہ چل جائے گا۔“

میں نے شادو کو اشارہ کیا اور ہم دونوں حویلی سے باہر آ گئے۔ دروازے پر کھڑے آدی سے کہا۔ ”ایک ٹھوڑا جلدی سے۔“ وہ آدی فوراً ہی ایک طرف چلا گیا اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد شادو نے کہا۔

”آپ کس طرح جائیں گے۔“
”میں ٹھوڑا سواری نہیں کرتا تم اڈے پر چلے جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میں اب وہ کام نہیں کروں گا جو اب تک کرتا تھا۔ میں اپنا آبائی کام کر لوں گا مزدوری کر لوں گا۔ میں نے آپ کے ساتھ جو دیکھا ہے وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔“

شادو لال کی اندرونی کیفیت کو میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس وقت تم اڈے پر جاؤ مگر صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم شادو لال کسان ہو تمہارے اندر جو ڈاکو تھا وہ مر گیا

ہے میں تم سے اڈے پر ملوں گا اور پھر تم اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام بناؤ گے۔“

شادو لال روانہ ہو گیا اور میں دلی اس لڑکی کو لے کر آ گیا۔ اب وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔“ رولو کا نے پوری روداد سنا ڈالی تو میں نے پوچھا۔

”شادو لال کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“
”حکیم صاحب زندگی میں ہر طرح کے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے مگر کوئی ایسا ضرور ملتا ہے جو متاثر کرتا ہے کوئی اپنے منہ سے کوئی علم سے کوئی گفتار سے کوئی کردار سے، شادو لال نے کردار سے متاثر کیا ہے۔ ڈاکے مارنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کے اندر ایک جذبہ تھا۔ اس کو انتقام کہتے ہیں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا کہ یہ اس کے اور اس کے خاندانوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس لئے وہ ان لوگوں کا دشمن ہو گیا۔ وہ شعوری طور پر نہ ظالم انسان ہے نہ دولت کالا لچی ہے۔ اگر اس کو تمہیل کی گھائی میں رہنے دیا جائے گا تو وہ اپنی ضرورت کے بجائے دوسروں کی ضرورت کی خاطر ڈاکے ڈالے گا۔ اس طرح ایک اچھا انسان برائی میں کب تک اچھا رہے گا۔ گندے تالے میں کوئی کب تک پاک رہ سکتا ہے۔“ رولو کا نے سنجیدگی سے کہا۔

”مگر اس پر جو ڈاکے کے الزامات ہیں ہو سکتا ہے قتل کے ہوں اس کے لئے کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”جو کام کرنے ہیں وہ تو کرنے ہیں راہ کے کانٹوں کا حساب نہیں کرتا ہے۔“ رولو کا نے جھپک دیا۔

”قانونی پیچیدگیاں اور وہ لوگ جو شادو لال کے دشمن ہیں وہ کب اس کو معاف کریں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ جس لائن پر سوچ رہے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہے مگر میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”اور مجھے امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تمہاری نیت نیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ دوسرے دن رولو کا پھر تمہیل روانہ ہو گیا۔ مجھیں اس نے بوڑھے آدی کا

ہی بنایا ہوا تھا۔

ان کا خرچ بھی پورا کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کو کرنا ہے مگر خود کو چھپا کر رکھتے ہیں ان کو اگر شرافت کی زندگی مل جاتی ہے، سماج ان کو قبول کرتا ہے تو ان کے لئے اس سے بہتر اور کیا بات ہوگی مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا ہونا آسان نہیں ہوگا اس لئے میں نے صرف اپنے بارے میں فیصلہ کیا ہے، سب کے بارے میں نہیں، میرے سب ساتھی میری طرف سے آزاد ہیں۔“ شادو لال نے کہا۔

”اور تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”میں اب ڈاکے نہیں ماروں گا کسی دور دراز شہر جا کر محنت مزدوری کروں گا۔“ شادو لال نے کہا۔
”اور اگر وہاں پر بھی پہچانے گئے تو جیل میں بند ہو جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔

”جیل اور پھانسی تو میرا مقدر ہے میں نے یہاں آنے سے پہلے ہی خود کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔“ شادو نے کہا۔

”مگر میں نے دوسرا طریقہ سوچا ہے۔“ میں نے کہا۔
”آپ کا طریقہ ضرور مجھ سے اچھا ہوگا بتائیے۔“ شادو نے پوچھا۔

”تم قانونی طور پر خود کو قانون کے سامنے پیش کر دو آئندہ کے لئے لکھ کر دو۔“ میں نے کہا۔

”یہ اچھی راہ ہے مگر اس میں جگہ جگہ کاٹنے کھڑے پڑے ہیں۔“ شادو لال نے اداسی سے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری سچائی تمہارے ساتھ ہے۔ وہ کاٹنے خود بخود دھٹ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے آپ کو بہت کم دیکھا ہے۔ مگر جتنا دیکھا ہے وہ بہت ہے آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔“ شادو لال نے کہا۔

”تمہارے ساتھیوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب اپنی اپنی جگہ آزاد ہیں جو یہاں رہنا چاہتے ہیں وہ رہیں جو میرے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں میرے ساتھ، جو کچھ دکھ میں اٹھاؤں گا وہ بھی اٹھائیں گے معاشرے

”اس دفعہ مجھے شادو لال کے پاس جانے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ شادو لال مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا بڑے ادب و احترام سے اس نے مجھے بٹھایا اور بولا۔“ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“
”مجھے پتہ تھا۔ تمہارے اندر جو تبدیلی آئی ہے میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے اب پتہ چلا ہے کہ دنیا میں صرف ٹھا کر ہی نہیں رہتے صرف ظالم ہی نہیں رہتے، یہاں پر مظلوم کی فریاد سننے والے اور ان کا دکھ دور کرنے والے بھی رہتے ہیں۔ میں صرف ایک ٹریک پر چل رہا تھا دوسرا ٹریک مجھے آپ نے دکھایا ہے میں آپ کا شکریہ ادا کس طرح کروں آپ کی کیا خدمت کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ شادو لال نے کہا۔

”یہ تم نہیں کہہ رہے ہو تمہارے اندر کا اچھا انسان کہہ رہا ہے تم بنیادی طور پر ڈاکو نہیں ہو، تم نے ڈاکے مارے ضرور ہوں گے مگر اپنی زندگی کو عیش و عشرت میں بسر کرنے کو نہیں مارے ہوں گے اپنی ضروری ضروریات کی خاطر اپنے ساتھیوں کی خاطر ڈاکے مارے ہوں گے مجھے اس کا اندازہ ہے کیونکہ میں نے تمہارے اندر ایک اچھے انسان کو تلاش کر لیا ہے اور میں دوبارہ صرف اہل لئے آیا ہوں کہ اس اچھے انسان کو باہر لے آؤں بولو تم اپنے اندر کے انسان کو باہر نکالتا چاہتے ہو۔“ میں نے اس پر اور اس کے پاس بیٹھے دو آدمیوں پر گہری نظر ڈالی اور بات ختم کی۔

کچھ دیر گھمبیر خاموشی رہی اس کے بعد شادو لال نے کہا۔ ”میرے اندر کا وہ انسان جس کا آپ نے ذکر کیا ہے اب تک ویسا ہی ہے جیسا اس اڈے پر آنے سے پہلے تھا۔ میں اپنی خوشی سے یہاں پر نہیں آیا تھا اور میرے ساتھ جو لوگ ہیں وہ سب بھی حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ کہیں نا کہیں پر وہ کسی کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں اور حکیم صاحب کوئی خوشی سے مجرم نہیں بننا، میرے ساتھ ایسے بھی ہیں جن کے بیوی بچے ہیں وہ ان سے ملنے جاتے ہیں

میں جگہ بنانے کو کچھ تو کرنا ہوگا۔“ شادو لال نے کہا۔

”تمہارے کل کتنے ساتھی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم سب ملا کر بائیس آدمی ہیں۔ ان کے علاوہ گاؤں گاؤں ہمارے خبر کام کرتے ہیں، ان کو میں شامل نہیں کر رہا کیوں کہ وہ بظاہر ہمارے نہیں ہیں۔“ شادو نے جواب دیا۔

”تم ایسا کرو ان سب کو بلاؤ ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ ان کی رائے لیتے ہیں۔ ہر آدمی کے سوچنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں سب کو بلاتا ہوں۔“ شادو نے بھوندو کو اشارہ کیا اور وہ سب کو بلانے چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں تمام لوگ آگئے دو آدمی پہرے پر تھے۔ وہ نہیں آئے۔ سب کے آنے کے بعد شادو نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا۔

”میرے دوستو! میں جب یہاں آیا تھا اس وقت میں کورا کاغذ تھا یہاں کا سردار چرن سنگھ تھا۔ چرن سنگھ ایک بہادر آدمی تھا، میں نے اس کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا اور اس نے مجھے اپنے بعد دوسرا میر قمر قرار دیا وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تو تم سب نے مجھے اپنا سردار بنانا چاہا تو میں نے انکار کر دیا کیونکہ یہاں پر مجھ سے بھی پرانے ساتھی موجود تھے پھر سب کی رائے معلوم کی گئی اور سب نے فیصلہ میرے حق میں دیا اور میں سردار بنادیا گیا، تم سب نے میرے حکم پر جان کی بازیاں لگا دیں۔ میں جانتا ہوں تم سب میرے وفادار ہو مگر میں اب اس مقام پر آ گیا ہوں کہ میں اس لائن پر نہیں چل سکتا۔ میرا دل اب ڈاکے مارنے کو نہیں کرتا اس لئے میں تم سب سے منتی کرتا ہوں کہ مجھے جانے کی اجازت دے دو، میں تم سے غداری نہیں کروں گا خاموشی سے چلا جاؤں گا اور خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا تم اپنا تیا سردار بنا سکتے ہو۔ میری لائن اب بدل گئی ہے میں تم کو اپنی روش بدلنے کو نہیں کہتا ہاں اگر کوئی اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلنا چاہتا ہے تو ضرور چلے۔ مگر وہ اچھی طرح سوچ لے، میں نے خود کو ہر قسم کے حالات سے گزرنے پر تیار کر لیا ہے۔ مجھ پر

مقدمے چلیں گے جیل ہوگی اور شاید پھانسی بھی ہو جائے مگر میں سب کے لئے تیار ہوں اور جو میرا ساتھی واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہے وہ اپنی مرضی سے جاسکتا ہے جو یہاں رہ کر یہی کام کرنا چاہتا ہے وہ بھی اپنی مرضی کا مالک ہے۔ دوستو! تم سب سے پچھڑنے کا مجھے بہت ملال ہے مگر جب دل ہی اچاٹ ہو چکا ہو تو رہنا بیکار ہے میں دو دن تمہارے ساتھ ہوں تم سب جو فیصلہ کرو گے میں اس میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔“

اور جب شادو لال خاموش ہو گیا تو بھوندو نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”سردار اپنے فیصلے پر ذرا نظر ثانی تو کرو۔ کتنے لوگ ہیں جو تم کو چاہتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں، اپنی جان تم پر نچھاور کرتے ہیں۔“ بھوندو کے بعد سب نے یہی کہا تو پھر شادو نے کھڑے ہو کر کہا۔

”میں جانتا ہوں تم سب یہی کہو گے کیونکہ تم سب جانتے ہو کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے کسی کا حق نہیں مارا اور خود کو سردار نہیں سمجھا خود ساتھی بنا کر رکھا۔ مگر میرے دوستو! مجھے معاف کر دو میں اب تم لوگوں کے قابل نہیں ہوں میں بندوق نہیں اٹھا سکتا کسی کا مال نہیں لوٹ سکتا تو پھر بتاؤ میں یہاں کیا کروں گا، میرے نصیب میں آگے کیا ہے مجھے پتہ نہیں ہے تم آرام کرو سوچو غور کرو پھر کل اسی جگہ آ کر بتاؤ۔“ اور سب لوگ خاموشی سے چلے گئے، میں نے حیرت سے ان کے جانے کے بعد کہا۔ ”حیرت ہے ایسا نظم و ضبط اور یہاں پر۔“

شادو لال مسکرایا اور بولا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب میری عزت کرتے ہیں عزت اس لئے کرتے ہیں کہ میں نے ان کی عزت کی ہے۔“

”واقعی تمہاری زندگی کا یہ پہلو قابل تحسین ہے۔“ میں نے کہا۔

دوسرے دن سب پھر جمع ہو گئے۔ بھوندو نے کہا۔

”سردار شادو لال نے ہم سب کا جتنا خیال رکھا ہے اتنا شاید ہمارے ماں باپ نہیں رکھتے۔ اب سردار کی جگہ پر جو آدمی آئے گا وہ سردار شادو لال ہی بنائیں گے، وہ جس پر

سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
دوسرے ہی دن میں اور رولو کا جگن ناتھ وکیل سے
ملے۔ ساری رو داد سننے کے بعد اس نے کہا۔ ”معاہدہ صلہ تو
ہو سکتا ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے پولیس اس کو طول دے اور شادو
لال اور اس کے ساتھیوں کو جیل میں رہتا پڑے۔ اخبارات
ذرا سی بات کو افسانہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں یہ تو ایک مشہور
ڈاکو کا کیس ہے، اخبار والوں کو ایک نئی کہانی مل جائے گی ہر
روز بے پرکی اڑائیں گے۔“ آپ معافی کی درخواست تو
کمشنر کو پیش کریں اس کے بعد بات آگے بڑھے گی۔“
رولو کا نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تیاری کرتا ہوں۔ کمشنر بڈن سے
میری اچھی ملاقات ہے، زبانی بھی قائل کرنے کی کوشش
کروں گا۔“

میں نے پانچ ہزار روپے اس کی ٹیبل پر رکھے اور
کہا۔ ”یہ آپ کی ابتدائی فیس ہے۔“
”حکیم صاحب، میں آپ کو جانتا ہوں، اس کی
ضرورت نہیں تھی میں نے جب ہاں کر لی ہے تو کام بھی ضرور
کروں گا۔“ وکیل نے کہا۔

اور شادو لال بعد تین ساتھیوں جن کے نام یہ ہیں،
بھوندو، پنالال، رشید بھیل کو کمشنر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔
کمشنر نے درخواست قبول کر لی مگر پولیس نے کئی مقدمات
کھڑے کر کے ان سب کو گرفتار کرنے کے احکامات کورٹ
سے حاصل کر لئے اور چاروں کو جیل بھیج دیا۔ اب کیس
عدالت میں پہنچ گیا۔

وکیل نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں قانونی طور پر
پولیس چالان پیش کرے تو ہم اپنا موقف بیان کریں گے۔“
درگا داس تھانہ انچارج جمیل گھائی بھی بلایا گیا اور
پیشیوں کا سلسلہ چلنے لگا۔ جیل میں رولو کا نے ایسا انتظام
کر دیا کہ شادو لال اور اس کے ساتھیوں کو کوئی پریشانی نہیں
ہوئی۔ وکیل کیس لڑتا رہا۔ سب سے زیادہ خلاف گواہ درگا
داس تھانہ کرتا تھا۔ وہ اچانک بدل گیا اور اس نے خاموشی
اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ حالات شادو لال کے حق میں

انگی رکھ دیں گے وہی سردار ہوگا، ہم سردار شادو لال پر پورا
بھروسہ کرتے ہیں۔ بھوندو ستو! کیا میں نے ٹھیک کہا ہے۔“
سب نے ہاتھ اٹھا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔
تو شادو لال اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کالے خان کو اپنے پاس
بلایا اور سب کو مخاطب کر کے کہا۔
”تمہارا پرانا ساتھی ہے آرنایا ہوا بہادر نڈر ساتھی
ہے مجھے یہ بہت پسند ہے اس کا حق بنتا ہے سرداری کا، بھولتو
سب کو مشکور ہے، کسی کو اعتراض ہو تو بے وقوف نہ بنائے۔“
شادو نے کہا۔

سب نے ہاتھ اٹھا کر اور با آواز بلند اپنی رضامندی
ظاہر کر دی۔ اس کے بعد بھوندو کھڑا ہوا اور بولا۔ ”سردار شادو
لال کی جگہ اب گروہ کا سردار کالے خان ہے، میں نے فیصلہ
کیا ہے کہ میں سردار شادو لال کے ساتھ جاؤں گا جو گزرے
گی برداشت کروں گا شادو لال کو نہیں چھوڑوں گا۔“
اس کے بعد تین اور ڈاکو شادو لال کے ساتھ چلنے پر
راضی ہو گئے۔ یوں یہ پانچ آدمی خود کو قاتون کے حوالے
کرنے پر اپنی خوشی سے راضی ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے
کھڑے ہو کر کہا۔

”دوستو! تم شاید یہ خیال کر رہے ہو گے کہ میرے
کہنے پر تمہارا سردار تم سے جدا ہو رہا ہے تو بھائیو! ایسا نہیں
ہے، یہ سرداری اپنی اندر کی آواز ہے جس پر وہ عمل کر رہا ہے
اور دوسرے تین ساتھی جو اس کے ساتھ جا رہے ہیں وہ بھی
اپنی مرضی سے جا رہے ہیں، میں کوئی برا لیڈر یا آفیسر نہیں
ہوں مگر میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ شادو لال اور اس کے دوست
معاشرے میں عزت کی زندگی گزاریں گے۔ میں قانونی
طور پر سرکار سے لڑوں گا بڑے سے بڑا وکیل کروں گا کچھ
وقت کی پریشانی ضرور ہوگی مگر شادو لال جیسا انسان ہے میں
اس کے مطابق اس کو مقام دلاؤں گا۔ آپ سب بھی ان
کے لئے دعا کرتا۔“

اس کے بعد میں شادو لال کو دوپیں چھوڑ کر دلی آیا
ہوں تاکہ آپ سے مشورہ کروں کہ کیا کرتا ہے۔“
”جگن ناتھ وکیل دلی کے نامی گرامی وکیل ہیں ان

ہوتے گئے۔

نے کچھ حقیقت جان لی ہے اور یہ حقیقت جاننے کے لئے انہوں نے بڑی سخت محنت کی ہے اس حقیقت کو دوسریوں سے جانا جاتا ہے۔ ایک طریقہ مادی کہلاتا ہے۔ اس طریقے سے کسی بھی شے کے بارے میں مادی وسائل سے غور و فکر کیا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ مذہبی ہے ہر مذہب میں اس کا طریقہ ہے لوگ اپنے اپنے مذہب کے اعتبار سے جسمانی اور مذہبی کوششیں کر کے کائنات کو سمجھنے کی جستجو کرتے ہیں۔

پھر میں نے پوچھا۔ ”اور درمیان میں یہ جادوؤں نے کی طاقت کہاں سے آگئی۔“ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ رب کائنات کی طاقت ہی فتح یاب ہوتی ہے۔ ایک طاقت شیطان کی بھی معروف عمل رہتی ہے یہ طاقت مختلف شکلوں میں انسانوں کو نقصان پہنچاتی ہے، رب کائنات نے شیطان کو اجازت دی ہوئی ہے کہ وہ انسانوں کو بہکانے ان کو نیک راہ سے ہٹائے مگر جو نیک بندے ہیں وہ شیطان کے بہکانے میں نہیں آتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ شیطان کے علوم تو عالم وجود میں ہیں اور جو اس کے پیروکار ہیں وہ بہر حال اپنی خبیث قوتوں کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں ہم ان کو ہی جادوگر کہتے ہیں۔“ رولوکانے بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔

”دنیا سے جادو کے وجود کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔“
”اس سے انسانوں کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ رب کائنات نے جو چیز بھی دنیا میں رکھی ہے وہ بے وجہ نہیں ہے تم کسی بھی چیز پر غور کرو اس کی افادیت سامنے آ جائے گی۔“
رولوکانے جواب دیا۔

”یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”اب کدھر کا ارادہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں تو آپ کے ارادے کا پابند ہوں آپ جہاں کہیں گے چل پڑوں گا۔“ رولوکانے جواب دیا۔
”ہانس بریلی کا نام سنا ہے تم نے۔“ میں نے

پوچھا۔

”ہانس کا سنا ہے آپ نے اس میں بریلی کا اضافہ

وکیل خود حیران تھا کہ اتنی جلدی وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمشنر اور حکومتی لوگ بھی شادولال کے خلاف نہیں تھے۔ یہ کس طرح، یہ صرف میں جانتا تھا رولوکا جو کام کرتا ہے اس میں وہ خود سانس نہیں آتا اور کام ہو جاتا ہے اور آخر ایک دن شادولال اور اس کے ساتھی باعزت طریقہ پر رہا ہو کر میرے پاس آ گئے۔ رولوکا موجود تھا مگر اس کا حلیہ وہی بوڑھے آدمی کا تھا۔

میں نے شادولال اور اس کے ساتھیوں کو مبارکباد دی تو شادولال نے کہا۔

”حکیم صاحب میرا دل اب تک یہ بات قبول نہیں کر رہا کہ میں رہا ہو گیا ہوں۔ جیل میں، میں اس طرح رہا کہ شاید کوئی اپنی سسرال میں بھی نہیں رہا ہوگا۔ جیلر اور پولیس اتنی خاطر کرتی تھی کہ کیا بتاؤں یہ سب کس طرح ہوا پتہ نہیں مگر ہے تو حیرت کی بات۔“

”اب تم کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

”مخت مزدوری ہی کر سکتا ہوں اور کیا کروں گا۔“
شادولال نے جواب دیا۔

”دو چار دن دلی میں گھومو پھر، آزادی کا مزالو، تفریح کرو پھر میں تم کو کام بتاؤں گا۔“ رولوکانے کہا۔

ایک ہفتہ کے بعد رولوکانے ایک لفافہ شادو کو دیا۔
چارلٹ فرسٹ کلاس کے بمبئی کے دیئے اور کہا۔ ”یہ تم چاروں کے ٹکٹ ہیں، اس لفافے پر پتہ لکھا ہے تم اس پتے پر جاؤ گے اور جو نیجر ہے وہاں کا اس کو یہ لفافہ دو گے بس تمہارا کام ختم وہ سب انتظام کر دے گا۔“ اور شادولال بمبئی روانہ ہو گیا۔

”شادولال بمبئی میں کہاں گیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کو میں نے اپنے پیر و دشمن آفس کا پتہ دیا ہے وہاں پر یہ سب کھپ جائیں گے۔“ رولوکانے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

کائنات کی حقیقت جاننا آسان نہیں ہے جن لوگوں

گیارہ بجے جوگندر پال میدان میں اترا۔ نہایت خوبصورت جسم لہذا قد اس نے ڈھول کی تال پر اکھاڑے کا چکر ایک ٹانگ سے لگایا۔

اس کے بعد گولی ناتھ جھومتا ہوا اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔ جوگندر پال کا جسم بہت خوب صورت تھا۔ سرخ و سفید تھا مگر گولی سیاہ کا لاکھا اور جسم بائیس کی مانند تھا وہ ایک گوشت کا پہاڑ لگتا تھا قد تو اس کا جوگندر پال سے کم تھا۔ مگر وزن زیادہ تھا۔

دونوں نے اکھاڑے کے درمیان آ کر ہاتھ ملایا درمیان میں ریفری نے کشتی کے قاعدے قانون بتائے۔ ڈھول کی آواز بند ہوگئی۔ ریفری ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور کشتی شروع ہوگئی۔ گولی ناتھ بہت تیزی سے حرکت کر رہا تھا وہ گول منول تھا وزن بھی زیادہ تھا مگر اس کی پھرتی حیرت ناک تھی وہ ایک جگہ نہیں نک رہا تھا جوگندر پال بڑے سکون سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا طریقہ کار وہی تھا جو شیر کا بھینسے پر وار کرنے کا ہوتا ہے اس کو جلدی نہیں تھی۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ گولی ناتھ بھاری پہلوان ہے اس کا داؤ بھی بھاری ہوگا وہ اس کے داؤ سے بچ کر اپنا داؤ لگانا چاہتا تھا۔ گولی ناتھ کا یہ داؤ تھا کہ وہ کسی ایک جگہ نہیں رہا تھا اس کو اندازہ تھا کہ جوگندر بدن میں ہلکا ہے اس کی حرکت بھی تیز ہوگی اور پھرتی بھی زیادہ ہوگی وہ جوگندر کا توڑ اپنی پھرتی سے کر رہا تھا۔

مگر جوگندر کا داؤ ڈھول چل ہی گیا۔ اس نے ایک زبردست چال چلی۔ دائیں طرف جاتے جاتے وہ اچانک بائیں طرف آ گیا۔ دراصل اس کو حملہ تو بائیں طرف سے ہی کرنا تھا مگر وہ دائیں صرف دھوکا دینے کو گیا تھا۔ اب گولی ناتھ کی دونوں ٹانگیں جوگندر پکڑے کھڑا تھا اور گولی زمین پر چپت پڑا کر وٹ بدل رہا تھا لیکن صرف ایک منٹ ہی وہ زمین پر آ رہا کیونکہ اس نے اتنی طاقت ہے اپنی ناگوں کو اپنی طرف کھینچا کہ جوگندر پال اس کے اوپر گر پڑا مگر جوگندر اس کے اوپر نہیں گر سکا کیونکہ گولی ناتھ اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا جوگندر اکھاڑے میں گر اور ایک بھاری لاری کی طرح گولی ناتھ اس کے اوپر چڑھ گیا اور صرف چند منٹ میں ہی کشتی کا

کر دیا ہے۔“ رولوکانے مسکرا کر کہا۔

”ہمارے قریب ہی ہے، آؤ اس طرف چلتے ہیں۔ وہاں پر آج کل بڑے زوردار مقابلے ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

”کس قسم کے مقابلے۔“ رولوکانے پوچھا۔
”کشتی کے مقابلے۔ پورے ہندوستان کے بڑے نامی گرامی پہلوان وہاں موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔
”ٹھیک ہے چلتے ہیں۔“ رولوکانے کہا۔

اور ہم بریلی کی طرف چل پڑے۔ بریلی میں بھی پوربی زبان بولی جاتی ہے مگر شہر میں اردو کا رواج ہے مگر پوربی زبان کی چاشنی اس میں شامل رہتی ہے۔ اچھا بڑا شہر ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں رہتی ہے اور لوگ بزرگان دین کی تعلیمات کی بدولت دین دار ہیں۔

ہم نے انکیشن کے قریب ہی ایک سرائے میں رہنے کا بندوبست کر لیا۔ کشتی کے دنگل کی وجہ سے شہر میں بڑی رونق تھی۔ ہندوستان بھر سے کشتی کے شوقین لوگ جمع تھے۔ پنجاب کے دور کے علاقوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہم نے شام کے مقابلوں کے دو ٹکٹ خرید لئے تھے۔ یہ مقابلے ایک میدان میں ہو رہے تھے انتظامات بہت اچھے تھے اور تمام پہلوانوں کو میدان کے قریب ہی ٹھہرایا گیا تھا۔ چار بجے سے ہی لوگ آنے لگے تھے۔ کشتی کا آغاز

شام چھ بجے ہوتا تھا۔ ہم جب اپنی نشست پر پہنچے تو اس وقت میدان بھر چکا تھا ڈھول والے تان اڑا رہے تھے پنجاب سے آئے ہوئے لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج سب سے بڑی کشتی پنجاب کے جو گندر پال سنگھ کی تھی جو کہ پورے پنجاب کا نمائندہ تھا۔ اس کے مقابلے پر ڈھول پور ریاست کے راجہ کا پہلوان گولی ناتھ تھا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف چند منٹ میں ہاتھی کو بھی گرا دیتا تھا۔

ان دونوں میں فاتح پہلوان کا مقابلہ چند منٹ سے کل ہونے والا تھا۔

مقابلے شروع ہو گئے پہلوان آتے گئے اور رات

کشتی کا مزالیں، رولو کا نے جواب دیا۔

ریفری درمیان میں آچکا تھا دونوں نے ہاتھ ملائے اور ریفری ایک طرف ہو گیا۔ کشتی شروع ہو گئی۔ گولی ہاتھ کے مقابلے میں چندوں بل بہت کمزور اور چھوٹا نظر آتا تھا۔ گولی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھا چندوں اپنی جگہ کھڑا ہوا مگر سب نے حیرت سے دیکھا کہ چندوں گولی کی گرفت میں نہیں آیا اور گولی کے مڑنے سے پہلے وہ اس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ کا رگڑا دے چکا تھا۔ گولی یہ ہاتھ کھا کر پلٹا مگر وہاں پر چندوں نہیں تھا وہ کھڑا دانت دکھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ عجب رنگت کا ہو رہا تھا یہ چہرہ وہ نہیں تھا جب وہ اکھاڑے میں اترتا تھا۔ گولی کے چہرے پر ذرا سا خوف ظاہر تو ہوا مگر وہ جلدی پھر وار کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ چند اکھاڑے کے درمیان کھڑا تھا اور گولی اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ لیکن وہ حملہ نہیں کر رہا تھا نہ معلوم کیا بات تھی دو تین دفعہ وہ آگے بڑھا بھی مگر پھر رک گیا۔ پھر چندوں نے ایک چھلانگ لگائی اور پورے وزن سے گولی پر آپڑا۔ اس کا وزن اتنا تھا کہ گولی آسانی سے اس کو ہٹ سکتا تھا مگر وہ اس کو شیخ نہ سکا اور اس کے وزن سے اکھاڑے میں جت گر گیا اور چندوں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ گولی نے بڑی کوشش کی مگر چندوں کو اپنے اوپر سے نہیں اتار سکا اور چندوں یہ مقابلہ جیت گیا۔

ایک ہاتھی کو کمری نے شکست دے دی تھی میں نے اور سارے پنڈال نے یہ حیرت انگیز کشتی دیکھی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ گولی ہار گیا ہے مگر یہ سب آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ میں اور رولو کا پنڈال سے باہر آ گئے۔ میرا دماغ گولی کی ہار قبول نہیں کر رہا تھا۔ سرائے میں آنے کے بعد میں نے رولو کا سے پوچھا۔

”یہ کیا تماشہ ہوا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”اب میں بتاؤں گا تو آپ کی سمجھ میں آئے گا۔ یہ

کشتی گولی پہلوان اور چندوں پہلوان کے درمیان نہیں تھی دراصل یہ کشتی گولی پہلوان اور ایک سفلی کے بھر کے درمیان تھی۔ آپ کو یہ اندازہ ہے کہ سفلی علم رکھنے والے جو جنر مشر

فیصلہ ہو گیا۔ ریفری نے گولی ہاتھ کو فاتح قرار دے دیا۔ کشتی ختم ہو گئی اور دوسرے دن گولی ہاتھ اور چندوں کے مقابلے کا اعلان کر دیا گیا۔

دوسرے دن چونکہ ان مقابلوں کا آخری دن تھا اور یہی دو پہلوان لڑتے لڑتے فائل میں پہنچے تھے اس لئے پنڈال میں تل دھرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چند گجرات کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ پہلوانی میں بالکل نیا تھا مگر ان مقابلوں میں وہ بہت بڑے بڑے پہلوانوں کو ہرا کر اس مقام تک آیا تھا۔ سنا تھا اس کی جسامت اور بدن بھی پہلوانوں والا نہیں تھا مگر حیرت انگیز پھرتی اور داؤ کی کاٹ کرتا تھا۔

چھوٹی کشتیاں ایک بڑھ گھنٹہ تک ہوتی رہیں اور رات ساڑھے نو بجے بڑی اور فائل کشتی کا اعلان ہوا۔ پہلے گولی ہاتھ ہاتھ کی طرح جھومتا اکھاڑے میں داخل ہوا اس نے ہاتھ ہلا کر اور نئی دفعہ ہاتھ جوڑ کر عوام کو سلام کیا پھر ایک طرف ایک بوڑھے پہلوان کے چرنوں کو ہاتھ لگا کر اس کے پاس بیٹھ گیا بوڑھے نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہا اور پھر وہ اپنی آنکھ اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔

کچھ ہی دیر میں چندوں اکھاڑے میں داخل ہوئے مگر اس کا انداز پہلوانوں سے الگ تھا۔ اس نے آتے ہی اکھاڑے کی مٹی ایک مٹی اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ پھر اکھاڑے کے سات چکر لگائے اور درمیان میں چند منٹ آسن جمار کھینچا رہا۔ اس کا یہ انوکھا طریقہ دیکھ کر میں نے رولو کا سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے۔“

”یہ اپنی جیت کا انتظام کر رہا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ یہ پہلوان نظر نہیں آتا اور یہ پہلوان ہے بھی نہیں۔ کشتی یہ نہیں لڑے گا بظاہر یہی لڑنا نظر آئے گا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”پھر کون لڑے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کی تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا ابھی آپ

ریاست میں روک لیا اور وہ دھول پور کا پہلوان ہو گیا۔
اکھاڑے میں رات سوگ کا سال تھا گوپی کی ہار کا سب کو غم تھا
سب اس تھے۔ استاد کرم چند نے پوچھا۔

”وہ مجھ سا چھوڑا تیری کپڑ میں نہیں آیا میں تو یہ
سوچ سوچ کے بالا ہوا جا رہا ہوں تو ہی بتا۔“

”ارے استاد کیا بتاؤں۔ کھوپڑی کچھ کام نہیں
کر رہی۔ تم مجھ سا کہہ رہے ہو مجھے تو وہ ہاتھی سا نظر آوے
تھا اور چھلاوے کی طرح یوں چڑی بھر رہا تھا ایک جگہ تو رکنا
ہی نہ تھا۔“ گوپی نے جواب دیا۔

”اے کیا بات کرے ہے وہ، مجھ ہاتھی کیسے نظر
آوے تھا۔“

”میں بتاؤں استاد۔“ ایک شاگرد نے کہا۔

”ہاں چل تو ہی بتا۔“ استاد کرم چند بولے۔

”یہ کوئی جادوؤں کا چکر لگتا ہے سو بات کی ایک
بات یہ کہ ہم چمچر دیکھیں اور استاد گوپی کو وہ ہاتھی نظر آوے
تھا۔“ شاگرد نے حیرت سے کہا۔

”تیری بات دل کو لاگے ہے۔“ استاد نے جواب دیا۔

”تم غم نہ کرو گوپی استاد یہ تو کھیل ہے اس میں

جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے پھر کبھی موقع ملے گا تو سب
بدلے پورے کر لینا۔“ شاگرد نے دلاسا دیا۔

”تو ایک طرف جادو بتلائے ہے پھر بولے ہے

سب بدلے پورے کر لینا۔ ارے عقل کے ناخن لے لڑائی تو

برابر والے سے ہوتی ہے اگر جادوؤں کا چکر ہے تو پھر ہم کا

کریں گے بھلے ماس بول جواب دے۔“ استاد نے پوچھا۔

مگر شاگرد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رات زیادہ ہونے لگی تھی سب اٹھ کر اپنے اپنے

ٹھکانوں پر جانے لگے گوپی چند بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں

چلا گیا استاد کرم چند بھی گھر روانہ ہو گئے اکھاڑے میں ستانا

چھا گیا۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا اور میں اکھاڑے کی

دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔

میں نے دیکھا اکھاڑے میں کچھ غیر مانوس سی

آوازیں آ رہی تھیں میں اکھاڑے کے عین سامنے جا کھڑا

پڑھتے ہیں اور ان کو ایسی غلیظ غذا کھانا پڑتی ہیں جو عام
آدمی کبھی نہیں کھائے گا اس کے بعد وہ درجے بدرجے اوپر

چلتا ہے اور پھر شیطان اس کو ایک بڑا مقام عطا کر دیتا ہے اور

ایک بڑا بھر پور اس کا غلام ہو جاتا ہے جس جادوگر کے

قبضے میں ہے ہوتا ہے وہ خود کو بہت کامیاب اور بڑا جادوگر سمجھتا

ہے مگر میں سمجھتا ہوں جس کی تقدیر تاریکیوں میں ڈوبے لگتی

ہے عقل اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور وہ بڑا طرم خان بن

جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان اس کے کان میں یہی پھونک رہا ہوا

بھیروں سے کام لیتا ہے اور بڑے سے بڑا کام بھیروں

آسانی سے کر دیتا ہے۔ شرب کام بد ہوتے ہیں پلید ہوتے

ہیں۔ اس سے کسی مریض کے لئے دوا نہیں منگائی جاسکتی

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دوا کھا کر مریض ٹھیک ہو جائے گا ہاں

ایک شرط پر وہ دوا دے گا کہ اس کے بعد اس کے کسی عزیز کو

ازیت ناک موت مارنے کی اجازت دی جائے گوپی ناتھ کی

زندگی کو خطرہ ہے کیونکہ بھیروں اپنی جیت صرف اتنی ہی نہیں

سمجھتا وہ گوپی پر مکمل فتح اس کو ہار کر ہی سمجھے گا۔“ رولو کا نے

بات پوری کی۔

”یہ تو تم نے بہت خطر ناک بات بتائی۔“ میں نے

کہا۔

”ہاں یہ ایک جان کا معاملہ ہے آج کی رات گوپی

پر بہت بھاری ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تو پھر تم کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں آج رات گوپی چند کے قریب رہوں گا صبح

آ کر بتاؤں گا۔“ اور رولو کا فوراً چلا گیا۔

”گوپی چند بریلی کے بھلے تاج والا میں ٹھہرا تھا۔

یہاں پر استاد کرم چند کا بہت بڑا اکھاڑا تھا۔ اکھاڑے کے

اطراف میں تمام گھر کرم چند کی برادری کے تھے اور سب

ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور جو جوان اس فن میں

شوق رکھتا تھا اس کی مالی مدد یہ سب مل کر کرتے تھے بہت

نامی گرامی پہلوان استاد کرم چند کے اکھاڑے سے ابھرے

تھے۔ گوپی چند بھی اسی اکھاڑے سے ابھرا تھا ایک کشتی کے

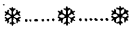
سلسلے میں دھول پور گیا تھا اور پھر وہ اس قدر پسند آیا کہ اپنی

ایک گہرا گڑھا تیار تھا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ ”اب تیرا کام ختم ہوا اور پھر وہ گڑھے میں دفن ہو گیا۔ گڑھا پھر بھر گیا۔ اکھاڑا پہلے کی طرح ہو گیا اور بھیروں کا ایک غلام اس میں دفن ہو گیا۔

ایسا ہوتا ہے کوئی کسی کے لئے گڑھا کھودتا ہے اور خود اس میں گر پڑتا ہے یہ ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے اور ہم اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اب میرا کوئی کام یہاں پر نہیں تھا۔ میں واپس آ گیا لیکن اب بھی گوپی چند کی زندگی محفوظ نہیں ہے بھیروں ایک خطرناک بیر ہے اس کی مکڑیاں بھر حرکت میں آ سکتی ہیں۔ ”رولو کا نے بات ختم کی۔

”مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب ابھی میں نہیں دے سکتا کیونکہ ابھی صورت حال واضح نہیں ہے میں گوپی کی طرف جا رہا ہوں کیونکہ بھیروں کو جب پتہ چلے گا کہ اس کا بیر دفن ہو گیا ہے تو وہ دوسرا انتظام کرے گا۔ اس لئے گوپی چند کے قریب میرا ہونا ضروری ہے۔“ اور رولو کا چلا گیا۔



”میں سیدھا گوپی چند کے پاس اکھاڑے میں چلا گیا اور اس سے ملا..... میں نے اس کو بتایا کہ تم صرف ایک اچھے پہلوان ہو مگر تمہارا مقابلہ اس دفعہ کسی پہلوان سے نہیں ہے۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مگر آپ کون ہیں۔“

”میں ایک انسان ہوں اور اسی رشتے سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک شیطان آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور دوسرا شیطان اس کی مدد کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر میرا دشمن شیطان کیوں ہو رہا ہے۔“ گوپی چند نے پوچھا۔

”اس کا مجھے پتہ نہیں ہے مگر جلد ہی پتہ چل جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ گوپی چند نے پوچھا۔

ہو امیں نے دیکھا ایک بڑا ہی لمبا چوڑا آدمی زمین کھود رہا ہے اور صرف ہاتھوں سے یہ کام کر رہا ہے اور اتنی تیزی سے یہ کام کر رہا ہے کہ چند منٹ میں ہی اس نے کافی گہرا گڑھا کر دیا۔ میں اس کے سر پر چلا گیا وہ گڑھے کے اندر تھا میں نے ایک اشارہ کیا مٹی گڑھے کے اندر بھرنے لگی وہ کھود کر مٹی باہر ڈال رہا تھا اور میں اسی مٹی کو اندر ڈال رہا تھا۔ وہ حیران تھا آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاید وہ سانس لینے یا کچھ اندازہ کرنے، گڑھے سے باہر آ گیا اس کے باہر آتے ہی پورا گڑھا مٹی سے بھر گیا وہ ہوا میں کچھ سوگھٹا رہا اور پھر گڑھے کی جانب پلٹا مگر زمین ہموار تھی اور کوئی گڑھا وہاں نہیں تھا وہ پھر اسی مقام پر کھڑا ہو گیا اور دوبارہ گڑھے کی جگہ کھودنے کی کوشش کرنے لگا مگر اب زمین میں سے ایک مٹی مٹی وہ نہیں نکال سکا اب اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مگر اس کی کوشش کم نہ ہوئی۔ کچھ دیر وہ لگا رہا اور آسان کی طرف دیکھا اور واپس کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک رسی کا بنا ہوا جال اس پر گر گیا اس نے اس کو توڑنے کی اور اس سے باہر آنے کی جان توڑ کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں اس کے سامنے کھڑا تھا مگر اس کو پتہ نہیں تھا۔ میں نے اور اس کے قریب جا کر کہا۔ ”بے کار ہے یہ حال تو نہیں توڑ سکے گا میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دے۔“

اس نے حیرت سے میری آواز سنی جب کچھ نظر نہ آیا تو بولا۔ ”تو کون ہے سامنے آ کر بات کر۔“

”تو حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں ہے میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دے۔“ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ”تو کون ہے۔“

”میں شنو ہوں۔“ وہ بولا۔

”شنو کون پوری بات کر۔“

”میں بھیروں کا غلام۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ گڑھا کیوں کھود رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”گوپی چند کو ڈالنا تھا مار کر۔“ شنو نے جواب دیا۔

”اچھا تو پھر جلدی سے گڑھا تیار کر۔“ میں نے کہا۔

اور وہ پھر گڑھا کھودنے لگا اور چند منٹ میں ہی

”تم صرف اتنا کرو کہ جب تک میں نہ کہوں اس اکھاڑے سے باہر نہ جانا۔ باہر زیادہ خطرہ ہے۔“ میں نے کہا۔

میں جانتا تھا جو کچھ ہوگا رات کو ہوگا دن میں سورج کی روشنی جادو کے بہت سے اثرات کو کمزور کر دیتی ہے اور سمندر اس کو ختم کر دیتا ہے۔

رات کے وقت میں روپوش تھا اور پورے بندوبست کے ساتھ اکھاڑے میں موجود تھا۔ مجھے پوری امید تھی بھیرو ضرور آئے گا میں صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ کس کے لئے کام کر رہا ہے اور اس کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے صرف بھیروں کو پکڑنا میرا مقصد نہیں تھا۔ اگر میں بھیروں کو پکڑ بھی لوں گا تو پھر کوئی دوسرا بیر آ جائے گا اور یہ سلسلہ نہیں رکے گا اور گوپی چند کی زندگی کو خطرہ ہی رہے گا۔

امادس کی راتیں بڑی اندھیری ہوتی ہیں کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اکھاڑے میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں ایک کونے میں اندھیرے کا ایک حصہ بنا کھڑا تھا۔ میں نے اچانک دیکھا اکھاڑے کے عین درمیان جہاں پر شونو فن تھا ایک چراغ جل اٹھا اور اس کی روشنی سارے اکھاڑے میں پھیل گئی۔ اس چراغ کے سامنے ایک ہیولہ سا گردش کرتا نظر آیا اور پھر اس ہولے نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ وہ انسان صرف ایک لنگوئی باندھے ہوئے تھا۔ سارے جسم پر مٹی سے لپ کیا ہوا تھا اور مٹی چراغ کی روشنی میں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھی اس کے سر پر دو چوٹیاں دو سینگوں کی طرح کھڑی تھیں۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دھبہ زہنی تھیں۔ چہرہ چھپا تھا اور عام آدمی کے چہرے سے بڑا تھا۔ ناک نہ ہونے کے برابر تھی صرف دو سوراخ نظر آتے تھے وہاں بہت چھوٹا تھا مگر دانت پھر بھی نظر آتے تھے اگر کوئی رات کے بجائے دن میں بھی اس کو دیکھ لے تو ڈر جائے۔ اس کے چہرے کی ہیبت ناک رات کے اس سنائے میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ سوائے بھیروں کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کا غلام کہاں ہے اس نے

اسی جگہ چراغ جلا یا تھا وہ چراغ کے سامنے بیٹھ گیا۔ چراغ کی لوا اپنی جگہ ساکت تھی۔ چند منٹ کے بعد اس نے آواز دی۔ ”شونو اے او شونو.....“ مگر اس کو جواب نہیں آیا تین دفعہ آواز

دینے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا میں نے فوراً آگے بڑھ کر وہ چراغ اٹھالیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا اس کو صرف یہ نظر آیا کہ چراغ ہوا میں معلق ہے اور میں نے پھونک مار کر چراغ کو بچھادیا۔ چراغ کے بجھے ہی اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی اور اس نے اکھاڑے کے باہر چھلانگ لگائی مگر درمیان میں ایک شیشے کی دیوار کھڑی تھی وہ اس سے ٹکرایا اور پھر اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔ ایک دفعہ پھر اس نے جانے کی کوشش کی اور ناکام ہوا۔

”تو کون ہے رے۔ کا ہے کھوٹی کرے ہے کچھ بول تو۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ میں نے جواب نہیں دیا چراغ کی روشنی نہیں تھی گھپ اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آ رہا تھا وہ اکھاڑے کے درمیان بیٹھا تھا میں اس کو دیکھ سکتا تھا اس کی ایک ایک حرکت میری نظر میں تھی میں جانتا تھا جب وہ ہر طرف سے ناکام ہو جائے گا تو گرد کو پکارے گا اور اگر ہوشیار ہوا تو گرد نہیں آئے گا اور اگر طاقت کے غرور میں ہوا تو آجائے گا۔ بھیروں جیسا میرے بس ہو جائے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ بات بڑی ہے بڑی بات کو بڑے سوجھ بوجھ اور بڑے علم و ہنر سے طے کرنا پڑتا ہے۔ جذبات میں یا اپنی طاقت کے زعم میں صرف نقصان ہوتا ہے۔

میں نے جو انداز لگائے تھے کہ بھیروں صرف اپنے گرد کو پکارے گا وہی ہوا۔ وہ دیوار سے ٹکریں مارنے کے بعد گرد کو پکارنے لگا..... گرد ہوشیار تھا وہ خود نہیں آیا اس نے وہیں سے بھیروں سے پوچھا۔ یہ آواز بھیروں کے کان میں آئی مگر میں تو بھیروں کے کان میں تھا۔ گرد نے پوچھا۔

”کا ہے رے۔ کا ہے شور کرے ہے۔“

”میں گھٹائی میں پڑ گیا ہوں گرد۔“ بھیرو نے کہا۔

”ارے واہ رے پھوڑے تیری شہتی تو اپر پار ہے

آ جاوا ایس۔“ گرو نے کہا۔

”چاروں طرف دیوار کھڑی ہے کیسے آؤں۔“
بھیروں نے کہا۔

”ارے تو دیوار گرا دے کا مشکل ہے۔“ گرو نے
جواب دیا۔

”نہ گرت نہ نظر آوت ہے۔ میری شکتی بے کار ہوگئی
ہے تم آؤ تو۔۔۔۔۔“ بھیروں نے کہا۔

”بھیروں کی شکتی منہ پھیر گئی تو یہ کوئی اور ہی شکتی
لانگت ہے میں اس نشتے میں نہ آسکوں اپنے کروں گا اپنے
استحان پر فخر مت کر میں کچھ کرتا ہوں۔“ اور آواز بند ہوگئی۔

بھیروں گرو کو پکارتا ہی رہا اور جواب نہیں آیا۔
اب میں نے اس کے کان میں کہا۔ ”گرو نہیں آئے

گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آئے گا تو واپس نہیں جائے گا۔ اگر
نہیں۔ یقیناً تو پھر گرو کو آواز دے۔“ میں نے کہا۔

”تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔“ بھیروں نے کہا۔
”میں کون ہوں اس کا یہ تو تیرے بہت سے گرو

نہیں چلا سکے میں تیرے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند
نہیں ہوں مگر تو میرے سوالات کا جواب دے اگر ٹھیک ٹھیک

جواب دے گا تو شاید کوئی نرم گوشہ میرے دل میں تیرے
لئے پیدا ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”پوچھ کیا پوچھتا ہے۔“ بھیروں نے کہا۔
”تیرا کون ہے اور کہاں پر رہتا ہے۔“

”میرے گرو کا نام گوبر دھن گوبر ہے۔“ بھیروں
نے جواب دیا۔

”تو اس کے پاس کب سے ہے۔“ میں نے
پوچھا۔

”سات سال پہلے اس نے مجھے پایا تھا ہزاروں کام
اس کے کر چکا ہوں۔“ بھیروں نے جواب دیا۔

”گوبر دھن گوبر کہاں رہتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”اس کا استحان کشمیر کے ایک مقام پر ہے۔“

بھیروں نے کہا۔
”میرے سوال کا ادھورا جواب مت دے۔ جگہ کا

نام بتا۔“

”کشمیر میں ایک مقام ہے گنگوڑی، یہاں سے
دریائے گنگا بن کر نکلتا ہے۔ اس مقام پر اس کا استحان ہے

اس مقام پر ایک جگہ اس کا ٹھکانا نہیں ہے ڈھونڈنا پڑے گا۔“
”تو نے جوابات ٹھیک دیئے ہیں اب یہ بتا تو اس

گرو کے لئے کام کرے گا جو تجھے برے وقت میں اکیلا چھوڑ
گیا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میں اسی کے لئے کام کروں گا کیونکہ میں مجبور
ہوں اس نے مجھے بڑے گرو سے پایا ہے اس نے کٹھن تپیا

اور جامپ کئے ہیں میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا اگر چھوڑوں گا تو
خود بخود ختم ہو جاؤں گا۔“ بھیروں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میں تجھے آزادی دے سکتا ہوں ایک
شرط پر۔“ میں نے کہا۔

”شرط بتا۔۔۔۔۔“ بھیروں نے کہا۔
”تو بڑے گرو کے پاس جائے گا۔ گوبر دھن کے

پاس نہیں جائے گا۔ بڑے گرو کو میرا یہ پیغام دے گا کہ
تیرے جیسے اور شیطان دنیا میں بھیج دے مگر تو کبھی کامیاب

نہیں ہوگا بول تو یہ کہہ سکتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”ہاں میں کہہ دوں گا۔“ بھیروں نے کہا۔

”ٹھیک ہے تو جا سکتا ہے پھر کبھی اس طرف مت
آنا۔“ میں نے کہا۔ اور بھیروں چلا گیا میں نے اس کی وہ

شکتی جس پر وہ پھولتا تھا یعنی وہ چراغ جیب میں رکھ لیا اور
اکھاڑے سے باہر آ گیا۔“

”تو اب تم گوبر دھن کی تلاش میں کشمیر جاؤ گے۔“
میں نے رولو کا احوال سننے کے بعد کہا۔

”جانتا تو پڑے گا کام ادھورا تو نہیں چھوڑا جائے گا۔“
رولو کا نے جواب دیا۔

”کشمیر بڑی حسین جگہ ہے۔ میں نے اب تک کشمیر
نہیں دیکھا ہے میں بھی ساتھ چلوں گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے ضرور چلیں۔“ اور ہم دونوں دوسرے
بھی دن جہوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جہوں سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے

آلو بخارے کے درخت گھر کے آس پاس موجود تھے۔ ہر طرف ایک بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور سرد ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں شام ہوتے ہی شاکر نے ایک لالٹین جلا کر کمرے میں رکھ دی تھی مالک مکان کا نام شاکر تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”کھانا کب کھاؤ گے۔“ یہ مرحلہ اس نے بڑی مشکل سے پار کیا اور میں نے اس کو بتادیا۔ ”رات نو بجے کھائیں گے۔“ میرے لئے بھی اتنی بات اس کو بتانا بھاری پڑ گیا۔ رات نو بجے جو کھانا شاکر نے ہمیں کھلایا وہ اچھا تھا بکری کا دودھ اور بھیتڑا گوشت بھی اس میں شامل تھا کھانے کے بعد ایک دوز قبوہ کا چلا اور پھر شاکر سونے چلا گیا۔ میں نے شاکر کے علاوہ اس مکان میں کسی کو نہیں دیکھا شاید شاکر کے بچے نہیں تھے۔

شاکر نے صبح آ کر مجھے آواز دی۔ میں اور رولو کا دونوں ہی جاگ چکے تھے۔ اس نے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کر کے بتایا یہاں پر پانی رکھا ہے اور ایک طرف رفح حاجت کا بندوبست ہے اس کے اشاروں اور کچھ شمیری اردو سے سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ناشتے کے بعد رولو کا نے کہا۔ ”آپ تفریح کریں، گنگا کا آخری سرا دیکھیں میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔“

گنگوتری ہندوؤں کا تیرتھ استھان بھی ہے یہاں پر بے شمار مندر ہیں۔ پہاڑوں پر مندر، وادیوں میں مندر اور نوا اور غاروں تک میں مندر بنے ہوئے ہیں اور سب ہی بہت قدیم ہیں دریا نے گنگا ہندوؤں کا نہایت متبرک دریا سمجھا جاتا ہے ہزاروں لوگ اس کی شروعات دیکھنے آتے ہیں۔ یہاں سے پانی بھر کر لے جاتے ہیں۔ ان مندروں میں برہمن روزانہ خوب پیسے کاتے ہیں۔ اکثر لوگ صبح آتے ہیں اور شام کو واپس چلے جاتے ہیں پورے ہندوستان کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں مقامی لوگ کم اور بیرونی زیادہ نظر آتے ہیں۔

میں جانتا تھا گو برہمن گوجر کسی نہ کسی مندر میں ہوگا میں ایک تک دھاری سادھو کے روپ میں تھا میرے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی ہاتھ میں ایک میو میو لکڑی تھی۔

سڑک بچ در بچ دروں سے گزرتی ہوئی اوپر کی جانب جاتی ہے سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے میدان اور پہاڑ نظر آتے ہیں پانی کے چشمے اور پہاڑ سے گرتے آبشار میں ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہتا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں میدان نظر آتا ہے وہیں پر کسان بھی کام کرتے نظر آ جاتے ہیں یہاں پر صرف دن میں لار لاریں اور بسیں چلتی ہیں راستہ خطرناک ہونے کی وجہ سے رات کو کوئی ستر نہیں کرتا گاڑی سے ہی نظر آتا ہے کہ گاڑی جس پگڈنڈی پر چل رہی ہے اس کے دونوں طرف کتنی گہری کھائی موجود ہے۔ مگر پہاڑی علاقے کے ڈرائیور اس روڈ پر گاڑی چلانے کے ماہر ہیں۔

ہم چار بجے شام گنگوتری پہنچ گئے۔ مقامی لوگ گاڑی سے اتر کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو میں نے رولو کا سے کہا۔ ”یہاں کا موسم کافی ٹھنڈا ہے اور ہوائیں پانی کا تناسب بھی زیادہ ہے۔“

آپ نے درست کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ چاروں طرف پانی کے آبشار ہیں۔ پہاڑوں سے پانی گر رہا ہے اور ہر طرف ہرے بھرے میدان ہیں۔ رولو کا نے جواب دیا۔ روڈ کے کنارے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ دو تین دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ رات ہونے سے پہلے کچھ سر چھپانے کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ میں اس بازار کی طرف چل پڑا ایک دکاندار سے میں نے پوچھا۔ ”یہاں رات گزارنے کو جگہ مل سکتی ہے۔“ بڑی مشکل سے دو چار دفعہ کہنے کے بعد وہ میری بات سمجھ سکا پھر اس نے بھی اتنی ہی مشکل سے ہم کو بتایا کہ ”آپ میرے گھر رک جائیں۔ کھانا نہیں ملے گا چائے لے گئے اور کرایہ دو روپے ایک آدمی کا روز کا ہوگا اگر کھانا کھاؤ گے تو تین روپے دینا ہوں گے۔“ اس نے اپنا نام بتایا تو پتہ چلا وہ مسلمان تھا۔ ہم اس کے گھر چلے آئے یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا دیواریں مٹی کی تھیں اور کمرہ بہت کشادہ تھا اس کی فلیو وہیں رہتی تھی گرد مریان میں ایک دیوار تھی اس کے مکان کے اطراف میں صرف چند مکان اور نظر آتے تھے وہ بھی اسی انداز کے بنے ہوئے تھے۔ چھتیں بہت نیچی تھیں اور ان پر بھی ہریالی نظر آتی تھی۔ اخروٹ اور

چہرے پر بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی اور اس داڑھی میں نیچے پھٹے ہوئے تھے۔ میں ایک بے پروا سا دھونا ہوا تھا۔

یہ بھیں میں نے اس لئے بنایا تھا کہ مجھے کسی مندر میں جانے سے کوئی نہ روکے۔ جا تو میں روپوشی کی حالت میں بھی سکتا تھا مگر اس سے لوگوں کے تاثرات مجھے نہیں پتہ چلتے۔ آپ کو پتہ ہے گو بردھن کتنا چالاک آدمی ہے۔ وہ حالات اور موقعہ شناسی کا ماہر لگتا ہے وہ اپنے سب سے بڑے بیربھروں کے قریب نہیں آیا۔ وہ سمجھ گیا تھا جو بھیروں کو قابو کر سکتا ہے وہ کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوگا۔ وہ دور بٹھ کر حالات کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ اپنی شکتی کا وزن کر رہا ہوگا۔ بھیروں سے آگے کی شکتی کا پلان کر رہا ہوگا۔ خاموش تو نہیں ہوگا اس کے قریب اس کے بیر اس کی حفاظت کر رہے ہوں گے وہ ضرور کنڈل بنا کر دیواریں اونچی بنا کر بیٹھا ہوگا ایسا وہ کھلے میدان میں تو نہیں کر سکتا چار دیواری اس کو مندر میں ہی میسر آ سکتی ہے۔

پہاڑ کے دامن میں مجھے ایک مندر نظر آیا میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا گیا۔ کافی بڑا میدان عبور کرنے کے بعد میں اس کے دروازے پر کھڑا تھا یہ مندر وشنو بھگوان کا تھا۔ مندر کے دائیں بائیں دو تین مکانات بھی نظر آئے تھے اور ان مکانوں کے سامنے سبزی کاشت کی ہوئی تھی۔ اسی سبزی کے کھیت میں ایک بیماری کھڑا تھا اس نے مجھے دیکھا تو میرے قریب آ گیا اور بولا۔

”مندر تو بند ہے سا دھو مہاراج۔ اب بار بار تو میں بند کرنے سے رہا ہوں بھی بہت کام ہیں کرنے کو۔“

”بھگوان کے درشن کرنے کو تم نے وقت مقرر کر دیا ہے ہمارے اور بھگوان کے بیچ تم دیوار بن گئے ہو۔“ میں نے ناراضگی سے کہا۔

میرے غصہ کرنے سے وہ مرعوب ہو گیا۔ بولا۔

”نہیں سا دھو مہاراج ہم تو سیوک ہیں۔ پر دنیا میں اور بھی تو کام ہیں نہ کریں تو بھوکے مر جائیں۔“

”تو پھر دوڑ کیوں بند ہیں۔ کھلے رکھ یہ بھگوان کا استھان ہے اس کے چاہنے والے تو کسی وقت بھی آ سکتے

ہیں۔“ میں نے رعب سے کہا۔ تو وہ بولا۔

”دوڑ تو رکھے ہیں بس بھیڑ دیتے ہیں۔ کوئی کتابلی اندر نہ جائے اس کارن۔“ وہ بولا۔

”اچھا بچہ تیرا نام کیا ہے۔“ میں نے سا دھوؤں کے انداز میں پوچھا۔

”میرا نام گنگا پرشاد ہے جی۔“ وہ بولا۔

”اچھا گنگا پرشاد۔ گنگوتری میں بڑا مندر کہاں اور کس کا ہے۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”سا دھو جی مندر تو بہت ہیں اور سب ہی بڑے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ارے سو کہ ہماری بات تو نہیں سمجھا جہاں بڑے گیانی شکتی دان پرش ہوں وہ بڑا استھان ہوتا ہے کوئی زمین پہاڑ چھوٹا ہوا نہیں ہوتا منش کی شکتی اور اس کے کرم بڑا چھوٹا بناتے ہیں۔ اب بتا۔“ میں نے کہا۔

”وہ سا دھو مہاراج اتنی گہری باتیں صرف تم ہی کر سکتے ہو۔“ گنگا پرشاد نے جھوم کر کہا۔

”بتاتا کیوں نہیں بڑا مندر کہاں ہے۔ اور اس کا بڑا پجاری کون ہے۔“

”اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک مندر بنا ہے۔ سرسوتی دیوی کا مندر ہے۔ وہاں کوئی نہیں جاتا کیونکہ اوپر چڑھنا پڑھتا ہے دوسرے وہاں کوئی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہاں پر سردی بہت ہے اور ہمیشہ موسم ایک ہی رہتا ہے، کھانے پینے کا بھی انتظام کرنا مشکل ہے پر ایک دیوی کا پجاری وہاں پر رہتا ہے۔ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اس کے وہاں ہونے کا پتہ یوں چلتا ہے کہ رات میں مندر میں روشنی نظر آتی ہے اور کبھی دن میں دھواں بھی نظر آ جاتا ہے۔ اس پجاری کو بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے، میں نے بھی اس کو نہیں دیکھا۔“ گنگا پرشاد نے بتایا۔

میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ پھر بولا۔

”کہو تو کواڑ کھول دوں سا دھو مہاراج۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں اب ضرورت نہیں..... پھر کبھی آئیں گے۔“ اور میں واپسی کو پلٹ گیا۔

پھاڑ پر اوپر جانے کا راستہ چکر دار تھا اور صرف ایک آدمی اس پر چل سکتا تھا کہیں کہیں درے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ راستہ پانی نے بتایا تھا بارش کا پانی پھاڑ سے اسی راستے سے بہتا ہوگا ابھی بارش کے آثار نہیں تھے اب بارش ہو جائے تو اس پر چلنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ پانی کے بہنے کی رفتار بہت زیادہ ہوگی چھوٹے بڑے پرندوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں اور ان میں گول گول اور سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھل لگے ہوئے تھے۔

میں جانتا تھا یہ پھل بڑا مقوی اور مزے دار پھل تھا۔ سرسبز پھاڑی علاقے میں یہ پیدا ہوتا ہے۔ راستہ ابھی آدھا بھی طے نہیں ہوا تھا کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس راستے پر رات میں سفر کا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا مگر میرا سفر عام آدمی کا سفر نہیں تھا۔ میں پگڈنڈی کے راستے پر چلنا نظر آتا تھا اگر چاہتا تو فوراً اوپر جا سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں جس جھیس میں تھا انداز بھی وہی رکھا تھا۔ میں جس کے پاس جا رہا تھا وہ ایک شاطر انسان تھا میرے قدم اس راستے پر پڑے ہوں اور اس کی نگاہیں دیکھ نہ رہی ہوں۔ اس لئے میں ایک دیوانہ سا سوچتا تھا اور اسی دیوانگی میں اس کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میرے کارندے میرے ارد گرد موجود تھے ان کی موجودگی صرف میں محسوس کر سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تھا۔

سامنے مندر کا کلس نظر آ رہا تھا مگر وہاں جانے کا راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ راستہ جس پر چل کر میں آ رہا تھا اچانک گہری کھائی میں چلا گیا تھا۔

میں نے سوچا یہ پہلی رکاوٹ آئی ہے وہ وزن کر رہا ہے پر کھ رہا ہے کہ آنے والا خالی ہے کہ اس کے تھیلے میں کچھ ہے کہ نہیں اگر ہوگا تو کھائی عبور کرے گا خالی ہوا تو واپس چلا جائے گا دونوں صورتیں مجھے منظور نہیں تھیں میں خود کو مشکف کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور واپس جانا بھی مشکل تھا۔ پھر کیا کروں۔ میں نے سوچا اور وہیں بیٹھ گیا۔

اور پھر بڑی بلند آواز سے سسوتی دیوی کو پکارا۔
”واہری دیوی یہ خوب رہی ہم تو تیرے درشن کو اتنی

دور سے آئے ہیں اور تو نے ہی ہماری راہ میں روڑے اٹکا دیے۔ مگر یاد رکھ ہم جائیں گے پھر بھی نہیں، ارے ہم تو دیوانے ہیں دیوانے۔“ میری آواز رات کے سنائے میں گونج رہی تھی میں نے کئی بار سسوتی کو پکارا اور پھر کہا۔
”ٹھیک ہے سسوتی تو ضدی ہے تو ہم بھی تیرے دیوانے ہیں نہیں جائیں گے۔ اسی جگہ پڑے ہیں مرجائیں گے بھوکے پیاسے۔“ مگر کچھ نہ ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔

میرے کارندے نے کان میں بتایا۔ ”مندر میں صرف دو آدمی ہیں دونوں نے آواز سن لی ہے۔ مگر گیان دھیان میں لگے ہیں۔“

میں اپنا روپ قائم رکھنا چاہتا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔ پوری رات گزر گئی۔ سورج کی کرنیں مندر کے کلس سے نکلنے لگیں پرندے بھی دانہ دنکا کھانے نکل کھڑے ہوئے مگر مندر کی طرف سے کوئی زندگی کے آثار نظر نہ آئے۔ میرا کارندہ پھر میرے پاس آیا اور اس نے بتایا ان دونوں کا گیان ختم ہو گیا ہے اور وہ اب مندر سے باہر آئیں گے میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر سسوتی سے لڑائی کرنے لگا۔

مندر کے دروازے پر ایک دروازہ شخص نمودار ہوا اور لٹاکر کر بولا۔ ”ارے کا نکواس کے جبار ہے ہو، مورکھ دیوی کا غصہ بہت بڑا ہے شراب سے ڈر۔“

میں نے اس دیویہ کل آدمی کو دیکھا اور کہا۔ ”ارے تو کس سے لڑوں۔ چنوں تک آنے کی راہ نہیں دیتی۔ کتنی کٹھور ہو گئی ہے۔“

”کا پاگل پن کی بات کرے ہے دیوی کا کیا تصور ہے اس میں۔“ وہ بولا۔

”تو پھر یہ راستہ کون کاٹا ہے تو نے یہ نہیں کیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”مہا گرو نے یہ کاٹا ہے اگر ایسا نہ کریں تو ہر کوئی منہ اٹھا کے چلانا آئے گا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر گرو سے کہہ جا کر راستہ ٹھیک کریں۔ ہم دیوی کے چرنوں کی دھول لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”آئیں تو آجاریہ تو ایسا ہی رہے گا۔“ وہ بولا۔

”اور پھر تو بھی سن رکھ، ہم بھی ایک خدی ہیں جائیں گے نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو کوئی پاگل لگتا ہے ارے مر جائے گا بھوک اور سردی سے جاواپس چلا جا۔“ دو پھر بولا۔

”تو اپنا کام کر..... ہم مرجائیں یا جی جائیں تیری بلا سے۔“ میں نے کہا۔

میری اداکاری بالکل ایک ضدی بچے جیسی تھی۔

”اچھا ٹھہر جا تو ایسے نہیں جائے گا۔“ وہ مندو کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اس جیسا

”بڑا ہی دھیت آدمی لگتا ہے گرو جی میں نے سب جتن آدمی اور تھا۔ پہلے والے نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔“

کر لئے پر یہ جانتا ہی نہیں ہے ” دوسرے آدمی نے میری طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھیں لال لال تھیں جسم سے

وہ بھی بہت گھڑا تھا ایک دو قدم اُگے کھائی کے عین کنارے پر آ کر بولا۔

”اپنی زندگی سے تجھے پیار نہیں ہے کیا؟“

”زندگی تو سب کو پیاری ہوتی ہے.....“ میں نے

جواب دیا۔

”تو پھر پلیٹ چا..... یہاں کسی دیوی کا استھان نہیں

ہے۔ ”وہ بولا۔“

”اے واہ سب کہتے ہیں یہاں پر سرسوتی دیوی کا
اتھان ہے ہم تو بڑی دوسرے درشن کو آئے ہیں درشن کئے بنا

کیسے لوٹ جائیں۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”تو پھر سن بیس سال پہلے یہاں پر سرسوتی دیوی کی
مورتی ہوا کرتی تھی وہ مورتی چور لے گئے اور تیری دلیوی کچھ

نہ نہ کر سکی اس کے بعد اس جگہ ہمارا استھان ہے یہاں کوئی نہیں آتا تو تو یا گل لگتا ہے کہ ایک دھن میں چلا آتا ہے اب واپس

چلا جا، اس نے کہا جو کہ یقیناً گوبردھن تھا۔

”یہ کیا نئی کہانی تم نے سنا ڈالی ہم نہیں مانیں گے
جب تک اپنی آنکھ سے نہیں دیکھیں گے ہم کو بہکانے کی

کوشش مت کر۔“ میں نے کہا۔

”تو بڑا نادان ہے نا سمجھ ہے اور تیری میری کوئی دشمنی بھی نہیں ہے اس لئے سمجھا رہے ہیں تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا کھائی میں پڑا ہوتا۔“ گوبر دھن نے کہا۔

”اچھا یہ تو بتاؤ کون ہے ذرا پتہ تو چلے کہ میں سال سے سرسوتی کا استھان ہتھیا کر بیٹھا ہے کسی کو آنے بھی نہیں

دیتا۔" میں نے کہا۔

گوبردھن کے چہرے پر ذرا سا غصہ آیا اور وہ
 بولا۔ ”تو سن ہم گرو گوبردھن گوجر ہیں اب آگے مت

بولیو۔ وہ بولا۔

”مجھے تو تو کو بردماغ لگتا ہے میں نے پوچھا کیا ہے
 در جواب کیا مدعا ہے۔“ میں نے کہا۔

گوہر دھن کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ دھاڑ کر بولا۔ ”اچھا
دو پھر تیرا کریا کر م کرنا پڑے گا۔“ اس نے ایک ہاتھ اور اٹھایا

مگر وہ ہاتھ نیچے نہیں آیا کیونکہ میرے کارندے اس پر سوار ہو چکے تھے۔ اس نے منہ میں کچھ منتر بڑھنا چاہا تو منہ بند

ہو گیا۔ وہ اپنی طاقت کے زعم پر اپنی کوئی احتیاطی تدبیر نہ کر سکا میری اداکاری نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے ایک جست لگائی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 اس کی آنکھیں کھلی تھیں حیرت سے اس نے میری طرف

”ہاں تو مہا گرو گوبردھن گوجر بیس سال پہلے تو نے

سوتلی کے استحان پر قبضہ کیا اور اس کو اپنے باپ دادا کی
اسناد سمجھ کر رہ رہا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو بر نشان

لڑ رہا تھا۔ تو نے بھیروں کو ایک بے گناہ پہلوان گوپی چند پر وار کر دیا۔ بتاتے رہے۔ بھیروں اب کہاں سے بڑی شگفتی والا سیر تھا

لہا ہے اور اس کی شکستی میری جب میں ہے۔“ میں نے کہا۔

میں پھر اس نے کہا۔

”میں دھوکے میں مارا گیا۔ تو بہت حالاک ہے۔“

”ہر مقام پر شکتی کی نہیں چلتی انسان میں عقل بھی
نا ضروری ہے اب تیری شکتی تیرے کام نہیں آئے گی اس

لئے کہ میں نے تیرے سارے سیر قابو کر لئے ہیں۔“
”مجھے معاف کر دے میں یہ استھان بھی چھوڑ دوں
گا سروسٹی کی صورتی بھی رکھ دوں گا۔“ وہ بولا۔

”مجھے پتہ تھا کہ تو ہی چور ہے مگر اب تو اس قابل
نہیں رہے گا کہ کسی کے استھان پر قبضہ کر سکے۔“ میں نے
اشارہ کیا اور میرا کارندہ اس کے اندر تک کے راستے چلا گیا
اور چند منٹ میں ہی گوبردھن ویران ویران نظروں سے
چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ ایک پاگل شخص تھا اس کے
جوسا تھا تو وہ میرے پیروں پر گر پڑا تو میں نے کہا۔

”دشمنی حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ
مشکل اس کا استعمال ہے۔ تیرا سیر کوئی جھگڑا نہیں ہے۔“
اور میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی
نگاہوں سے مجھے تلاش کرتا رہ گیا اور میں واپس آپ کے
پاس آ گیا۔“ رولو کا نے اپنی رو دوا ختم کی تو میں نے کہا۔
”تم نے ٹھیک کہا انسان کی دشمنی اس کی طاقت بھی

ہے جب انسان کے پاس طاقت آ جاتی ہے تو وہ اپنا وہ وقت
بھول جاتا ہے اور آخر یہ طاقت ہی اس کو ختم بھی کر دیتی
ہے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ جو طاقت اس کو ملی ہے وہ کہاں
سے ملی ہے دینے والا لے بھی سکتا ہے یا کسی اور کو بھی اس
سے زیادہ طاقت دے سکتا ہے۔“

”اگر انسان اتنی بات پر غور کرے تو وہ کسی پر ظلم نہ
کرے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

اب ہمارا کوئی کام گنگوٹری میں نہیں تھا ہم وہاں
سے جوں واپس آ گئے اور پھر دلی کی طرف روانہ ہو گئے وہ
چاردن دلی میں گزار کر جے پور کی طرف چل دیئے۔

جے پور ایک راج واڑہ ہے یہاں پر ایک راجپوت
راجہ کی حکومت ہے۔ یہ ایک نہایت صاف ستھرا شہر ہے
سڑک کے کنارے جو عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ سب سرخ پتھر
کی ہیں اور طرز تعمیر ایک جیسا ہے سڑکیں صاف ستھری ہیں
صفائی کا یہاں پر بہت خیال رکھا جاتا ہے راجہ خود سڑکوں پر
سیر کو نکلتا ہے۔ راجہ انصاف پسند ہے ہندو ریاست ہونے کے
باوجود یہاں پر بڑی تعداد میں مسلمان اور دوسری قومیں آباد

ہیں اور کبھی کسی کو راجہ سے شکایت نہیں ہوئی۔ سب راجہ
صاحب کا احترام کرتے ہیں راجہ سورج مل ہر دل عزیز
شخصیت ہے۔ ریلوے کا اسٹیشن بھی نہایت صاف ستھرا اور
عمارت سرخ پتھر کی تعمیر کردہ ہے۔ اسٹیشن کے باہر مسافر
خانے کھلے ہوئے ہیں ان میں ہندو مسافر نانے اور مسلمان
مسافر خانے الگ الگ ہیں ہم نے بھی ایک مسلمان مسافر
خانے میں قیام کر لیا۔

مسافر خانے کے مالک کا نام احمد دین تھا مگر سب
ہی اس کو دینو پھوپھا کہتے ہیں۔ بہت سادہ اور سیدھا آدمی
ہے مگر باتونی بہت ہے اس نے ہمارا پورا انٹرویو کر لیا
پھر بولا۔

”کیوں بھیا کا دھورے سے آئے ہو یادو سے۔“
میں نے کہا۔ ”دلی سے آئے ہیں۔“
”ارے دلی کا دور ہے یہ ہی پڑوس میں گلی ہے۔“
وہ بولا۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر بولا۔ ”دلی میں کا
کام کرے ہو بھائی۔“
ہم نے کہا۔ ”ہم دونوں حکیم ہیں۔ دلی میں ہمارا
مطب ہے۔“

حکیم کے نام پر وہ چونکا اور بولا۔ ”ارے واہ یہ بھی
خوب رہی آج ہی بھرت پور سے چمپی آئی ہے۔“ ہم پھر
خاموش رہے تو وہ بولا۔ ”ہم ہیں تو بھرت پور کے پر یہاں
آ کر بس گئے تھے کا کرتے مجبور ہو گئے تھے ہماری کون
سنتا۔“ وہ ہاتھ مسل کر بولا۔

”آ خر ہوا کیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہوتا کیا تھا جی بات یہ ہے کہ ہم بھرت پور کے
قریب گاؤں تلسمی پور کے ہیں راج دھانی تو راجہ بھرت پور کی
لاگے ہے تو بھیا وا کا سی چلے گا اور ہم بھرت پور کے
گاؤں دو ہی گھر مسلمانوں کے تھے دادا پر وادا سے رہتے
آئے تھے بہت زمین اور بہت بڑی حویلی ہمارے پرکھوں
نے ہمارے لئے چھوڑ لی تھی پر کا خبر تھی کہ وہی زمین اور حویلی
دشمن ہو جائے گی اور ہمیں جنم بھومی چھوڑنا پڑے گی۔“ وہ

خاموش ہو گیا جیسے اپنی یادوں کے دفینے میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر خود ہی بولا۔ ”ہمارے دادا نے بڑے کروڑوں اور ٹھاکوں سے جانوں کے گاؤں میں زندگی گزاری ہے بنے خان کے نام کا ڈنکا بجاتا تھا اور دور دور کے گاؤں والے فیصلہ کرانے آتے تھے سات گاؤں کی پہچانیت کے وہ بڑے تھے ان کا فیصلہ کورٹ پکھری تک میں مانا جاتا تھا مگر وہ بات ہمارے باپ میں نہیں تھی جو قوت فیصلہ دادا میں تھی وہ ان میں نہیں تھی وہ موقعہ محل دیکھ کر بات کرتے تھے ان کی بات میں پلک بھی دو ٹوک بات کرنا ان کو نہیں آتا تھا ان کی یہ کمزوری جب پتہ چل گئی تو ان سے لوگوں نے بہت سے فیصلے اپنے مطلب کے کر لئے اور پھر ان کا زوال شروع ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے منصب سے ہٹا دیئے گئے۔ سارے گاؤں تو ہندوؤں کے تھے ان کی نظر میں بھی بدل گئیں اور پھر ایک کے بعد ایک گاؤں ہماری عملداری سے نکلتا تھا اور جب میرے ہاتھ میں لگام آئی اس وقت صرف تلسی پوری کی زمین اور جوہلی تھی اور پورے بیس کیس زمینوں کے دیوان میں چل رہے تھے۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی تارن پڑ جاتی تھی میں صرف کورٹ پکھری کا ہوکمدہ گیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں زمینداری پر توجہ کیا دیتا کارندے اپنی من مانی کر رہے تھے۔ وہ سب ہی ہندو تھے۔ ان کی ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ تھیں وہ میرے ملازم ہو کر مجھ سے وفادار نہیں تھے یہ وہ لوگ تھے جو پرکھوں سے ہمارے ملازم تھے جن پر ہمارے خاندان کے ہزاروں احسانات تھے ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا تھا یہ لوگ کچھ چکے تھے کہ بنے خان خاندان ختم ہو رہا ہے گرتی دیوار سے کون لپٹا رہتا ہے مجھے کوئی گواہ نہیں ملتا تھا شہوت بھی میں ہارے نہیں کر پا رہا تھا اور کس میرے خلاف جارہے تھے مجھے بھی اپنی گرتی سدا کا اندازہ تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ یہ حالات میرے ساتھ ہی نہیں تھے سب مسلمان زمینداروں کا بھی حال تھا راجہ کے درباری اور خود راجہ بھی ہندوؤں کا پارٹ لیتا تھا پولیس میں عدالت میں ان کی ہی چلتی تھی۔ یہ ریاستی نظام تھا صرف ایک آدمی کا فیصلہ سب کو ماننا ضروری ہوتا ہے جو اس کے خلاف ہوا، وہ ریاست سے گیا۔

ان حالات میں میرا وہاں پر رکنا اپنی اور اپنے خاندان کی خرابی کرنا تھا لہذا میں عزت کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اور کچھ تو کرنا تھا تو یہ سرائے بنا کر بیٹھ گیا ساری زمین بیویوں کی تجوری میں چلی گئی رہ گئی ایک جوہلی تو اس میں مہری بہن رہتی ہے مگر اس پر بھی بیویوں کی نیت خراب ہے۔ وہ اس کو بھی ہتھیانے کی فکر میں ہیں۔ میری بہن آئے دن کی بیمار۔ تھوڑی سی زمین ہے اس پر اس کا گزارہ ہے۔ مگر میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں علاج ہو رہا ہے ٹھیک ہو جاتی ہے اور پھر بیمار پڑ جاتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ روگ کیا ہے۔

”تم ایسا کرو بہن کو اپنے پاس بلانا دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے کل ہی بلوائے لیتا ہوں۔“ دینو نے جواب دیا۔

دوسرے روز شام کو اس کی بہن آ گئی۔ تو دینو نے مجھے اطلاع دی۔ میں اکیلا ہی اس کو دیکھنے چلا گیا۔ وہ چار پائی پر لیٹی تھی۔ عمر کا اندازہ میں نے چالیس سے اوپر لگایا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ جسم ہڈیوں کی مالا تھا۔ میں نے معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کا نظام ہاضمہ بہت بگڑا ہوا ہے میں نے پوچھا۔ ”کیا کھاتی ہو کتنا کھاتی ہو۔“ تو پتہ چلا کہ وہ کئی کئی دن کچھ نہیں کھاتی وراسا دودھ یا سیسم کی غذا پر زندہ ہے۔ اندر زخم وغیرہ کا سراغ بھی نہیں ملا۔ میں اس کے پاس ہی تھا کہ رولوکا آ گیا۔ میں نے اشارے سے اس کو معائنہ کرنے کو کہا۔ رولوکا اس کے سر ہانے کھڑا ہو گیا اور ایک ہاتھ اس نے مریضہ کے ماتھے پر رکھ دیا۔ چند منٹ وہ خاموشی سے کھڑا رہا اور پھر بولا۔

”دینو کچھ کھانے کو لاؤ نرم چیز ہو تو زیادہ بہتر ہے۔“ یہ سن کر دینو دوڑ کر گیا اور ایک پیالے میں دلیہ لے کر آ گیا دلیہ میٹھا تھا اور اس میں دودھ پڑا ہوا تھا۔ رولوکا نے کہا دینو اپنی بہن کو کھلاؤ تو دینو اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور پیچھے سے کھلانے لگا مریضہ نے پورا لی کھالیا۔

دینو نے حیرت سے کہا۔ ”اس کے پیٹ میں تو ایک

”چچ نہیں سنا تھا کیسے کھالیا۔“

”نہیں آپ دلی چلے جائیں کیونکہ میں کسی اور ہی روپ میں بھرت پور جاؤں گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔
”دوسرے ہی روز میں دلی اور رولوکا بھرت پور روانہ ہو گیا۔“



”بھرت پور اور جے پور کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہاں پر سرکاری کارندے دندناتے پھرتے تھے عوام ڈری ڈری نظر آتی تھی۔ قانون تو انگریزی چلتا تھا مگر اس قانون کے اوپر راجہ کا حکم بھی چلتا تھا۔ نہ کسی کی عزت محفوظ تھی اور نہ کوئی راجہ کے کارندوں کے خلاف آواز اٹھا سکتا تھا راجہ کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے گھر میں بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا کہ کون راجہ تک بات پہنچا دے اور اس پر عذاب نازل ہو جائے کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ ہر چیز پر راجہ کا حق تھا۔ وہ مکان ہو دکان ہو جانور ہوں کھیت کھلیان ہوں راجہ جب چاہے جو چاہے لے سکتا تھا ایک کٹھن گھٹی سی فضا اور خوف میں ڈوبا ہوا ماحول تھا۔ اس ماحول میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ میں ایک بے روزگار اور بھوکے نوجوان کے روپ میں تھا۔ مجھے روزگار کی تلاش تھی۔ میں شہر میں مارا مارا پھرتا تھا کسی نے رحم کھا کر مجھے ایک داروغہ کا بیٹا دیا میں اس کے ورورہ جا کھڑا ہوا۔ داروغہ نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تانڈے کر پوچھا۔

”کیا ہے کیوں آیا ہے؟“

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”حضور پریشان ہوں آپ مائی باپ ہیں رحم کریں کوئی چاکری دلوایں تو روٹی پانی کا کچھ ہو جائے۔“

اس نے ہیر آگے کر دیے اور بولا۔ ”اچھا پہلے میرے بوٹ کھول اور ذرا بیڑا۔“

میں نے جلدی سے اس نے جو کھا تھا کیا اور پیروں میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ گردن کرسی پر ٹکا کر آنکھیں بند کر کے آرام سے بیٹھا رہا۔ میں نے بہت اچھی طرح اس کی تسکین اتاری۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”کام تو چوکھا کرے ہے۔“

میں گردن جھکا کر خاموش اس کے پیروں میں بیٹھا

رولوکا نے کہا۔ ”اب یہ سب کچھ کھائے گی فکر نہ کرو۔ انسان کا پیٹرول غذا ہوتی ہے اگر گاڑی میں یہ نہ ہو تو وہ چلنے پھرنے لگی اور چہرے پر بھی رونق آگئی۔ نہ میں نے کوئی دوائی دی اور نہ ہی رولوکا نے کچھ کہا۔ میں نے رولوکا سے پوچھا۔

”آخر یہ ٹھیک کس طرح ہوگئی۔ تم نے تو بظاہر کچھ نہیں کیا۔“

”یہ چکر کسی دشمن کا تھا اس نے ایک حرام غذا اس کے پیٹ میں اتار دی تھی اور وہ حرام چیز درمیان میں رکاوٹ بن رہی تھی اور چونکہ یہ گندے عمل سے اتاری گئی تھی اس لئے صاف اور پاک غذا اندر نہیں جا پاتی تھی۔ یہ بھوک اور پیاس سے مرنے کے قریب آگئی تھی۔ میں نے صرف یہ کیا کہ اس گانٹھ کو پگھلا دیا اور وہ پانی بن گئی رکاوٹ ختم ہوگئی اور غذا معدے میں جانے لگی اور اس کا علاج ہو گیا۔“ رولوکا نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہوا یہ کسی دشمنی کا شکار ہوگئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”دینو کے حالات تم نے سنے ہیں؟ یہ سارا خاندان ہی دشمنی کی نظر ہو رہا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”انسان کی فطرت بھی عجیب و غریب ہے۔ وہ گرنے پر آتا ہے تو جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اپنی کوتاہیوں کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دولت اور اقتدار کی ہوس میں اتنا آگے چلا جاتا ہے کہ خاندان در خاندان نسل در نسل لڑتا رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس کا نتیجہ پھر بھی وہ نہیں نکلتا جو وہ چاہتا ہے وہ لڑتے لڑتے مر جاتا ہے اور اپنی لڑائی کی میراث اپنے پیادوں کو سونپ جاتا ہے پھر وہ لڑتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ انسان کی سوچی ہوئی ہر بات رو بہ عمل نہیں ہوتی وہ خود پھنسنے جاتا ہے اس لئے میں بھرت پور جاؤں گا اور یہ نسلوں سے چلتی لڑائی کو ختم کرانے کی کوشش کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں ساتھ چلوں۔“ میں نے پوچھا۔

رہا تو وہ پھر بولا۔ ”ہاتھ پیر کا بھی ٹھیک لاگے ہے کیا کام کرے گا۔“

”جو آپ حکم کرو گے کروں گا۔“ میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

”اچھا تو کل آئیوں میں کچھ کروں گا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تو پھر میں جاؤں۔“

”ہاں تو جا کام کرتا ہوئے تو کل آجائو۔“ وہ بولا۔

میں پھر دوسرے دن اس کے پاس چلا گیا وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”مالی کا کام کرے گا بول۔“ میں نے جھٹ جواب دیا۔ ”ضرور کروں گا۔“

”رہبر کے محل میں جگہ ہے پر ایک بات کا خیال رکھنا۔ وہ رہبر کا محل ہے وہاں پر زنانیاں بہت ہیں۔ راج کنار یوں کے علاوہ لونڈی باندی بھی بہت ہیں۔ نظریں نیچی رکھنا راجی بھول تیری گردن اڑا دے گی۔ بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے زندگی اور موت کا کھیل ہے یہ سن کھینٹو گٹ پکا ہے تو ہاں کر بول کیا ہوتا ہے۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ”میں تو بھوک کا ستا ہوا ہوں۔ میں کا بے نظریں اٹھاؤں گا کوئی آئے کوئی جائے میں دیکھوں گا بھی نہیں آپ چٹانہ کریں۔“

”اچھا تیرا نام کیا ہے اور پتہ بھی لکھوا دے۔“ وہ بولا۔ ”نام تو میرا لیکن ناتھ ہے پر پتہ کیا بتاؤں میرا تو کوئی گھر دوار ہے ہی نہیں میں تو کی رائٹ کا ساڑھوں اور اب تو وہ رائٹ بھی نہیں رہی۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”اچھا چل ٹھیک ہے۔“ اور میں اس کے ساتھ رہبر کے محل تک گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک لٹنی دروازے سے اندر گیا اور ایک بہت موٹے اور بڑی بڑی آنکھوں والے سے ملوایا اور بولا۔

”یہ بانی لایا ہوں جو بے جی تم نے کہا تھا نا۔“

جو بے جی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”اے کام کرے گا۔ مالی کا کام آتا ہے تجھے۔“

”کروں گا جی جیسا حکم ہوگا کرتا جاؤں گا۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”تجھے پتہ ہے یہاں صرف کھانا ملتا ہے روپے پیسے کی بات مت کر یوں۔“ وہ بولا۔

”روٹی ملے گی یہ بہت ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا چل، باغیچے میں تجھے پتہ پتوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور میں رہبر کے محل میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کام کے علاوہ جو بے جی کا بھی کام کر دیا کرتا تھا۔ جو بے دن رات شراب پیتا تھا۔ سارے محل کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا وہ جس کو چاہتا بھرتی کر لیتا اور جس کو چاہتا ہر نکل دیتا۔ میں وہیں رہتا بھی تھا جو بے جھ سے بہت خوش

تھا۔ میں اس کا خاص آدمی بن گیا۔ اس کی کمزوری شراب اور شباب تھی رات کو باندیاں اس کے پاس آتی تھیں اور شراب محل سے لا کر اس کو میں دیتا تھا وہ رات بھر شراب پی کر عیشی کرتا تھا میری خدمت سے وہ اس قدر خوش تھا کہ مجھے محل میں جانے کی اجازت اس نے دے رکھی تھی یہ محل کیا تھا عیشی کا اڈہ تھا۔ سینکڑوں ملازم ان میں جوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ان کے علاوہ راج کماریاں الگ اپنی اپنی دنیا میں مست تھیں۔ ان کی دنیا کیا تھی ان کو پتہ نہیں تھا کہ ریاست میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی عیشی کا ہر سامان محل میں موجود تھا۔ رہبر کی دنیا الگ تھی تو رانی کی دنیا بھی الگ تھی۔ شاہی خاندان میں یوں تو بڑی محبت نظر آتی تھی مگر اندر اندر ہی وہ ایک دوسرے کی کاٹ کرتے تھے۔

رانی رہبر کے علاوہ ہر مرد کو پسند کرتی تھی تو رہبر رانی کا حصہ کسی اور کو دیتا تھا۔ یہی حال راج کماروں کا تھا وہ ایک دوسرے کے خلاف تھے کیونکہ معاملہ گدی کا تھا۔ وہ کب سے کوشش میں تھے کہ رہبر مرے اور وہ رہبر کی گدی پر بیٹھیں۔ چھوٹا راج کمار خود کو زیادہ ہوشیار اور گدی کا اہل سمجھتا تھا تو بڑا جلد باز جلد باپ کی جگہ لینا چاہتا تھا۔

جو بے یہ سب کچھ جانتا تھا وہ بڑا کیاں تھا۔ اس صورت حال کا وہ پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا وہ راج کماروں سے خوب دولت کماتا تھا مگر وہ کسی کا وفادار نہیں تھا جس طرح وہ دونوں اپنے باپ کے وفادار نہیں تھے۔ یہ کیسی دنیا

تھی جہاں پر نہ وفا تھی نہ محبت نہ کسی رشتے کا تقدس تھا سارے محل کے در و دیوار پر سیاہی کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ جو اس محل کے اندر جاتا تھا وہ سفید پوش صاف ستھرا کس طرح رہ سکتا تھا وہ بھی اس رنگ میں رنگ جاتا تھا میں خود پر حیران تھا میں کیوں یہاں آیا ہوں کس کوراہ پر لگاؤں کس کوسر اودوں یہ تو خود اپنی بختی کی طرف تیزی سے رواں دواں ہیں ان کی سزا یہی ہے جو یہ کر رہے ہیں میں چوبے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

”میں جا رہا ہوں۔ اس گندگی کے ڈھیر پر میں اور زیادہ نہیں رہ سکتا۔“ اس نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا..... ”روٹیاں لگ گئی ہیں مفت کی جو تھیں۔“

”تم اس قدر گر چکے ہو کہ تم صرف ایک طرف ہی دیکھ سکتے ہو اس محل کے باہر بھی ایک دنیا ہے تم شراب اور عورت کے آگے کچھ اور نہیں سوچ سکتے۔ اس محل کے سب مکین اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس لئے میں جا رہا ہوں۔“

”ساری ریاست میں ہمارا راج ہے جانے گا کہاں ذرا باہر جا کر تو دیکھ پتہ چل جائے گا۔“ وہ بولا۔

”میں کیوں آیا تھا اور کیوں جا رہا ہوں یہ میں تم کو نہیں بتاؤں گا مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ تم مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا میں نے جو دیکھا تھا دیکھ لیا۔“ اور میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ پگڑی والے پہرے دار نے روزانہ کھول دیا میں باہر آ گیا اور تلسی پوری کی طرف روانہ ہو گیا۔

راجہ کے محل کے حالات جو تھے وہی تلسی پور گاؤں کے تھے یہاں پر بھی جس کی لالچی اس کی بھینس کا قانون چل رہا تھا۔ بنے خان کی جو بیوی ویران تھی ہر طرف دھول مٹی اڑ رہی تھی دیواروں پر پودے اگ رہے تھے۔ چیل کوؤں نے گھونسلے بنائے ہوئے تھے روزانہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ دینو کے خاندان کا کوئی فرو یہاں نہیں رہتا تھا۔ ساری زمینیں ہندو بیچوں کے پاس تھیں اور وہ پھر بھی اور زیادہ کی تلاش میں تھے غریب بہت زیادہ غریب تھا اور دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتا تھا اور دوسری طرف عیش تماشا شراب تھی شباب تھا اس پوری ریاست کا ماحول اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اس کی موجودگی

پر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے تلسی پور میں بھی کسی سے کچھ نہیں کہا ہے جیسا گیا تھا واپس آ گیا ہوں شیطان بہت خوش ہو گا میں اس کا کچھ نہیں کر سکا میں خود بھی شرمندہ ہوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ رولو کا نے اپنی روداد بڑے دردناک انداز میں ختم کی اور خاموش ہو گیا ماحول پر سوگواری کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اس کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ”اس میں تمہارا کیا قصور ہے تم کیوں اداس ہوتے ہو جو کرے گا وہ بھرے گا تم ایک نیک نیت لے کر گئے تھے مگر اس کا لک کے ڈھیر میں کس کس کو کھوتے کس کس کو اٹھاتے ان کے نصیب ان سے رکھ گئے ہیں۔“

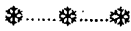
”یہ بات آپ کی درست ہے، ہم کسی کی تقدیر کو تو نہیں بدل سکتے۔“

میں نے احمد دین عرف دینو سے کہا۔ ”تم نے سارے حالات سن لئے تمہاری بہن ٹھیک ہوگئی۔ کیا تم اب بھی تلسی پور اور اپنی زمین سے کچھ دلچسپی رکھتے ہو۔“

احمد دین نے فوراً جواب دیا۔ ”اس زمین پر میں قدم رکھنا بھی نہیں چاہتا وہ تو گناہ کی نگری ہے میں جس حال میں ہوں بہت خوش ہوں اور میری بہن کے جو بچے ہیں میں ان کو بھی بلوالوں گا۔“

”تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے دولت زمین محل حویلی یہ سب چند روزہ ہیں ساتھ تو کچھ نہیں چائے گا اور جو چیز چند روزہ ہو اس سے محبت بڑھانا کون سی عقل مندی ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”اب تم ہم کو اجازت دو۔“ اور ہم بے پور سے روانہ ہو گئے۔



”جو مرجاتا ہے اس کے لئے ہر شے مرجاتی ہے یہی دنیا ہے یہاں ہزاروں آئے نئی نئی تہذیبیں آئیں ایک سے ایک ختم آئی ایک سے بڑھ کر ایک بہادر آیا چنگیز خان اور اس جیسے نہ جانے کتنے ظالم فرمانروائے اور آخر کار سب فنا کی گود میں چلے گئے کیونکہ ہا کسی شے کو نہیں ہے۔“

ہر دور کا انسان یہ دیکھنا آیا ہے اس حقیقت کو وہ مانتا

تلاش کیا ہے وہ تو خود چل کر تہارے پاس آتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک پھر دلی چلتے ہیں۔“

میں مطب میں مصروف ہو گیا اور رولو کا بھی کبھی کبھی میرے ساتھ بیٹھ جاتا۔ وہ اکثر خاموش ہی بیٹھا رہتا کبھی میرے کام میں مداخلت نہیں کرتا مرلیض آتے میں دوا کیں لکھتا وہ لیتے اور چلتے جاتے۔

ایک دن ایک مریضہ آئی وہ ایک جوان عورت تھی اس کے ساتھ بوڑھی عورت اور مرد تھا میں نے معائنہ کیا بوڑھی عورت نے مریضہ کی کیفیت بتائی دورے پڑتے ہیں۔ ”اس کی یہ حالت کب سے ہے۔“ میں نے پوچھا۔

چھ سال پہلے تک ٹھیک تھی ہم نے اس کی شادی کردی شادی کے چھ ماہ بعد اس کو پہلا دورہ پڑا ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے منہ سے کف جاری ہو گیا دانت ایک دوسرے پر چڑھ گئے اور آنکھیں ایک طرف لگ گئیں سب گھبرا گئے مگر تھوڑی دیر کے بعد درد ختم ہو گیا اور یہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماد نے ہمارے پاس لا کر چھوڑ دیا۔ داماد سخت ناراض تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ بیمار تھی تو میرے سر کیوں منڈھ دیا۔ رکھو اس کو اپنے پاس جب ٹھیک ہو جائے تو بتلوینا لے جاؤں گا۔“

”یہ دورہ روز پڑتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں دو تین ہفتے کے بعد دورہ پڑتا ہے۔“ جواب ملا۔

”یہ مریضہ آپ کی کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”مجھ بد نصیب کی بیٹی ہے اور یہ اس کے باپ ہیں۔“ اس نے مرد کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

”اس کا کیا نام ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کا نام روشنی ہے۔“

”اور شوہر کا کیا نام ہے۔“

جواب ملا۔ ”حیدر علی۔“

”اب بتائیں حیدر علی کہاں رہتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ آگرہ کے محلے شاہ کنج میں رہتا ہے یہ وہیں بیاہ کر گئی تھی۔“ ماں نے جواب دیا۔

بھی ہے مگر پھر بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے اس نے رستم و سہراب کی شہزادی کو ختم ہوتے دیکھا ہے اس نے نیوا چیرے شہر ختم ہوتے بھی دیکھے ہیں بے حساب آبادیاں ہیں اور پھر ان کا نشان نہ رہا۔ مورخ نے جو لکھا وہ ایک فصد بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز نہیں مرنے تو وہ ہے امید یہ کسی حال میں فنا نہیں ہوتی۔

انسان مرتا ہے تہذیب مرتی ہے شہر مرتے ہیں۔ طاقت اور غرور مرتا ہے۔ تاریخ میں کچھ لوگ زندہ ہیں ان کے کارنامے زندہ ہیں یہ اپنی نیک نامی سے زندہ ہیں۔ ہزاروں سال کی دھند ان کے نام کو دھندلا نہیں سکی تو زندگی تو یہ ہوئی۔“ رولو کا نے کہا۔

”بے شک تمہاری بات کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہر طرف کچھ نہ کچھ مسائل ہیں شاید یہی زندگی کی رنگا رنگی ہے خوشی اور غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے کوئی ہمیشہ خوش نہیں ہوتا کبھی نہ کبھی غم کا مزہ لینا پڑتا ہے کوئی انسان اس سے مبرا نہیں ہے۔ مگر انسان میں اس کو سمجھتا ہوں جو تجربات سے سیکھتا ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”تجربات انسان کو سکھاتے ہیں اور وہ سیکھتا بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بیس سال کا جوان چالیس سال کے بعد بھی بیس سال کا ہی رہے مگر وہ ایسا نہیں رہتا بدل جاتا ہے یہ وقت کے تجربات کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سیکھنے کا عمل تو ساری عمر چلتا رہتا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تمہارا موڈ ٹھیک ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں آپ پروگرام بتائیں۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں تم کچھ آرام کرو۔ دلی میں تم آرام کرو میں کام کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”آرام وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کام نہ ہو۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”کام تو دلی میں بھی آ ہی جائے گا تم نے کبھی کام

”میں کسی کو بھیج دوں گی۔“ اور وہ لوگ چلے گئے۔
ان کے جانے کے بعد میں نے رولو کا سے پوچھا۔ ”کیا چکر
نظر آتا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”آپ نے دیکھا عورت صحت مند ہے کسی بیماری
کے آثار نہیں ہیں۔ اس نے اپنی بیماری کے بارے میں ایک
لفظ بھی نہیں کہا ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنی بیماری کی کوئی پرواہ
نہیں ہے اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آپ
نے کیا اندازہ لگایا ہے۔“

”تمہاری قوت مشاہدہ مجھ سے بہت زیادہ ہے میں
تسلیم کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس قسم کے کیسوں میں اکثر جو نظر آتا ہے وہ نہیں
ہوتا۔ تم نے دیکھا ہوگا کنواری اور خوب صورت لڑکیوں میں
بے ہوشی کی بیماری ہوتی ہے زیادہ تر تو ہمسویائی دورے
ہوتے ہیں جن کا علاج مریضہ کی شادی ہوتی ہے مگر اس کے
ساتھ کچھ مکر کے دورے بھی ہوتے ہیں یہ دورے نہیں صرف

ڈرامہ ہوتا ہے اس سے ماں باپ کو اشارہ دینا ہوتا ہے کہ وہ
اس کی شادی کر دیں یا کسی مخصوص مرد کو حاصل کرنا ہوتا ہے
سمجھ دار ماں باپ مریضہ کی شادی کر دیتے ہیں اور تا سمجھ اس
کا علاج کسی سیانے سے کر داتے ہیں اور وہ صو کا کھاتے ہیں۔
پہل جب پک جانے تو اس کو ٹپنی پر رہنا پسند نہیں ہوتا
حالانکہ وہ اسی ٹپنی پر لگا تھا اس پر پرورش پا کر کسی کے استعمال
کے قابل بنادہ اسی ٹپنی کو چھوڑنا چاہتا ہے یہی قدرت ہے اگر
اس کو اسی ٹپنی پر رکھو گے تو وہ زمین پر گر جائے گا بکھر جائے گا
مگر تمہارا یہ کیس اس سے ذرا مختلف ہے اگر لڑکی شادی شدہ
نہ ہو تو مند رجب بالا انداز میں سوچا جاسکتا تھا یہ لڑکی نہیں
ایک جوان اور خوب صورت عورت ہے اور مزے کی بات یہ
بھی آپ کو بتا دوں کہ یہ عورتوں کی اس قسم سے ہے جو مرد
کے بغیر نہ ہی نہیں سکتی۔“

”پھر یہ چھ سال سے اپنے مرد سے دور کس طرح ہے۔“
رولو کا خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

”تم نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے اور تجربہ بات
کی بھٹی میں ہی انسان کندن بنتا ہے میں خود کو کندن تو نہیں

”شادی سے پہلے کبھی اس کو دورہ پڑا یا اس قسم کے
کوئی آثار آپ نے کبھی محسوس کئے یاد کر کے بتائیں۔“

”نہیں حکیم صاحب بڑی تندرست پیدا ہوئی تھی اور
شادی ہونے تک کبھی کسی بیماری میں بھی مبتلا نہیں ہوئی۔“
میں نے پھر ایک بار معائنہ کیا جسم میں کوئی آثار کسی بیماری
کے نظر نہیں آتے تھے سمجھ بھی ٹھیک کسی چہرے پر بھی رونق
تھی۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ ایک حسین عورت
کہی جاسکتی تھی۔ کسی بیرونی اور بناوٹی چیز کے بغیر بھی وہ اچھی
لگ رہی تھی۔

میرے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو رولو کا دیکھ رہا تھا
اور مسکرا رہا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ وہ اٹھ کر میرے
قریب آ گیا اور بولا۔ ”اس کا علاج مطب میں نہیں
ہو سکتا۔“ میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

میں نے عورت سے پوچھا۔ ”آپ کا مکان کہاں
ہے۔“

”کھاری ہاولی میں رہتے ہیں ان کی دکان وہیں پر
ہے کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”بات یہ ہے بہن کہ آپ کی لڑکی کو جسمانی تو کوئی
بیماری نظر نہیں آتی کیونکہ دورہ روز کا ہوتا تو ہم دورے کے
فوریان پتہ چلاتے کہ کس قسم کا دورہ ہے اس وقت ان کا جسم
بالکل نارمل ہے اب روحانی طریقہ پر غور کرنا پڑے گا اور وہ
علاج یہاں دواؤں سے نہیں ہوگا۔ کل شام کو آپ کسی کو میرے
پاس بھیج دیں میں اور میرے یہ ساتھی آپ کے پاس آ جائیں
گے اور پتہ چلانے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا کسی سائے وغیرہ کا چکر ہے حکیم صاحب۔“
وہ بولی۔

اس تمام عرصہ میں بوڑھا خاموش رہا۔ میں نے
پوچھا۔ ”کیا یہ بات نہیں کرتے۔“

”کرتے ہیں مگر سنتے نہیں ہیں ہم لوگ کیا باتیں
کر رہے ہیں ان کو کچھ پتہ نہیں ہے۔“ عورت بولی۔

”شام سات بجے میں فارغ ہوتا ہوں۔“ میں
کہا۔

کہتا مگر دنیا کے تاریک ترین علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں کو میں نے دیکھا ہے ان کو پڑھا ہے۔ یہاں یعنی ہندوستان میں ماورائی قوتوں کا غلط استعمال بہت ہے۔ اس کو یہاں پر انسانوں کے نقصان کے لئے ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر ہر وہ آدمی جو ذرا بھی ماورائی طاقت رکھتا ہے وہ غلط راہوں پر گامزن ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ غلط راہ پر انسان انسان نہیں رہتا وہ نفس کا غلام بن جاتا ہے اور یہی نفس پرستی اسے صراطِ مستقیم سے دور کر دیتی ہے وہ ایک راہ گم کردہ کا سا مسافر بن جاتا ہے یہ گمراہی اس کو اندھیروں کی طرف دھکیل دیتی ہے وہ بھول جاتا ہے کہ اندھیرے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے روشنی ضرور ہوتی اور جب روشنی کی کرنیں اپنا نور پھیلاتی ہیں تو ان اندھیروں کے مسافروں کو اپنی قوت کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ”رولوکانے بات ختم کی۔

رولوکانے دوسرے روز ایک آدمی کے ساتھ کھاری گاڑی مریضہ کے دروازے پر تھے وہ آدمی اندر چلا تو رولوکانے گہری نظروں سے مکان کا اور اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر ہم مکان کے اندر چلے گئے۔ اندر زیادہ لوگ نہیں تھے ان دو عورتوں کے علاوہ دوسرے تھے۔ ایک تو وہی بہرے مریضہ کے باپ اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی انہوں نے ہم کو بیشک میں بٹھایا اس کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنا تعارف کرایا۔

”میرا نام مرزا شوکت علی ہے میں برکت بھائی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ بھابی نے بتایا تھا کہ آپ لوگ آنے والے ہیں تو میں بھی آ گیا آپ نے مریضہ کو دیکھا ہے اس کو کیا مرض ہے ذرا مجھے بھی بتائیے۔“ شوکت علی نے کہا۔

”میں نے ان کا معائنہ کیا تھا جسمانی طور پر میں نے ان میں کسی بیماری کے آثار نہیں پائے یہ میرے ساتھ میرے دوست حکیم کامل ہیں یہ روحانی علاج بھی کرتے ہیں اس لئے اس جگہ جہاں مریضہ رہتی ہے کو دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہاں پر کیا اثرات ہیں اس لئے یہاں آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا۔ میں ان چیزوں کو نہیں مانتا اپنا ہندہ کرنے کو بہت لوگ یہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں کہہ رہا میں ایک عام سی بات کر رہا ہوں۔“

”میں نے کہا یہ دنیا ہے میرے عزیز لوگ ضرور ایسا کرتے ہیں مگر سب نہیں کرتے۔ ہم یہ کام کسی لالچ یا دولت کمانے کو نہیں کرتے۔ رہی یہ بات کہ آپ اس کو نہیں مانتے تو میرے عزیز آپ کے نہ ماننے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ یہ ہندوستان ہے۔ یہاں پر یہ ہوتا ہے یہاں پر طاقت ور چیز کو پوجا جاتا ہے یہاں شیطان بڑی آسانی سے اپنا کام کرتا ہے کہیں وہ کسی دیوی کے روپ میں سامنے آتا ہے کہیں جادوگر کے روپ میں ملتا ہے کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایک دیوی حسین اور جم کی دیوی کہلاتی ہے۔ دوسری طرف وہی قہر کی دیوی بن جاتی ہے ظلم کرتی اور بد صورتی کا بہروپ بدل لیتی ہے اس پر سائنے کیوں غور نہیں کرتے وہ ہزاروں سال سے سن رہے ہیں دیکھ رہے ہیں مگر خاموش ہیں کون ہے جو ان کی عقل پر پردہ ڈالے ہوئے ان کو اسی قدیم راہ پر چلائے جا رہا ہے۔“ میں نے بات ختم کی تو شوکت مرزا بولے۔

”آپ کی بات سمجھ میں تو آتی ہے۔“

”اگر اب بھی بات صاف نہیں ہوئی تو میں کچھ عرض کروں۔“ رولوکانے کہا۔

”ضرور فرمائیں ایسی علمی باتیں میں پہلی بار سن رہا ہوں۔“ شوکت نے کہا۔

”ایک قوم نے دور جہالت میں کچھ ایسی رسوم کو اپنایا تھا کہ وہ اس وقت کی ضرورت تھی ہزاروں سال اس بات کو گزر گئے ہندوستان میں بیرونی لوگ بھی آ گئے وہ بڑے ہوشیار تھے۔ ان کے پاس ہتھیار اچھے تھے وہ ان کمزور ہندوستانیوں پر حاوی ہو گئے۔ انہوں نے یہاں کے کچے ذہن کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ہر طاقتور چیز سے ڈرتے ہیں اور اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ آنے والے ہوشیار لوگوں نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان رسوم کو اور زیادہ پائیدار بنانے کو ان کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ خود

جواب دیا۔

”آپ جائیں میں قیام کرتا ہوں۔“ رولوکا نے کہا۔

”وہ رات خیریت سے گزر گئی میں نے کوئی رکاوٹ کسی کے آنے میں کھڑی نہیں کی اور مریفہ کو بھی نہیں بتایا کہ اس کا علاج شروع ہو چکا ہے۔ مجھے مریفہ کی نقل و حمل کی خبر رکھنا تھی میں رات دس بجے روپوشی کی حالت میں کمرے سے نکل کر مریفہ کے کمرے کی طرف گیا۔ یہ مکان قدیم طرز کا بنا ہوا تھا زنا نہ حصہ مردانے سے دور تھا۔ مریفہ کا کمرہ آخری سرے پر تھا۔ دروازہ بند تھا میں اندر چلا گیا کیونکہ بند دروازے سے نہیں جانا تھا میرے اندر جانے کے بہت راستے تھے مریفہ جس کا نام روشنی تھا وہ ایک بڑے سے آئینہ کے سامنے بیٹھی تھی اور بالوں میں کٹنگھی کر رہی تھی میں خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کٹنگھی کرنے کے بعد وہ صندوق کی طرف گئی اور کئی جوڑے نکال کر پلنگ پر ڈال دیئے پھر ہر ایک کوالٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی اور پھر اس نے اپنے پہنے ہوئے پکڑے اتارنا شروع کر دیئے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ پھر آئینہ کے سامنے بیٹھی ہے اور چہرے پر تازہ اور نہ جانے کیا کیا لگا رہی ہے نیا لباس اس کے جسم پر بہت جگڑا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور بدن سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ہر مقام پر جس قدر گوشت ہونا چاہئے وہ تھا، نہ کہیں کم نہ کہیں زیادہ اتنا اچھا تناسب بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سیاہ بال گھٹاؤں جیسے تھے جن کا اس نے جوڑا بنایا تھا جوڑے میں سفید موتے کے پھول سجائے تھے۔ اس کی تیاریاں زوروں پر تھیں وہ بھجان انگیز قیامت بنتی جا رہی تھی۔ وہ کسی کے بھی وجود کو خنجر کرنے کی طاقت بنتی جا رہی تھی میں خاموشی سے اس کی ایک ایک ادا دیکھ رہا تھا۔ کچھ مقام اس دوران ایسے بھی آئے کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

پھر اس نے پلنگ پر ایک نئی چادر بچھا لی چادر کا رنگ سرخ تھا اور موتے کے پھول اس پر کھیر دیئے اور ایک

کو چونکہ اس وقت طاقتور تھے سب سے اوپر رکھ لیا یعنی برہمن بن گئے ان کو کوئی کام نہیں دیا گیا۔ یہ صرف مندروں میں آرام کریں اور سب ان کی خدمت کریں ان کا کوئی گناہ نہیں مانا جائے گا۔ ان کو سب کے مال پر حق حاصل ہو گا ان کا مال کوئی نہیں کھائے گا یہ سب کا کھا لیں گے۔

اس کے بعد دوسرا راجہ کھشتری (راجپوت) ان کو کہہ گیا کہ تم حکومت کرو گے۔

تیسرے نمبر پر ویش کو کہہ دیا یہ کاروبار کریں گے۔ اور آخر میں سب سے مظلوم شہر آتے ہیں۔ یہ لوگ سب کی خدمت کریں گے اور ہر قسم کا ظلم برداشت کریں گے ان کے کوئی حقوق نہیں ہیں ان کا کچھ نہیں ہے اس ذات بات کی تقسیم اس ظالمانہ انداز میں وہی کر سکتا ہے جس کو مقامی لوگوں سے لگاؤ نہ ہو اس نے اپنے عیش کا سامان کر لیا۔ ہزاروں سال سے یہی ہو رہا ہے اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ اس قوم نے علم حاصل کرنے کے بعد بھی صحیح راستہ کا تعین نہیں کیا۔ کسی بھی قوم کے لئے اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا کہ وہ اپنے دور جہالت کی اساسی باتوں کو اب تک قائم کئے ہوئے ہیں۔“ رولوکا نے بات ختم کی۔

”آپ نے بڑی دور کی اور کام کی باتیں کر کے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“ شوکت مرزا نے کہا۔

”میں نے آتے ہی آپ کا مکان اور اس کے اطراف دیکھ لیا ہے یہاں پر کچھ نہیں ہے لیکن یہ ضرور وہ کیا اور کیوں آتا ہے اس کا پتہ چلانا لازمی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”اگر یہ کسی مخصوص وقت کی بات ہوتی تو آپ کو اس وقت بلایا جاتا مگر دورہ کسی دن اور کس وقت پڑتا ہے اس کا تو کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔“ شوکت مرزا نے کہا۔

”اس کا ایک طریقہ ہے اگر آپ لوگ مان سکیں۔ یہ میرے دوست حکیم کمال کو ایک کمرہ دے دیں یہ اس میں رہیں۔ دو دن چار دن دورہ کے دوران ان کا ہونا بہت ضروری ہے اور علاج بھی دورہ کے کدھان ہی ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ شوکت مرزا نے

بڑے سے بڑے کنبہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اب وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت شخص کمرے میں آ گیا اس کی جج جج بھی خوب بھی مردانہ حسن کا وہ شاہکار تھا اس کا سینہ چوڑا تھا۔ دونوں کی خوب جوڑی تھی۔

میں نے سوچا میں ان کی خلوت میں رہوں کہ نہیں مگر فوراً ہی میں نے یہ خیال اپنے دماغ سے جھٹک دیا کیونکہ میں تو علاج کی غرض سے موجود تھا۔ روشنی نے آگے بڑھ کر آنے والے کا دلہانہ استقبال کیا چہرے پر بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی۔ آنے والا بھی مسکرا رہا تھا۔ دونوں ہلکے پر بیٹھ گئے۔ ”مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔“ آنے والے نے اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

”نہیں مکاشی تم ٹھیک اپنے وقت پر آئے ہو تم ہمیشہ مجھ سے پہلی پوچھتے ہو۔“ روشنی نے کہا۔

”میں تمہاری ناراضگی سے ڈرتا ہوں۔“ مکاشی نے کہا۔

”میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوتی۔“ روشنی نے کہا۔
”عورت کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب اور کس بات پر ناراض ہو جائے۔“ مکاشی نے کہا۔

”محبت جس کا مان ہو وہ اپنے محبوب سے کبھی ناراض نہیں ہوتی وہ تو محبوب کی محکوم رہ کر ہی خوش ہوتی ہے۔ میں تو تمہاری ناراضگی سے ڈرتی ہوں اور اس سے زیادہ مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے تم کتنا لمبا سفر کر کے میرے پاس آتے ہو۔ یہ تمہاری محبت ہی تو ہے۔“ روشنی نے کہا۔

”میں نے بھی یہ نہیں سوچا تم کیوں سوچتی ہو؟“ مکاشی نے کہا۔

”مجھے احساس ہے کہ کبھی کبھی مجھے تم سے بچھڑنے کا ڈر لگتا ہے۔“ مکاشی نے کوئی جواب نہیں دیا ہونٹوں پر ہلکی رکھ کر روشنی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا چند منٹ کے بعد روشنی نے پوچھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو۔“ مکاشی نے جواب دیا۔ ”مجھے

ایسا لگا جیسے اس کمرے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی ہے آج تمہائی بول رہی ہے۔ کچھ کچھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیوں نہیں دیکھ پا رہا۔“

”تمہارا دم ہے میں نے شام سے دروازہ بند کر لیا تھا آئے گا کوئی کیسے۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”کچھ آنے والوں کو دروازے کی ضرورت نہیں ہوتی کیا میں تمہارے پاس دروازے سے آتا رہا ہوں۔“

”ہاں میں ایک بات بتانا بھول گئی، اماں مجھے علاج کے لئے حکیم کے پاس لے کر گئی تھیں۔“ روشنی نے کہا۔

”علاج کس چیز کا علاج۔“ مکاشی نے پوچھا۔

”اسی ڈرامہ کا جو میں ایک دو تین ہفتہ میں کرتی ہوں۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”اب نہ کرو، وہ نہیں لے کر جائیں گی۔“ مکاشی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہوگئی تو آگرہ سے حیدر علی لینے آجائے گا۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ حیدر علی کا کاغذ نکالے دیتا ہوں مگر تم نے منع کر دیا۔ اب حکم کرو ڈال آتا ہوں کسی پہاڑ کی چوٹی پر۔“ مکاشی نے پوچھا۔

”نہیں کسی کی جان لینا ٹھیک نہیں، میں تو تمہاری ہوں وہ ہمارا کیا لگاڑ سکتا ہے اور رہے حکیم صاحب تو بیماری ہوگی تو اس کا علاج کریں گے دورے تو پڑتے ہی رہیں گے اور حکیم صاحب مرض پکڑتے رہیں گے۔“ وہ زور سے فٹس کر بولی۔

”تو پھر کرتی رہو ڈرامے۔“ مکاشی نے کہا۔

”تم کتنا ترپانے کے بعد آتے ہو روز نہیں آ سکتے۔“ روشنی نے پوچھا۔

”تم میری مجبوریوں کو جانتی ہو پھر بھی یہ کہتی ہو۔“ مکاشی نے جواب دیا۔

”میں کیا کروں، میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ رات گزرے گی اور میرا انتظار شروع ہو جائے گا۔“ روشنی نے کہا۔

نے کہا۔

شوکت نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔
”کیا واقعی آپ درست فرما رہے ہیں۔“
”مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔“ اس

نے کہا۔

”میری عقل تسلیم نہیں کر رہی۔ اگر روشنی کنواری
ہوتی اور یہ حالات ہوتے تو ہم کوئی مطلب نکال سکتے تھے مگر
روشنی تو ایک شادی شدہ عورت ہے اس کو دوروں کا مکر کرنے
کی ضرورت کیا پڑ گئی۔“

”میں ابھی اس مقام پر نہیں ہوں کہ آپ کو اس کی
تفصیل بتا سکوں۔ مگر بہت جلد آپ کو میں بتاؤں گا۔“ میں
نے کہا۔

”کچھ تو فرمائیے میرے دماغ میں تو ایک بالچل پیدا
کر دی ہے آپ نے۔“ شوکت نے کہا۔

”خند نہ کریں..... جب وقت آئے گا تو میں ضرور
بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں خند نہیں کرتا۔“ شوکت نے کہا۔

”اب ذرا روشنی کو بلائیے۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“
شوکت مرزا چلے گئے واپس آئے تو ان کے ساتھ
نہایت سادہ لباس میں نظریں جھکا کر روشنی آ گئی۔ میں نے

اس کے سر اپنے کا گہری نظر سے جائزہ لیا مجھے وہ رات والی
روشنی کہیں سے نظر نہیں آتی پھر میں نے شوکت مرزا کو کہا۔

”آپ ذرا دور چلے جائیں میں کچھ باتیں تنہائی میں کرنا
چاہتا ہوں۔“ شوکت اٹھ کر دالان میں چلا گیا تو میں نے
روشنی کو کہا۔

”دنیا میں کم لوگ ہیں جو پورے پورے ایماندار اور
سچے ہیں۔ کوئی کسی مصلحت کے تحت جھوٹ بولتا ہے کوئی اپنی

عادت سے مجبور ہوتا ہے ہر جھوٹا انسان بے وقوف ہوتا ہے
کیونکہ وہ جھوٹا ہے کہ میں جھوٹ بول کر کامیاب ہوں مگر ایسا
نہیں ہوتا اس کا جھوٹ کبھی نہ کبھی پکڑا ہی جاتا ہے۔ اس
وقت بچاؤ کے راستے بند ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہی
جھوٹ کے جال میں پھنس چکا ہوتا ہے۔ اس لئے داناؤں کا

”یہی زندگی کی چاشنی ہے، یہ انتظار ہی تو محبت
بڑھاتا ہے۔“ مکاشی نے کہا۔

اور دونوں پلیگ پر لیٹ گئے اب میرا دہاں رہنا
مناسب نہیں تھا۔ میں آپ کے پاس چلا آیا۔“ رولو کا نے
پوری روداد بیان کر دی۔

”اس کا مطلب ہے میرا خیال درست تھا۔“ میں
نے کہا۔

”کون سا خیال۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”یہی کہ روشنی کو کوئی دورہ پڑنے کی بیماری نہیں ہے
وہ صرف دورے کا ڈرامہ کرتی ہے کیوں کرتی ہے اس کا کچھ
اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اب مجھے آنے والے کے بارے میں پتہ چلنا
ہے کہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ کام بھی بڑی ہوشیاری سے کرنا
ہوگا کیونکہ اس کے ایک جملے نے مجھے ہوشیار کر دیا ہے۔“
رولو کا نے کہا۔

”کون سا جملہ تم نے سن لیا کہ تم چوکنہا ہو گئے۔“ میں
نے کہا۔

اس نے روشنی سے کہا تھا۔ ”تنہائی بول رہی ہے۔ میری
موجودگی کا اس کو کچھ نہ کچھ احساس ضرور ہوا تھا اس کا مطلب یہ
ہوا کہ وہ کچھ نہ کچھ علم رکھتا ضرور ہے۔“ رولو کا نے بتایا۔

”تو پھر کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔
”رہنا تو مجھے روپوشی میں ہی ہے مگر کچھ پردہ دیز کرنا
ہوگا۔“ رولو کا نے کہا۔

”اب اس کے آنے کا کیا پروگرام ہے تم کو کچھ پتہ
ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں پتہ چلاؤں گا۔ اچھا میں جا رہا ہوں پھر آؤں
گا۔“ اور رولو کا چلا گیا۔



”یہ تو مجھے پتہ تھا کہ مکاشی روز نہیں آتا۔ ناشتہ پر
میں نے شوکت مرزا سے کہا۔“ ایک مسئلہ حل ہو گیا۔“

”اچھا کون سا مسئلہ حل ہو گیا۔“ شوکت نے پوچھا۔
”دورے لگتی ہیں روشنی کو کوئی بیماری نہیں ہے۔“ میں

آ کر بیٹھ گئے رات میں پیدل پندرہ میل سفر کرنا خطرناک تھا۔“

رات جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ماحول کی خوفناکی بڑھتی گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ میرا ڈر کے مارے برا حال تھا اور میرے شوہر کا حال بھی مجھ سے زیادہ خراب تھا۔ مگر نہ جانے حیدر کو نیند کیوں زیادہ آ رہی تھی۔ میری تو ڈر کے مارے نیند اڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا کبھی کبھی جھینگروں کے بولنے کی آواز البتہ آ جاتی تھی مگر ماحول کی وحشت ناکی کو کم نہیں کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ جھجھوڑ کر حیدر کو اٹھایا۔ وہ ہر بار آہستہ سے کہتا، پتہ نہیں مجھے کیوں نیند آ رہی ہے اور پھر گردن ڈال دیتا۔

اور پھر وہ بے خبر سو گیا۔ میں ڈری سگری اس کے قریب بیٹھی رہی۔ تھوڑی سی دیر میں ایک سایہ آتا نظر آیا۔ میری حالت اور خراب ہونے لگی۔ وہ سایہ میرے قریب آ گیا وہ ایک حسین اور قد آور مرد تھا اس کے آنے سے ایک عجیب طرح کی خوشبو اس جگہ پھیل گئی اور اس خوشبو کی وجہ سے ایسا لگا کہ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں۔

”ڈرو نہیں میں تم کو یا تمہارے آدمی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

میں خاموش رہی تو پھر اس نے کہا۔ ”تم ایک حسین عورت ہو۔ میں حسن کا دیوانہ ہوں تم جیسی عورت کے ساتھ یہ مردا چھانیں لگتا۔ تم نے اس سے شادی کیوں کر لی؟“ میں پھر بھی خاموش رہی تو وہ بولا۔

”کیا تم کو یہ مرد پسند ہے؟“ میری زبان میرے ذہن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی؟ میں نے جواب نہیں دیا۔ ”میری بات کا جواب دو اگر جواب نہیں دو گی تو تمہارے اس بزدل مرد کو اٹھا کر میں کسی کنوئیں میں ڈال دوں گا۔“ وہ ناراضگی سے بولا۔

اب میرا بولنا ضروری تھا میں نے کہا۔ ”میری پسندنا پسند کس نے پوچھی تھی۔ ماں باپ نے دیکھا تھا اور پسند کیا اور شادی کر دی تھی۔ ہمارے خاندان میں لڑکی کی نہیں چلتی۔“ تم کو یہ پسند آ گیا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

کہنا ہے کہ بنیاد سچ پر رکھی جائے جھوٹ پر رکھی گئی بنیاد کمزور ہوتی ہے کیونکہ ابتدائی جھوٹ کو ثابت کرنے کے لئے اور بھی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔“

میں جب تک بولتا رہا روشنی کی نگاہیں زمین پر ہی رہیں۔ میں نے پھر کہا۔ ”اتنی لمبی تمہید میں نے اپنی بات کہنے سے پہلے اس لئے باندھی ہے کہ میں تم سے امید کروں کہ تم میرے سوالات کے جواب اس تمہید کی روشنی میں دو۔“ اس نے گردن ہلا کر اقرار کر لیا تو میں نے کہا۔ ”تم نے دو دروں کا ڈرامہ کیوں کھیلنا اور کب سے دورے تم پر پڑے۔“

چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھ کو دیکھا۔ میری لمبی تمہید سے وہ کچھ متاثر نظر آئی مگر زبان اس نے نہیں کھولی۔

”آنکھوں کی زبان کو سمجھنا بہت مشکل ہے تم اپنا ماضی الضمیر زبان سے ادا کرو۔“ میں نے کہا۔

”آپ کا اندازہ درست ہے میرے دورے اصلی نہیں ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ان دوروں کی ضرورت کیوں پڑ گئی اور کب سے پڑی۔“ میں نے پوچھا۔

”میں شادی کے بعد آگرہ حیدر کے پاس چلی گئی تھی۔ آگرہ میں میلے بہت لگتے ہیں میں بھی حیدر کے ساتھ ایک میلے میں چلی گئی۔ یہ میلا شہر سے دور سکندرہ کے مقام پر لگتا ہے اس مقام پر مثل بادشاہوں کے پرانے کھنڈرات بہت ہیں۔ سارا دن ہم میلا دیکھتے رہے رات ہو گئی ہم نے خیال نہیں کیا۔ شہر کے سارے تانگے چلے گئے۔ اس دیران جگہ جموے والے اور کچھ کاندرا رہ گئے۔

وہ بھی اپنا اپنا سامان بیل گاڑیوں میں لادنے لگے۔ تو میرے شوہر نے ایک بیل گاڑی والے کو کہا کہ وہ ہمیں کسی آباد مقام پر پہنچا دے مگر ان کا سامان بہت تھا کوئی راضی نہیں ہوا۔ آخر سب چلے گئے اپنے ساتھ گیس پتیاں بھی لے گئے اب ہر طرف ہوا کا عالم تھا اور گھپ اندھرا تھا۔ ہم نے ایک آدمی گری ہوئی باؤلی کا انتخاب کیا اور اس میں

”بس وقت کی گاڑی کھینچی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”اب کچھ فرق پتہ چلا۔“ وہ بولا۔
 ”نہیں میں وفا کی شمع ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد پھر مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ میرا دل دماغ اور ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو دل و دماغ اس کا ہو چکا تھا لاکھ کوشش کے باوجود میرا ذہن میرے بس میں نہیں تھا۔ اب مجھے حیدر علی ایک پھیکا پکوان نظر آتا تھا جاتے جاتے وہ بول گیا میں رات کا شہزادہ ہوں صرف اور صرف رات میں ہی ہمارا ملن ممکن ہے۔

اور پھر مجھے سرال میں پہلا دورہ پڑا حیدر علی ڈر گیا اور مجھے میکے میں چھوڑ گیا۔ وہ ایک دو دفعہ مجھے کسی سیانے کے پاس بھی لے کر گیا تھا۔ اس کو بتایا گیا کہ اس پر بہت زبردست سایہ ہے تم زندگی چاہتے ہو تو اس سے دور رہو اور وہ ایک کمزور آدمی تھا مجھے فوراً آکرہ سے دلی چھوڑ گیا اور میں دلی میں اپنے ماں باپ کے پاس رتی ہوں۔ وقفہ وقفہ سے دوروں کا ڈرامہ اس لئے کرتی ہوں کہ حیدر علی لینے نہ آئے کیوں کہ مجھے اب فرق کا پتہ ہو گیا ہے۔ وہ ایک بھڑپور مرد ہے اور مجھے وہ بہت پسند بھی ہے۔“

”تم کو پتہ ہے کہ وہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں پتہ ہے۔ مگر وہ مجھے چاہتا ہے۔ وہ میری خاطر آگرہ سے آتا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی وہ مجھے وہ خوشیاں دیتا ہے جو حیدر علی نے کبھی مجھے نہیں دیں۔“
 ”مگر تمہارا اور اس کا ساتھ نہیں ہو سکا وہ انسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس تو وہ انسان بن کر ہی آتا ہے۔ مجھے اس کا اتنا نواں والا روپ اچھا لگتا ہے۔ آپ میری مدد کریں حکیم صاحب میری جان حیدر علی سے چھڑا دیں۔“ روشنی نے کہا۔
 محبت اندھی ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ عورت تھی۔
 میں اس کی جان ایک غیر انسان سے چھڑانا چاہتا تھا اور وہ اپنی جان ایک انسان سے چھڑانا چاہتی تھی۔“ تم نے مکاش

کا اصل روپ دیکھا ہے۔“
 میں نے پوچھا۔ تو وہ بولی۔
 ”میں نے آپ کو اس کا نام نہیں بتایا تھا آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ اس کا نام مکاش ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”مجھے اس سے بھی زیادہ بہت کچھ پتہ ہے۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔“

”میں نے صرف ایک روپ دیکھا ہے اور وہ بہت حسین ہے۔“ روشنی نے کہا۔
 ”تم نے زندگی کے بہت سے روپ نہیں دیکھے ہر حسین چیز حسین نہیں ہوتی انسانی نظر صرف ظاہری چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ کچھ چیزیں ظاہری نظروں سے نظر نہیں آتیں ان کو دیکھنے کے لئے اندر کی آنکھ استعمال کرنی پڑتی ہے اور پھر کوئی اس آنکھ کا استعمال نہیں چاہتا۔ تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو۔ میں تم کو اس وقت قائل نہیں کر سکوں گا کیونکہ تمہارے انگ انگ میں اس کی محبت بھری ہوئی ہے اور تمہارا خاکی بدن اس چاشنی کی لذت کا عادی ہو گیا ہے۔ یہ نشہ آسانی سے اترنے والا نہیں ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے میں اس کا اصلی روپ تم کو ضرور دکھاؤں گا اور پھر تم سے پوچھوں گا۔“ میں نے بات ختم کی تو وہ بولی۔
 ”میں مکاشی سے محبت کرتی ہوں اس کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

”یہ فیصلہ ابھی مت کرو۔ وقت آنے پر میں خود تم سے پوچھوں گا۔“

میں آگرہ اس مقام پر جہاں میلہ لگتا تھا چلا گیا۔ یہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ یہاں سے قریب ہی اکبر بادشاہ کا مزار ہے۔ اس کے مزار کی چار دیواری سے لگی ہوئی شرق کی طرف ایک آبادی ہے۔ اس کا نام بائیں پور ہے۔ یہ شہزادہ سوری روڈ پر واقع ہے اس آبادی یا گاؤں سے اور آگے چلیں تو کھیت ہیں اور جگہ جگہ پرانی باڈیاں اور بارہ دریاں نظر آتی ہیں جو کہ کچھ گرچی ہیں اور کچھ کھڑی ہیں۔ اب یہ سب کھیتوں کے درمیان ہیں۔ یہیں ہر سال میلہ لگتا ہے قریب اور دور کے گاؤں کے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں تین

دن کا یہ میلہ ہوتا ہے تین دن کے بعد یہاں کوئی نہیں ٹھہرتا۔ آگرہ شہر میں شاہی عمارتوں کے کھنڈرات آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ کو دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ یہاں اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ جگہ جگہ گرے ہوئے گنبد اور بارہ دریاں دلی تک نظر آتی ہیں۔ میں دن میں سندرہ گیا تھا۔ وہاں تک شہر سے تانگے ملتے ہیں مگر اس سے آگے جنوب کی طرف پیدل چلنا پڑتا ہے۔ تین روڑے آدے سفر لانگ پر بائیں پور کی آبادی ہے مگر جہاں پر میلہ لگتا ہے وہ جگہ خاصی دور ہے۔ مجھے اس مقام کی تلاش تھی جہاں پر روشنی اور حیدر نے رات گزاری تھی۔ میں ہر کھنڈرات میں گیا مگر ان میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ دور ایک باؤلی اور بارہ دری نظر آ رہی تھی میں اس طرف چلا گیا۔ یہ بارہ دری کچھ اچھی حالت میں تھی میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ جگہ صاف ستھری تھی کسی قسم کی گندگی یہاں پر نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ رات اسی بارہ دری میں گزاروں گا۔ میں اب بھی روپوشی کی حالت میں تھا اور اس میں بھی سخت احتیاطی تدبیر کر رہی تھی۔ اب رات ہونے کو تھی کسان اپنے اپنے کام ختم کر کے گھروں کی طرف چل دیئے تھے۔ پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کر رہے تھے اور میں بارہ دری میں بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

شام ختم ہوئی۔ رات نے اپنے پر پھیلانے رات آتے ہی آسمان پر زور کی بجلی چمکی اور بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز آئی اور اچانک تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی بارہ دری بھی روشن ہوگئی اور لوگ آنے لگے۔ پہلے تین مرد آئے۔ وہ اپنے ساتھ دریاں اور چاندنی لائے تھے۔ انہوں نے قاعدے سے ان کو فرش پر بچھا دیا اور چلے گئے ان کے جانے کے چند منٹ کے بعد جو آئے وہ کچھ اور سامان لے آئے اور اس کو بھی چاندنی پر سجا کر چلے گئے۔ ایک بڑا سنا گاؤ نکلیے بھی رکھ دیا اب مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد پوری بارہ دری گہم گہم کی چالیس پچاس مہمان آگئے مگر گاؤ نکلیے پر کوئی نہیں تھا۔ وہ سب آپس میں مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مگر آواز بہت دھیمی تھی جیسے پاس ادب ان کو تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک سفید

ریش بزرگ آگئے تمام حاضرین مجلس ان کے ادب میں کھڑے ہو گئے اور جب وہ بیٹھ گئے تو سب لوگ اپنی اپنی جگہ ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی ایک آئندہ ان جس میں آگ جل رہی تھی ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس سفید ریش نے اپنے دونوں ہاتھ اس آگ میں داخل کر دیئے۔ سب لوگ خاموشی سے یہ سب دیکھتے رہے کوئی پانچ منٹ کے بعد انہوں نے ہاتھ آگ سے باہر نکالے مگر ان کے ہاتھ کا کچھ نہ بگڑا ایک رواں تک نہیں جلا۔ سب نے با آواز بلند ان کو مبارکباد دی جب سب خاموش ہو گئے تو وہ بولے۔

”میرے عزیز تو نے دیکھا میں ہر محفل میں آگ کی پوجا کرتا ہوں یہ آگ میرا کچھ نہیں بگاڑتی اس لئے کہ میں خود آگ سے پیدا ہوں اور تم سب بھی آتش ہو تمہارا بھی آگ کچھ نہیں بگاڑے گی۔ مگر کچھ ہمارے ساتھی خاکی انسان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں کہ وہ آتش ہیں۔ ان لوگوں نے خاکی انسانوں سے اپنا میل ملاپ زیادہ کر لیا ہے۔ ہم عظمت اور جبروت والے ہیں۔ ہمارے پاس لامحدود طاقت ہے حضرت انسان ہمارے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے ہم میں کیا کمی ہے ہم ہر جگہ ہر روپ میں جاتے ہیں انسان ایسا نہیں کر سکتا پھر بھلا وہ ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ پھر ان سے متاثر ہونے کا کیا مطلب ہے۔ اگر مجھے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ انسانوں سے ملتا ہے یا ان سے کوئی تعلق رکھتا ہے تو میں اس کو سخت سزا دوں گا۔“ اس کے بعد وہ اپنی کچھ مناجات پڑھتے رہے اور آخر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ میں ایک کونے میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ سب دیکھتا رہا۔ ان تمام لوگوں میں مکاشی کون سا تھا مجھے پتہ نہیں تھا کیونکہ مکاشی کا جو روپ میں نے دیکھا تھا وہ اس کا اصلی روپ نہیں تھا۔

اب مجھے مکاشی کا ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔ اگر بات انسانوں کی ہوتی تو کسی سے بھی اس کا پتہ کیا جاسکتا تھا مگر یہ سب تو رات کے راہی تھے میں ان سے پوچھتا تو دس سوال اور اٹھ کھڑے ہوتے مگر میں خوش تھا کیونکہ مجھے پہلی کامیابی

چکر چل پڑا ہے۔

اور میں نے اس کا بچھا چھوڑ دیا اور پاؤں میں آگیا۔
اب پاؤں میں دریاں بچھائی جا رہی تھیں۔ چاندنیاں ایک
طرف پڑی تھیں۔ دریوں کے بعد وہ چاندنی بچھانے لگے مگر
یہ کیا سفید براق چاندنیوں کے درمیان بڑے بد نما داغ پڑے
تھے اور ان میں سے سخت بد بو اٹھ رہی تھی۔ ایک بولا۔

”کشموق کیا تو اندھا ہو گیا ہے یہ اتنی گندی
چاندنیاں کہاں سے اٹھا لایا۔ ان کو بچھا کر کیا اپنی موت کو
دعوت دے گا۔“

کشموق جو اس کا دوسرا ساتھی تھا اس نے حیرت
سے داغوں کو دیکھا اور بولا۔ ”میں دیکھ بھال کے لایا تھا صاف
صاف تھیں یہ داغ کیسے لگ گئے اور ان میں سے تو بد بو بھی
آ رہی ہے۔“

”کواس نہ کر تیری شکایت کرنا ہی پڑے گی۔ تیرا
دھیان کام میں لگنا نہیں ہے۔“ دوسرا بولا۔

کشموق نے ڈر کر کہا۔ ”تم یقیناً کروشموق میں دیکھ
کر لایا تھا میری تو عقل کا نام نہیں کر رہی۔ دوڑ کر دوسری لے
آتا ہوں۔“

”ہاں اور کیا کرے گا جلدی کر۔“ کشموق نے کہا اور
کشموق دوسری چاندنیاں لینے دوڑ گیا اور کشموق ایک طرف
پہنچ گیا۔ چند منٹ کے بعد کشموق چاندنیاں لے کر آ گیا مگر
یہ کیا ساری دریاں جو وہ بچھا کر گیا تھا تہہ کی ہوئی ایک طرف
رکھی تھیں اور کشموق بیٹھا تھا وہ حیرت سے بولا۔

”دریاں کیوں اٹھا دیں پھر بچھانا پڑیں گی۔“ کشموق
نے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

”دریاں میں نے تو نہیں اٹھائیں میں کیوں
اٹھاؤں گا؟“

کشموق نے کہا۔ ”اب جلدی کر وقت کم رہ گیا
ہے۔“ دریاں پھر بچھا دی گئیں ان پر چاندنیاں بھی ڈال دی
گئیں یہ چاندنیاں صاف تھیں۔ وہ دونوں اپنا کام ختم کر کے
چل گئے۔

ان کے جانے کے بعد دوسرے کام والے آ گئے مگر

مل گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ میں ان کے درمیان رہا اور ان میں
سے کسی کو شبہ تک نہیں ہوا۔ مکاشی کے ایک جملے نے میرا
بہت کام کر دیا تھا۔ مجھے دیکھے جانے کا ڈر صرف ان کے
بڑے کی طرف سے تھا۔ اب میرا دوسرا قدم اور زیادہ منظم
طریقہ پر اٹھے گا میرے اعتماد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے یہ
پتہ چل گیا تھا کہ جنات کا یہ قبیلہ کس مذہب سے تعلق
رکھتا ہے یہ آگ کی پوجا کرتے ہیں جنات آگ سے ہی
پیدا کئے گئے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ آگ ان کو جلاتی نہیں
نمرکی نہ کسی حد تک یہ آگ سے محفوظ ضرور رہتے ہوں
گے۔ ان لوگوں میں بت پرست بھی ہیں اور مسلمان بھی، جو
لوگ خدائے لاشریک کو ماننے ہیں ان پر کنٹرول حاصل کرنا
قدرے مشکل ہوتا ہے۔ وہ مقدس آیات پڑھتے ہیں اور
عبادت بھی کرتے ہیں وہ کسی کو بلا وجہ جنگ نہیں کرتے۔ جس
طرح انسان میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں اسی طرح
ان میں بھی ہیں۔

میں دوسری رات پھر پاؤں میں موجود تھا۔ دس بجے
رات دو صفائی والے آ گئے۔ ان کے جانے کے بعد پانی کی
مشک ایک بھتی لے کر آ گیا۔ اس نے ہر جگہ ہلکا ہلکا پانی
چھڑک دیا اور جانے لگا وہ پاؤں سے نکل رہا تھا کہ میں نے
اس کی مشک پکڑ لی اور ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اور مشک میں
سے ہوا بھرتا گیا مشک آہستہ آہستہ پھولنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں
اسے احساس ہو گیا کہ مشک پھول رہی ہے اس نے حیرانی
سے پھولتی مشک کو دیکھا اور بولا۔

”کون بد معاش ہے۔ کیوں کیا مشک پھاڑے گا۔“
مگر میں ہوا بھرتا گیا۔

وہ گھبراہٹ میں بولا۔ ”کون ہے سامنے تو آ۔“
اس نے کاندھے پر سے مشک اتار دی اور ایک
طرف کو بھاگا۔ مگر مشک نے اس کی جان نہ چھوڑی وہ بھی
ساتھ ساتھ اس کے کاندھے پر لگی رہی اور پھر مشک بھاری
ہونا شروع ہو گئی اور اس کے دہانے سے پانی گرنے لگا اب تو
بہشتی بانپ کر کھڑا ہو گیا۔ اور خود سے بولا۔
”پانی کیسے بھر گیا، میں نے تو خالی کر لی تھی آج یہ کیا

نہیں دیکھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہم سب کے اوپر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔“

اب میرے بولنے کی ضرورت تھی۔ میری آواز ان کے کانوں میں پہنچی۔ ”تم لوگ خبردار ہو جاؤ۔ آج سب انہونی ہوگی۔ اس لئے تم میں ایک ایسا ہے جو وہ کر رہا ہے جس کو تم بھی پسند نہیں کرو گے مگر اس کے گناہ کے بدلے تم سب سزاوار محترمہ آئے جاؤ گے اور سب کو سزا ملے گی۔“ میں خاموش ہو گیا یہ دیکھنے کو کہ ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔

سردار نے اور ان داڑھی والوں نے چاروں طرف دیکھا کچھ بڑھا کچھ دیر سو گھا مگر ان کو کچھ پتہ نہیں چلا تو سردار نے کہا۔

”تم کون ہو مہربان۔ تم نے ہمیں آگاہی دی ہم تمہارے احسان مند ہیں۔“

”تم میں سے ایک ہے اس کا نام مکاشی ہے اس نے آدم زاد کی ایک عورت سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ وہ عورت دلی میں رہتی ہے اور مسلمان ہے۔“ میں نے کہا۔ سردار یہ سن کر غصے سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”مکاشی سامنے آؤ اور جواب دو۔“

اس محفل کی آخری قطار سے ایک اٹھا اور سردار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ نہایت بدہیت اور عمر رسیدہ جن تھا۔ ”سردار نے اس کو فترت اور غصے سے دیکھا اور کہا۔“ تم نے وہ شبی آواز سنئی۔ بتاؤ کیا یہ سچ ہے؟“

وہ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ سردار اور تمام محفل اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر مکاشی خاموش تھا۔ سردار پھر بولا۔ ”تیری خاموشی تجھے گناہ گار ثابت کرتی ہے۔ تجھے پتہ ہے میں تجھے کتنی عبرت ناک سزا دینے والا ہوں۔“

مکاشی نے نظریں اٹھائیں اس کا چہرہ جو پہلے ہی بد نما تھا اور زیادہ بگڑ گیا۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔..... ”میں سردار۔ میں گناہ گار ہوں۔ میں کیا کرتا میری عمر کے میرے ساتھی درجنوں بچوں کے باپ ہیں مگر میری شادی صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ مجھے کسی نے پسند نہیں کیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ صورت کے علاوہ تمام اوصاف تو مجھ میں ہیں

میں نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ آج کی محفل ان کی خالص مذہبی محفل تھی۔ دو تین لمبی لمبی داڑھیوں والے آخر میں آئے اور سب سے آخر میں ان کا سردار آیا۔ میں نے پردہ اور دیکھ کر لیا۔

ایک داڑھی والے نے فضا میں سو گھا کر کہا آج کچھ نئی خوشبو آ رہی ہے کوئی غیر بھی آیا ہے کیا؟“ سردار نے یہ سن کر کہا۔ ”یہ میرا علاقہ ہے یہاں ہر طرف میرے پیرے پیرے ہیں یہاں کون آئے گا۔“

”مجھے ایسا لگتا تھا اس لئے پوچھا۔“ وہ پھر بولا۔ ”یہ علاقہ ہمارا ہے آگ کے پجاریوں کا کسی اور قوم کا جن تک یہاں آنے کی جرات نہیں کرتا۔“ سردار نے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے کام شروع کرو۔“ سردار نے اشارہ کیا۔ ایک بڑا آتش دان درمیان میں آگیا اس میں بہت تیز آگ روشن تھی ایک داڑھی والے نے اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال دیئے۔ مگر یہ کیا ہوا اس کے ہاتھ آتش دان میں جاتے ہی آگ ایک دم بجھ گئی۔ سردار اور سب حاضرین مجلس اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہائے ہائے کرنے لگے۔

سردار نے گلہ بھڑا کر کہا۔ ”یہ تو نے کیا کیا؟ بد شگونی کر دی بوڑھے ہم سب کو عذاب میں ڈال دیا۔“ وہ داڑھی والا جس نے ہاتھ آگ میں ڈالے تھے بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا ہے سردار۔ میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہے مجھے خود یقین نہیں آ رہا کہ آتش رب کیوں ناراض ہو گیا ہے؟“

”تو نے کوئی ایسا کام ضرور کیا ہے۔“ سردار نے کہا۔ ”میں آتش رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ آتش دان پھر اسی تیز ہی سے جل اٹھا۔ سردار نے اور سب نے حیرت سے اس کو دیکھا اور سب کے چہروں پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب کے دوسرا داڑھی والا آگے بڑھا اس نے آتش دان میں ہاتھ ڈال دیئے۔ مگر یہ کیا اس نے فوراً ہاتھ باہر نکال لئے سب کی چیخیں نکل گئیں۔ سردار نے غصے سے کہا۔ ”یہ تم آج کیا تماشا کر رہے ہو ایسی بد شگونی میں نے زندگی میں

نکالا اور اب مہر نہ صرف سرخ تھی بلکہ اس پر چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ سردار نے ایک داڑھی والے کو اشارہ کیا وہ فوراً سردار کے قریب آ گیا۔ سردار نے کہا تم سب گواہ رہنا کہ میں نے اس کے گناہ کی سزا دی ہے اور وہ چنگاریاں اڑاتی مہر مکاشی کی بیٹھ پر چیکادی کچھ دھواں سا اٹھا۔ مکاشی کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آئے مگر وہ کھڑا ہا میں نے سوچا اگر یہ کسی انسان کو لگائی جاتی تو وہ مارے تکلیف کے ضرور بے ہوش ہو جاتا۔ مگر مکاشی بے ہوش نہیں ہوا۔ سردار نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

”میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میرے قبیلے کو معاف کر دے اے دنیا کو روشنی اور حرارت دینے والے۔ ہم تیرے غلام ہیں تو جب چاہے آزمائے ہم تیرے ہیں۔ آج سے مکاشی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“ اور پھر اس نے اشارہ کیا کہ مکاشی کو باہر نکال دو۔

میری آواز پھر ابھری۔ ”تم سب کو معافی مل گئی۔“ اور میں اس باؤلی سے باہر آ گیا۔

مکاشی کے ارد گرد دو پہر سے دار تھے اور وہ سکندرہ کی طرف جا رہے تھے۔ سکندرہ کی حدود آنے پر دونوں واپس چلے گئے اور مکاشی اکیلا کھڑا رہ گیا تو میں اس کے قریب چلا گیا اور کہا۔ ”اب تم دلی روشنی کے پاس جاؤ گے۔“ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا مگر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بولا۔ ”تم کون ہو سانسے تو آؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کون ہوں تم یہ سوال مت کرو۔ میں جو کہ رہا ہوں وہ کرو، نہیں تو مجھے اور طریقے بھی آتے ہیں۔“

”میں روشنی کے پاس اب نہیں جاسکتا۔“ وہ بولا۔

”کیوں نہیں جاسکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جس روپ میں ہوں یہ میرا اصلی روپ ہے۔“

میری پیٹھ پر سردار نے مہر لگا دی ہے اب میں اپنا روپ بدل نہیں سکتا میری ساری طاقت ختم ہو چکی ہے اب صرف جنگلات اور پہاڑوں پر آوارہ گردی میرا نصیب ہے۔“ مکاشی نے بے بسی سے کہا۔

جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پورے قبیلے میں کوئی مادہ مجھ سے رغبت سے پیش نہیں آئی۔ میں نے دوسرے قبیلوں میں جانا شروع کر دیا۔ گردواں پر مجھ میں دو عیب نکل آئے۔ ایک میری صورت دوسرا غیر مذہب۔ کہیں پر میری دال نہیں لگی پھر میں کیا کرتا۔ بے شک جو کچھ یہی آواز نے کہا درست ہے میں اس کی سزا سے بھی واقف ہوں مگر پھر بھی رحم کی درخواست تو کر سکتا ہوں۔“

مکاشی خاموش ہو گیا تو سردار نے کہا۔ ”تو نے دیکھا تیری وجہ سے آج ہزاروں سال سے جلتا ہوا آتش دان بجھ گیا۔ کتنی بڑی بدشگونی ہوئی۔ اس بدشگونی کی سزا پورے قبیلے کو جھیلنا پڑے گی۔ میں تجھے معافی نہیں دے سکتا۔“

”سردار میری مجبوری کو بھی تو دیکھو۔“ مکاشی گڑگڑا کر بولا۔

”تیری مجبوری کی وجہ سے میں پورے قبیلے کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“ سردار نے کہا۔

مکاشی زور زور سے رونے لگا۔ داڑھی والوں اور دوسرے سب نے اس کو کڑی سزا دینے کا اصرار کیا۔ تو میں نے پھر کہا۔

”اس کی کڑی سزا یہ ہے کہ اس کو تم قبیلے سے نکال دو۔ پھر دوبارہ یہ تمہارے قبیلے میں نہ آئے نہ کسی سے تعلق رکھے یا در کوسب کہ اگر یہ کسی سے ملا تو اس پر بھی وہی گناہ لگا ہو جائے گا۔ اس کو نکال باہر کرنے کے بعد ہی تم سب اس عذاب سے بچ سکو گے جو تم پر آنے والا ہے اس کام کو جتنی جلدی کرو گے اتنا ہی تمہارے قبیلے کے لئے اچھا ہوگا۔“ میں خاموش ہو گیا۔ سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آواز دی۔ ”میری مہر لاؤ۔“

ایک جن دوڑ کر گیا اور ایک تانبے کی مہر لے آیا۔ سردار نے اس کو آتش دان میں رکھ دیا سارے ماخرین عقل دم بخود خاموش بیٹھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں مہر آگ میں سرخ ہو گئی۔ سردار نے اس کی ڈنڈی پکڑ کر باہر نکالا دیکھا اور پھر آگ میں رکھ دیا۔ اب سردار نے اشارے سے مکاشی کو اپنے قریب بلایا۔ اس کی پیٹھ اپنی طرف کی اور پھر مہر کو پھر

”مگر تم کو ایک دفعہ روشنی کے پاس اسی حالت میں جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس نے مجھے ایک حسین مرد کے روپ میں دیکھا ہے اب وہ مجھے اس روپ میں برداشت نہیں کرے گی۔ مجھے معاف کر دو مجھے اس کے پاس جانے پر مجبور نہ کرو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”تمہاری سزا موت بھی ہو سکتی تھی سردار تم کو ضرور موت کی سزا دیتا۔ مگر میں نے تم کو مارنا نہیں چاہا اب تم کو روشنی کے پاس نہ صرف جانا بلکہ اس کو یہ بھی بتانا ہے کہ تم مکاشفی ہو اور یہی تمہارا اصل روپ ہے۔ تم جس مکاشفی سے ملتی رہی ہو وہ نقلی اور بناوٹی مکاشفی تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ سزا موت سے بڑھ کر ہے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”تم بے وقوف ہو تم نے موت کو دیکھا نہیں ہے۔ ابھی تم زندگی کو موت پر ترجیح دو گے۔ یاد رکھو زندگی پھر زندگی ہے۔ ایک آس تو ہے امید تو ہے شاید کوئی ایسا طریقہ مستقبل میں نکل آئے کہ تم پھر سے اپنی دنیا میں واپس جاسکو یا اس سے بھی زیادہ بہتر دنیا تم کو مل جائے ذرا سوچو مرنے کے بعد تم کو کیا ملے گا صرف تمہارے گناہوں کی سزا۔ ایک مہلت تم کو مل رہی ہے اپنے گناہوں کے بوجھ کو کم کر سکتے ہو تو کراؤ۔“ مکاشفی گردن جھکائے میری بات سننا رہا پھر بولا۔

”تمہاری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔“ زندگی پھر زندگی ہے۔“

”تو پھر جاؤ دلی اور اپنی حقیقت روشنی کو بتادو۔“ اور مکاشفی چلا گیا۔ مجھے پتہ تھا اب وہ وہی کرے گا جو اس سے کہا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ کل روشنی کے گھر چلیں گے۔“ رولوکانے رو روٹم کی۔ اور دوسرے دن میں اور رولوکانہاری باؤلی شوکت مرزا کے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ذرا روشنی کو بلوائیں۔“

شوکت مرزا نے کہا۔ ”اس کی طبیعت خراب ہے وہ شاید نہ آسکے۔“

میں نے پوچھا۔ ”ہوا کیا ہے بتائیں تو۔“
”رات کو اس نے کوئی بہت بھیا نک خواب دیکھ لیا ہے۔ بہت خوف زدہ ہے شوکت نے بتایا۔“
”اس کو بلائیں میں اس کو اس کے خواب کی حقیقت بتانے آیا ہوں۔“ رولوکانے کہا۔

کچھ ہی دیر میں روشنی ہمارے سامنے تھی رولوکانے کہا۔ ”تم نے اس کی حقیقت دیکھ لی۔“

روشنی نے گردن جھکا کر کہا۔ ”خوب دیکھ لی۔“
”اب بتاؤ دوبارہ اس کو دیکھنا چاہو گی۔“ رولوکانے پوچھا۔

روشنی نے کانوں پر ہاتھ لگا کر کہا۔ ”ہرگز نہیں۔“
”تو پھر آگرہ حیدر علی کے پاس جانے کی تیاری کرو اور ہاں اب بتاؤ حیدر بہتر ہے کہ مکاشفی۔“

روشنی کے چہرے پر ایک شرمندہ سی مسکراہٹ آگئی اور صرف ایک لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ”حیدر علی۔“

”ہم جس دور میں ہیں اس سے آگے جو دور آنے والا ہے یعنی تم اس کا اندازہ پچاس سے سو سال لگا سکتے ہو اس دور میں ہر بات عملی ہوگی اور مادہ پرستی اس قدر بڑھ جائے گی کہ موجودہ دور کے تصورات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مگر اس کے باوجود اس دور میں بھی وہ لوگ ہوں گے جو کسی کے لئے بھی مصائب کو گلے سے لگائیں گے اور دوسروں کے لئے مٹ جانے کا جذبہ ان کے اندر ہوگا۔ یہ لوگ ہر دور میں رہے ہیں اور ہیں گے کیونکہ رب کائنات کا پیمانہ اور توازن بگڑتا نہیں۔ جہاں انسان بنے لگام ہوتا ہے وہیں پر کوئی نہ کوئی آسمانی آفت آ جاتی ہے۔ یہ ایک سبق بھی ہونی ہے وارننگ بھی ہوتی ہے اگر امکانات پر غور کیا جائے اور اپنے اعمال پر نظر رکھی جائے اور ان حدود کے اندر رہا جائے جو کہ بنیادی گئی ہیں تو انسان ترقی کرتا ہے۔ کوئی ہنر کوئی تعلیم حاصل کرنے پر پابندی نہیں ہے مگر ہندو دائرے کے اندر ہے اس سے باہر جانے والی قومیں ختم ہو گئیں ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”تمہاری باتیں اور فلسفہ ایسا ہے کہ اس کو عام کیا جانا چاہئے۔“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ خاموش خدمت گار جو ہوتے ہیں وہ کبھی منظر پر نہیں آتے۔ کبھی خود کو مشکف نہیں کرتے اور میں تو خود کو کسی تمارقطار میں شامل ہی نہیں سمجھتا آپ سے جو باتیں ہوتی ہیں وہ ہماری ذاتی باتیں ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں بھی تم کو آشکار کرنا نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔
 ”دیکھئے میں بھی آخر انسان ہوں اور کمزوریاں انسانی فطرت کا جزو لازم ہیں۔ کوئی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ میں ان کی بات نہیں کرتا جن کو رب کا نکتہ خامیوں سے مبرا رکھتا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسان رہے صرف انسان۔ انسان ہونا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہوں گی.....“ رولوکا نے کہا۔

”تم جس انداز میں سوچتے ہو وہ بہت اعلیٰ سوچ ہے۔“ میں نے کہا۔ ایک مریض گورکھ پور سے آیا ہے۔ پتہ نہیں میری شہرت گورکھ پور تک کیسے پہنچ گئی۔ میں تو خود کو گمنام سا آدمی سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھائی اور برائی دونوں کے پر ہوتے ہیں وہ اڑتی ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔ ”اس مریض کی کیفیت کیا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”وہ ایک تندرست آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر کسی اور اپنے عزیز کے لئے آیا ہوگا۔“ رولوکا

نے کہا۔

”وہ رات کو مطب کے بعد آئے گا میں نے اس کو وقت دیا ہے۔ پھر آرام سے اس کی بات سنیں گے۔“ میں نے کہا۔

آنے والا ایک گورکھ تھا۔ عام طور پر ان کے قدم ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت، جفاکش اور سختی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں اور بہت سخت زندگی گزارتے ہیں اس لئے جسمانی طور پر یہ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر کہا جاتا ہے ذہنی طور پر یہ اتنے ہوشیار نہیں جتنے کہ جسمانی

طور پر مضبوط ہوتے ہیں ان کا طرز زندگی بھی شہروں سے تو بالکل الگ ہے ہی مگر ہندوستان کے دیہاتوں سے بھی نہیں ملتا۔ اس لئے کہ یہ لوگ ہندوستان کے ہیں ہی نہیں۔ ان کے چہروں کے نقوش جاپانی اور چائنی ہیں۔ یہ لوگ نیپال، بھوٹان اور تبت میں رہتے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ زیادہ تر بڑھشت ہیں مگر ان میں بھی ہندو مسلمان پائے جاتے ہیں۔ گھورکھ پور سرحدی شہر ہے یہ لوگ اپنی ضروریات خریدنے یہاں پر آتے ہیں اور کچھ نے اپنا ٹھکانا بھی میدانی علاقوں میں بنالیا ہے اور آہستہ آہستہ یہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی پیدل آرمی میں ان کی ایک گورکھار جمنٹ بھی ہے اور بہت بہادر اور جمنٹ کہلاتی ہے۔

میں نے آنے والے سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہم رانا گوباشو ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو گوباشو میں نے تم کو دیکھا۔ تم تو ٹھیک ہے پھر تم

ادھر اتنا دور ہمارے پاس کیوں آ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم حکیم کامل کے پاس آیا۔ ہم کو بتاؤ وہ ادھر

ہے۔“ وہ بولا۔

میں نے رولوکا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ حکیم

کامل ہیں۔“

گوباشو اٹھ کر رولوکا کے پاس گیا اور بولا۔ ”آپ کا

ضرورت ہے ہم بہت پریشان ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ میں جو کر سکتا ہوں کروں گا۔“ رولوکا نے

جواب دیا۔

”ہم ادھر گورکھ پور میں رہتا ہے۔ پہلے سرحد سے

دور نیپالی گاؤں میں رہتا تھا۔ پہاڑی گاؤں میں دو چار گھر

ادھر تھا ادھر کچھ نہیں تھا پھر ہم گورکھ پور گیا۔ گاؤں کا تھوڑا

زمین تھا۔ دو چار جانور تھا سب چھین لیا کا ہم کوشش کیا ہم کو

بہت مارا ہمارا ایک لڑکی کو بھی وہ لے گیا۔ گورکھ پور میں بھی ہم

اس کا کچھ نہیں کیا۔“ وہ بولا۔

وہ کون ہے یہ کس نے کیا؟“ رولوکا نے پوچھا۔

”وہ ایک نیپالی ہے۔ بھٹشو ہے مگر ہم بولتا ہے وہ

اس کا بات نہیں مانتا گھر چھوڑ دیا اور خالی ہاتھ گورکھ پور آ گیا۔ ادھر بھی ہمارا جان نہیں بچا اور وہ ہمارا لڑکی کو لے گیا۔ ہم اس کو نہیں روک سکا۔ اب ہم ادھر پہاڑ پر نہیں جا سکتا سب لوگ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے ہر کوئی اس کے سامنے نہیں جاتا۔ وہ جادو کرتا ہے اور خود کو بھکھو کہتا ہے۔ شاکیرہ منی کو بھکھو ایسا نہیں کرتا وہ جادو گر ہے۔

”اچھا تم آج رات آرام کرو۔ کل گورکھ پور اپنے گھر جاؤ پتہ بتا کر جانا میں تمہارے پاس آ جاؤں گا پھر جو ہو گا وہ کریں گے۔“ رولو کا نے کہا۔

میں نے اس کے سونے کا اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔ صبح وہ گورکھ پور چلا گیا۔

رولو کا نے کہا۔ ”میں گورکھ پور جا رہا ہوں۔“

گورکھ پور ہندوستان کا سرحدی شہر ہے اس سے آگے کوئی شہر نہیں ہے۔ کچھ فاصلے سے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر نیپالی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہے۔ سرحد کی قریبی آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی ہے مگر بدھ مت اور مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد کو کم ہے۔

گو باشو کا مکان بلکہ جھونپڑا گورکھ پور کی آبادی سے باہر تھا۔ یہاں اور بھی نیپالی بدھ مت رہتے تھے۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ میں آ گیا ہوں اور نیپال جا رہا ہوں۔ تو وہ بولا۔

”ہم ساتھ چلے گا تم کو وہ جگہ نہیں ملے گا۔“

میں نے کہا۔ ”چلو مجھے اعتراف نہیں ہے۔ مگر سوچ لو وہ مجھے نہیں جانتا مگر تمہارے لئے تو خطرہ ہے۔“

”ہم تمہارا ساتھ جائے گا تو ہم کو خطرہ نہیں ہوگا“

صبح ہی صبح ہم نکل کھڑے ہوئے۔ ایک نیل گاڑی میں ہم نے وہاں تک سفر کیا جہاں تک جا سکتے تھے اس کے بعد پہاڑیاں تھیں اور پیدل سفر کرنا تھا۔ گو باشو بہت تیزی سے میرے آگے آگے چل رہا تھا تین گھنٹے کے بعد اس نے راستہ بدل لیا اور وہ اس طرف چل دیا جو کہ راستہ نہیں تھا میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

کچھ نہیں ہے وہ بدھی ستون نہیں ہے۔ اس کو دروان نہیں ملا ہے وہ دھوکا دیتا ہے۔ وہ شاکیرہ منی کو بدنام کرتا ہے وہ بدھ مت بھی نہیں لگاتا وہ ایسا کام کرتا ہے کہ ہم بتا نہیں سکتا۔“ وہ بولا۔

”انسان کسی دھرم کا ہو بھکھو انسانی فطرت ہے۔

انسان اور شیطان کا تعلق ازل سے ہے۔ شیطان ہر وہ دروازہ کھولتا ہے جو برائی کی طرف جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یہی کرتا ہے اس نے رب کا نجات سے اس کے بندوں کو بھکھو کا وعدہ کیا ہے۔

مگر رب کا نجات نے شیطان کو بھگوانے کا طریقہ بھی تو بتایا ہے۔ شیطان کے عمل کا توڑ بھی تو دیا ہے اگر شیطان کے کارندے مصروف عمل ہیں تو کیا ہوا اس کا توڑ کرنے والے بھی تو ہر جگہ ہر وقت موجود ہیں۔“ رولو کا نے کہا۔

”نھیک بولا۔“ ہم نہیں جانتا ہم کو کوئی بتا تو تھا ہم ادھر آیا۔“ گو باشو نے کہا۔

”تمہارا گھر گورکھ پور نہیں ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”گھر کدھر ہے جھونپڑا ہے۔ ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ ظالم جھین لیا۔“

”دیکھو میں حکیم ہوں علاج کرتا ہوں حکیم کے ساتھ مریض کا بھی فرض ہے کہ کوئی بات نہ چھپائے پوری بات بتائے۔ دشمنی بلا وجہ تو نہیں ہوتی وہ تمہارا دشمن کیوں ہے تم کو نقصان کیوں پہنچا رہا ہے۔ اس کی کوئی تو بنیادی وجہ ہوگی۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”ہاں بتاتا ہے۔ وہ ہمارے پاس آیا تھا بولتا تھا اپنی لڑکی کو ہمارا ساتھ شادی کر دو۔ ہم منع کر دیا وہ بہت غصہ ہوا چلا گیا۔“

”تم نے اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟“ رولو کا بولا۔

”اس کے گھر بہت عورت لوگ ہے۔ وہ اسی طرح ڈرا کر شادی کرتا ہے ہم کو پتہ تھا تو ہم منع کر دیا بس اس دن کے بعد ہم پریشانی میں پڑ گیا۔ روز کوئی نیابت ہوتا تھا۔ بچہ بیمار لگے، بیمار، چھوٹا سا کھیت تھا وہ جل گیا۔ ہم کو کوئی بولا تم ادھر رہے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ تم کو اس کا بات مانتا پڑے گا۔ ہم

آ گیا اور بولا۔ ”آج کارات ادھر رہنا ہوگا۔“
میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا
کیا؟“

”تھا صاحب وہی راستہ تھا جو سب استعمال کرتا ہے وہ
ہمارے واسطے خطرناک تھا۔ اس واسطے ہم ادھر آیا۔ توڑا لمبا
ہے پر ادھر وہ نہیں آ سکتا۔ آپ ادھر آرام کرو ہم جانے گا۔“
میں نے گردن ہلائی اور زمین پر لیٹ گیا۔ اس کو میں کیا بتاتا کہ
میں رات میں بہت کم سوتا تھا۔ وہ ایک درخت کی موٹی جڑ پر
بیٹھ گیا۔ ”تم کو بھوک نہیں لگتی۔“ میں نے اس سے پوچھا۔
اس نے میری طرف شاید دیکھا تھا اور پھر آواز
آئی۔

”لگتا ہے کھائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں کھائے
گا۔“
”تم کھانا تو لایا نہیں ہے کھائے گا کیا؟“ میں نے
پوچھا۔

”ادھر رات کو پانی کے واسطے بہت جانور آتا ہے۔
وہی کھائے گا۔“ گو باشو نے جواب دیا۔
”تم پہلے اس راستے پر آ چکے ہو۔“ میں نے پھر
پوچھا۔

”ہاں کئی دفعہ آیا ہوں اور شاید میں اکیلا ہوں جو یہ
راستہ جانتا ہے یہ بولے کہ یہ راستہ ہم نے کھوجا ہے تو بھی
ٹھیک ہے۔“ گو باشو نے جواب دیا۔

میں جاگ رہا تھا اور گو باشو بیڑے کے گرے ہوئے تھے
پر خاموش بیٹھا تھا۔ درختوں کے گرے پتوں پر سرسراہٹ
ہوئی اور میں نے کدوٹ اسی طرف کر لی۔ گو باشو اپنی جگہ
ساکت بیٹھا رہا۔ دیکھتا تھا کہ شکاری کون ہے آنے والا
گو باشو کو شکار کرتا ہے یا گو باشو شکاری بننا ہے۔ میں درمیان
میں خاموش تماشا شائی تھا۔ مگر نہیں میں تماشا شائی تو تھا مگر ایک ایسا
تماشا شائی جو گو باشو کا مددگار بھی تھا۔ سرسراہٹ تیز ہو گئی مگر آنے
والا شکاری نہیں شکار تھا۔ خرگوش جیسے ہی گو باشو کے قریب آیا
گو باشو کے جسمے میں جان بڑ گئی اور خاموش شکار ہو گیا۔ اس
طرح تین خرگوش گو باشو نے پکڑ لئے پھر اس نے ان کی کھال

اب پہاڑوں کی چڑھائیاں خطرناک ہو گئی تھیں۔
مگر وہ ان کا عادی تھا۔ کوئی نہ کوئی راستہ اوپر جانے کا وہ تلاش
کر لیتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک چاک چو بند
تھا تھکن کے آثار مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ یہاں کے
پہاڑوں میں سبز نہیں تھا کہیں کہیں جھاڑیاں نظر آ جاتی تھیں
مگر ان کے پتوں کا رنگ بھی مثیالہ ہر تھا۔ آسان پر کبھی کبھی
کوئی پرندہ بھی اڑتا نظر آ جاتا تھا۔ اب ہمارے سامنے ایک
دیوار کھڑی تھی۔ پتھر کی دیوار بہت اونچی جس پر چڑھنا
انسان کے لئے قطعی ناممکن تھا اس دیوار کی جڑ بھی نظر نہیں
آتی تھی کیونکہ گہری کھائی تھی اور اس کھائی میں درختوں کے
جھنڈے تھے اگر اس کھائی میں اتر آجائے تو بھی یہ نہیں وہ کھائی
کتنی گہری ہے۔ مگر گو باشو اس کھائی میں اتر رہا تھا۔ میں بھی
اس سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ اب ہم درختوں تک آ چکے
تھے۔ اوپر پہاڑ آسان تک جاتے محسوس ہوتے تھے۔
درختوں کے قریب کی آب و ہوا بدل چکی تھی یہاں پر ٹھنڈی
ہوا چل رہی تھی اور ان درختوں کی جڑوں میں پانی نظر آ رہا
تھا۔ گو باشو اس پانی کے اندر چلا گیا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔
ہم آگے بڑھتے گئے اب ہم درختوں کے سامنے میں چل
رہے تھے اوپر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا یہ نہیں ہم سطح زمین سے
کتنے نیچے تھے۔ وقت کی گردش کو کون روک سکا ہے روشنی اور
اندھیرے کا یہ کھیل صدیوں سے جاری و ساری ہے۔
قدرت نے سورج اور چاند کو جس کام پر لگایا ہے وہ کر رہے
ہیں ہر روز صبح ہوتی ہے روشنی ہوتی ہے اور پھر اپنے وقت
مقررہ پر رات ہو جاتی ہے اور رات ہو گئی ہر طرف ہیبت
ناک اندھیرا پھیل گیا۔ ہمارے چاروں طرف سنگلاخ
چٹانیں تھیں ہم ایک ایسے قلعہ میں قید تھے جس کا کوئی دروازہ
نہیں تھا۔ درخت خاموش تھے۔ رات کے اندھیرے میں
درخت بھی خوفناک عفریت نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے
اس مقام پر کبھی حضرت انسان کے قدم نہیں آئے۔

گو باشو مجھے یہاں کیوں لایا تھا۔ کیا وہ راستہ بھول
گیا تھا۔ یا ان بھول بھلیوں میں ہی راستہ تھا۔ گو باشو کے اندر
میں نے جھانکا مگر اس کے اندر کچھ نہیں تھا وہ میرے قریب

اتار کر تین لکڑیوں کا جھولا بنا کر اس پر ٹانگ دیا اور آگ جلا دی۔ گوباشو کا کھانا تیار ہو گیا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں اور رات کے پہرے دار کو کھڑا کیا اور سو گیا۔ رات کا پہرہ دار میرا جاگتا ہوا ہی ہے۔

صبح ہو گئی۔ درختوں پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ پرندے اڑ کر اپنی خوراک کے لئے روانہ ہوئے گوباشو میرے قریب آ گیا اور بولا۔ ”بھوک لگا ہے تو بندوبست کرنا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ میں تین دن اور نہیں کھاؤں گا۔“

گوباشو نے حیرت سے میری طرف دیکھا مگر خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ”اب آگے چلنے کی تیاری کرو۔“ اور گوباشو آگے پانی کے کنارے سے چل پڑا۔ ہم ایک وادی میں تھے۔ سارے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑی سلسلہ تھا اور اس پہاڑی سلسلے کی جڑ میں یہ پانی بہہ رہا تھا۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ پانی کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے درخت بہت گھنے تھے مگر یہ درخت پہاڑوں سے بہت نیچے تھے اس وادی کا کنارہ کچھ اس طرح تھا کہ ہر پہاڑ سے یہ وادی نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی وہاں سے نیچے آنے کا کوئی راستہ تھا۔ گوباشو ایک مقام پر رک گیا اور بولا۔

”پانی ادھر سے آتا ہے وہ دیکھو بلبلاتا ہے۔“ میں نے غور سے ادھر دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پانی زمین سے ابل رہا تھا۔ گوباشو نے کہا۔

”ہم پہلے جانے گا۔ دیکھو گوباشو پانی پورا سرگ بھر کر آتا ہے یا کم ہے ہم پھر واپس آئے گا اور تم کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اگر سرانگ بھر کر پانی آیا تو رکنا ہوگا ہم دیکھ کر آتا ہے اور گوباشو پانی میں غائب ہو گیا اور آدھے گھنٹے کے بعد واپس آ کر بتایا کہ تھوڑا پانی کے اندر چلنا ہوگا سانس روکنا ہوگا اس کے بعد سرگ میں پانی کم ہو جائے گا اور ہم گردن پانی سے نکال سکے گا۔ شروع میں سرگ چھت تک پانی میں ڈوبی ہے۔ میں بھی پانی میں اتر گیا اور آگے بڑھنے لگا تو گوباشو

میرے آگے اچانک غائب ہو گیا۔ میں گوباشو کے مقام پر پہنچا تو میں بھی ایک دم سرگ میں گر گیا۔ اب ہمیں پانی کے اندر چلنا تھا اور پانی کے مخالف سمت سفر کرنا تھا۔ گوباشو ایک اچھا تیراک تھا۔ وہ بہت تیزی سے جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کئی دفعہ پلٹ کر مجھے دیکھا اور آگے بڑھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد پانی چھت سے نیچے ہو گیا اور گوباشو نے گردن پانی سے باہر نکال لی میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ سرگ میں اندھیرا ضرور تھا مگر کسی قسم کی ٹکھن نہیں تھی۔ پانی موتی کی طرح صاف تھا اور کسی قسم کا جانور پانی میں نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ اور سفر کرنا پڑا اور چھت ہمارے سروں سے ہٹ گئی اب ہم ایک آبشار کے نیچے تھے اور اوپر سے پانی تیزی سے گر رہا تھا۔ آبشار کے اطراف درخت تھے اور دور دور پر ہیرا لی نظر آتی تھی۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی میں نے آبشار کے چاروں طرف نظریں سمھائیں تو پتہ چلا ہم ایک بہت بڑے کنویں میں ہیں اور اوپر سے آبشار گر رہا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں کی دیواریں ہمارے چاروں طرف کھڑی ہیں۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سورج کی روشنی تھی اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے گوباشو سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ”کوئی فکر بات نہیں ہے ہم کو اوپر جانے کا ابھی ضرورت نہیں ہے۔“ اور وہ ایک طرف چل پڑا۔ ایک جگہ جنگلی بیر کی ٹھنی جھاڑیاں پہاڑ کی جڑ میں اگی ہوئی تھیں۔ گوباشو نے سینے سے ایک چھری نکالی اور جھاڑیوں کو کاٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا میں اس کے قریب گیا تو میں نے دیکھا جھاڑیوں کے پار ایک سرگ تھی اس کی چھت زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ تھی اور اندر اندھیرا تھا۔ گوباشو جھاڑیاں پھلانگ کر سرگ میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے اندر چلا گیا۔ گوباشو نے اندھیرا ہوتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے چھری پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا اندر کچھ خطرہ ہے؟“ تو وہ بولا۔

”نہیں خطرہ نہیں ہے اندھیرا ہے احتیاط ضروری ہے۔“ یہ سرفکرتی دیر کا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پہاڑی سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ گوبا شو ایک ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ گیا اور بولا۔

”اس میدان کے آخری سرے پر میرا مکان ہے اور یہ میدان میری ہی زمین ہے۔ میں اسی پر کچھ کاشت کرتا تھا۔ میں اس سے آگے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ اگر اس نے دیکھ لیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ مگر تم یہاں کبھی خود کو محفوظ نہیں کر سکتے۔ اس لئے تم میرے ساتھ رہو۔“

میں نے اپنے کارندے کو ہوشیاری کا اشارہ کر دیا تھا؟ اور میں میدان کی طرف چل دیا تھا۔ میدان کے درمیان میں ہم دونوں پہنچے تھے سامنے کوئی آنا نظر آیا۔ گوبا شو نے مجھے بتایا۔ ”وہ سامنے آ رہا ہے۔“

وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ اس کے جسم پر صرف اور صرف ایک دھوئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کو تبت کا باشندہ ظاہر کرتا تھا۔ مگر قد اس کو منگول نسل کا ظاہر کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جو کئی جگہ سے خم کھائی ہوئی تھی اس لکڑی کے آخری سرے پر ایک سرخ رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا اور اس نے اس کو کٹھنی میں پکڑا ہوا تھا۔ اب وہ ہمارے قریب آ گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اس بات سے اس کی گہرائی کا اندازہ ضرور ہوتا تھا۔

اس کا بدن کسی ساز کے کسے ہوئے تاروں کی طرح سیدھا اور چمکیلا تھا۔ مگر اسکو اپنی آنکھوں پر کنٹرول نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت و عداوت کی آماجگاہ نظر آتی تھیں۔ اس نے آتے ہی اپنی لکڑی زمین پر ماری اور بولا۔

”تو پھر آ گیا۔ میں نے منع کر دیا تھا آئے گا تو مارا جائے گا۔“ وہ کچھ اور بھی کہتا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا اور پوچھا۔

”میں تیرے پاس چل کر آیا ہوں۔ اس طرح میں تیرا مہمان ہوا اور تو یہ سلوک کرتا ہے اپنے مہمانوں کے ساتھ۔“

اس نے ایک قبر میں ڈوبی نظر مجھ پر ڈالی اور کہا۔ ”تو کون ہے۔ مجھے نہیں پتہ پر یہ ضرور جانتا ہوں کہ تو اس

وہ بولا۔ ”زیادہ نہیں صرف ایک گھنٹہ لگے گا۔“
سرگ میں روشنی نہیں تھی مگر ہوا کا گزر خوب تھا۔ ہم جس طرف جا رہے تھے اس طرف سے ہوا آ رہی تھی اور جس راستے سے آئے تھے وہاں سے نکل رہی تھی۔ یہ سرگ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی نہیں تھی کبھی اس سرگ سے پانی آتا جاتا ہوگا مگر اب یہ کبھی تھی اس کی اونچائی کہیں ایک دم کم ہو جاتی اور کہیں پر ہمارے سروں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سرگ میں کسی قسم کے کیڑے مکوڑے نہیں تھے۔ شاید اس کی وجہ وہ تھی جو اس میں پھیلی ہوئی اور وہ بھی کندھ کی۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ایک قدرے کھلے علاقے میں نکل آئے۔ یہاں بھی وہاں سے پر جھاڑیاں کاٹی پڑیں۔ اس جگہ کو میدانی تو نہیں کہہ سکتے۔ پہاڑ دور دور ضرور نظر آتے تھے۔

گوبا شو نے کہا۔ ”میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔ اوپر میرا گھر ہے یہ علاقہ میرے لئے اب خطرناک ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کو محفوظ راستے سے ادھر پہنچا دیا ہے۔ وہ ظالم اوپر ہوگا ضرور۔ اب جو کرنا ہے وہ آپ کو کرنا ہے میرا کام یہاں ختم ہوا، بولو اوپر بھی پہنچا سکتا ہوں۔“

”تم صرف یہ کرو کہ اس راستے سے میرے آگے اوپر چلو۔ ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔“ اور وہ ایک چڑھائی چڑھنے لگا۔ اتنا سفر کرنے کے باوجود بھی اس میں تھکن کے آثار نہیں تھے۔ وہ واقعی ایک پہاڑی آدمی تھا۔ پہاڑوں پر چڑھنا اترنا اس کے لئے معمولی بات تھی۔

وہ بہت تیزی سے اوپر جا رہا تھا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ درمیان میں غلاء آ گیا اور بڑی لمبی چھلانگ لگانی پڑی اگر وہ ذرا کوتاہ یا چھلانگ چھوٹی پڑ جاتی تو وہ کھائی میں گر پڑتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کے قدم بڑے میکانیکی انداز میں آگے اور اوپر بڑھتے رہے یہ سفر تھکا دینے والا تھا مگر گوبا شو شاید اپنی عادت اور مشق کی وجہ سے تازہ دم تھا۔

چڑھائی ختم نہیں ہوئی۔ مگر ہم جہاں تک پہنچے تھے وہاں پر بائیں طرف کچھ میدانی علاقہ تھا اس کے بعد

میرے دشمن کے ساتھ آیا ہے۔ تو ضرور اس کا حمایتی ہے۔ یہ تجھے بھی پتہ ہوگا کہ دشمن کا حمایتی کون ہوتا ہے۔“

”یہ صرف تیرے اندازے ہیں۔ صرف اندازوں کو بنیاد بنا کر اگر تو فیصلہ کرے گا تو بعد میں پچھتانا پڑے گا اس لئے پہلے پوری بات کر لے پھر کوئی فیصلہ کرنا۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے لکڑی زمین پر نکادی اور بولا۔ ”تو بتا تو کون ہے اور کیوں آیا ہے؟“

”میں حکیم ہوں۔ صرف جسمانی حکیم نہیں ہوں میرا نام حکیم کامل ہے دلی میں ہوتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو کہاں آ گیا حکیم۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔“ وہ مسخرانہ انداز میں بولا۔

”مجھے مریض نظر آ رہا ہے اور تم کہتے ہو کوئی مریض نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو شاید مجھے مریض کہہ رہا ہے۔ میں تبت کا مشہور اور شکیہ منی کا نمائندہ ہوں تو نہیں جانتا۔ ہلائی ہوں ان پہاڑوں پر میری حکومت ہے تو کتنا پاگل ہے کہ مجھے مریض کہتا ہے۔“

”تو حکومت کرنے کا شوقین ہے شاید۔“ میں نے کہا۔

”یہ شوق کس کو نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر تو بدھٹ نہیں ہو سکتا۔ شاکیہ منی نے تو اپنا راج پاٹ چھوڑ کر گیان پایا تھا۔ وہ سچائی کی تلاش میں کل چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ سخت تکلیفیں برداشت کرتا رہا۔ بدھ کی تعلیم آدمی کو راست بازی اور نیک دلی کی ہدایت کرتی ہے تو کیسا اس کا پیروکار ہے کہ حکومت کرنے کا شوق رکھتا ہے یہ تو اس کی تعلیمات سے بالکل الگ ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ چند منٹ غور سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ”تو بھی تو حکیم نہیں ہے میری طرف انگلی اٹھانے سے پہلے اپنی اصلیت بھی تو کھول دے۔“

”میری اصلیت یہی ہے۔ میں علاج کرتا ہوں مگر تو تو بدھا کو بدنام کرتا ہے جس کا خود کو پیروکار بتاتا

ہے۔ میں جانتا ہوں تو نے صرف ایک لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہت باتیں کر لیں اب تو جا پھر واپس مت آنا چھوڑ اس لئے رہا ہوں کہ تیری میری لڑائی نہیں ہے۔ مگر یہ نہیں جائے گا۔“ اس نے گوباشو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ بھی جائے گا اور میں بھی جاؤں گا۔ تو ذرا آسمان کی طرف دیکھ کون آ رہا ہے۔“

اس نے فوراً آسمان کی طرف دیکھا اور یہی اس کی بھول تھی۔ آسمان پر ایک بادل اس کو نظر آیا۔ مگر نظریں میری طرف کرنے سے پہلے اس کی لکڑی ہوا میں اڑ گئی۔ اس نے دوڑ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے کہا۔ ”بے کار ہے تیری جادو کی لکڑی کو ہوا اڑا لے گئی۔“

”تو نے دھوکا کیا ہے میرے ساتھ۔“ وہ غصے سے بولا۔

”آسمان پر کچھ تجھے نظر آیا۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے پھر اوپر دیکھا اور اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آواز منہ سے نہیں نکلی تو میں نے کہا۔ ”اب بتا کس کی حکومت ہے۔ یہ لا تعداد چھوٹی چھوٹی کھیاں ہیں، تو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور چلا ہے حکومت کرنے تیرا سارا جادو منتر ایک لکڑی میں تھا اور وہ لکڑی بھی نہیں سنبھال سکا، تو کس منہ سے حکومت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تیرا دھوکے باز گرو جس نے تجھے بانس پر چڑھا کر رکھا تھا وہ کہاں ہے۔ اس کو آواز دے۔ مگر وہ آئے گا نہیں۔ بتا دہڑ کی کہاں ہے جس کو تو گوباشو کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا۔“

”میں بتا دوں گا۔ تو پہلے ان کو روک۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پہلے بتا کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں بتاتا ہوں۔“ وہ ایک طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر چلنے کے بعد ایک مکان نظر آنے لگا۔ وہ مکان پہاڑ کے دامن میں تھا اور بہت بڑی جگہ میں تھا۔ گوباشو نے کہا۔

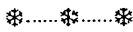
”یہی میرا مکان ہے۔“

مساموں سے زیادہ سوراخ تھے اور ہر کی زیادتی کی وجہ سے اس کا پورا بدن نیلا ہو گیا تھا۔ گوبا شونے حیرت سے اس کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”گوبا شو! یہ تمہارا دشمن سامنے مرا پڑا ہے۔ تم کو مبارک ہو تمہارا مکان تم کو مل گیا تم اپنی لڑکی کو دیکھو اور مجھے بتاؤ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں“

وہ مکان کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ بیس عورتیں تھیں اس نے اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ”یہ سب عورتیں زبردستی اٹھائی ہوئی ہیں“ گوبا شونے بتایا۔

”تم ان سب کو ان کے گھروں پر پہنچا دو۔ ان کو بتا دو کہ شیطان مر چکا ہے اور وہ اب آزاد ہیں۔“ اور میں واپس پلٹ گیا۔



”ہر آدمی اولاد کی خواہش کرتا ہے اور اس کی اولین خواہش اولاد زینہ کی ہوتی ہے۔ اولاد تو اولاد ہے۔ وہ لڑکی ہے تو اور لڑکا ہو تو۔ پھر اولاد زینہ کی خواہش ہی کیوں کرتا ہے۔ اس کی چند معاشرتی اور کچھ فطری وجوہات ہیں۔ فطری وجہ تو یہ ہے کہ اس کے کان میں شروع سے یہ پھونکا گیا ہے کہ لڑکے سے نام چلتا ہے۔ یہ صرف دل کو بہلانے کا بہانہ ہے۔ بیٹا باپ کے خانے میں اس کا نام لکھتا ہے جب وہ باپ بننا ہے تو باپ کے خانے میں اس کا نام آتا ہے۔ دادا کا نام دور چلا جاتا ہے آگے اسی طرح چلتا ہے۔ اور آدمی کا نام ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ پھر نام چلنے والی بات تو ختم ہو گئی۔

معاشرتی طور پر آدمی خود غرض ہے۔ وہ اپنی کھوئی چیز کسی کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا وہ چاہتا ہے اس کی دولت اس کا بیٹا حاصل کرے کسی اور کو وہ دینا نہیں چاہتا۔ اس لئے اس کو بیٹے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد اس کی دولت اس کا بیٹا کھائے یا کوئی اور مرنے والے پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ بیٹا کھاتا ہے تو اس کا کیا فائدہ ہوا اور گھر کسی دوسرے نے کھایا تو کیا نقصان ہوا؟

دنیا میں نام مرنے کے بعد بھی چلتا ہے مگر صرف ان خصوصی لوگوں کا جو کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے جاتے

اندر سے یہ مکان بہت بڑا تھا حالانکہ ایسا باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ ہلائی اندر چلا گیا۔ وہ ایک پتھر کی بہت بڑی مسل پر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے منہ سے کچھ آواز نکالی۔ ایک آدمی دوڑ کر اس کے قریب آ گیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ہلائی کے بولنے سے پہلے میں نے کہا۔ ”ہلائی کھڑا ہوا جا یہ تیرا مکان نہیں ہے مالک مکان کھڑا ہے اور تو مالک کی طرح بیٹھا ہے۔ کچھ شرم حیاتیرے اندر ہے۔“

اس کا چہرہ یہ سن کر سرخ ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے میں اتنی آسانی سے سب کچھ چھوڑ دوں گا۔“

”آسمان کی طرف ایک دفعہ اور دکھ لے کیونکہ اس کے بعد تجھے گردن اٹھانے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے پتھر کی سل پر پیروں کو رگڑا۔ اس کی رگڑ سے چنگاریاں اور آگ کے شعلے نکلے اور آسمان کی طرف چلے گئے۔ آسمان پر کھیلوں کا بادل درمیان سے پھٹ گیا اور شعلے اوپر چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے بادل پھر اپنی جگہ قائم ہو گیا۔

”اور کچھ تیرے پاس ہے تو وہ بھی نکال لے۔“ میں نے کہا۔

اس نے پھر پتھر کی سل پر پیروں کو رگڑ دیئے۔ اس کے ایسا کرتے ہی وہ بھاری سل ایک گڑ گڑا ہٹ کے ساتھ ہوا میں معلق ہو گئی ہلائی اس پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تیرے اوپر آسمان نہیں بادل ہے نہ ہریلی کھیلوں کا بادل۔ تیرے پاس اس کا کوئی تو نہیں ہے۔ اس لئے زمین پر آ جا۔“

وہ گردن اٹھا کر بولا۔ ”تو اتنا رسک ہے۔ بول تجھ میں اتنی شکتی ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے تو خود اتر آئے گا۔“ اور پھر بادل قریب آئے لگا۔ وہ منتر پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتا رہا اور کھیاں اس سے لپٹ گئیں اور چند منٹ میں ہلائی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب کھیاں اس کے جسم سے اڑ گئیں تو اس کی جگہ ایک ایسا بدن میرے سامنے پتھر کی سل پر پڑا تھا جس کے بدن پر

وقار ہوں۔“

”میں کل آیا تھا آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔“ وہ بولے۔

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کر لیا۔“ میں نے کہا۔
 ”ہمارا نام نواز شیر جنگ ہے اور اورنگ آباد کے قریب ہماری زمینداری ہے۔ آپ کا نام ہم نے سنا تھا تو ہم آئے ہیں۔“ وہ بولے۔

”بڑی ذرہ نوازی آپ کی۔ فرمائیے ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔“
 ”آپ ہمارا علاج کر دیں پھر خدمت تو ہم کریں گے۔“ وہ بولے۔

آپ کو کیا تکلیف ہے۔ پہلے زبانی بتادیں اس کے بعد معائنہ بھی کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”میرا پانچ لڑکیاں ہیں اور دو بیٹیاں ہیں مگر اولاد زینہ نہیں ہے۔“ وہ بولے۔

”دیکھئے اگر آپ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتے تو میں آپ کا علاج ضرور کرتا کیونکہ یہ ایک مرض ہوتا اور ہر مرض کی دوا قدرت نے بنائی ہے۔ بات صرف اس کو استعمال کرنے کے طریقے کی ہے۔ مگر آپ کا کیس دوسرا ہے آپ بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں اور آپ کی بیویاں بھی کسی کو اس قسم کا مرض نہیں ہے پھر میں علاج کیا کروں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے سنا ہے حکمت میں ایسی دوائیں ہیں کہ زینہ اولاد پیدا ہو جاتی ہے۔“ وہ بولے۔

”دیکھئے میرے بھائی قدرت نے کچھ کام اپنے پاس رکھے ہیں ان کے کرنے کا اختیار انسان کو نہیں دیا ہے۔ کہن چاہتا ہے اس کا کوئی عزیز مر جائے مگر مر جاتا ہے۔ انسان اس کو مرنے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے کام ہیں ان میں سے اولاد پیدا کرنے کا معاملہ ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں فریق صحت مند ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شادی کے بیس سال بعد اولاد ہو جاتی ہے۔ یہ کام بھی قدرت نے اپنے پاس رکھا

ہیں۔ یا انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کا کام کر جاتے ہیں۔ اولاد زینہ سے صرف نسل چلتی ہے۔ نام نہیں چلتا اور نسل بھی ایک حد تک ہی چلتی ہے۔ ہمیشہ وہ بھی نہیں چلتی۔ لوگ بڑے نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر اس کی نسل کو ظاہر ضرور کرتے مگر ان میں کتنے چپے ہوتے کوئی نہیں پوچھتا۔“

رولو کا خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ”یہ آج اولاد زینہ کا خیال آپ کو کیونکر آ گیا۔“

”آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے ایک مریض آئے تھے۔ ان کو میں نے دیکھا تھا وہ صاحب اولاد تھے۔ پانچ لڑکیوں کے باپ تھے اور اولاد زینہ کے خواہش مند تھے۔“ رولو کا جواب دیا۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”انسان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ اولاد پیدا کرے۔ لڑکا لڑکی کا پیدا کرنا تو دور کی بات ہے تم صاحب اولاد ہو جو کچھ ملتا ہے اس پر مہر کرو۔ میں نے ان کو بھالایا۔“ رولو کا کہنا۔

”تو پھر ان کی سمجھ میں آ گیا۔“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں ان کو کسی نے بتا دیا ہے کہ وہ ان سے زینہ اولاد ہو سکتی ہے۔“ رولو کا کہنا۔

”اب پھر آئیں گے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”ضرور آئیں گے۔ کیونکہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے وہ تمہارا نام سن کر آئے تھے۔“ رولو کا جواب دیا۔

”میرا نام میں نے کب اولاد پیدا کروانے کا دعویٰ کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کل آئیں گے آپ پتہ کر لیں۔“ رولو کا بتایا۔
 دوسرے دن شام چھ بجے موصوف تشریف لے آئے۔ شکل سے ہی کھاتے پیتے گھر آنے کے لگتے تھے۔ سفید برق کرت اور کنگی دار پاجامہ کا ادراسلم شامی ان کا لباس تھا۔ عمر کا اندازہ تیس اور چالیس کے درمیان تھا۔ نہایت عمدہ صحت اور چہرے پر فارغ البالی کی ہر گئی تھی۔

آتے ہی بولے ”میں حکیم وقار احمد سے ملتا ہے۔“
 ”میں نے کہا۔“ میں حاضر ہوں فرمائیے میں حکیم

انسانوں کے دکھ دور کرتے ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں میں زندگی اور موت کے راز پوشیدہ ہیں جو لوگ ان کو پہچانتے ہیں وہ مبارکباد کے مستحق ہیں جن بات کی تاثیر جو جانتا ہے وہی اچھا معالج بھی ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”حکیم صاحب آپ کی عالمانہ اور ماہرانہ باتیں سن کر میرا دل کہتا ہے کہ آپ کچھ کوشش تو کریں۔“ شیر جنگ نے کہا۔

رولو کا موجود تھا مگر ہماری گفتگو میں اس نے حصہ نہیں لیا ویسے بھی رولو کا بلا وجہ کی گفتگو نہیں کرتا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے زبان کھولی۔

”نواب صاحب کوشش کرنے میں حرج نہیں ہے مگر آپ توقع مت رکھنا یہ آپ کی تقدیر کا معاملہ ہے کوئی کسی کی تقدیر نہیں بدل سکتا جو کچھ آپ کو لکھا جا چکا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ہم سے گلہ شکوہ آپ نہ کرنا اور ہاں آپ سے صرف دعا کے طالب ہیں کوئی رقم کسی شکل میں ہم قبول نہیں کریں گے کامیاب نہ ہوں یا ہوں دونوں صورتوں میں۔“

”مجھے آپ کی آخری بات سے ذرا سا اختلاف ضرور ہے مگر مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔“ شیر جنگ نے خوش ہو کر کہا۔

”تو پھر آپ اپنا پتہ بتا جائیں۔ میں آپ کے پاس خود آ جاؤں گا اور پھر آپ کا ماحول اور حالات کے مطابق کچھ کروں گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”بہت بہتر، میں آپ کا انتظار بڑی بے چینی سے کروں گا۔“ شیر جنگ نے کہا۔

اور پھر وہ چلا گیا اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”یہ کام تو ہمارے بس سے باہر ہے پھر تم نے کیوں وعدہ کر لیا؟“

”ہے تو ہمارے بس سے باہر مگر بعض اوقات جو کچھ سامنے نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی اصل بات کچھ ہوتی اور نظر کچھ آتی ہے۔ میں ان کے پاس جاؤں گا، وہاں کے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر واقعی قدرت کا یہ فیصلہ نظر آیا کہ ان کو اولاد دینا ضروری نہ ہو تو معافی مانگ لوں گا سارا کچھ تو اس کو

ہے۔ اس میں مداخلت نہیں ہوتی وہ جب چاہے گا تم کو بیٹا دے دے گا۔ ہر کام وقت پر ہوتا ہے مگر کرنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اگر بوڑھا ہو گیا اور پھر بیٹا ہوا تو کیا فائدہ نہ میں اس کو دیکھ سکوں گا اور نہ پرورش کر سکوں گا۔“ وہ بولے۔

”دیکھئے نواب شیر جنگ صاحب۔ آپ سے نہیں میں ایک عام بات کر رہا ہوں۔ انسان بہت خود غرض ہے۔

وہ صرف وہی بات سوچتا ہے جس میں اس کو فائدہ ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی جدوجہد اس کو کامیابیاں دلا رہی ہیں۔ وہ قدرت کے فیصلوں پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے راستے قدرت بتا رہی ہے۔ اگر اس

کی سمجھ میں ہے بات آ جائے تو وہ کبھی مغرور نہ ہو، بے شک ہر انسان کو اولاد کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ اس خواہش کو قدرت نے ہر انسان میں رکھا ہے اور اس کی پرورش کو مامتا کا جذبہ بھی دیا ہے۔ مگر اولاد کا دینا نہ دنیا کب

اور کس طرح دیتا ہے یہ صرف قدرت ہی جانتی ہے۔ حکیم ڈاکٹر علاج کرتے ہیں مگر کارکنی کوئی نہیں دے سکتا۔“ میں نے بات ختم کی۔

”آپ نے ٹھیک فرمایا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ جڑی بوٹیوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے

میں آپ سے متفق ہوں اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ آپ کچھ کوشش تو کریں۔“ شیر جنگ نے کہا۔

”آپ کا یہ کہنا کہ جڑی بوٹیوں میں حیرت انگیز تاثیر ہوتی ہے درست ہے۔ ہر علاقے کی جڑی بوٹیاں الگ

الگ تاثیر کی حامل ہوتی ہیں۔ زمین کے اندر کا رخا نہ قدرت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ مٹی پتھر بن جاتی ہے اور ہزاروں سال کے بعد بھی پتھر تانبہ بن جاتا ہے اور پھر یہی تانبہ سونا بن جاتا

ہے اس کی بھی ایک مدت ہوتی ہے اس کے بعد یہ بھی اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے۔ یہ ہزاروں سال کا چکر ہے اس

کائنات کے خالق کو ہی اس پر کنٹرول حاصل ہے جڑی بوٹیوں میں بے شک حیرت انگیز خصوصیات ہوتی ہیں

صاحب نظر ان کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں اور اس سے

بتا دیا ہے۔“ اور رولڈ کا دوسرے دن اورنگ آباد روانہ ہو گیا۔

اورنگ آباد سے بیس میل دور بہادر جنگ گڑھی تھی۔ یہاں کی ساری زمین اور اطراف کے کئی گاؤں شیرجنگ کی زمینداری میں شامل تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں خاموشی سے اپنا کام کروں گا مگر میرے پیچھے ہی شیرجنگ اتنا خوش ہوا کہ اس نے حویلی میں ایک جشن کا سامان باندھ دیا۔
”آپ اتنی جلدی تشریف لائیں گے میں نے نہیں سوچا تھا۔“ شیرجنگ نے کہا۔

”کام کرنا ہو تو اس کو ذمہ داری سے اور جلدی کرنا چاہئے۔“ میں نے کہا۔

”بہت خوب، میں نے جیسا سنا تھا آپ کو اس سے بھی آگے دیکھ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”یہ آپ کی مہربانی ہے مگر آپ کوئی خصوصی بندوبست میرے لئے نہیں کریں گے۔ میں اگر ہوا تو آپ کے ساتھ ہی کھانا وغیرہ کھاؤں گا اور اگر نہ ہوا تو تردد نہ کیجئے گا۔ میں دن بھر کو بھی جاسکتا ہوں اور رات بھر بھی غائب رہوں گا۔ معاف کرنا محترم ہمارا اپنا طریقہ کار ہے میری آمد کو آپ نے آشکار کر دیا مگر اس میں آپ کا قصور نہیں ہے کیونکہ میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اب تو سب کو پتہ ہے آپ حکیم ہیں اور علاج کے غرض سے آئے ہیں اب میں کیا کروں۔“ شیرجنگ نے کہا۔

”اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اگر میں اپنے کمرے میں موجود ہوں اور کوئی بھی مجھ سے ملاقات کرنا چاہے خواہ وہ آپ خود ہی ہوں صرف ایک بار دروازے پر دستک دیں گے جواب ملا تو ٹھیک ہے میں دروازہ کھول دوں گا اگر جواب نہ ملے تو دوبارہ دستک نہیں دینی ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ اگر میری بات پر عمل نہ ہوا تو نقصان آپ کا ہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔

شیرجنگ نے بڑے غور سے میری بات سنی اور کہا۔
”ایسا ہی ہوگا۔“

رات کے کھانے پر حویلی کے سارے مکین موجود تھے۔ شیرجنگ نے تعارف کرایا۔ انہوں نے دو خواتین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ میری شریک حیات ہیں۔ یہ بڑی ہیں اس نے ہرے سوٹ والی کی طرف اشارہ کیا ان کا نام خیر النساء بیگم ہے۔ یہ پہلے سوٹ میں ارم بیگم ہیں۔“
پھر ایک چالیس سالہ عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ میری بڑی بہن ہیں اور ان کے برابر میرے برادر نسبتی تشریف رکھتے ہیں۔ اس حویلی کا یہ دستور ہے کہ رات کے کھانے پر سب بڑے شریک ہوتے ہیں بچوں کو پہلے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم لوگ اسی وقت ضروری گفتگو بھی کرتے ہیں۔ بچے ہوں گے تو وہ مداخلت کریں گے۔“
سب لوگ ان کی باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔

انہوں نے پھر سلسلہ کلام جوڑا میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ حکیم صاحب ہیں دلی سے آئے ہیں۔ بیگمات کا کچھ علاج وغیرہ کریں گے یہ میرے معزز مہمان بھی ہیں۔“ اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شیرجنگ جب تعارف کر رہے تھے تو میں سب چہروں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ صرف ان کی بہن مشعری بیگم اور بہنوئی اختر میاں کے چہرے کے تاثرات کچھ ناگوار سے تھے انسان کا چہرہ ایک آئینہ ہوتا ہے اس آئینہ میں نظر رکھنے والا آدمی انسان کے اندر کا کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگا ہی لیتا ہے۔ تو میرا اندازہ تھا کہ پہلے اسی سڑک پر گاڑی دوڑاؤں گا۔

حویلی بہت بڑی تھی اس میں بے حساب کمرے تھے۔ کچھ میں ملازمین بھی رہتے تھے جو کہ کچا منزل پر تھے مالکان کے کمرے پہلی منزل پر تھے ان کمروں میں ضرورت کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ میں ایک گھنٹے کے بعد رپوشی کی حالت میں کمرے سے باہر آ گیا۔ پہلے ملازمین کے کمروں کے اندر دیکھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں کچھ کمرے اندر سے بند تھے مگر میں اپنے طریقے سے اندر چلا گیا۔ اس طرح کی خلوت میں جانا مناسب تو نہیں تھا مگر میں ان کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ ملازمین کے کمروں میں کچھ میں مجھے ایسے

”تو پھر خاموش رہو۔“ مشتری بیگم نے کہا۔

”خاموش ہی ہیں۔“ اختر میاں بولے۔

اب اور میرا وہاں رکنا بیکار ہی تھا۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ تو ہوا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ پھر میں ملازمین کی طرف رجوع ہوا۔ تو پتہ چلا کہ حویلی کا پورا کنٹرول مشتری بیگم کے ہی پاس ہے۔ حویلی میں جو خرچ ہوتا ہے اور جو ملازمین کو دیا جاتا ہے سب کا حساب مشتری بیگم کے پاس رہتا ہے۔ شیرجنگ کی دونوں بیگمات نہایت سادہ اور آرام پسند ہیں۔ مشتری بیگم نے اپنی چالاکی اور چرب زبانی سے دونوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ میں روز ہی مشتری بیگم کے کمرے میں جاتا رہا۔ ان کے برابر میں جو کمرہ تھا اس میں ان کا دس سالہ لڑکا رہتا تھا اور اس کے برابر ہی ان کی لڑکی کا کمرہ تھا۔ ایک رات میں گیا تو دونوں باتیں کر رہے تھے۔

”بیگم ذرا سوچو! ہم کو کیا ایک پوتے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اختر میاں نے کہا۔

”ہے تو پھر کیوں اور کا جھنجھٹ پالوں۔“ مشتری بیگم نے تیریاں بدل کر کہا۔

”وہ تو ہے پر خالص اپنا بھی ہونا چاہئے۔“ اختر میاں نے کہا۔

”آج پھر تم کو دورہ پڑا ہے پوتے کا۔“ مشتری بیگم نے کہا۔

”اولاد کا شوق تو سب کو ہوتا ہے نا۔ میں کوئی نرالی بات بولا کیا۔“ اختر میاں نے کہا۔

”ہوتا ہے مگر تم مجھ سے اب امید مت رکھنا۔“ مشتری بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

”تو پھر کس سے بولوں گا۔ کرائے کی اولاد کو اپنی اولاد کہتے میرا دل نہیں کرتا۔“ اختر نے کہا۔

”میاں بوش میں تو ہو، کیا اول نول کہنے لگے آئندہ پھر ایسی بات ہرگز مت کرنا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں یہ میں پہلے بھی بولی تھی مگر تم ہو پورے گاؤ کی ایک دفعہ کہے کی بات سمجھتے نہیں ہو۔ میں بولتی ہوں اپنی اوقات میں رہو بڑا شوق ہوا ہے پوتے کا۔“ مشتری بیگم نے بگڑ کر کہا۔

نظارے جس کا تصور اس حویلی کے مالکان نہیں کر سکتے نظر آئے مگر یہاں پر میرے کام کی چیز کچھ نہیں تھی۔ اوپری منزل پر کونے میں چار کمرے مشتری بیگم کے پاس تھے۔ میں سیدھا اس کمرے میں چلا گیا۔ جہاں پر مشتری بیگم اور ان کے میاں اختر میاں موجود تھے۔ میں ان کے قریب چلا گیا وہ باتیں کر رہے تھے۔

”میں کہتی ہوں یہ ٹیگور مارا حکیم کہاں سے ٹپک پڑا۔ کیا علاج کرے گا۔“ مشتری بیگم نے کہا۔

”آیا ہے تو کچھ نہ کچھ کرے گا ہی۔“ اختر میاں بولے۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ پوتی ہی ہوگی۔ شیرجنگ پوتے کو ترستا ہی رہے گا۔“ وہ بولی۔

”اور اگر ہو گیا تو پھر ہم لوگاں کیا کریں گے۔“ اختر میاں بولے۔

”دہی کریں گے جو پہلے کیا تھا۔“ مشتری بیگم بولیں۔

”ارے ایسا اتفاق بار بار کیسے ہوگا۔ پہلے تو تم نے پوتی کو جنم دیا تھا تو کام بن گیا بار بار ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہونے کو ہے۔“

”میں بولتی ہوں تم اپنی زبان پر قابو کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ خاموشی سے میرا کھیل دیکھتے جاؤ۔ اپنی زبان کو بند کرو۔“ مشتری بیگم نے اختر میاں کو جھاڑا۔

”کیا کرو گی کچھ پتہ تو چلے۔“ اختر میاں نے پوچھا۔

”تم یہ تو مانتے ہونا کہ میں تم سے زیادہ چتر چالاک ہوں۔ میری وجہ سے تم زمیندار بنے بیٹھے ہو اگر میں بھائی کو ہاتھ میں نہ رکھتی تو تم حیدر آباد میں ملازمت کرتے ہوتے۔“ مشتری بیگم نے کہا۔

”سو تو ہے۔ تم نے کمال ہی کر دیا۔ شیرجنگ کی دونوں بیگمات بھی تمہارا ہی دم بھرتی ہیں۔“ اختر میاں نے تعریف کی۔

”تم کچھ کہو میں اپنی اس خواہش کو دبا نہیں سکتا۔“
اختر میاں بولے۔

”جہیل دبا سکتے تو بھر حیدر آباد چلے جاؤ۔ اپنے گھر۔
میں اب اور بچے پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوں۔“ مشتری
بیگم نے سخت غصے سے کہا۔

”ہاں چلا ہی جاؤں گا مگر یاد رکھو جانے سے پہلے
تمہاری جہلنازی کی داستان سب کو بتا کر جاؤں گا کہ تم نے
کتنی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنی لڑکی کو شیر جنگ کے
لڑکے سے بدل لیا۔ ہماری لڑکی شیر جنگ کی ہوئی اور اس کا
لڑکا ہمارا بن گیا۔ اس کے بعد تم نے صرف ایک لڑکی اور پیدا
کر دی۔ مجھے تو تم نے کوئی بیٹا دیا نہیں جس کو میں اپنا کہہ
سکوں۔ مگر اب کان کھول کر سن لو میں اپنے مطالبے سے ہرگز
ہرگز دستبردار نہیں ہوں گا۔ اختر میاں نے غصے سے کہا۔

مشتری بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا مگر زبان سے
ایک لفظ نہیں نکلا اور بھر پوئینتر ابدل کر نہایت ملامت آواز میں
بولیں۔

”تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ یہ بہت بری عادت
ہے تم میں۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لگا لیتے ہو میں تمہاری
بیگم ہوں تم بولو تو میں ایک کیا ایک درجن بچے تم کو پیدا
کردوں میں اپنی صحت کی وجہ سے کہہ رہی تھی اور تم سنجیدہ
ہی ہو گئے۔ میری بات کو ذرا سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ انور ہی
اس ساری زمینداری کا مالک بننے والا ہے۔ میں نے تمہارا
اپنا اور اپنی اولاد کا مستقل سنوارنے کو ہی تو یہ کھیل کھیلا ہے۔
بھائی کی آنکھیں بند ہونے کے بعد کوئی وارث ہوگا۔ ان کی
تو اولاد زینہ ہی نہیں ہے اور اگر آئندہ ہوگی بھی تو میں نے
دائی کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ ہوئے ہی اپنا کام کر دے
گی۔ وارث تو انور ہی ہوگا۔ تم میری بات پر غصہ دے دماغ
سے غور کرو۔ میں بھی تمہارے مطالبے پر غور کروں گی میں تم
سے دور نہیں رہ سکتی۔“ اس کے بعد بدنی کرتب شروع
ہو گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔ ساری کہانی سامنے
آ گئی انور جو کہ مشتری کا بیٹا بنا ہوا تھا وہ سب بچوں میں
سب سے بڑا تھا اور ایک بیٹی اتنی ہی عمر کی شیر جنگ کی بڑی

بیگم کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ لڑکی مشتری کی اور انور شیر
جنگ کا بیٹا تھا۔ اب مجھے یہ بات ثابت کرنا تھی۔ حویلی کے
ارد گرد بھی کچھ خاندان آباد تھے ان میں زیادہ تر توہاری
وغیرہ تھے۔ مگر کچھ حویلی کے ملازم بھی تھے۔ وہ اپنے بال
بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

میں نے شیر جنگ کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔
اس کی بیگمات کو بھی دوائیں دے رہا تھا۔ یہ دوائیں صرف
طاقت کی تھیں اور ان کو دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ
سمجھتا رہے کہ اس کا علاج ہو رہا ہے میری مصروفیت کا اس
کو اندازہ نہیں تھا۔ میں اس دایہ کی تلاش میں تھا جس نے
شیر جنگ کی بڑی بیگم کی پہلی زچگی کرائی تھی۔ مگر کچھ پتہ
نہیں چل رہا تھا۔ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو میں
نے شیر جنگ سے بات کرنے کی ٹھان لی اور ایک رات
کھانے کے بعد میں نے کہا۔

”نواب صاحب کچھ ضروری بات تمہاری میں کرنی
ہے۔“

”ہاں ضرور کریں آئیے۔“ اور ہم ان کی شاندار
بیٹشک میں آکر بیٹھ گئے۔

میں نے پہلا سوال کیا۔ ”بعض اوقات اتنا ہی دایہ
اس طرح زچگی کراتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی نقص پیدا ہو جاتا
ہے۔ آپ کی بڑی بیگم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے میں
جاننا چاہتا ہوں ان کو زچگی کے بعد کیا دوائیں دی گئی تھیں۔“
میں نے بہت گھما بھرا کر سوال کیا۔

شیر جنگ نے بہت غور سے میرا سوال سنا اور پھر
کہا۔ ”حکیم صاحب یہ عورتوں کا معاملہ ہے میں نے پوچھا
نہیں۔“

”زچگی کے وقت کون کون تھا۔ یہ تو پتہ ہوگا۔“ میں
نے پھر پوچھا۔

”ایک تو دایہ تھی۔ دوسری میری ہمشیرہ مشتری کی بیگم
تھیں۔“ شیر جنگ نے جواب دیا۔

”ان کے علاوہ اور کوئی تھا۔“ میں نے کہا۔
”نہیں ہمشیرہ نے سختی سے سب کو منع کر دیا تھا۔“

موسیٰ خان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں نوب شیر جنگ کے پاس سے آیا ہوں اصغری دایہ سے ملنا ہے۔“
بے کار ملنا ہے جی۔ اب وہ کسی کام کی نہیں ہیں جی۔“

”کام کچھ ان سے نہیں کروانا ہے۔ خالی دو چار باتاں کرنی ہیں۔“
”ہاؤٹھی ہے۔ بیمار ہیں زیادہ پریشان لگو کرنا۔“ وہ بولی۔

”نہیں کچھ ضروری بات ہے اس لئے آئے ہیں۔“
موسیٰ خان نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اندر آ جاؤ۔“ وہ ایک طرف ہو گئی۔
موسیٰ خان نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ آپ کی کون ہیں؟“
”وہ میری ساس ہیں اور خالہ بھی ہیں۔“ عورت نے جواب دیا۔

وہ ہم کو ایک کمرے میں لے گئی۔ ایک چار پائی پر ایک بوڑھی عورت کبھی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کا چہرہ جھروں سے پر تھا۔ سفید بالوں کے درمیان اس کا کالا چہرہ منہ میں کسی دانت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چہرے پر کسی اندرونی تکلیف سے کرب کے آثار تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تب بھی اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نبض دیکھی بہت آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی زندگی کا سفر اب کم نظر آتا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میری گواہ تھی۔ مجھے اس کو اس قابل کرنا تھا کہ یہ ایک بار پھر نوب شیر جنگ کی حویلی چلے اس لئے میں نے کہا۔

”یہ تو سخت بیمار ہیں آپ نے ان کا علاج نہیں کرایا۔“

”کرائے جی پر آرام نہیں آتا۔ ہم لوگ تو بہت پریشان ہیں۔“ عورت نے جواب دیا۔

”یہ ابھی ہمارے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں ہیں پہلے میں ان کا علاج کروں گا اس کے بعد جب یہ

کیونکہ اس سے شور ہوتا ہے اور زچہ پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ اس لئے وہ وہی تھیں۔“ شیر جنگ نے جواب دیا۔
”آپ کو بچی کی پیدائش کے کتنی دیر بعد پتہ چلا۔“
میں نے سوال کیا۔

”میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ کیس شام کو ہوا اور میں رات گیارہ بجے کے قریب آیا تو مشتری نیگم نے بچی کی مبارکباد دی تھی۔“
”میں اس دایہ سے ملنا چاہتا ہوں مگر۔“ میں نے کہا۔

”وہ میرے پاس ہی ملازم تھی گ تاکہ وہ بڑھ کی رہنے والی تھی۔ اس کا بیٹا اس کو وہیں لے کر چلا گیا۔ اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔“ شیر جنگ نے جواب دیا۔
”ناو بڑھ میں اس کا پتہ تو ہوگا۔“ میں نے کہا۔
”ہاں وہ مل جائے گا۔“ مٹی کے پاس سب لیکارڈ رہتا ہے۔“ شیر جنگ بولا۔

اور میں پتہ لے کر ناو بڑھ روانہ ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور نوب حیدر آباد کی حکومت میں ہی ہے۔ دکنی تہذیب یہاں پر پوری طرح نظر آتی ہے۔ زبان دکنی اردو بولی جاتی ہے۔ آبادی مسلمانوں کی بہت ہے مگر پھر بھی ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مگر چونکہ مسلمانوں کی حکومت ہے اس لئے مسلمان ہندوؤں سے بہتر حالات میں ہیں۔ اکثریت ہنرمند ہے یا تعلیم یافتہ ہے۔ سرکاری دفاتر میں اردو کا رواج ہے میں اسٹیشن سے سیدھا دیئے گئے پتے پر چلا گیا۔ میں ٹرین سے اس لئے آیا تھا کہ نوب شیر جنگ نے ایک آدمی میرے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کا نام موسیٰ خان تھا اور وہ نوب کا خاص آدمی تھا۔

موسیٰ خان نے دایہ اصغری کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ ناو بڑھ سے واقف تھا۔ ایک دو جگہ پتہ کرنے کے بعد ہم خواہ پور محلے میں پہنچ گئے۔ دایہ کے بیٹے کا نام رمضان میاں تھا۔ اس کا پتہ کیا اور ہم اس کے دروازے پر تھے۔ موسیٰ خان نے دروازے پر دستک دی تو ایک عورت نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ ”کس کو ملنا ہے۔“

بالکل تندرست تھی۔ میں روزانہ ہی اس کے پاس جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے کہا۔

”اب تم تندرست ہو میں تم سے ایک بات کرنے آیا تھا۔ مگر تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں کچھ کہتا اس لئے میں نے اب تک تم سے کوئی بات نہیں کی اب تم خود کو کیسا پاتی ہو۔

وہ بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے تم کو یہاں بھیج دیا اور میں موت کے منہ سے نکل آئی۔“

”دیکھو اصغری بیگم انسان جو کچھ کرتا ہے وہ سب ریکارڈ پر رہتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی کبھی چوک نہیں ہوتی۔ انسان اپنے کئے کو بھول سکتا ہے مگر قدرت کے ریکارڈ پر جو کچھ ایک بار آ گیا وہ ختم نہیں ہوتا اگر وہ اچھا کرتا ہے تو وہ بھی رہتا ہے اور برا کرتا ہے تو وہ بھی رہتا ہے۔ اگر اس نے کسی کے لئے برا کیا ہے تو اس کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور مرنے کے بعد بھی اس کو نہیں چھوڑا جاتا۔

جس نے اتنی بڑی کائنات بنائی ہے اس نے اس کو چلانے کا نظام بھی بنایا ہے۔ اس کا یہ نظام کروڑوں سال سے چل رہا ہے۔ جو دور ہونے کے باوجود ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو نظر نہیں آتا مگر ہر جگہ موجود ہے جس نے ہمارے فانی جسم میں روح ڈالی ہے جو رحم مادر میں غذا پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے جو پتھر کے اندر کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔ ہماری برائیاں اس کے سامنے ہیں وہ دیکھتا ہے اس کی سزا بھی وہ فوراً دے سکتا ہے۔ مگر نہیں دیتا وہ دیکھتا ہے کہ بندہ کہاں تک اس کے احکامات کو نہیں مانتا وہ موقع دیتا ہے کہ شاید وہ اچھائیوں کی طرف پلٹ آئے اور میں اس کو معاف کر دوں۔ وہ سب سے بڑا مہربان ہے۔ سب سے زیادہ شفیق، سب سے زیادہ رحیم، سب سے زیادہ قدیر ہے۔ میری تمہید ذرا زیادہ ضرور ہوگئی ہے مگر یہ ضروری بھی تھی۔ اب تم خود اپنا محاسبہ کرو گزرے وقت کو دوبارہ اپنے ذہن کے پردے پر لاؤ پھر بتاؤ

صحت مند ہوں گی تو آگے بات کریں گے۔“ اس کے بعد میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ موسیٰ خان تم اوپر ٹھہرو میں دوا میں لے کر آتا ہوں اور میں روانہ ہو گیا۔ کچھ دوا میں نے بازار سے خرید لیں اور چند بوٹیوں کے لئے اپنے طور سے جنگل جانا پڑا۔ اس کام میں مجھے چار گھنٹے لگے کیونکہ یہاں سے جنگل بہت دور تھا۔ اس کو جو مرض تھا میں اس کی مجرب اور آزمودہ دوا میں لے آیا تھا۔ میں نے آتے ہی علاج شروع کر دیا۔

موسیٰ خان نے ایک سرانے میں رہنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ہم دونوں روزانہ دایے کے گھر جاتے تھے۔ دوا میں میں خود دیتا تھا اور جو رات کو دینے کی تھیں وہ اس کو اس کی بہو دے دیا کرتی تھی۔ اس دوران اس کے بیٹے رمضان سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ موسیٰ خان نے اس کا پتہ کیا تو عورت رونے لگی اور بولی۔ اس کو جب روپے کی ضرورت ہوگی تو آئے گا۔“

”تو پھر تمہارا اگر ارہ کس طرح ہوتا ہے۔“ موسیٰ خان نے پوچھا۔

”اللہ نواب شیر جنگ کو حیات رکھے۔ وہی انتظام کرتے ہیں۔ پہلے بھی اور اب بھی۔“ وہ بولی۔ میں نے یہ سن کر سوچا وہاں دیکھا کیا تماشا ہے کہ جواب تک کفالت کر رہا ہے اسی نے اس کے گھر کو اندھیروں میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی کتنی پر تیں ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا اور خوبی یہ ہے کہ ہر انسان کی پر تیں الگ الگ ہیں۔ کوئی احسان کے بدلے زندگی ہارنے پر راضی ہے تو کوئی احسان کرنے والے کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہ انسان بھی عجیب و غریب جانور ہے غلطیوں پر غلطی کرتا چلا جاتا ہے اور ان کو محسوس نہیں کرتا اور کبھی لے تو ان کی عجیب و غریب توجیہات کر کے خود کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دایہ اصغری ایک ہفتہ کے بعد پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ اس کو نہیں بتایا گیا تھا کہ میں کون ہوں وہ مجھے حکیم ہی سمجھتی تھی۔ دو ہفتہ کے بعد وہ اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔ اب وہ پوری غذا بھی کھاتی تھی۔ ایک مہینے کے بعد وہ

”تم کو ایک بار پھر میرے ساتھ حویلی چلنا ہوگا۔“
 ”میں چلوں گی۔ چاہے جتنی زحمت برداشت
 کرنا پڑے۔ نواب صاحب جو تیاں مار لیں مجھے منظور
 ہے۔“ وہ بولی۔

”تو پھر تیار ہو جاؤ۔ کل چلیں گے تم کو قدرت نے
 اپنے گناہوں کی طمانی کرنے کا موقعہ دے دیا ہے۔“ میں
 نے جواب دیا اور دوسرے دن، ہم شیر جنگ کے پاس جانے
 کو روانہ ہو گئے۔ پہنچتے ہی میں نے دایہ اصغری کو نواب شیر
 جنگ کے سامنے پیش کر دیا اور کہا۔ ”آپ تنہائی میں ان سے
 کچھ باتیں کریں میں بھی ساتھ ہوں ہمارے علاوہ کوئی نہ
 ہو۔“ میں نے کہا اور ہم تینوں بیٹھک میں آ گئے دروازہ بند
 کر لیا گیا۔ تو میں نے کہا۔ ”جو باتیں یہ کریں گی وہ میں بھی
 کر سکتا تھا مگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش رہتی۔ اس لئے
 میں ان کو ہی لے آیا تاکہ یہ اپنی زبان سے سب کچھ بیان
 کریں۔ پھر میں نے اصغری کو اشارہ کیا اور اس نے شروع
 سے پوری کہانی بیان کر دی۔ وہ جس قدر آگے بڑھتی جاتی
 تھی اسی قدر نواب کے چہرے کی رنگت اور تاثرات بدلتے
 جاتے تھے۔ روداد ختم ہو گئی۔ پورے کمرے میں سناٹا
 چھا گیا۔ صرف نواب کی غصہ بھری تیسرے سانسوں کے سوا کوئی
 آواز نہیں آ رہی تھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ بولے۔

”دل کرتا ہے تجھے کتوں کے سامنے ڈلوادوں۔ مگر
 میں تجھ سے پوچھتا ہوں تجھے کیا سزا دوں بول۔“ اصغری
 خاموش ہو گئی مگر میں نے کہا۔ ”بے شک یہ سزا کی مستحق
 ہے۔ مگر اصل محرک کی طرف بھی ذرا دھیان فرمائیں۔“
 ”ہاں وہ بھی اسی لائق ہے۔ میں نے دونوں کے
 لئے کیا نہیں کیا اور انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا۔“ نواب
 بولے۔

”یہ ایک غریب عورت ہے۔ اس کی مجبور یوں نے
 اس کو خرید لیا۔ مگر جو خریدار ہے اس کو کیا مجبور یاں تھیں۔ اس
 کے گناہ سے کئی گنا بڑا گناہ تو مشتری بیگم کا ہے وہ آپ کی
 بہن ہے شاید اس لئے آپ اس کو بڑا مجرم سمجھ رہے ہیں اگر
 ایسا ہے تو یہ انصاف کے منافی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

آج سے دس سال پہلے کیا ہوا ہے؟“ میں خاموش ہو گیا۔
 وہ گردن جھکا کر خاموش بیٹھی رہی جیسے کسی پرانی
 کتاب کے ورق الٹ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر ندامت
 کے آثار نظر آنے لگے اور آنکھوں سے ندامت کے دواؤں
 ٹپک پڑے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا شروع کیا۔
 ”ہاں دس سال پہلے میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ میں
 نے نمک حرامی کی شہ گمیں کیا کرنی ایک تو میں ضرورت مند
 تھی دوسرے مجھ پر مشتری بیگم کا دباؤ تھا۔

اس نے کہہ دیا تھا کہ جو میں کتنی ہوں وہ کرنا پڑے گا
 نہیں کرے گی تو بے عزت کر کے حویلی سے باہر نکال دوں
 گی۔ ایک طرف بے روزگاری تھی، بھوک تھی، بے عزتی
 تھی۔ دوسری طرف کرارے نوٹے تھے، میرا لڑکا شرابی ناکارہ
 تھا، میرا گھر صرف نواب صاحب کی مہربانی سے چلتا تھا میں
 کیا کرتی۔ میں بک گئی مشتری بیگم نے مجھے صرف پانچ ہزار
 روپے میں خرید لیا۔ میرا منہ مجھے ملامت کرتا رہتا۔ میں اندر
 ہی اندر کہتی رہی نہ کسی کو اپنا دکھ بتا سکتی تھی نہ ضمیر کو مطمئن
 کر سکتی تھی۔ میری صحت گرتی گئی اور پھر میں نے حویلی
 چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس فرشیہ صفت نواب نے میرا
 آج تک ساتھ دیا ہے۔ مگر میں نے اس کا نمک کا حق ادا
 نہیں کیا یہ میرا بہت بڑا گناہ ہے۔ مشتری بیگم کی لڑکی کو میں
 نے نواب کی حویلی پہنچایا تھا اور بڑی بیگم کو جولا کا ہوا تھا اس کو
 بھی میں نے مشتری بیگم کے کمرے میں پہنچا دیا تھا صرف دو
 دن وہ لڑکی بڑی ہے مگر کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے مشتری بیگم
 نے بڑی ہوشیاری سے یہ بات اڑائی تھی کہ ان کے ہاں لڑکا
 ہوا ہے۔ یہ بات بھی میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں ان
 کو بتادی تھی کہ بڑی بیگم کو لڑکا ہی ہوگا اور تم کو لڑکی ہوگی۔ وہ
 پہلے سے پروگرام بنائے ہوئے تھیں میں بے شک بہت
 بڑی گناہ گار ہوں حکیم صاحب مجھے کوئی راستہ بتائیں۔“ وہ
 خاموش ہو گئی۔

”راستہ تو ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کو تیار

ہوں۔“ وہ بولی۔

ایسا کیا۔ مرنا صرف مجھ ہی کو ہے تم نہیں مرو گی تمہارے کس کام آئے گا یہ سب۔ کیا قبر میں ساتھ لے کر جاؤ گی اور اگر تم میری بہن نہ ہوتیں تو شاید میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتا کہ پوری دنیا دیکھتی اور تمہارے چہرے پر تھوکی مگر میں صرف یہ کرتا ہوں کہ تم کو اس حویلی میں کل سے نہیں دیکھوں گا۔ اپنی لڑکی کو لے جاؤ اور میرا بیٹا میرے حوالے کر دو۔“

مشتري بيگم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہلدی کی طرح زرد چہرہ تھا کوئی معافی کا لفظ اس کی زبان پر نہیں تھا وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور نواب کے پیروں میں گر پڑی۔ نواب نے اپنے پیرے سکڑے لٹے اور کھڑے ہو کر کہا۔ ”اگر تم خود سے اعتراف کرتیں تو کچھ گنجائش نکل آتی مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ میں تم کو معاف نہیں کروں گا۔ اصغری نے خود اعتراف کیا ہے میں اس کو معاف کرتا ہوں۔ تمہارے لئے میرا وہی حکم ہے کہ کل تم حویلی میں نظر نہ آؤ۔“ اور نواب شیر جنگ کمرے سے چلے گئے۔

انسانی دوست بن کر دشمنی کی یہ داستان رد و لود کا ختم کی تو میں نے کہا۔ ”واقعی آدمی جب گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شیطان اس کو نت نئے راستے دکھاتا ہے اور وہ ان راستوں پر اتنی دور نکل جاتا ہے کہ واپسی کا راستہ تک بھول جاتا ہے۔ وہی حال مشتري کا ہوا۔ شیطان انسان کو کس کس طرح اپنے جال میں پھنساتا ہے اور جب ایک دفعہ انسان پھنس جاتا ہے تو وہ اس بدی کو پائیدار بنانے کو اور کوئی ترکیب انسان کو بتاتا ہے اور پھر وہ ایک ایسے مہنور میں الجھ جاتا ہے کہ پھر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا حکیم صاحب۔ گرنیکی کی روشنی بہت جاندار ہوتی ہے۔ بدی کتنی بھی قوی ہو جائے نیکی کی ایک کرن بھی اس کو ختم کر دیتی ہے۔ نیکی کا عمل کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ نیکی خود بخود بھیت پڑے اور خود ہی پائیدار بھی ہو جاتی ہے۔ یہ دل میں از خود پیدا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر بھی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جس کو آپ ضمیر کے نام سے جانتے ہیں وہ بھی مرنا نہیں کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا

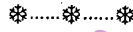
نواب شیر جنگ گردن جھکائے کچھ خاموش رہے پھر بولے۔ ”تو پھر حکیم صاحب آپ ہی فیصلہ کر دیں۔“
”دیکھئے نواب صاحب۔ انسان گناہ کرتا ہے خوب کرتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ اس کا ضمیر جاگ جاتا ہے وہ توبہ کرتا ہے۔ توبہ کے دروازے تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس کی توبہ بھی قبول ہو جاتی ہے اور وہ اس گناہ کی غمگینی سے نکل جاتا ہے۔ شیطان بار جاتا ہے جب انسان جھوٹ کی سیاسی سے نکل کر سچ کی روشنی میں آ جاتا ہے تو اس کو پھر معاف کر دینا ہی سب سے احسن کام ہے۔ کم از کم اس کو احساس تو ہو گیا ہے کہ اس نے گناہ کیا تھا اور یہ معافی مانگنے اور سچائی بتانے تو آگئی ہے۔ اس کو کیا کہیں جواب تک شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہی ہے۔ جس کو اب تک اپنے گناہ کا احساس تک نہیں ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے درست کہا۔ میں اس کو بلاتا ہوں بات آج اور ابھی صاف ہو جانی چاہئے۔“ اور نواب شیر جنگ دروازے پر گئے اور مشتري بیگم کو بلوایا۔

چند منٹ کے بعد ہی مشتري بیگم آگئیں۔ ان کی نظر جب دایہ اصغری پر پڑی تو ان کو ایک جھٹکا لگا چہرے کے تاثرات بدل گئے مگر زبان سے صرف یہ کہا۔ ”تم کب آئیں اصغری۔“

اصغری نے جواب نہیں دیا۔ نواب صاحب بولے۔ ”ان کو حکیم صاحب لائے ہیں اور اپنے ساتھ ایک بھیا تک مطلب پرستی اور دولت کی حوس کی کہانی بھی لائے ہیں اس کہانی کا آغاز دس سال پہلے اس وقت ہوا جب ایک الچی عورت نے اپنے سگے بھائی کے گھر میں نقب لگائی اور اس کے پہلو بھٹی کے کڑے کو چرا لیا اور اپنا بیٹا بنالیا۔ اس کے بعد اتفاق سے کوئی لڑکا ہوا ہی نہیں اور اگر ہوتا تو وہ بھی چوری ہو جاتا۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا تم حویلی میں حکومت نہیں کرتی تھیں۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ تم نے جس ہانڈی میں کھایا اسی کو توڑنے کی کوشش کی۔ مجھے وارث سے محروم رکھ کر تم کو بیہ زمین مکان روپیہ سب مل جاتا اس لئے تم نے

ضرور آتا ہے کہ وہ خود بخود قوی ہو کر انسان کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اور روشنی کی طرف لے جاتا ہے گھپ اندھیرے میں اس کی روشنی کی ایک ہی کرن روشنی پھیلا دیتی ہے اور اندھیرا دور ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ بہت دیر میں ہوتا ہے کبھی جلدی مگر ہوتا ہے۔ مشتری بیگم کے اندر کا ضمیر اس کو ضرور روشنی کی طرف لاتا ہے مگر کب یہ میں نہیں بتا سکتا۔ ایک نہ ایک دن حق دار کو حق ضرور ملتا مگر وقت کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا اس لئے مجھے یہ کام کرنا پڑا اور مشتری کو ذلیل ہونا پڑا۔“



رام بھروسے بھروسے کے محلے رام بسا میں رہتا تھا۔ اس کی دو لڑکیاں جوان تھیں اور شادی کے لائق تھیں۔ اس کی تیسری اولاد ایک لڑکا تھا جو کہ ایک سال کا تھا۔ اس کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ وہ چاٹ کا ٹھیلہ لگاتا تھا۔ اس کی بیوی بھبھوٹی اور لڑکیاں دو بجے تک ٹھیلہ تیار کر دیا کرتی تھیں وہ سب صبح سے ہی آلو کے کباب، دہی بڑے بنانا شروع کر دیا کرتی تھیں، لڑکیاں میٹھی میٹھی چٹنیاں بنانے میں لگ جاتی تھیں دو بجے رام بھروسے ٹھیلہ لے کر نکلتا تھا۔ سارا گھر کام کرتا تھا۔ تب جا کے دس روپے کی بچت ہوتی تھی کبھی کبھی مال فوج جاتا تھا تو منافع بھی کم ملتا تھا اور الٹا نقصان بھی ہو جاتا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا کوئی بھروسہ اس کو آتا نہیں تھا تعلیم کے نام پر صرف تھا کرتا تو اس کو بھی کام تھا سو وہ کر رہا تھا۔ بڑی لڑکی کا رشتہ اس نے اپنی موسیٰ کے لڑکے کو دے دیا تھا۔ صرف تیار کر کے پھیرے کرانا باقی تھا۔ یہ لڑکی شکل صورت کی واجبی سی تھی اس سے چھوٹی اس کا نام گوتی تھی۔ وہ البتہ سب سے الگ سی لگتی تھی اس کی اٹھان بھی اچھی تھی۔ ناک نقشہ بھی خاندان سے الگ تھا۔ رنگ بھی گورا تھا۔ رام بھروسے بازار میں کاروبار کرتا تھا۔ لوگوں کی اچھی بری نظروں کو پہچانتا تھا اور زمانے کے رنگ ڈھنگ کو بھی سمجھتا تھا۔ آدمی کا گناہ اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ غریب ہے اس گناہ کی سزا اس کو عمر بھر جھگلتا پڑتی ہے۔ غریب عورت کا حسین ہونا بھی ایک گناہ بن جاتا ہے ہر کوئی لوٹ کا مال سمجھتا ہے۔ ہر کوئی اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ غریب ہے۔ غربت اس

معاشرے میں ایک گالی بن چکی ہے۔ ہندو معاشرے میں تو یہ اور بھی زیادہ گلی گزری بات ہے۔ شور ہونا بذات خود ایک گالی ہے۔ شور کتنا بھی نیک شریف ہو اس کو عزت مل ہی نہیں سکتی۔ ہندو جاتی کی کوئی قوم اس کو عزت نہیں دے گی۔ کیونکہ اس معاشرے کو جن لوگوں نے بنایا ہے انہوں نے صاف صاف دھارمک کتابوں میں لکھ دیا ہے کہ شور کے کچھ حقوق نہیں ہیں۔ وہ صرف خدمت کرنے کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی املاک نہیں ہے۔ وہ اس راستے پر بھی چل نہیں سکتا جس پر بڑی ذات کے چلتے ہیں۔ ان کو اپنا کنواں الگ بنانا ہوگا۔ مندر الگ بنانا ہوں گے کیونکہ ان کا بھگوان الگ ہے اور بڑی ذات کا مالک ہے۔ شور کی ہر اچھی چیز کو وہ بلا معاوضہ لے سکتے ہیں اور وہ منع نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں شاید حیرت انگیز لگیں مگر یہی حقیقت ہے۔

پھر گھومتی کا حسین ہونا گناہ ہی تو ہوا۔ رام بھروسے سب جانتا تھا اس نے گھومتی کو بارہ سال کی عمر سے ہی پردے میں بٹھادیا تھا اور اس کی ماں کو بھی بتادیا تھا کہ اس کو باہر ہرگز نہ جانے دے۔ اس طرح اس کی عمر اٹھارہ سال ہوگئی۔ باغ میں جب پھول کھلتے ہیں تو ان کی خوشبو پورے باغ میں پھیل جاتی ہے۔ گھومتی تو غریب کے گھر کا پھول تھی اس کی خوشبو کیوں نہ پھیلیں اور پھر ایک رات ایک پھولوں کا عید آ گیا اور پھول کو ڈالی سے توڑ کر لے گیا۔ رام بھروسے کچھ نہ کر سکا۔ نہ پولیس نے اس کا ساتھ دیا نہ کسی عزیز نے کچھ مدد کی اور صرف ایک ماہ بعد لوگ بھول بھی گئے۔ رام بھروسے کے دل پر ایک گہرہ گھاؤ پڑ گیا مگر وہ کس کو دکھاتا اندر ہی اندر سلگتا رہا جلا رہا اور بڑی کے ہاتھ پیلے کرتے ہی پر لوک سدھار گیا۔ اس کا لڑکا اس وقت آٹھ سال کا تھا اس کا نام واس دیو تھا۔ رام بھروسے کی بیوی خاموش ضرور تھی مگر اندر اس کے بھی گہرا رنج تھا۔ اس نے زندگی بھر محنت کر کے بچوں کو پالا تھا اور اس کا سب سے اچھا اور پسندیدہ کھلونا کوئی پھین کر لے گیا تھا مگر غریب کا گناہ اس کی زبان بند کئے ہوئے تھا اور پھر ایک دن وہ بھی اپنے پتی کے پاس چلی گئی۔ جتنی خاموشی سے پیدا ہوئی تھی اتنی ہی خاموشی سے دنیا

اس کے اندر ایک خوف کا دیو بیٹھا تھا کیونکہ اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ ہم تو خدمت گار ہیں۔ گندے ہیں بھگوان نے ہمیں اسی لئے پیدا کیا ہے کہ بڑی ذات کی چاکری کریں۔ ان کے جوئے کھائیں اور مرجائیں۔ باپ کی یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کی سمجھ میں یہ باتیں آتی گئیں مگر گھمی گھمی وہ سوچتا ضرور تھا کہ بھگوان اتنا ظالم ہے کہ اس نے سارے حقوق بڑی ذات والوں کو دے دیئے ہیں۔ کیا ہم اپنی مرضی سے دنیا میں آئے ہیں ہم کو کیا اس نے پیدا نہیں کیا۔ اس سے آگے اس کا داغ کام نہیں کرتا تھا۔ اس کا ماحول بھی ایسا تھا کہ اس کے دل میں اٹھنے والے سوالات کا جواب اس کو نہیں ملتا تھا۔ دلی سے آنے کے بعد اس نے ایک نئی دنیا دیکھی، نور احمد کا سلوک اور اس کا طریقہ انسانوں والا تھا۔ نور احمد پکا مسلمان تھا۔ وہ ہر کام اپنے مذہب کے دائرہ کار میں رہ کر کرتا تھا۔ مسلمان کارگیروں کے ساتھ وہ کھانا بھی کھاتا تھا مالک اور ملازم کا فرق یہاں نہیں تھا۔ کسی ذات برادری کا بھید بھاؤ وہ نہیں جانتا تھا۔ سب کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ واس دیو کے لئے یہ ایک نئی بات تھی وہ سوچتا کیا ان کے یہاں ذات برادری نہیں ہے کوئی چھوٹ چھات نہیں ہے۔ غریب امیر کا فرق نہیں ہے ایک صف میں سب اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور ایک ہی پلیٹ میں کھاتے ہیں اور اس نے جو ظلم و ستم اب تک دیکھے تھے اس کے مقابلے میں یہ ایک نئی بات تھی۔ اس کا اس سے متاثر ہونا تو لازمی تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اسلام کے قریب آتا گیا۔ اس کا دل بھی کرتا کہ وہ سب کے ساتھ کھانا کھائے سب کے ساتھ مسجد جائے۔ عید پر نئے کپڑے پہن کر نور احمد کے ساتھ جامع مسجد جائے اور نور احمد سے عیدی طلب کرے۔ مگر وہ تو ایک ہندو تھا اور ہندو بھی شور جس کی زبان تو پیدا ہوتے ہی کاٹ دی جاتی ہے۔ اس کے دل میں بڑی ذات والوں کا خوف بھر دیا جاتا ہے صرف ہاتھ اور پیر چھوڑے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کی غلامی کر سکے۔ اس کی زبان پر تو تالے پڑے ہوئے تھے وہ نور احمد سے بہت کچھ

چھوڑ گئی۔ یہی غریب شور کی زندگی ہے ان کی زندگی میں کوئی بلچل نہیں ہے کوئی خوشی نہیں ہے خاموشی سے آتے ہیں خدمت کرتے ہیں جوئے کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ واس دیو اکیلا رہ گیا۔ بجنور میں وہ کیا کرتا ایک اپنے جیسے دوست کے ساتھ دلی چلا آیا اور ایک کار چوہی کے کارخانے میں ملازم ہو گیا۔ اس کا رخانے کا مالک ایک مسلمان نور احمد تھا۔ واس دیو دن میں کارخانے میں کام کرتا اور سیکھتا اور رات کو چھت پر ہی سو جاتا کیونکہ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اس چھت پر اس کے علاوہ دو لوگ بھی سوتے تھے۔ نور احمد کا سلوک سب کارگیروں کے ساتھ ایک جیسا تھا وہ نہ کسی ذات برادری کو دیکھتا تھا نہ ہندو مسلمان میں فرق کرتا تھا۔ وہ صرف کام دیکھتا تھا اور سب کو ان کی محنت کا معاوضہ ایمانداری سے ادا کرتا تھا۔ یہاں کا ماحول بجنور کے کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ واس دیو نے ایسا کب دیکھا تھا اس کے ساتھ تو ہمیشہ گرا ہوا سلوک ہوتا رہا تھا۔ کبھی کسی نے اس کے نام سے نہیں پکارا تھا۔ وہاں سب ہی اوئے اے واسو کہا کرتے تھے۔ یہاں پر سب کو کام کے اعتبار سے عزت ملتی تھی۔ وہ شروع میں اٹھائی دھرائی کا کام کرتا سب لوگ واسو کہتے تھے اور وہ جب کارگیٹر بن گیا تو واس دیو ہو گیا۔

یہاں پر عزت کام کی تھی ذات برادری کی نہیں تھی۔ اس سے نور احمد نے کبھی نہیں پوچھا کہ اس کا باپ کیا کرتا تھا کس ذات کا تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ یہ ہنو ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ واس دیو کی مندر میں نہیں جاتا تھا ایک تو وہ مذہب سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔ دوسرے اس کے دل میں ایک خوف بھی تھا کیونکہ وہ شور تھا یہ تو وہ جانتا تھا کہ ہندو معاشرے میں اس کی کیا عزت ہے۔ وہ کسی مذہب کی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا دوست گوپی جس کے ساتھ وہ آیا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ واس دیو تو تانستک ہو گیا ہے دھرم کی تو بات ہی نہیں کرتا حالانکہ وہ خود بھی کبھی مندر نہیں گیا تھا۔ واس دیو کی دھرم کو نہیں جانتا تھا اس نے کسی مندر کو اندر سے نہیں دیکھا تھا وہ کسی مندر میں جا ہی نہیں سکتا تھا۔

”نہیں تم روزہ نہیں رکھ سکتے اس لئے کہ پہلی شرط مسلمان ہونا ہے“ نور احمد نے جواب دیا۔

”مجھے مسلمان اور ان کے طریقے اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں میں بھی ان جیسا بن جاؤں تو پھر میں کیا کروں“ واس دیو نے پوچھا۔

”تمہارا دل اگر اسلام کی طرف راغب ہے تو تم مسلمان ہو جاؤ۔“ نور احمد نے کہا۔

”میں تیار ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ واس دیو نے پوچھا۔

”تم دل سے مسلمان ہونا چاہتے ہو تو تم کو کچھ نہیں کرنا ہوگا میں سب کچھ کروں گا مگر میں تم کو مشورہ دوں گا کہ تم پہلے اسلام کو سمجھو اور اپنے اندر کی آواز پر لیک کہو۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”میں بہت دن سے تیار ہوں۔ مجھے تمہارے اصول قاعدے اچھے لگے ہیں مگر میری زبان پر یہ نہیں آ رہا تھا اس لئے خاموش تھا۔“ وہ بولا۔

”یہ رمضان شریف کی برکت ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ تم کو میرے اصول اور قاعدے اچھے لگے۔ یہ اصل میں میرے پیارے نبی کے اصول و قاعدے ہیں جن پر ہم عمل کرتے ہیں میں آج ہی جامع مسجد جاؤں گا وہاں امام صاحب سے تمہارا ذکر کروں گا اور پھر تم کو ان کے پاس لے کر جاؤں گا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔“ اور اس طرح واس دیو جنیل احمد بن گیا اور رمضان کے روزوں کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست گوپی بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام غفور احمد رکھ دیا گیا۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی یہ بات پھیلنے لگی نور احمد کے خلاف ہندوؤں نے یہ اڑادی کہ یہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر رہا ہے دھرم کے نام پر ہندوؤں کو ایک مقام پر لانے کا کام پنڈت کشن چند نے کیا اور ایک دن کشن چند اور اس کے کچھ چیلے نور احمد کے کارخانے آ گئے۔

کشن چند نے آتے ہی نور احمد سے کہا۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہے میاں جی۔ ابھی ہم مر نہیں گئے ہیں ہم زندہ

کہنا چاہتا تھا مگر پشت پاشت کی بزدلی اور زبان کی تالابندی کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ پاتا تھا۔

یہی حالت گوپی کی تھی دونوں نور احمد اور سب مسلمان کاریگروں کو دیکھتے تھے کسی نے ان کو شور یا بچ کہہ کر ان کی عزت نفس کو بے عزت نہیں کیا تھا۔ کسی نے ان کو گھٹیا انسان نہیں سمجھا۔ وہ خود ہی ڈرے ڈرے سہے ہوئے رہتے تھے۔ ان میں کسی کی کیا غلطی تھی یہ خوف صدیوں کا خوف تھا چند دن میں تو دور نہیں ہو سکتا تھا گوپی اور واس دیو دونوں اب بہترین کاریگر تھے۔ نور احمد بھی ان سے خوش تھا۔ چھ ماہ گزر گئے رمضان کا مہینہ آ گیا نور احمد کے ساتھ سارے مسلمان ملازمین روزہ رکھنے لگے۔ پہلے روزے والے دن نور احمد نے واس دیو اور تمام غیر مسلم ملازمین جن کی تعداد کل سات تھی کہا۔

”دوپہر کا کھانا تو رمضان کی وجہ سے ہم سب کا بند ہے۔ یہ اللہ کا مہینہ ہے سب مسلمان روزہ رکھیں گے آپ لوگوں کے کھانے پر پابندی نہیں آپ لوگ چھت پر جا کر کھالیا کریں اور پانی بھی وہیں جا کر پی لیں سگریٹ بیڑی جو بیٹا ہے وہ بھی چھت پر اپنا شوق پورا کر سکتا ہے۔ ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں آپ لوگ افطار سے پہلے چھٹی بھی کر لیں کام بند کر دیں کیونکہ یہاں پر افطار کا بندوبست باقی سب کے لئے کرنا ہوتا ہے۔ اگر کام باقی ہے اور کرنا ہو تو ایک گھنٹے کے بعد آ جانا کام کر لینا لیکن مسلمان کاریگر افطار کے بعد کام نہیں کریں گے کیونکہ کھانے کے بعد نمازوں کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ کام کرنا چاہیں تو افطار کے بعد کر سکتے ہیں۔“

واس دیو نے پوچھا۔ ”استاد روزہ کیا ہوتا ہے۔“ نور احمد نے کہا۔ ”اللہ کا حکم ہے۔ سال میں ایک مہینہ روزہ رکھو اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ میں مولوی تو نہیں ہوں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کو پورا کرنا ہے۔“

”میں بھی روزہ رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں۔“ واس دیو نے پوچھا۔

ہیں اور دھرم بھی زندہ ہے اور اس زندہ دھرم کی خاطر ہم اپنی جان لڑا دیں گے۔“

”میں نے کیا کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔“ نور احمد نے کہا۔

”تم نے دو ہندو لونڈوں کو مسلمان بنالیا وہ بھی زبردستی۔“ پنڈت کشن چند نے کہا۔

”میرے کارخانے کے دو ملازمین نے اسلام قبول ضرور کیا ہے مگر ان کے ساتھ زبردستی کسی نے نہیں کی۔ وہ اپنی مرضی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کرتا اور اگر تم سچے بھی ہو تو کان کھول کر سن لو ہم ان کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ اس طرح تو سارے مسلمانوں کو لو گے ہمارا دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا۔“ پنڈت کشن چند نے غصے سے کہا۔

”پنڈت جی آپ بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ دونوں اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں تو زبردستی کی اجازت ہی نہیں ہے پھر ہم ایسا کیوں کریں گے اگر ان سے پوچھنا چاہیں تو خود پوچھ لیں۔“ نور احمد نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے ان کو بلاؤ۔“ پنڈت نے جلدی سے کہا۔ چند منٹ ہی میں دونوں آگئے، تو پنڈت نے کہا۔ ”تم دونوں میں سے واس دیو کون ہے؟“ دونوں خاموش رہے کوئی جواب نہیں دیا۔ پنڈت کی تیوریوں پر ہزاروں بل چڑھ گئے۔ وہ پھر غصے سے بولا۔

”کیا تم دونوں بہرے ہو کہ میری بات کا جواب نہیں دے رہے۔ جلدی بتاؤ۔“ مگر دونوں ہی خاموش تھے اب تو پنڈت غصے سے لال بھوکا ہو گیا۔

”جواب تو تم کو دینا ہوگا باندھ کر لے جاؤں گا پھر تو بتاؤ گے۔“ پنڈت نے کہا۔

”ہم نے ایسا کیا جرم کر دیا ہے کہ آپ اس قدر ناراض ہیں۔“ جمیل نے پوچھا۔

”پنڈت نے جمیل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا الٹا

سوال کر دیا۔“ تو نبی واس دیو ہے۔“

”نہیں میرا نام جمیل احمد ہے اور یہ غفور احمد ہے۔

یہاں کوئی واس دیو نہیں ہے۔“ جمیل احمد نے جواب دیا۔

”تم کو اس نے کیا لالچ دیا ہے۔“ پنڈت نے نور احمد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اس کی محبت ایک انسان سے انسان کی محبت

ہے۔ اس کا سلوک برابری کا درجہ یہ اس کا لالچ ہے

آپ مجھے یہ لالچ دے سکتے ہیں آپ مجھے وہ عزت

دے سکتے ہیں جو اس نے دی ہے۔ میں ان کے ساتھ

ایک پلیٹ میں کھانا کھاتا ہوں آپ ایسا کر سکتے ہیں۔

دھرم دھرم کی ڈونڈی بجاتے ہو۔ تمہارا دھرم صرف بڑی

ذات کا دھرم ہے۔ میں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا

ہے میں مر سکتا ہوں مگر اس پیارے دھرم کو نہیں چھوڑوں

گا اور یہ میرا دوست اس نے بھی میری طرح ہی اسلام

قبول کیا ہے مگر یہ بھی میری طرح آزاد ہے۔ اس کا دل

کرے تو یہ آپ کے ساتھ جاسکتا ہے کوئی اس کو نہیں

روکے گا۔

”لو یوں کہو کہ گھورے کی اینٹ چوبارے پر لگ

گئی ہے مگر یاد رکھو جو میرا نام کشن چند ہے۔ میں بھی تجھے

چھوڑوں گا نہیں۔ پھر گھورے پر پہنچا کر دم لوں گا اور یہ جو

تیرا سرخ تیرے سر پر ہاتھ رکھ رہا ہے اس کا تو وہ حشر کروں

گا کہ آئندہ کبھی ایسا کرنے کے لائق ہی نہیں رہے گا۔ آؤ

سجوں اب کوئی دوسرا ہی راستہ اپنانا ہوگا۔“ اور پنڈت

پہنچھٹاتا ہوا چلا گیا۔

پنڈت کشن چند کڑھندو تھا اور پھر برہمن۔ وہ کب یہ

چاہے گا کہ ان کا ایک غلام کم ہو جائے اور وہ عزت کی زندگی

گزارے۔ اس نے اپنے حلقے میں اس بات کو پھیلانا شروع

کر دیا۔ نور احمد کے خلاف ایک محاذ بنالیا جمیل اور غفور کا گھر

سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ یہ حالت نور احمد نے دیکھی تو وہ امام

صاحب سے ملان ان کو حالات بتائے تو انہوں نے کہا۔ ”نور

احمد تم نے ایک نیک کام کیا ہے اور ہر نیک کام کرنے والے کو

قربانی دینا پڑتی ہے۔ تم ان حالات سے مت گھبراؤ میں

تمہارے ساتھ ہوں۔ ساری دلی کے ہندو بھی اگر ایک ہو جائیں تو بھی ہم قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔“

جیل احمد اور غفور احمد پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا۔ ہندوؤں کے اس زمانے کے سرکردہ ہندو نیتوں نے بڑے بڑے لالچ ان دونوں کو دیئے مگر کچھ نہ ہوا۔ جب تو کے دو گنام لڑکے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا جو ہندوؤں کی گھنیا ترین ذات سے تعلق رکھتے تھے اچانک ہندوؤں کے ناک کا بال بن گئے۔ ان کی عزت کا سوال بن گئے یہ سب پنڈت کشن چند کا کیا دھرا تھا۔ جب کسی طرح ان کا بل نہیں چلا تو وہ گھنیا حرکتوں پر اتر آئے۔ ایک دو دفعہ ان دونوں پر حملہ کرانے کی کوشش کی مگر نور احمد نے ان کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ ہندو ناکام ہوئے مگر ان کی کوششیں جاری رہیں۔ مسلمان بھی تیاری پر تھے دلی کی فضا بڑی کشادہ تھی۔ مگر انگریزی قانون دونوں کے لئے برابر تھا۔ ہندوؤں کو ہندو نیتا ڈھارس دے رہے تھے تو مسلمانوں کے ساتھ بھی مسلمان لیڈر تھے۔ کسی وقت بھی چنگاری بھڑک کر بھیا نک آگ بن سکتی تھی انگریز انتظامیہ کو بھی احساس ہو گیا تھا اس لئے دونوں فریقوں کو ایک میز پر جمع کر دیا۔

ہندوؤں کا موقف تھا کہ یہ لوگ زبردستی ہندوؤں کو مسلمان کر رہے ہیں مگر اس دلیل کے لئے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ اگر کوئی اپنی خوشی سے ہمارے اخلاق یا ہماری تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتا ہے تو ہم اس کو منع نہیں کر سکتے۔ اس کیس میں بھی جی ہوا ہے جمیل احمد اور غفور احمد کو بلایا گیا انہوں نے وہی کہا جو مسلمان کہہ رہے تھے۔ ہندوؤں کو تاکید کر دی گئی کہ آئندہ وہ یہ ایٹو نہ اٹھائیں، پنڈت کشن چند کو پابند کر دیا گیا کہ اگر کسی قسم کا جھگڑا ہو تو اس کا ذمہ دار اس کو سمجھا جائے گا اور سزا بھی اس کو ہی ملے گی۔ یہ مسلمانوں کی فتح تھی مگر انگریز نے ان کو بھی پابند کر دیا کہ خاموشی اختیار کریں۔ وقتی طور پر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ بیان بازی کا سلسلہ بھی رک گیا مگر اندرونی طور پر ختم نہیں ہوا، پنڈت کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی وہ دوسرے طرح سے ناکام ہوا تھا ایک تو مسلمانوں کا موقف مانا

گیا دوسرے وہ بیچ ذات و عزت والا بن گیا۔

اور پھر وہ بجنور چلا گیا۔ یہ پتہ کرنے کے واس دیو کے ماتا پتا کہاں رہتے تھے اور کیا کرتے تھے وہاں اس کو پتہ چل گیا کہ واس دیو کے پتا کا نام رام بھروسے تھا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکے کا باپ تھا اور چاٹ کا ٹھیلہ لگاتا تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی کر دی تھی چھوٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی یا کوئی اٹھا کر لے گیا۔ لڑکا کیلارہ گیا تھا وہ دلی چلا گیا۔ اس کا ہی نام واس دیو تھا۔

اس کو بھی پتہ چل گیا کہ لڑکی کا نام گھومتی تھا اور وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس پر ٹھاکر ہری سنگھ کا دل آ گیا اور وہ لے گیا تھا۔ ٹھاکر ہری سنگھ اس علاقے کا اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ پنڈت ایک کانیاں مطلب پرست آدمی تھا اس کے شیطان ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ٹھاکر کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور وہ ٹھاکر ہری سنگھ کے پاس چلا گیا۔ ٹھاکر بجنور سے ذرا فاصلے پر رہتا تھا اور ایک بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ بلا کا عیاش اور شرابی تھا عیاری مکاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ پنڈت سے وہ عزت سے ملا مگر اتنی عزت اس نے نہیں کی جتنی کا پنڈت خود کو اہل سمجھتا تھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں بولا کوئی اور موقع نہ ہوتا تو شاید پنڈت اپنی بڑی ذات ہونے کا ٹھاکر کو احساس کرانے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ موقع اس کے لئے مناسب نہیں تھا وہ اپنی غرض سے آیا تھا اس کو ٹھاکر کی کیا ضرورت تھی۔

پنڈت اندر ہی اندر کڑھتا رہتا مگر ٹھاکر نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”ہاں مہاراج پنڈت کشن چند جی اتنی دور آنے کا ہے کشٹ اٹھایا۔“

پنڈت چونک پڑا اور بولا۔ ”ارے ٹھاکر صاحب شرمندہ کر رہے ہیں۔“

”نہیں میں پوچھ رہا ہوں۔ کا ہے آنا ہوا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”کچھ برس پہلے ایک کنیا آپ کے پاس آئی تھی۔ اس کا نام گھومتی تھا۔ بڑی کٹیلی کنیا تھی وہ واقعی اس لائق تھی کہ آپ کی حویلی میں سجا کر جائے۔ وہ سسرال کا باپ

روک تھام تو کرنا پڑے گی کچھ تو پائے کرنا پڑے گا۔“ پنڈت نے کہا۔

”چنتا کی بات تو ہے مگر اتنی نہیں جتنی تم نے بتائی ہے تم دلی والے کوئی پائے کر دے میں کیا کروں میں تمہاری لڑائی میں ٹانگ کیوں ڈالوں۔“ ٹھاکر نے صاف جواب دے دیا۔

پنڈت یہ سن کر ذرا تامل کیا مگر وہ ہار ماننے والا کب تھا اس نے دوسرا داؤ مارا۔ ”اب یہ آگ دلی سے بجور آنے والی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو پتہ چلا ہے کہ واس دیو جو کہ اب جیل احمد ہے کی بہن آپ کی حویلی میں موجود ہے۔ مسلمان تیاری کر رہے ہیں کہ اس کو یہاں سے برآمد کرادیں اب تو آپ اور میں ایک ہی کشتی میں سوار ہو گئے۔“ پنڈت نے کہا۔

”پنڈت تم پوری تیاری کر کے آئے ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو مسلمان تو کیا تم بھی ان کے ساتھ آ جاؤ تو بھی کتنا کو برا آمد نہیں کر سکتے اول تو تمہاری بات پر مجھے یقین ہی نہیں ہے۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”یہ بھی خوب رہی میں دھرم کے رشتے چتاؤنی دینے آیا ہوں اور تم ہو کہ میری بات کا یقین ہی نہیں کرتے تمہاری مرضی نہ کرو میں نے تو دھرم کے ناطے جو کرنا تھا وہ کر دیا۔ اب آ گیا دو میں چلتا ہوں۔“ پنڈت چلا گیا مگر ٹھاکر کے دل میں ایک پھانس ضرور ڈال گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ساری ہندو برادری پر بھاری پڑ سکتا تھا مگر مسلمانوں سے لڑنا بہت مشکل تھا۔ سینکڑوں سال کی تاریخ گواہ تھی کہ مسلمان ہندوستان پر حکومت کرتا آیا تھا اور صرف اپنی بہادری کی وجہ سے وہ کامیاب ہوا تھا۔ پنڈت بھاری تھا مگر مسلمان اس پر بھاری تھانے بہت غور کیا اور پھر ایک فیصلہ کر لیا۔

پنڈت کے تن بدن میں ٹھاکر کے رویہ نے آگ لگا دی تھی۔ اندر سے وہ ٹھاکر کا بھی دشمن ہو گیا تھا وہ اس کے غرور کے شے کو بھی چکنا چور کرنا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی اور اس نے

چاٹ فروش کیا اس کی قدر کرتا۔ اچھا کیا کہ آپ نے اس پر یہ احسان کر دیا۔

پنڈت خاموش ہوا تو ٹھاکر بولا۔ اس کے چہرے پر کوئی اچھے تاثرات نہیں تھے۔ ”تم کو یہ بات کس نے بتائی کہ وہ چھوری میری حویلی میں آ گئی ہے۔“

”ارے ٹھاکر جی یہ بات تو بجور کے سب لوگوں کو پتہ ہے آپ کے پاس کوئی نہیں آیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے رام بھروسے مر گیا اس کی گھر والی مرنے کی بات اٹھاتا کسی اور کو کیا غرض پڑی ہے کہ دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ پھنسائے۔“

”تو پھر پنڈت تم کا ہے پریشان ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ ٹھاکر نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”شریمان ہم تو اپنا کام ہی کر رہے ہیں بات ہندو جاتی کی عزت کی آن پڑی ہے اس لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ دھرم کی خاطر تو ہم اپنی جان پر کیل جائیں۔“ پنڈت نے آواز کو پراثر بنا کر کہا۔

”تم ان چکروں میں مت پڑو بھجن کیرتن کرو دان دکھنا لو اور مفت کی روٹیاں کھا کر جان بناؤ تمہارا کام جان دینا اور لیتا نہیں ہے اور دھرم کو میری وجہ سے کیا خطرہ ہو گیا کہ تم میرے پاس دوڑے آئے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ہاں بتاتے ہیں وہی بتاتے تو آئے ہیں۔ اس چھوری کا ایک بھائی واس دیو تھا وہ اور ایک چھورا چھوری کے جانے کے بعد دلی چلے گئے تھے۔ وہاں پر وہ ایک کار جوئی کے کارخانے میں کام کرنے لگے۔ اس کارخانے کا مالک مسلمان نور احمد ہے۔ وہ وہاں پر کام کرتے رہے اور وہیں رہتے بھی تھے اور کچھ دن کے بعد وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ دلی کے ہندوؤں نے بڑا شور مچایا مگر ان کا کچھ نہ لگاڑ سکے کیونکہ ان دونوں نے انگریز سرکار کے سامنے یہ اقرار کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئے ہیں اب بتاؤ یہ ڈیڑھ مسلمان ہوتے گئے تو مسلمانوں کی طاقت تو دلی شہر میں بہت بڑھ جانے گی اور ہم دیکھتے ہی رہیں گے۔ اس کی

طاقت کے ساتھ جانا ہوگا۔“ پنڈت نے کہا۔
 ”اور اگر یہ بات جھوٹ ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔“ جمیل
 نے پوچھا۔

”میرے علاوہ بھی تم بجنور میں جا کر پتہ کرلو۔
 تمہاری بہن ٹھاکر کی حویلی میں ہی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔
 پنڈت تو آگ لگا کر چلا گیا مگر جمیل کا سکون و چین بھی ساتھ
 ہی لے گیا۔ اندرونی کرب اور بے چینی اس کے چہرے پر
 نظر آنے لگی تو نور احمد نے پوچھا۔

”کیا بات ہے جس میں تم کچھ پریشان ہو۔“
 ”ہاں استاد میں بہت پریشان ہوں۔“ جمیل نے
 جواب دیا۔

”اپنی پریشانی میں مجھے شریک نہیں کرو گے۔“ نور
 احمد نے کہا۔

”آپ کے سوا میرا کون ہے میں آپ کو ہی بتاؤں
 گا۔ بات یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں تھیں ایک کی شادی میرے
 باپ نے کر دی تھی اور ایک کو کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسی غم
 میں ماں باپ دونوں مر گئے میں غمور کے ساتھ دلی چلا آیا۔
 مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری بہن کہاں کس حال میں ہے مگر اب
 پتہ چلا ہے کہ وہ ٹھاکر ہری سنگھ کی حویلی میں قیدی کی زندگی
 گزار رہی ہے۔“ جمیل خاموش ہو گیا۔
 ”اور یہ ٹھاکر ہری سنگھ کہاں رہتا ہے۔“ نور احمد نے
 پوچھا۔

”وہ بجنور سے قریب ہی اپنی جاگیر میں رہتا ہے
 بہت بڑا جاگیردار ہے۔ میں نے اس کا صرف نام سنا ہے
 دیکھا کبھی نہیں۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں کر سکتا وہ اپنی جاگیر
 میں بہت مضبوط ہے۔“ جمیل نے جواب دیا۔ نور احمد کچھ
 دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

”ماپوس مت ہو۔ بے شک وہ بہت مضبوط ہے اپنی
 جگہ پر مگر اللہ نے چاہا تو کوئی راستہ ہم بھی پالیں گے برہی کو
 ختم کرنے کے لئے نیکی آ جاتی ہے یہ ہمارا ایمان ہے۔“ نور
 احمد نے کہا۔

”میری تو نیند اڑ گئی ہے۔ خت بے چینی ہے دل کرتا

اپنے چہرے پر ایک چہرہ اور چڑھا لیا دوستی کا چہرہ محبت کا چہرہ
 اس کے بولنے کا لہجہ بھی بدل گیا اور وہ مسلمانوں سے
 میل ملاقات بھی کرنے لگا۔ نور احمد کے پاس بھی آنے
 جانے لگا۔ جمیل اور غفور سے ملنے لگا کچھ اعتماد کی فضا بحال
 کرنے کے بعد ایک دن پنڈت نے جمیل کی طرف ایک
 باریک سا کنکر پھینکا۔
 ”میں نے سنا ہے تمہاری ایک بہن بھی ہوا کرتی
 تھی۔“

”ایک نہیں دو بیٹیاں تھیں۔“ جمیل نے جواب دیا۔
 ”ایک کی تو شادی ہو گئی تھی۔ دوجی کیا ہوئی۔“
 پنڈت نے پوچھا۔

جمیل نے جواب نہیں دیا۔ خاموش رہا تو پنڈت
 نے پھر کر دیا۔ ”تم نے بتایا نہیں دوجی کا کیا ہوا۔“ پنڈت
 نے کہا۔
 ”گڑے مردے مت اکھاڑو پنڈت اس بات کو
 رہنے دو رنج ہوتا ہے۔“ جمیل نے کہا۔

”تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے میں تم کو رنج پہنچانے کو
 نہیں پوچھ رہا تھا۔ نہیں بتاتے تو تہ بتاؤ مگر مجھے پتہ نہ چلا ہے
 کہ ٹھاکر ہری سنگھ کی حویلی میں بھاری قیدی کی گزار رہی
 ہے اب تم ہوشیار ہو کوئی اپائے کر کے اس کی جان اس قید
 سے چھڑا سکتے ہو۔ تم بھائی ہو اور تمہارے پیچھے مسلمانوں کی
 ایک بڑی طاقت بھی ہے۔ یہ ٹھاکر تمہارے سامنے کیا ہے
 اب تم واس دیو نہیں ہو واس دیو تو بچارا مجبور و لاچار تھا تم تو
 نہیں ہو۔“ پنڈت نے یہ کہہ کر جمیل کے چہرے پر آتے رنگ
 دیکھنے لگا۔

پنڈت نے تو ایک کنکر پھینکا تھا مگر اس کنکر نے جمیل
 احمد کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کی آنکھیں نم
 ہو گئیں۔ پنڈت سب دیکھ رہا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ لوہا سرخ
 ہو چکا ہے اب چوٹ لگانے کا وقت ہے وہ بولا۔ ”میں
 تمہارے دکھ کو بھٹتا ہوں مگر یہ کام رونے دھونے سے نہیں
 ہوگا تم کو کہہ سنا پڑے گی وہ اکھنڈی تھا کہ تمہارے آنسو دیکھ
 کر نہیں پھٹے گا میں اس کو جانتا ہوں تم واس کے پاس

ہے اڑ کر بجور جاؤں اور اس ٹھاکر سے بھڑ جاؤں۔“ جمیل نے جذباتی ہو کر کہا۔

”نہیں تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے کیونکہ جذباتی فیصلے ہمیشہ نقصان پہنچاتے ہیں اور جو فیصلے دماغ کرتا ہے وہی کامیابی دلاتے ہیں۔ تم خود پر کنٹرول کرو تم نے مجھے بتا دیا یہ معاملہ میرا ہے تم سکون سے رہو انشاء اللہ بہتر راستہ نکل آئے گا۔“

جمیل کے اندر تو آگ بھڑک رہی تھی اس کو ایک پل چین نہیں آ رہا تھا جب تک اسے یہ نہیں تھا اس وقت تک وہ بیجور تھا۔ کہاں تلاش کرتا مگر اب تو وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں بہن کہاں پر ہے اس کے ساتھ ساتھ بھیا تک اور شرمناک خیالات اس کو آتے جا رہے تھے۔ وہ اس کی بے چینی کو اور بڑھا رہے تھے۔ دو دن کے بعد اس کی حالت اور خراب ہو گئی اور اس کو سخت بخار چڑھ گیا۔ کھانا پینا تو اسی دن سے چھوٹ گیا تھا جس دن پنڈت کنکری مار گیا تھا۔ نور احمد پریشان ہو گیا۔ کئی جگہ سے دوائیں وہ لایا مگر جو آگ جمیل کے اندر تھی وہ کب بخار اترنے دیتی۔ نور احمد اس سے دکھ کو سمجھ رہا تھا مگر اس کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔ جمیل کی حالت گرتی جاتی تھی اس کو اندر کا غم ایک منٹ چین نہیں لینے دے رہا تھا اور اسی حالت میں اس کو کمرے پاس لایا گیا۔

میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ کوئی بڑی خرابی ایسی نظر نہیں آئی جو بخار اترنے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے راولو کا اشارہ لیا اس نے بھی معائنہ کیا اور پھر کہا۔ ”یہ بخار طبی و معانی خرابی کا نتیجہ نہیں لگتا مریض کو کوئی بہت ہی گہرا صدمہ ہے اس کے اندر ایک بھٹی سی جل رہی ہے اس کے تفصیلی حالات پتہ کریں۔“

میں نے کچھ ضروری اور کچھ مقوی دوائیں مریض کو دیں اور پھر نور احمد سے پوچھا۔ ”مریض سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔ تو اس نے مریض کی پوری کہانی بیان کر دی۔ میرے ساتھ راولو کا بھی یہ کہانی سنتا رہا۔ نور احمد خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

”تم نے اپنا فرض ادا کر دیا اب یہ میرا فرض ہے یہ

انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا اس کا مرض سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جسمانی مریض تھا ہی نہیں۔ تم اس کو میرے پاس رہنے دو اگر تم خود بھی رہنا چاہو تو رہو۔“ میں نے کہا۔

”میرا ہنا اگر ضروری نہیں تو چلا جاتا ہوں صبح پھر آ جاؤں گا۔ میرے گھر سے آپ کا مطب تاکنے میں صرف آدھا گھنٹے کا سفر ہے۔“ نور احمد نے بتایا۔

”میں اس کو رات کو کچھ اور دوایں دینا چاہتا ہوں۔ صبح جب تم آؤ گے تو انشاء اللہ یہ تم کو ٹھیک ملے گا۔ پھر میں آپ کے سامنے کچھ باتیں کروں گا اور اس کی مشکل کا حل تلاش کروں گا۔“ میں نے کہا۔

نور احمد چلا گیا تو میں نے راولو کا سے مشورہ کیا اور ایک آزمودہ نسخہ جمیل کو کھلا دیا۔ نور احمد صبح آتا تو جمیل بستر پر بیٹھا تھا۔ اس کا بخار اتر چکا تھا مگر چہرہ پھر بھی اداں تھا اور کرب و تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے جمیل کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو جمیل۔“

اس نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔ ”بہتر ہوں۔“

”اب تم بہتر ہی رہو گے۔ خوش ہو جاؤ تمہارے صحت مند ہوتے ہی ہم تمہارے ساتھ بجور جائیں گے اور انشاء اللہ تمہاری بہن کو لے آئیں گے۔ تم اکیلے نہیں ہو میں چلوں گا۔ خود ٹھا کر سے بات کروں گا۔ اگر وہ نہ مانا تو ہم تمہاری بہن کو وہاں نہیں رہنے دیں گے۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

جمیل کے چہرے پر امید کی ایک روشنی سی پیدا ہوئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا ہم ہرگز ہرگز تمہاری بہن کو وہاں نہیں رہنے دیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ جمیل احمد کے کمزور جسم میں خانہ سی پڑ گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ جمیل نے کہا۔

”ہم جو کام کرتے ہیں اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ کسی پر احسان نہیں کرتے۔“ میں نے جواب دیا۔

معلوم ہوئی تھی دروازے پر ایک بچہ پروا دی بیٹھے تھے پی رہے تھے۔ ہم کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے اور ایک بولا۔
”کس سے ملنا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ٹھاکر صاحب سے کام ہے۔“
دوسرا بولا۔ ”کیا کام ہے یہ بھی تو بتاؤ۔“
میں نے جواب دیا۔ ”ان کو یہی بتائیں گے تم ان کو

ایک ہی ہفتہ کے بعد جیل احمد بالکل ٹھیک ہو گیا۔
ہر میں اس کے ساتھ مجبور روانہ ہو گئے۔ ریلوے
پر اس نے کہا۔ ”حکیم صاحب یہاں پر میرا تو کوئی
س ہے۔ سرائے وغیرہ میں ٹھہرنا ہوگا۔“
”ہم ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں
میں نے جواب دیا۔

”تم کو ٹھاکر ہری سنگھ کا ٹھکانا پتہ ہے۔“ رولو کا نے
”میں نے تو اس کا نام بھی پہلے بار سنا ہے۔“ جمیل
جواب دیا۔
”خیر پتہ کر لیں گے مشہور آدمی ہے پتہ پتہ جانے
سے اندر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد آ کر بولا۔ ”میرے
ساتھ آ جاؤ جاتے ہیں۔“

”کیا کہوں کچھ نام پتہ تو ہو؟“ وہ بولا۔
”کہو دی۔“ حکیم آئے ہیں۔ رولو کا نے جواب دیا۔
اس نے سر سے جیر تک رولو کا کوڑکھا اور خاموشی
سے اندر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد آ کر بولا۔ ”میرے
ساتھ آ جاؤ جاتے ہیں۔“

اور پھر ہم نے اسٹیشن کے قریب ہی ایک سرائے
انا بنا لیا۔ یہ سرائے مسلمان رہائے تھی اس لیے
کی بھی فکر نہیں تھی۔ رات کے کھانے کے بعد
ئے کے مالک سے پوچھا۔ ”رشید صاحب مجبور میں
جب سے ملنے آئے ہیں گران کا ٹھکانا ہم کو پتہ نہیں
ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔“
رشید سرائے کے مالک کا نام تھا وہ بولا۔ ”مجھے پتہ
رواؤ تاؤں گا پوچھئے۔“

”ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کا نام ٹھاکر
ہے۔“ میں نے کہا۔
”یہ بھی خوب رہی کسی تانگے والے کو کہہ دیجئے وہ
ان کے پاس پہنچا دیتا۔ بہت مشہور آدمی ہیں سب
نتے ہیں۔“ رشید نے جواب دیا۔

”آپ کا بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ تو وہ بولا۔
”شکریہ کی کیا بات ہے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“
دوسرے روز ہم ایک تانگے پر جاگیردار کی طرف
ئے ایک گھنٹہ کے بعد ہم جاگیردار ٹھاکر ہری سنگھ کی
لے سامنے کھڑے تھے۔ چوہلی کے چاروں طرف باغ
ما بہت بڑی چار دیواری تھی اس چار دیواری کے
یہ چوہلی و مزنلہ بنی ہوئی بہت قدیم عمارت تھی مگر

”ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کا نام ٹھاکر
ہے۔“ میں نے کہا۔
”یہ بھی خوب رہی کسی تانگے والے کو کہہ دیجئے وہ
ان کے پاس پہنچا دیتا۔ بہت مشہور آدمی ہیں سب
نتے ہیں۔“ رشید نے جواب دیا۔

”آپ کا بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ تو وہ بولا۔
”شکریہ کی کیا بات ہے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“
دوسرے روز ہم ایک تانگے پر جاگیردار کی طرف
ئے ایک گھنٹہ کے بعد ہم جاگیردار ٹھاکر ہری سنگھ کی
لے سامنے کھڑے تھے۔ چوہلی کے چاروں طرف باغ
ما بہت بڑی چار دیواری تھی اس چار دیواری کے
یہ چوہلی و مزنلہ بنی ہوئی بہت قدیم عمارت تھی مگر

”آپ کا بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ تو وہ بولا۔
”شکریہ کی کیا بات ہے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“
دوسرے روز ہم ایک تانگے پر جاگیردار کی طرف
ئے ایک گھنٹہ کے بعد ہم جاگیردار ٹھاکر ہری سنگھ کی
لے سامنے کھڑے تھے۔ چوہلی کے چاروں طرف باغ
ما بہت بڑی چار دیواری تھی اس چار دیواری کے
یہ چوہلی و مزنلہ بنی ہوئی بہت قدیم عمارت تھی مگر

سامنے ہی ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا۔ اس پر گلابی
مکر کی چادر پڑی تھی۔ تخت کے اوپر بڑی خوب صورت
چھت تھی اس کے کناروں پر بھی گلابی تیل لگی ہوئی تھی پورا

سامنے ہی ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا۔ اس پر گلابی
مکر کی چادر پڑی تھی۔ تخت کے اوپر بڑی خوب صورت
چھت تھی اس کے کناروں پر بھی گلابی تیل لگی ہوئی تھی پورا

کی طرف دیکھنے لگا میری باتیں سن کر ٹھاکر کے چہرے پر ایک رنگ آتا رہا ایک جاتا رہا۔ اس کی اخلاقی گراوٹ تو ہمارے سامنے تھی۔ کردار کی گراوٹ بہت پہلے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ صرف چہرے اور امارت کے دبے میں ہم آنے والے نہیں تھے۔

”میرے پاس آنے کا مقصد بتاؤ۔ ادھر ادھر کی کہانیاں سننے کا مجھے شوق نہیں ہے۔“ ٹھاکر نے غصے سے کہا۔

”آپ کو یہ کہانی ادھر ادھر کی معلوم ہو رہی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ہی آپ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اپنی زبان کو لگام دو حکیم، میری چھت کے نیچے مجھے ہی گالی دے رہے ہو۔“ ٹھاکر آگ گولا ہو گیا۔

”انسان ہر جگہ طاقتور نہیں ہوتا بے شک تم اپنی حویلی اور جاگیر میں خدا بنے ہو مگر یہ خدائی صرف کچھ دن کی ہے آخر اس کا آخری سرا آ جائے گا۔ پھر تم کیا کرو گے۔ کچھ گنجائش چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

”تم کہتے ہو کہ حکیم ہو۔ مگر باتیں لیڈروں والی کرتے ہو۔ خود کو دیکھو اور مجھے دیکھو اور پھر موازنہ کرو۔“ ٹھاکر تحقیرانہ انداز میں بولا۔

”وہ تو میں نے کر لیا ہے۔“ رولوکا درمیان میں بولا۔
”اچھا تم بھی بات کرتے ہو۔“ ٹھاکر نے مذاق اڑایا۔

”اس لڑکی کا نام گھومتی تھا ہم اس کو لینے آئے ہیں۔“ رولوکا نے صاف بات کی۔

”تو پھر کان کھول کر سن لو۔ یہ درست ہے کہ میں نے اس کو اٹھوایا ہے کیونکہ اچھے اچھے پھول حویلی میں اگانا اور خوب صورت عورتیں رکھنا ہمارا خاندانی شوق ہے۔ تم اور تم جیسے نہ جانے کتنے آچکے ہیں مگر ایک عورت بھی یہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”اچھا ٹھاکر یہ تو بتاؤ تم اتنی عورتوں کا کیا کرتے ہو۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”وہ کھلونے ہیں ان سے کھیلتے ہیں۔“ ٹھاکر نے

کمرہ روشن تھا ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اس پر ایک شخص بیٹھا تھا وہ بھی بہت رعب دار تھا چہرہ چوڑا تھا اور اس پر اس کی داڑھی نے اور چوڑا کر دیا تھا۔ سفید کرتا اور سفید ہی دھوئی اس کا لباس تھا۔ ایک طرف ایک بہت بڑا حقہ کھاتا تھا اور اس کی اسٹک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسٹک کا آخری سرا جس کو منہ میں لگا کر وہ کش لے رہا تھا ہاتھی دانت کا تھا۔ ایک تو وہ شکل سے بارعب تھا دوسرے اس کمرے کا ماحول اس کو اور رعب دار بنا رہا تھا۔ تخت کی پچھلی طرف ایک آدمی کھڑا تھا، خاموش اور بے حرکت جیسے پتھر کا بت کھڑا کر دیا ہو۔

ٹھاکر نے بھرپور نظر سے ہم تینوں کو دیکھا اور کہا۔

”کیسے آتا ہوا جنوں۔“ اس کی آواز بڑی متوازن اور بھاری تھی چہرے کی طرح آواز میں بھی رعب ظاہر ہوتا تھا۔

”م لوگ دلی سے آئے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی کام سے آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہی پوچھ رہا ہوں کیا کام ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ آنے والوں کو پہلے بٹھایا جاتا ہے مجھے پتہ نہیں بخجور میں کیا طریقہ ہے۔“ میں نے کہا۔

ٹھاکر کے چہرے پر ذرا ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر وہ پھر نارمل ہو گیا اور بولا۔ ”دستور تو یہی ہے مگر ہم پہلے پوچھتے ہیں پھر بٹھاتے ہیں۔“

”خیر یہ تو اپنا اپنا طریقہ ہے۔ کچھ آنے والوں کو عزت دیتے ہیں کچھ نہیں دیتے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ حکیم ہیں۔“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ہاں ہم دونوں حکیم ہیں اور یہ ٹیٹل احمد ہے۔ اس کا پہلے نام واس دیو ہوا کرتا تھا۔ اس کے باپ کا نام رام بھروسہ تھا یہ بخجور کے ایک محلے کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کی دو بہنیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک کی ماں باپ نے شادی کر دی تھی مگر دوسری کو کسی نے اغوا کر لیا۔ یہ غریب بچہ تھا کیا کرتا۔ اغوا کرنے والا بڑا آدمی اور بڑے اثر و رسوخ والا تھا۔ یہ دلی چلا گیا اور رحمت مزدوری کرنے لگا اور آج تک اپنی بہن کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ مگر اب پتہ چلا ہے۔“ میں اٹھا کہہ کر ٹھاکر

”تم زلالت کی آخری سیڑھی تک جا چکے ہو۔ وہ کون دوسرا ذلیل تھا جس نے وہ تحفہ وصول کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تھا کہ ہر نام سنگھ ہے یہاں سے میں کوں پر ایک اور جاگیر ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ اس نے گھومتی کو مانگا تھا۔“ تھا کرنے بتایا۔

”اتر سے اتر ملے کیچ سے کیچ۔ بہت خوب جیسا تو ہے ویسا ہی تیرا دوست ہے۔“ میں نے کہا۔

تھا کہ خاموش رہا تو رولوکا نے کہا۔ ”اب ہم تیرے تھا کہ ہر نام سنگھ کو دیکھتے ہیں۔ اور سن لے اچھی طرح تو اب کسی عورت کے قابل نہیں رہا۔ سب کو آزاد کر دے تیری آواز بھی بس اتنی ہی رہے گی اگر زیادہ ہاتھ مارے گا یعنی دوا دارو کرے گا تو بالکل جاتی رہے گی۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں والا سلوک کرنا میں پلٹ کر دوبارہ بھی آ سکتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تیرا یہ پتھر کا بت بھی آدمی بن جائے مگر میری طرف مت آنا۔“ اور ہم حویلی سے نکل آئے میرے لئے تو یہ سب کچھ نیا نہیں۔ میں رولوکا کے بہت سے کھیل دیکھ چکا تھا۔ مگر جمیل احمد کی آواز تو مارے حیرت کے بندھتی۔ تاکلے والا موجود تھا۔ میں نے کہا۔

”میاں کو چوان تم کو ذرا انتظار کرنا بڑا معاف کرنا دیر ہوگی۔“

”نہیں میاں جی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ وہ بولا۔

”اب یہ بتاؤ آگے چلو گے۔ سفر ذرا لمبا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ حکیم کریں میرا گھوڑا گڑا ہے۔ زیادہ لمبا سفر ہوا تو بیچ میں تھوڑا آرام کر لیں گے گھوڑے کو تازہ کر لیں گے چتا کی کیا بات ہے۔“ کو چوان نے کہا۔

”تھا کہ ہر نام سنگھ کی جاگیر پر جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”وہاں کے دور استے ہیں۔ ایک تو صاف ہے مگر لمبا ہے کوئی بیس کوس ہے۔ رک رک کر جانا ہوگا۔ وقت بہت لگے گا۔ دوسرا ایک راستہ جنگل کی

گردن تان کر کہا۔

”مگر عورتیں تو مرد رکھا کرتے ہیں تم کیوں رکھتے ہو۔“ رولوکا کے اس سوال پر تھا کہ ساتھ میں بھی چونک

گیا۔ تھا کہ پارہ ایک دم آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ دھاڑ کر بولا۔

”ابے ہم مرد ہیں تجھے ابھی بتاتے ہیں کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔“ اور اس نے اپنے پیچھے کھڑے کر زیل جوان کو اشارہ

کیا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو غصے سے بولا۔ ”کیا مر گیا ہے۔ دبوچ کر لے جا اور ڈال دے کال کوٹھری میں۔“ مگر

جوان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تھا کہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”میں خود دیکھتا ہوں۔“ مگر کھڑا ہی رہا اس نے آگے قدم بڑھانے کی کوشش ضرور کی مگر بڑھانہ سکا۔ اس نے باہر سے

کسی کو بلانے کو آواز دینا چاہی تو اتنی آہستہ آواز نکلی کہ وہ گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جب ہر طرف سے ماپوں ہو گیا تو پھر بیٹھ گیا اور من مانی آواز میں بولا۔ ”کون ہے تو یہ سب

کیا ہو رہا ہے۔“

”میں کوئی بھی ہوں مگر تو سخت بداخلاق بد زبان اور بد کردار آدمی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

تھا کہ خاموش رہا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب کسی کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوتا ہے تو اس کا چہرہ گلا جاتا

ہے۔ تھا کہ جو اس جگہ کا مالک تھا اپنی ہی حویلی میں وہ بے بس تھا یہ احساس اس کو مارے ڈال رہا تھا۔

”وہ لڑکی کہاں ہے جس کا نام گھومتی ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”وہ حویلی میں نہیں ہے۔“ تھا کہ باریک آواز نکلی

”خود اپنی آواز سن کر پریشان ہو گیا۔“

”تم نے اس کو کہاں بھیج دیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

تھا کہ خاموش رہا تو رولوکا نے کہا۔ ”لڑکی کہاں ہے ل کا پتہ چلانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بت جو خاموش کھڑا ہے فر فر بتائے گا، اس کو پتہ نہ ہوا تو کوئی دوسرا بتائے گا۔ مگر

اپنا اتجاہام سوچ لینا۔“

”وہ میں نے اس کو ایک دوست کو تحفہ دے دیا۔“

طرف سے بھی ہے۔ یہ ہے تو کم مگر بڑا بدنام ہے یہاں پر
ڈاکو وغیرہ بھی رہتے ہیں اس لئے لوگ اس پر سفر نہیں
کرتے۔“ کوچوان نے کہا۔

”تم یہ بتاؤ تم کو فائدہ کس طرف سے جانے میں
ہے ڈاکوؤں کی تم فکر نہ کرو۔“ رولوکانے پوچھا۔

”جنگل والا راستہ چھوٹا ہے۔ دوسرے یہاں
گھوڑے کی غذا بھی بہت ہے مگر ڈر لگتا ہے۔“ کوچوان
بولتا۔

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں تم ادھر سے ہی چلو۔“
اور تانگہ چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد تانگہ
بائیں طرف چلنے لگا۔ دن کے دو ڈھائی کا وقت تھا۔ سڑک
دور تک ویران تھی۔ دور دور کی سواری کا نشان نہیں تھا۔
درختوں کے درمیان سڑک تھی۔ درختوں کے بعد گھنی
جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ آدی تو کجا کوئی جانور بھی نظر نہیں
آتا تھا۔ سڑک ہوا رتی اور گھوڑا دلکی چال سے چل رہا تھا۔
دو تین میل کا سفر کیا تھا کہ اچانک گھوڑا رک گیا گھوڑے کا
اس طرح رکنا خطرے کی علامت تھی کوچوان نے کوشش کی
کہ گھوڑا آگے چلے مگر اس نے ایک قدم بھی آگے نہیں
بڑھایا تو وہ بولا۔ ”یہ آگے نہیں جائے گا کیونکہ آگے ضرور
کوئی موڑی جانور ہے۔“

رولوکانے سے اتر پڑا اور بولا۔ ”ہاں تم نے ٹھیک
اندازہ لگایا ہے۔ گھوڑا اور کتا بہت حساس ہوتا ہے۔ ضرور کچھ
ہے تم یہیں پر کھڑے رہو میں دیکھتا ہوں اور رولوکا اسی سڑک
پر پیدل آگے جانے لگا۔ دس بارہ گز جانے کے بعد وہ کھڑا
ہو گیا۔ جہاں وہ کھڑا ہوا تھا وہاں پر ایک بڑا موٹا نیم کا درخت
سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور اس درخت کی جڑ کے پاس
ایک ناگ کا لے رنگ کا بچھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ رولوکا کو
دیکھ کر بھاگا نہیں وہیں جما بیٹھا رہا۔ رولوکا اس کے قریب چلا
گیا دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر ناگ قریب کی
جھاڑیوں میں رینگتا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رولوکا
واپس آگیا تو کوچوان نے پوچھا۔

”کیا تمہارا کار۔ میرا خیال ہے کوئی ناگ ہوگا۔“

رولوکانے پوچھا۔ ”تم نے کیسے اندازہ لگالیا کہ ناگ
ہوگا۔“

”میرا گھوڑی کسی موڑی سے ڈرتا ہے تو صرف ناگ
سے ڈرتا ہے اس لئے میں نے کہا۔“

”ہاں ناگ تھا وہ چلا گیا اب آگے بڑھو۔“

کوچوان نے لگام پکڑی اور گھوڑا پھر سڑک پر چل
لگا۔ آگے سڑک اور دشوار ہو گئی درخت اور جھاڑیاں اتنی گھنی
ہو گئیں کہ تانگہ جب گزرتا تھا تو ہمیں لگتی تھیں۔ یہاں
سڑک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ تانگے کی رفتار بھی کم ہو
گئی اب شام کے سائے بھی پھیلنا شروع ہو گئے تھے
کوچوان کے اندازے سے زیادہ وقت اس راستے پر لگ رہا
تھا۔ مگر تانگہ چل رہا تھا گو کہ رفتار کم تھی، ہم رات ہونے سے
پہلے اس سڑک کو پار کرنا چاہتے تھے۔ جنگل گھنا ہوتا جا رہا
تھا۔ دو تین میل اسی طرح چلتے رہے۔ پہلے سائے لے
ہوئے تھے مگر اب سائے مٹنے جا رہے تھے اور رات کی آ
آمد تھی اس ویرانے میں رات گزارنے کا تصور روکنے
کھڑے کر دیتا تھا۔ کوچوان کا چہرہ فکر مند تھا۔ مگر رولوکا بڑے
سکون سے بیٹھا تھا جھیل خاموش تھا۔

اندھیرا پوری طرح نہ پھیلا تھا کہ ایسا لگا جیسے ہم کم
نی سڑک پر پہنچ گئے ہیں۔ سڑک کے کنارے جھاڑیاں تھیں
اور زمین صاف تھی ایسا لگتا تھا یہ جگہ صاف کی گئی ہے
پھر چند لوگ سڑک پر درمیان میں آ کر کھڑے ہو گئے اور
رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ رولوکانے کہا۔ ”تانگہ روک دو۔
تانگہ کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلا رولوکا کو دکر اتر اس کے بو
ہم سب تانگے سے اتر پڑے۔ ایک لمبا چوڑا کالے لہا
والا رولوکا کے سامنے آ کھڑا ہوا اور رعب سے بولا۔ ”کہا
سے آئے ہوا دکہاں جاتے ہو؟“

رولوکانے بتایا۔ ”ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ ہمیں
جاگیر دار ہر نام سنگھ ٹھاکر سے ملنا ہے۔“

”تم اس طرف کیوں آئے ایک راستہ اور بھی
ہے؟“ وہ بولا۔

”میں نے کہا نا کہ جلدی کی وجہ سے آئے ہیں۔“

رولوکانے جواب دیا۔

”آگے اب تم نہیں جاؤ گے واپس جانا ہوگا۔“ وہ

بولاً۔

”مجھے تم اپنے سردار کے پاس لے چلو، میں اس سے اجازت لے لوں گا۔“ رولوکانے کہا۔

”سردار بیمار ہے وہ نہیں ملے گا۔“ جواب ملا۔

”ہم دونوں حکیم ہیں۔“ رولوکانے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”شاید ہم تمہارے سردار کے کچھ کام آجائیں۔“

”تم کیا علاج کرو گے اس کو کسی سانپ نے ڈسا ہے۔“ وہ بولا۔

”پکڑ نہ کرو علاج سب چیز کا ہے۔“ رولوکانے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا ہوا اور پھر بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ مگر صرف تم دونوں یہ دونوں یہاں رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے مگر ان دونوں کی تم لوگ حفاظت کرو گے۔“ رولوکانے کہا۔

اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا۔ ”ذرا خیال رکھنا چھوڑے گا۔“

اور وہ ایک طرف چل دیا اس کے ساتھ ہم دونوں بھی چل پڑے۔ کچھ ہی دور گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک

بڑا سالکڑی کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے پر دو آدمی بندوقیں لے کر کھڑے تھے وہ لوگ آنے والے کو دیکھ کر

ایک طرف ہو گئے اور ہم سب جھونپڑے کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا ایک تخت پر گھاس کا

بستر تھا اس پر ایک شخص پڑا تھا۔ رولوکا بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھا نبض پر ہاتھ رکھا پھر دل کی حرکت سنی اور بولا۔

”ابھی زندہ ہے۔“ پھر اس آدمی سے بولا۔ ”ایک بوٹی کی ضرورت ہے یہ میرا ساتھی یہاں موجود ہے میں جنگل سے وہ

لے کر آتا ہوں۔“ اس نے گردن ہلا کر اجازت دے دی۔ آدھے گھنٹے میں رولوکا ایک پودا لے آیا۔ اس کا رنگ ہرا تھا اور پیلے پھول بہت باریک لگے ہوئے تھے۔

رولوکانے وہ پھول توڑے۔ ان کو تھیلی پر رکھ کر گڑا اور اس میں سے جو رس نکلا وہ مریض کے منہ میں ٹپکایا اور اس

پودے کو مریض کے سر کے نیچے رکھ دیا اور پھر بولا۔ ”اب خطرہ نہیں ہے مگر کام ختم نہیں ہوا ہے۔ تم ایسا کرو کم از کم چار

پانچ نوکری گو برکا بندوبست کرو۔ گو برکا تازہ ہو پرانا سوکھا ہوا نہ ہو۔“ وہ آدمی فوراً ہار آیا اور اس نے گو برکا لانے کو آدمی

دوڑا دیے اور ایک بڑی سی لائٹین کمرے میں روشن کر دی۔ رولوکانے کہا۔ ”ہمارے دونوں آدمی کہاں ہیں؟“

”وہ وہیں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تو کیا ساری رات ان کو کھلے آسمان تلے رکھو گے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”نہیں ہم ان کو دوسرے ٹھکانے پر پہنچائے دیتے ہیں اور کھانے کا بھی بندوبست کر دیتے ہیں۔“

”اور گو برکا آئے گا؟“ رولوکانے پوچھا۔ ”آدمی آئے والے ہوں گے قریب ہی ایک گاؤں

ہے وہیں سے لائیں گے۔“ کچھ دیر میں پتہ چلا کہ گو برکا آ گیا ہے۔ اب رولوکا

نے ایک نیا حکم دیا۔ ایک چار فٹ گہرا گڑھا کھدواؤ وہ صرف دو فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا ہو۔ میں کچھ کچھ بھر ہاتھ مگر میں

نے سانپ کے کانٹے کا اس طرح کبھی علاج نہیں کیا تھا۔ گڑھا تیار ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ مریض کو اس میں بٹھا دیا

جائے۔ دو آدمیوں نے سردار کو جو کہ ابھی تک بے ہوش تھا پکڑ کر گڑھے میں بٹھا دیا۔ رولوکانے اس گڑھے کو گو بر سے

بھرنا شروع کر دیا اور وہ گڑھا پورا ہوا پھر دیا اب سردار کا صرف چہرہ گو بر سے باہر تھا ایک آدمی اس کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رولوکانے

وہی بوٹی جو اس کے سر کے نیچے رکھی تھی لا کر ایک ایک پتی اس گو بر میں ڈال دی اور وہیں پر بیٹھ گیا۔ ساری رات رولوکا

کے ساتھ میں بھی وہیں رہا اور اس کے سارے آدمی بھی سردار کے گرد رہے۔

رات کا سفر تمام ہوا۔ چاند تھک کر چلا گیا اور سورج اپنی ڈیوٹی پر آ گیا تو رولوکانے گو بر میں انگلی کا زکریہ دیکھی۔ گو بر سوکھ گیا تھا اور اس کی رنگت نیلی ہو گئی تھی۔ دھوپ پھیلنے

پوچھا۔

”نہیں ہم نے تم سے ملوانے کو روک رکھا ہے۔“
موہن نے جواب دیا۔

”ارے تو جلدی بلاؤ ان کو میرے پاس لو بھلا یہ کوئی بات ہوئی اتنا بڑا الکا رکھ پر کر دیا۔“

موہن دوڑ کر ہمارے پاس آیا اور بولا۔ ”سردار اٹھ گئے بلا تے ہیں۔“

ہم سب اس کے بڑے جھونپڑے میں چلے گئے۔ سردار بستر پر بیٹھا تھا۔ کسی قسم کی بیماری کے یا کمزوری کے آثار نہیں تھے۔ وہ ہم کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سب سے گلے ملا اور بولا۔ ”آپ لوگ سب حکیم ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میں اور یہ حکیم ہیں۔ جا تو رہے تھے کسی اور کے علاج کو مگر آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر بھلا کس طرح جا سکتے تھے۔“

”آپ نے جو احسان مجھ گناہ گار پر کیا ہے اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں ہے یہ زندگی آپ نے مجھے دی ہے اگر اس کی ضرورت کبھی پڑ جائے تو میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ اب تک تمہارا نام پتہ نہیں چلا۔“ میں نے کہا۔

”میرا نام تو جلوانی سنگھ ہے۔ مگر سب جلوڈا کو کے نام سے جانتے ہیں۔“

”اب تم ہمیں جاننے کی اجازت دے دو کیوں کہ ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں پر بھی ایک مریض ہے اس کا علاج بھی کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کی بیماری کچھ ایسی ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا تو جلو نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے۔ بتائیں تو میں آپ کے ساتھ آپ کو پہنچا کر آؤں گا۔“

”تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے، ہم جس طرح یہاں آئے ہیں اسی طرح اس تک جا سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

ہی رولو کا نے سردار کو گوبر سے نکال لیا۔ دل کی حرکت اور نبض وغیرہ چیک کی اور پھر اعلان کیا۔ ”تمہارا سردار ٹھیک ہو گیا ہے اب وہ سو رہا ہے بڑی گہری نیند میں ہے دوپہر تک خود بخود اٹھ جائے گا۔“ اس کے سب ساتھی خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

وہی شخص آگے بڑھا اور بولا۔ ”آپ نے تو کمال کر دیا ہم سب تو نا امید تھے۔ اب آپ سردار سے ملاقات کر کے ہی جائیں گے۔ اگر ہم نے آپ کو جانے دیا تو سردار اٹھنے کے بعد بہت ناراض ہوگا۔“ ہم جو جلدی میں تھے اب ان کی بات کو کیسے ٹھکراتے دوپہر تک رک گئے۔ اس جنگل میں ہم کو جو ناشہ کر دیا گیا وہ بھی ایک یادگار تھا اور جن برتنوں میں پیش کیا گیا وہ بھی تعجب خیز بات تھی۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے سردار اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے آواز لگائی۔ ”ارے او موہن سنگھ۔“

موہن سنگھ جو ہمارے ساتھ ساتھ رہا تھا دوڑ کر اندر چلا گیا اور جاتے ہی بولا۔ ”مبارک ہو سردار۔“

”ارے کاہے کی مبارک کا میرے ہاں چھوڑا ہوا ہے۔ سردار نے تعجب سے کہا۔

”ارے سردار ہم تو سب تم کا کریا کر مرن کی تیاری میں تھے کہ بس چٹکار ہو گیا۔“ موہن بولا۔

”کا گول بات کرے ہے صاف بتا۔“ سردار نے پوچھا۔

”تم کا ایک بہت خطرناک ناگ نے ڈس لیا تھا۔ تم تو ایک بل میں گر پڑے اور اس کے بعد تم کا کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ ہم بتاتے ہیں ہم تم کا اٹھا کے ڈیرے پر لے آئے جو کچھ دوا دارو کر سکتے تھے کیا پر تمہاری حالت خراب ہوئی گئی ہم نے سمجھ لیا کہ بس اب تمہارا ہمارا ساتھ چھوٹا کہ میٹھوان کی کریا سے ایک تانگہ آ گیا ہے نا چٹکار۔ بھلا کب ادھر تانگہ آیا ہے۔ پر آ گیا چار آدمی اس میں سوار دو حکیم۔ ادھیکم نے تم کا دیکھا اور علاج کر دیا تم پھر سے زندہ ہو گئے۔“ موہن سنگھ نے بات ختم کی۔

”اوہ وہ سب کا چلے گئے۔“ سردار نے حیرت سے

”یہ تو بتا دیں کہ کس گاؤں جاؤ گے۔“

”ہم ٹھاکر ہرنام سنگھ کے پاس جا رہے ہیں۔“

رولوکا نے کہا۔

ٹھاکر ہرنام کا سن کر جیلو چونکا اور بولا۔ ”حکیم صاحب وہ بہت میڑھا آدمی ہے۔ وہ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا جھوٹ گالی دیتا ہے۔ زبان اور کردار دونوں کا خراب ہے۔“

جلو نے کہا۔

”میری تو اس کی بیماری ہے۔ اس کا ہی تو علاج کریں گے۔“ رولوکا نے کہا۔

جلو حیرت سے بولا۔ ”کیا اس کا بھی علاج ہوتا ہے۔“

”ہر مرض کا علاج ہوتا ہے۔ تم کو ایک بہت ہی زہریلے ناگ نے ڈسا تھا اس کا علاج ایک مفت کی چیز گوبر سے ہوا اور ہرنام کا علاج بھی کسی مفت کی دوا سے ہوگا۔ ہمارا طریقہ علاج سب سے الگ ہے کوئی مریض اپنا علاج نہیں بھی کرانا چاہے تو بھی ہم زبردستی اس کا علاج کر دیتے ہیں۔ تم حیران مت ہو اس دنیا میں ایک سے بڑا ایک دیوانہ پڑا ہے۔“ رولوکا نے مسکرا کر کہا۔

”ہے تو بات حیرت کی۔ میری ضرورت اگر کسی مقام پر پڑے تو ضرور یاد رکھیں۔“ وہ بولا۔ اور ہم تانگے میں ہرنام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب روڈ صاف تھا جھاڑیاں اور درخت بھی روڈ سے دور تھے دن کا وقت تھا شام تک ہم ہرنام سنگھ کی جاکیر میں تھے اب ہمیں جلدی دیر کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ جو دیر ہونا تھی وہ تو ہو چکی تھی ہم نے ہرنام کی حویلی کا پتہ معلوم کیا اور سیدھے وہیں پر چلے گئے۔ اس کی حویلی کا وہ کرفز نہیں تھا۔ آدمی حویلی کے چاروں طرف نظر آنے لگے۔ دروازے پر دو آدمی بندوق کے کر بیٹھے تھے دونوں کے سروں پر پیلی پچڑی تھی جسمانی طور پر بھی یہ نگڑے جوان تھے۔ میں اور رولوکا دونوں تانگے سے اتر کر ان کے پاس چلے گئے۔ میں نے ایک کو کہا۔ ”ہمیں ٹھاکر ہرنام سنگھ سے ملنا ہے۔“ اس نے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا اور بولا۔ ”کیوں کیا کام ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”ذاتی کام ہے ان کو ہی بتائیں گے۔“

”پھر تو ملنا مشکل ہے ہم کانے کو کھڑے ہیں پہلے ہم کا بتاؤ پھر آگے بات بنے گی۔“ وہ بولا۔

”یہ ٹھاکر صاحب کی ذاتی بات ہے تم کو کیا بتائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

دوسرا بولا۔ ”ارے یہ ذاتی بات کا ہوت ہے سمجھ تو آجائے پھر ٹھاکر کو بتائیں۔“

رولوکا آگے بڑھا اور بولا۔ ”زیادہ ہوشیاری مت کرو۔ کیا فائدہ کہ ٹھاکر تم کو مار بیگائے بات بتانے والی نہیں ہے۔“

پہلا بولا۔ ”تو یہ کہو تا یہ ذاتی ماتی ہم نہ سمجھیں ذرا ٹھہرو ابھی آتے ہیں۔“ اور وہ اندر چلا گیا۔

”اندر آنے کا حکم نہ دیا ہے۔ وہ خود آتے ہیں۔ باہر ہی بات کریں گے۔“ کچھ ہی دیر میں ایک پھولے پھولے گالوں والا بھاری بھر کم آدمی ہاتھی کی چال چلتا ہوا دروازے سے برآمد ہوا اور نہایت بازاری زبان میں بولا۔ ”کون آ مرا اس وقت مزا کر کرادیا۔“ میں آگے بڑھا اور کہا۔

”ہم لوگ بہت دور سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

”ارے تو میں کیا کروں۔ مجھ پر کیا احسان کر دیا۔ میرا تو مزا خراب کر دیا۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے منہ اٹھایا اور چلے آئے ضرور کوئی کام ہوگا۔ کرو تو نہ گن نہ احسان، نہ کہ تو بدنام کریں گے۔“ وہ ناگوار سے بولا۔

”کام تو ہے مگر وہ کام آپ نہیں کریں گے اور ہاں ایک بات آپ کو بتا دیں کہ تم اپنی گل گفتار کو ذاتی کنٹرول میں رکھنا۔“ میں نے کہا۔

”کس کو کنٹرول میں رکھوں تم نے کیا کہا ہے۔“

ہرنام بولا۔ ”اپنی زبان کو۔ تم نے اب تک ایک لفظ شریفانہ نہیں کہا ہے۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔“ میں نے کہا۔

باندھ دیا۔

”میں توڑ ہوں۔ تیرے غرور کا توڑ۔ تو جتنا بد آدمی ہے کہ شاید تیری برابری ہری سنگھ بھی نہیں کر سکتا۔ تجھے پورا حساب آج دینا ہوگا۔ سب کھایا پیا نکالنا پڑے گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

رولوکا دروازے کے اندر چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ نہایت واہیات قسم کی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک اوباش اور عیاش آدمی کا کمرہ ہے۔ کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی میز پر شراب کی بوتلیں اور سوڈے کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ایک بہت بڑی مسبری پڑی تھی اس پر ایک عورت اس ہوشیار انداز سے بیٹھی تھی کہ رولوکا کی جگہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو اس کو بار بار دیکھتا ہی رہتا۔ اس کا سارا بدن جھٹک جھٹک کر دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ رولوکا نے پہلی نظر اس پر ڈالی اور کہا۔

”کھڑی ہو جا اور اندر چلی جا۔“

وہ اٹھ کر میٹھ گئی اور بولی۔ ”زمیندار جی کہاں ہیں۔ میں ان کے حکم کے بنا کمرے سے باہر کیسے جاؤں۔“

”زمیندار اندر نہیں آئے گا۔ تو یہ تاتیرے علاوہ اور کتنی عورتیں حویلی میں ہیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ آج میرا دن تھا تو میں آئی ہوں۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”اپنے بدن اور زبان دونوں پر قابو رکھ، کس کو پتہ ہوگا یہ بتا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”نشی رہیہ کو سب پتہ ہے۔“ وہ بولی۔

”جاس کو بلا کر لا جلدی کر۔“ رولوکا نے کہا۔

رولوکا نے کچھ اس انداز سے حکم دیا تھا کہ وہ اندر دوڑ گئی اور جلد ہی ایک آدمی کے ساتھ آئی، رولوکا نے اس آدمی سے پوچھا۔ ”تو نشی ہے؟“

”ہاں جی میں ہی نشی ہوں۔ مگر تم کون ہو۔ جاگیر دار صاحب کے کمرے میں کیا کر رہے ہو۔“

”زیادہ پر مت نکال۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ بتا۔“

”تو تم مجھے سبق پڑھا بنے آئے ہو۔ میں بہت پڑھ چکا ہوں کام بتاؤ کیوں آئے ہو؟“ وہ بولا۔

”ٹھا کر ہری سنگھ کو تم جانتے ہو۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”کون ہری سنگھ ٹھا کر.....“ ہر نام نے گروان میڑھی کر کے کہا۔

”بہت خوب تمہاری یادداشت بھی کمزور ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”زبان کو نگام دو میرے ایک اشارے پر تم زمین پر پڑے ہو گے۔ تم میرے گھر پر اور میری زمین پر ہو جو بات کرو یہ ضرور ذہن میں رکھنا یہاں پر میرا قانون چلتا ہے۔“ وہ غصے میں بولا۔

”وہ ہری سنگھ جس نے تم کو ایک تھن دیا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے یاد نہیں مجھے تو روز ہی تجھے ملنے رہتے ہیں میں کس کس کو یاد رکھوں۔“ وہ غرور سے بولا۔

”تمہارے بارے میں جو سنا تھا تم اس سے بھی اوپر ہو۔“ میں نے کہا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ منہ گالیوں سے بھر گیا مگر ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ اس نے آدمیوں کو ہم پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ذہ خود اپنی جگہ ہانسی کی مانند جھومتا رہا اور پھر بولا۔

”ارے سب مر گئے کیا۔“

رولوکا نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”ان سب کو مروں میں ہی اشار کر لو۔ تم کو پچانے نہیں آئے گا اب بتاؤ وہ لڑکی کہاں ہے؟“

ہر نام بڑا ڈھیٹ ہڈی کا تھا بولا نہیں خاموش رہا۔ نہ بتاؤ میں خود اندر بھا کر تلاش کر لوں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”اندر تم کو کون جانے دے گا۔ میرے آدمی، دروازے پر ہیں۔“ وہ بولا۔

”وہ مٹی کے بت ہیں۔ وہ کیا کریں گے اور تو خود اپنی بتا زمین نے تیری ٹانگیں باندھ دی ہیں۔“ ہر نام نے پیر ہلانے کی کوشش کی پھر چیخ کر بولا۔ ”تو کون ہے رے مجھے

رولوکا نے کہا۔

”ہر کیوں بتاؤں خواہ مخواہ تم کون ہو؟“ وہ پھر بولا۔
”اگر اپنے ہاتھ بند سے پیار ہے تو بتائے گا۔
میرے سوال کا جواب دے۔ جویلی میں کتنی عورتیں ہیں۔“
”بہت ہیں کتنی یاد نہیں ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”تیرا دماغ بہت اوپر ہے۔ نیچے لانا پڑے گا۔“
رولوکا نے ایک آنکھ کا اشارہ کیا تھا کہ اس کے گال پر ایک
بہت بھاری ہاتھ پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے
تاروں کی بارات آ گئی۔ چمکا کر گر بڑا مگر ہوش میں رہا رولوکا
نے کہا۔ ”بات کچھ سمجھ میں آ گئی تو جو بٹے کا بھوت ہے
باتوں سے نہیں مانے گا۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”ہاں بتاتا ہوں مارنا نہیں۔
پندرہ چھوڑیاں ہیں۔ سب جوہلی میں الگ الگ رہتی ہیں۔“
فشی بولا۔

”ان سب کو باہر لے آ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ
میں۔“ رولوکا نے کہا۔

فشی مشینی انداز میں اندر دوڑ گیا اور رولوکا پھر
دروازے سے باہر آ گیا۔ باہر سب اپنی اپنی جگہوں پر اسی
طرح موجود تھے جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ رولوکا میرے پاس
آ کر کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ دروازے سے عورتیں آنا
شروع ہو گئیں۔ پندرہ تو جوان عورتیں تھیں اور چار کچھ زیادہ
عمر کی تھیں۔ فشی نے بتایا یہ خدمت گار عورتیں ہیں۔ وہ سب
لائن میں کھڑی تھیں۔ رولوکا ہر نام سنگھ کے قریب گیا اور
پوچھا۔ ”عورتیں کون ہیں۔“ ٹھاٹھ کر ہر نام سنگھ خاموش رہا۔

رولوکا نے ایک زور کا پتھر اس کے گال پر مارا۔ ہر نام
اپنی جگہ کھڑا رہا مگر اس کا چہرہ اپنی بے عزتی اور پتھر کی تکلیف
سے بگڑ گیا۔ کانوں تک چہرہ سرخ ہو گیا مٹھیاں بندھوئے
اور کھٹکے لگیں اور اس نے پیروں پر پوری طاقت لگا دی مگر خود
کو ہلاتک نہ سکا۔ اس کی حرکات و سکنات کو رولوکا دیکھ رہا تھا
اس کے دلی جذبات کو سمجھ رہا تھا وہ اس کے آدمیوں کے

سامنے اس کی عزت و کوڑی کی کر رہا تھا وہ اس کو احساس دلا
رہا تھا کہ انسان کی بے عزتی جب ہوتی ہے تو وہ کیسا محسوس
کرتا ہے۔ آج تک ہر نام سنگھ سب کی بے عزتی کرتا آیا تھا
اس کو پتہ نہیں تھا کہ ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے وہ غریب
ہو امیر ہو کوئی ہو۔ وہ گلی کھا کر اگر خاموش رہتا ہے تو یہ اس
کی مجبوری ہوتی ہے مگر دل میں تو گالی کا جواب گالی سے
ضرور دیتا ہے جس طرح اس وقت ٹھاٹھ کر ہر نام سنگھ رولوکا کو
دل میں گالیاں دے رہا تھا۔

”تو نے بتایا نہیں یہ عورتیں کون ہیں تیری مائیں
ہیں، بہنیں ہیں، بیویاں ہیں، کون ہیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔
ٹھاٹھ کر خاموش تھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رولوکا جیل کے قریب آیا اور اس سے پوچھا۔ ”تم
اپنی بہن کو پہچانتے ہو۔“

”میں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا جب زیادہ
ہوشیار نہیں ہوا تھا۔ اب وہ کیسی ہوگی میں نہیں پہچان سکتا۔“
جیل نے جواب دیا۔

”خیر کوئی بات نہیں میں پتہ کرتا ہوں۔“ رولوکا نے
کہا اور عورتوں کے قریب چلا گیا۔ ”تم میں سے گھومتی کون
ہے جو پہلے ٹھاٹھ کر ہری سنگھ کے پاس تھی۔“ رولوکا نے کہا۔

ہری ساڑھی میں ایک جوان عورت آگے بڑھی اور
بولی۔ ”میرا نام گھومتی ہے۔“

رولوکا نے جیل کو اشارہ کیا۔ جیل اس کے پاس کھڑا
ہو گیا تو رولوکا نے کہا۔ ”گھومتی یہ تیرا اکھوتا بھائی ہے واس
دلو۔ تو نے پہچان لیا۔“

گھومتی نے چند منٹ غور سے جیل کو دیکھا اور ”میرا
بھیا“ کہہ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں
سے نہ جانے کب کا رکا رکا آنسوؤں کا سیلاب اُٹھ پڑا۔ ان کی
زبانیں مارے جذبات کے بند ہو گئیں۔ ہم سب کے لئے
یہ منظر بڑا اثر انگیز تھا۔ سب عورتیں بھی خاموش تھیں وہ بھی
اپنوں کو یاد کر رہی تھیں۔ کچھ دیر تک آنسوؤں کی بارش ہوتی
رہی جذبات میں ذرا ٹھہراؤ آ گیا تو رولوکا نے ہر نام کو کہا۔
”تو نے دیکھا، ظالم انسان۔ یہ دونوں کتنے جتے

آدی ہوں۔ ایک تھپڑ کے ہی لائق تھا۔ دوسرا برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو میں اب یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ ٹھاکر کی نوکری نہیں کروں گا جتنا دیکھ لیا ہے وہ بہت ہے۔“ منشی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”تو کہیں نہیں جائے گا۔ ہاں یہ سب ضرور جائیں گے۔“ اور رولوکانے اشارے سے سب آدمیوں کو اپنے پاس بلا یا وہ سب دوڑ کر اس کے قریب آ گئے اور حیران رہ گئے کہ رولوکانے بلانے پر وہ چلنے کے قابل ہو گئے۔ رولوکانے ان سب کو جو کہ تعداد میں گیارہ تھے مخاطب کر کے کہا۔

”تم سب ابھی اور اسی وقت اس جاگیر سے دور چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر مت آنا۔ آؤ گے تو پچھتاؤ گے۔ کوئی سوال مت کرنا اپنا سامان مال مویشی سب لے جاؤ۔ اس کی تم کو اجازت ہے جاؤ۔“

وہ سب اس طرح بھاگے جیسے ان کے پیچھے شیر آ رہا ہو۔ اب صرف منشی اور ہر نام سنگھ ٹھاکر رہ گئے تھے رولوکانے کہا۔ ”منشی تم اس بد بخت کے پاس ہی رہنا۔ اس کو بھی روٹی کھلانا اور خود بھی کھانا کیونکہ یہ اب خود سے روٹی بھی نہیں کھا سکے گا۔“ رولوکانے کہا۔

ہر نام سنگھ ٹھاکر نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ ”اتنی بڑی سزا دو مجھے معاف کر دو میں آئندہ انسان بن کر رہوں گا۔“ رولوکانے منشی سے پوچھا۔ ”تو کیا کہتا ہے یہ انسان بن جائے گا۔“

”سرکار میں بھی تو اس جیسا ہی تھا ایک تھپڑ نے مجھے انسان بنا دیا اس کو تو پھر لمبی سزا ملی ہے۔“

”تم دونوں اپنی اصلی حالت سے رہو گے مگر کسی ناری پر غلط نگاہ مت ڈالنا اگر ڈالو گے تو میں پھر آ جاؤں گا انسانوں کی خدمت کرنا اپنی طاقت کا غلط استعمال مت کرنا۔“

کچھ لوگ پیدا آئی لاپرواہ ہوتے ہیں مگر کتنے بھی لاپرواہ ہوں، اپنے آپ سے کتنے ہی بے نیاز ہوں، اپنے اور دوسروں کے لئے ان کا سوچنے کا انداز کچھ بھی ہو مگر ہیں تو

چھین تھے۔ تو نے ان کے ماں باپ کو ان سے چھین لیا ان دونوں کو جدا کر دیا یہ عورتیں جو کھڑی ہیں ان سب کی ایسی ہی کہانی ہے تو نے اپنے پیش کی خاطر کیا کیا ظلم غریبوں پر ڈھائے ہیں تجھے اس کا احساس نہیں ہے۔ مگر میں تجھے یہ احساس ضرور کراؤں گا۔“ پھر منشی کو رولوکانے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ”تجھے سب پتہ ہے کہ یہ عورتیں کہاں کہاں سے لائی گئی ہیں تو ان عورتوں کو ان کے گھر پہنچا کر آئے گا۔ میں یہاں پر ہوں تو یہ کام ابھی سے شروع کر دے۔ سب اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی میں تب جاؤں گا۔“

منشی ایک تھپڑ کا غلام تھا۔ تیزی سے کام میں لگ گیا۔ شام ہوئی اور پھر رات ہوئی۔ منشی، جمیل، کوچوان اور گھومتی ایک کمرے میں چلے گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ گھومتی نے کھانا لانے کو کہا بھی مگر میں نے انکار کر دیا۔ رولوکا اسی جگہ کھڑا رہا۔ ٹھاکر اور اس کے آدی بھی پتھر کے بت بنے رہے۔ نہ کوئی بولتا تھا نہ جنبش کرتا تھا۔ صرف ٹھاکر کی آواز نکلتی تھی۔ وہ اتنی باریک اور ہلکی ہوتی تھی کہ اس کو خود اس پر شرم آتی تھی۔ ساری رات منشی تانگہ دوڑاتا رہا۔ ملازمائیں بھی چلی گئیں اب صرف وہی لوگ تھے جو دروازے کے باہر موجود تھے اور ان کو ہاندھا ہوا تھا۔ صبح ہو گئی منشی نے کہا۔

”سب کو ان کے گھروں پر پہنچا دیا ہے سرکار۔“

”ان کے علاوہ بھی کوئی اور ہیں وہ بھی بتا دے۔“

رولوکانے کہا۔

”سرکار وہ تو کرائے پر آتی ہیں اپنا کام ختم کر کے چلی جاتی ہیں۔“ منشی نے جواب دیا۔

”تیرے علاوہ کتنے لوگ ہیں جو اس کی عیاشی کا بندوبست کرتے ہیں۔“ رولوکانے پوچھا۔

”سب ہی موجود ہیں ایک دو دور سے مال لے کر آتے ہیں۔ رقم لے کر پٹے جاتے ہیں ملازم نہیں ہیں۔“

”تو جو بات کر رہا ہے وہ سب سچ کر رہا ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”حضور میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بال بچے دار

انسان ہی انسانی ضروریات سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس سے ان کی دل شکنی اور فطری طلب دونوں برقرار رہتی ہیں اور جو صفات قدرت نے انسان کو دی ہیں وہ ان کا استعمال بھی کرتا ہے ان میں حسن و دلکشی سے پسندیدگی بھی شامل ہے کسی بھی حسین شخصیت کی قربت کا احساس بھی اس میں شامل ہے اس کا کسی حسین چہرے سے متاثر ہونا بھی شامل ہے۔

باقر علی نواب کی اولاد تھا نواب جعفر علی ان کا نام تھا اور ان کی بہت بڑی جاکیر امروہہ سے دس میل تھی۔ نواب جعفر خود کو نواب واجد علی کا رشتہ دار بھائی کہا کرتے تھے اور یہ جاکیر بھی نواب واجد کی بخشی ہوئی تھی مگر نواب جعفر میں وہ خصوصیات نہیں تھیں جس کے لئے نواب واجد علی مشہور تھے۔

مگر ان کا بیٹا نواب باقر علی باپ سے بہت آگے تھا۔ حویلی میں باندیوں کے درمیان بیل کرنا جو ان نواب کے محلوں میں باندیاں بھی دیکھ بھال کر رکھی جاتی ہیں اس لئے کہ وہ صرف گھر کی صفائی سترائی کے لئے نہیں ہوتیں کسی بھی وقت نواب صاحب کو کوئی کام پر سکتا ہے۔ اس لئے ان کا نیک سک سے درست ہونا بھی ضروری ہے۔ چھوٹے نواب کی خدمت پر بھی یہی مامور تھیں۔ رات سونے تک ان کا دل بہلانا، ان کو موسیقی سنانا، پیرو ہانا، بدن دہانا، نواب باقر چندہ سال کی عمر تک آتے آتے سارے منازل طے کر گئے۔ ان کو وہ ہنر اذیر کر دیئے گئے جو عام آدمی اتنی جلدی نہیں سیکھتا۔ باندیاں سب ایک سے ایک کھائی کھیلی ان کی استاد تھیں پھر نواب کی خوشنودی اور مراعات حاصل کرنے کی ان میں دوڑ لگی ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا رہی تھیں اور نواب باقر علی ایک ایسا اھلوانا بنے ہوئے تھے جو چابی سے چلتا ہے ہر کوئی چابی بھرتا خوب دوڑا تا کھلتا اور جب چابی ختم ہو جاتی۔ پھر دوسرا چابی بھرتا اور چلاتا رہتا۔

لاکھ بے فکری کی زندگی تھی نہ کمانے کی فکر تھی نہ دولت کا ٹھکانا تھا۔ باقر علی کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس کو اپنی صحت جوانی کے خرچ ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ تو سمجھتا تھا

کہ یہ عیش ہمیشہ رہے گا۔ نواب باقر علی جسمانی ساخت اور چہرے مہرے سے بے شک ٹھیک نظر آتے تھے مگر وہ جانتے تھے وہ کتنے ٹھیک ہیں۔

بڑے نواب جعفر علی کی خواہش تھی کہ اب نواب باقر علی کی شادی کر دی جائے۔ مگر یہ وہ نہ کر سکے اور ان کا بلاوا آ گیا۔ ان کے انتقال کے بعد جاکیر کی ساری ذمہ داری باقر علی پر آ گئی۔ باپ کی اچانک موت نے ماں کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ بیٹے کی شادی کر دی جائے۔ باپ بیٹے کا سہرہ نہ دیکھ سکا لیکن میں تو دیکھ لوں مگر بیٹا شادی کے نام سے چڑتا تھا ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ مردانے میں اب کسی بھی لونڈی کا داخلہ بند ہے۔ مگر ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ باندی پہلے نواب باقر علی کی خدمت میں آئی تھی۔ اب کیا ہوا۔ کیا بیٹا اتنا دین دار ہو گیا کہ عورتوں سے ہی منہ موڑ لیا یا کچھ اور..... ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی ایک دن ماں نے بیٹے کو طلب کر لیا۔ نواب باقر علی ماں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

”بیٹا آپ نے دیکھا کہ بڑے نواب صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ کیا میں یا آپ یہ یگانہ کر سکتے تھے۔“ ماں نے پوچھا تو نواب نے جواب دیا۔ ”میں کیا کوئی بھی ابا حضور کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔“

”بیٹا موت کا تذکرہ ہمیشہ باعث رنج ہوتا ہے۔ موت کسی کی ہوا میری ہو غریب کی ہو اپنے کی ہو پرانے کی ہو دکھ ہی پہنچاتی ہے میں آج ہوں کل نہ ہوں۔ تمہارے والد دل میں تمہارے سہرے کی حسرت لے کر چلے گئے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تم میری یہ آخری خواہش پوری کر دو۔“ بڑی نیگم نے کہا۔ نواب باقر علی کچھ دیر خاموش گردن جھکا رہے پھر بولے۔

”امی میں ابھی وہی طور پر شادی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ اب حضور کے انتقال کے بعد جاکیر کا سارا بوجھ ناتواں کاندھوں پر آ پڑا ہے ابھی تو میں اس کے داؤچ سیکھ رہا ہوں میں سحانی چاہتا ہوں۔“

”دیکھو بیٹا۔ عورت کا دل بھی قدرت نے خوب بنایا

جاتا تھا دونوں ہی اس کو ناپسند تھے مگر ان دو میں سے ایک کو ہی چننا بھی تھا۔

ہر دوسرے روز ماں کی طرف سے یاد دہانی کروائی جاتی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے اور اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ شادی کرنے کا فیصلہ۔ مگر ایک شرط کے ساتھ۔ وہ شرط یہ تھی کہ وہ کسی نواب یا جاگیردار کی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔ کسی معمولی غریب لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس سے اس نے یہ فائدہ حاصل کرنا چاہا کہ برابری کی لڑکی ہوگی تو وہ میرا راز افشا کر دے گی۔ اگر غریب گھر کی ہوئی نیک اور شریف ہوئی تو شاید میرا پردہ رکھ لے اور عزت رہ جائے۔ اس نے اپنی شرط والدہ کو بتادی۔ پہلے تو وہ اس کی شرط سن کر حیران ہوئیں اور جتنی سے منج کر دیا کہ بھلا نواب ابن نواب کسی غریب باری کا داماد بنے گا۔ مگر بیٹے کی ضد کے آگے ان کو بھٹکانا پڑا کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ پھر بیٹا شادی سے انکاری نہ ہو جائے۔

اب نواب باقر علی کو ایک غریب اور محصوم لڑکی کی تلاش ہوئی اور ان کی نگاہ ایک باری حکیم خان کی لڑکی پر پڑی حکیم خان ان کا بہت پرانا باری تھا۔ خاندان در خاندان نواب کی خدمت کرتا آ رہا تھا۔ نواب مرحوم کے اس پر بڑے احسانات تھے۔ اس کی گردن بھی نواب جعفر اور نواب باقر کے سامنے نہیں اٹھتی تھی۔

ایک دن نواب باقر اس کے گھر گاؤں چلا گیا وہ بھی اکیلا۔ دروازے پر کھوڑا کھڑا کر کے آواز دی۔ حکیم خان باہر آیا تو ہکا بکا دیکھتا رہ گیا نواب صاحب بذات خود موجود تھے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نواب باقر علی گھوڑے سے اتر آئے اور مسکرا کر کہا۔ ”کیا بات ہے حکیم خان حیران کیوں ہو؟“

”حیزت کی بات ہے مجھے طلب کر لیا ہوتا آپ نے زحمت کیوں اٹھائی۔“ حکیم خان نے گڑگڑا کر کہا۔ ”کام ہمارا تھا تو ہم کو ہی آنا تھا تم کو کیوں بلا تے۔“ نواب نے کہا۔

”میں حاضر ہوں حکم فرمائیں مگر پہلے آپ اندر

ہے۔ شادی کے بعد اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ماں کہلائے اور جب ماں بن جاتی ہے تو پھر اس کے دل میں یہ خواہش جنم لیتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اولاد کو کھلائے ہر انسان موت سے ڈرتا ہے میں بھی ڈرتی ہوں مگر یہ ضرور چاہتی ہوں تمہاری اولاد دیکھ لوں۔“

”مگر امی جان میرے لئے یہ بہت مشکل ہے میری مصروفیات مجھے بیوی کے ساتھ انصاف نہیں کرنے دیں گی۔“ نواب نے جواب دیا۔

”مگر میں تمہاری مجرد زندگی نہیں دیکھ سکتی۔ میں خاندان کو آگے چلانا چاہتی ہوں۔ نواب مرحوم کی تم واحد اولاد زریہ ہو اس خاندان کا نام صرف تم سے آگے چلے گا۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”آپ! فرماتا اپنی جگہ درست ہے مگر میں مجبور ہوں جلدی نہ کریں۔“ باقر علی نے جواب دیا۔

”میں جلدی نہیں کرتی مگر تم بھی اتنی دیر نہ کرنا کہ میں اپنی حسرت لے کر چلی جاؤں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”اللہ آپ کا سایہ میرے سر پر رکھے یہ بات اپنی زبان پر نہ لائیں۔“ نواب باقر نے کہا۔

”تو پھر جلدی فیصلہ کرلو تمہاری شادی کی لمبی عمر ہے۔“

آدھی جو کرتا ہے اگر وہ اس کے اچھے برے نتائج پر غور کر لے، آتے وقت کے ورق کو پڑھ لے تو بہت سی پریشانیاں جن کو وہ خود بلاتا ہے اس سے بچ سکتا ہے۔ نواب کچھ تو نادانی اور کچھ اشیائے صرف کی آسان دستیابی نے اس کو اس منزل پر کھڑا کر دیا تھا کہ وہ عورت کے قریب بھی جانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا اور یہ سلسلہ اب آہستہ آہستہ جسمانی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بھی جو گیا تھا۔

اس نے ماں سے جھوٹ بولا تھا وہ اپنی حالت بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ جھوٹ تو ہمیشہ سہا ہوا رہتا ہے۔ وہ تذبذب میں گرفتار تھا۔ وہ ایک ایسے دورا ہے پر کھڑا تھا جہاں سے ایک راستہ اس کی بدنامی اور رسوائی کی طرف جاتا تھا اور ایک ماں کی نافرمانی کی طرف

کی لڑکی آپ پسند کریں گے وہ اپنی قسمت پر رشک کرنے کا کیونکہ اس رشتے سے اس کی تو عزت ہی بڑھے گی۔ مگر آپ کو کیا ملے گا شاید آپ بعد میں پچھتاہیں بھی لوگوں کی تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑے۔ اس لئے صرف یہی کہوں گا کہ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیں۔“ حکیم نے کہا۔

”میں تمام پہلوؤں پر خوب غور کر کے تمہارے پاس آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہاری لڑکی سے عقد کرنا چاہتا ہوں بولو تم کو منظور ہے۔“ نواب نے اپنا فیصلہ سنایا۔

حکیم خان یسین کر ہکا بکار ہو گیا۔ آج کتنا اچھا دن ہے کہ لڑکی کا رشتہ آیا اور رشتہ بھی ایسا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ گم صم بھڑا کر لڑکی کو جواب نہ دے سکا۔

”تم نے جواب نہیں دیا حکیم خان۔“ نواب نے پوچھا۔

”میری عقل گم ہے کیا جواب دوں آپ مجھ غریب سے مذاق کر رہے ہیں۔“ حکیم خان نے بڑی مشکل سے کہا۔

”آپ میرے بزرگ ہیں میں مذاق کروں یہ سوچ بھی نہیں سکتا میں سنجیدہ ہوں آپ کو اختیار ہے کہ آپ اگر مجھے پسند نہیں کرتے تو منع کر دیں میں برائیاں مانوں گا۔“ نواب نے کہا۔

”منع کس پر کرتوں گا۔ میں کیا میری اوقات کیا۔ پشت با پشت سے آپ کا دیا کھا رہا ہوں اب میرا نصیب کھلا ہے کہ آپ نے کچھ طلب کیا ہے ورنہ ہمیشہ تو دیا ہی ہے۔ منع کیوں کر کروں گا ایک کیا عقلی بھی بیٹیاں ہوتی ہیں نذر کر دیتا آپ کی امانت ہے جب دل کرے دو بول پڑھا کر لے جائیں۔“

بڑی بیگم نے جب یہ سنا کہ نواب باقر علی ایک ہماری حکیم خان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ایک دم ناراض ہو گئیں۔

”آ خر تم نے یہ کیسے سوچا۔ ایک گھور سے کی اینٹ کو چوہا رہے میں فٹ کر دو گے۔ تم ایک بڑے جاگیردار ہو کیا تمہارے برادر کوئی نہیں ہے کہ ایک ہماری کی لڑکی کو اس حویلی کی دیوار بناؤ گے میری زندگی میں یہ ہرگز نہیں ہوگا کچھ نکل

غریب کی کنیا کو عزت بخش دیں۔“ حکیم خان نے بڑی مشکل سے یہ کہا۔

”پہلے تم اپنی گھبراہٹ پر قابو کرو پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ باقر نے اطمینان سے کہا۔

”آئیے اندر آئیے۔“ اندر کمرے میں ایک کھاٹ پر لی تھی اس نے اس پر جلدی سے دری اور ایک صاف چادر بچھادی اور بولا۔ ”یہ آپ کی شان کے مطابق نہیں ہے۔“

”اب بس کرو حکیم خان مانا کہ تم اہل زبان ہو مگر مجھے شرمندہ نہ کرو۔“ نواب نے جواب دیا۔

”میری مجال ہے کہ آپ کو شرمندہ کرنے کی کوشش کروں۔ پشت با پشت سے آپ کا ٹنگ کھا رہا ہوں۔ ایسی جرات کس طرح کر سکتا ہوں۔“ حکیم خان نے کہا۔

”اور اس گھمنڈ میں ہم آئے ہیں کہ تم ہمیں ناامید نہیں کرو گے۔“ نواب نے کہا۔

”سب کچھ آپ کا ہی ہے سرکار۔ میرے پاؤں جو ہے وہ آپ کا ہے آپ حکم کریں۔“ حکیم خان بولے۔

”والدہ کی خواہش ہے کہ ہم شادی کر لیں۔“ حکیم خان نے کہا۔

”بہت نیک خواہش ہے بیگم صاحبہ کی۔“ حکیم خان نے جواب دیا۔

”مگر میں کسی جاگیردار امیر زادی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ نواب نے کہا۔

”یہ آپ نے کیا فرمایا۔ رشتے تو برابر والوں سے ہی پائیدار ہوتے ہیں۔“ حکیم خان بولے۔

”میرے خیالات دوسرے ہیں۔“ حکیم خان میں کسی غریب کی لڑکی کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔“ نواب نے جواب دیا۔

”جھٹل میں ٹاٹ کا پیوند کچھ اچھا نہیں لگے گا سرکار۔“ حکیم خان بولے۔

”میں اس ٹاٹ کو بھی ٹھل بنا لوں گا۔“ نواب باقر نے کہا۔

”میں آپ کو کیا بتاؤں بس یہ سمجھ لیں کہ جس غریب

کر بن لو۔“

”تو پھر آپ بھی میری بات سن لیں۔ میں شادی کروں گا ہی نہیں۔“ نواب نے کہا۔

”میری بات کو غور سے سنو۔“ بیگم بولیں۔

”اس حویلی میں اعلیٰ خاندان کی بیویں آتی رہی ہیں۔ میرے والد نواب تھے۔ تمہارے والد نواب تھے ان کے والد بھی نواب تھے۔ اس پشت ہاپشت کے نوابی خاندان میں تم داغ کیوں لگانا چاہتے ہو۔ مجھ سے کو میں ایک سے ایک حسین اور خاندانی لڑکی تمہارے لئے تلاش کر سکتی ہوں۔ ذرا سوچو میرے اور تمہارے والد کے سب سے ہی لوگ نواب جاگیردار ہیں ان کی رشتہ داریاں بھی ایسوں میں ہی ہیں تم ایک باری کے دادا بن کر کیا فخر کر سکو گے۔ اپنی سسرال کسی کو لے جا سکو گے تم کلہو بن جاؤ گے کسی کے پاس اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہو گے تمہارے منہ پر نہ کہیں مگر پیٹھ مڑتے ہی تم کو برا کہیں گے آخر اس لڑکی میں کیا خاص بات ہے کہ تم اس سے ہی شادی کرنا چاہتے ہو مجھے یہ بتاؤ۔“ بیگم نے کہا۔

”اس لڑکی میں کوئی بات نہیں۔ میں نے اس کو صرف ایک بار دیکھا ہے۔“ نواب نے جواب دیا۔

”پھر اس قدر اس پر مر مٹنے کی کیا بات ہو گئی ہے۔“ بیگم نے پوچھا۔

”اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے میں اس پر مر مٹا بھی نہیں ہوں۔ میں نے اس سے عشق بھی نہیں کیا اب تک میں نے اس کی آواز بھی نہیں سنی اور نہ اس نے میری آواز سنی۔“ باقر علی نے جواب دیا۔

”پھر تو یہ اور بھی زیادہ تعجب کی بات ہے۔ کوئی تو خاص بات اس میں ہوگی۔“ بیگم نے کہا۔

”اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں خاص بات نہیں ہے۔“ باقر علی نے کہا۔

”پتہ نہیں کس زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔“ بیگم جھنجھلا کر بولیں۔

”امی آپ عورت ہیں آپ کو کسی بھی عورت میں خاص چیز نظر نہیں آئے گی میری نظر اور آپ کی نظر میں بہت

فرق ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے سامنے ذرا پر اسرار بن جائے یا بنادی جائے تو دوسری عورت کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی عورت کے اسرار جاننے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اتنی بے چین ہو جاتی ہے کہ کھانا پینا ہونا تک چھوڑ دیتی ہے اور آخر راز جان کر رزقی ہے۔ اور پھر راز جاننے کے بعد اس کے پیٹ میں وہ راز رہتا نہیں وہ جب تک کسی کے سامنے اس راز کو لے نہیں کرتی اس کے پیٹ میں درد رہتا ہے۔“ نواب نے ہنس کر کہا۔

”تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔“ بیگم ناراضگی سے بولیں۔

”میری یہ جسارت کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں ایک عام عورت کی فطرت بیان کر رہا تھا۔“ نواب نے جواب دیا۔

”اور میری فطرت یہ بھی ہے کہ میں تم کو اس کی اجازت نہ دوں خاندان کے نام کو بڑھ نہ لگنے دوں۔ تم بے شک پوری جاگیر کے وارث ہو۔ مالک ہو بہت بڑے جاگیردار ہو، ہزاروں لوگ تم کو سلام کرتے ہیں مگر یاد رکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ میرا کہنا ماننا بھی تمہارا فرض ہے۔“ بیگم نے کہا۔

”امی آپ کا کہا میرے لئے پتھر کی لکیر کی مانند ہے مگر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مشورہ اولاد اپنے ماں باپ سے نہیں کرتی۔ میں آپ کی کسی بات سے انحراف کرتا ہوں تو اس کو آپ میری مجبوری خیال کریں گستاخی نہ خیال کریں۔ اس طرح اگر آپ سوچیں گی تو شاید آپ کے دل میں میری بات کا وزن بڑھ جائے گا۔ اور مجھے آپ گستاخ اور بے ادب نہیں کہیں گی۔“ نواب نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

بیگم نے ایک نظر نواب کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا زبان سے کچھ نہیں کہا اور چلی گئیں۔

بیگم نے سب طرف دیکھا ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ اس سے محبت بھی بہت کرتی تھیں۔ ہر عورت اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے محبت میں پائے جانے کی ہی تمنا نہیں ہوتی وہ صرف چاہنے کے لئے ہوتی ہے۔ کچھ دینے کے لئے ہوتی

معیار پر پوری نہ اترے وہ حویلی کے طور طریقوں کو نہیں جانتی۔ غلطیاں بھی ہوں گی اس کے عادت و اطوار بھی حویلی والوں جیسے نہ ہوں گے اس کے باوجود اس کو آپ گوارہ کریں گی اور یہ کہ آپ اس کو اپنی بہو جائیں گی یہ بھول جائیں گی کہ وہ کس کی بیٹی ہے کہاں سے آئی ہے۔“

نواب نے بات ختم کی تو بیگم نے ایک لمبی ہوں کی اور بولیں۔ ”مجھے یہ سب منظور ہے۔“ اور پھر ایک دن رضیہ بنت حلیم خان نواب باقر علی کی دلہن بن کر حویلی میں آ گئی۔ یہ ایک انہونی تھی جس کو پوری جاگیر نے حیرت سے دیکھا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا مگر اصلیت کیا تھی اور آگے کیا ہونے والا تھا اس کا پتہ صرف نواب باقر کو تھا۔ شادی کی خوشی میں تمام ہاریوں اور دور دور کے گاؤں والوں کو کھانا کھلایا گیا بہت کچھ بانٹا گیا بہت کچھ معاف کیا گیا۔ سب ہی نے نواب کے گن گائے، دعائیں دیتے اپنے اپنے گھر وں کولوٹ گئے۔

اب زندگی کی وہ اہم رات آنے والی تھی جس رات کے انتظار میں لڑکے سالوں سے رہتے ہیں۔ لڑکیاں اس رات کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ مگر نواب باقر علی کے ساتھ ایسا کچھ نہ تھا وہ دلہن کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ تیری اس بات کی تھی کہ وہ کس طرح اس کو اپنی مجبوری بتائے گا۔ کس طرح خود کو اس کے سامنے مجبور ظاہر کرے گا اس کو کس طرح متاثر کرے گا اور آخر اس کو دلہن کے کمرے میں جانا تو تھا۔

پہلی رات کی دلہن روایتی انداز میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ گھٹکت میں چھپا ہوا تھا۔ اس کو دکھ کر باقر علی کو بوجہ آ یا خود کو دنیا کا بہت بڑا ظالم آدمی اس نے محسوس کیا۔ باقر علی کو اپنی رنگین راتیں یاد نہیں تھیں مگر موجودہ پریشانی اس کے سر پر ضرور سوار تھی۔ اس کی حالت قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔ چہرہ فق تھا اس رات کے انتظار میں دلہن پر جو کیف و سرور کی کیفیت ہوتی ہے اس کی جگہ وحشیانہ کوفت اور روحانی تکلیف تھی۔ وہ ایک وحشی عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک معصوم لڑکی کے ڈر سے اس کا برا حال تھا۔ اس کا بس چلنا تو

ہے وہ ماں تھیں ان کو ہی کچھ دینا تھا اپنی ان کی قربانی خاندان کی قربانی اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر کیا ہوگا۔ بیٹے کا گھر نہیں بے گا جس خاندان کا نام وہ اونچا رکھنا چاہتی ہیں باقر کے بعد ختم ہو جائے گا کوئی نام لیوا نہیں ہوا تو یہ جاگیر اجڑ جائے گی نام مٹ جائے گا۔ ”مجھے باقر کا گھر رسانیہ اجاڑنا نہیں ہے مجھے اپنی محبت کا ثبوت دینا ہے وہ اگر ایک ہاری کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو مجھے اس بات کو تسلیم کرنا ہے۔“ اور انہوں نے باقر علی کو کہا۔ ”میں نے بہت غور کیا ہے تمہاری بات پر۔ تم نے میری بات پر غور کیا تھا۔“

”ہاں امی میں نے آپ کے فرمان پر خوب غور کیا مگر میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔“ نواب نے جواب دیا۔ ”بیٹا تم عقل مند بھی ہو اس کا ثبوت جاگیر کا انتظام ہے اور ذہین بھی ہو کہ تم نے اچھے الفاظ میں مجھ سے اختلاف بھی کر دیا۔ مگر یاد رکھو یہ ضروری نہیں کہ جو ذہین ہوں وہ غلطیاں نہ کرتے ہوں۔ سمندر میں اچھے تیراک بھی ڈوب جاتے ہیں۔ میری بات پر پھر غور کرو گے۔“ بیگم نے پوچھا۔ ”اب عمل کا وقت آ رہا ہے۔ جو سوچنا تھا غور کرنا تھا وہ وقت ختم ہوا۔“ نواب نے کہا۔

”اتنی جلدی عمل کا وقت آ گیا۔“ بیگم نے کہا۔ ”جی ہاں یہ بھی آپ کے فرمان کے مطابق ہوا ہے۔“ نواب نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تیاری کر لو میں تمہاری رضا کے ساتھ ہوں۔“ بیگم نے کہا۔

”مجھے پتہ تھا امی آپ ضرور راضی ہو جائیں گی ایک وعدہ آپ کو اور کرنا ہوگا۔“ نواب نے کہا۔

”شرطیں منوائے مجھ سے۔“ بیگم نے کہا۔ ”نہیں درخواست ہے۔“ نواب نے جواب دیا۔

”میں تمہارے بغیر بتائے بھی درخواست قبول کرتی ہوں۔“ بیگم نے جواب دیا۔

”پہلے آپ سن لیں میری درخواست تو آپ میرے بغیر بتائے بھی مان رہی ہیں مگر وہ لڑکی آپ کی نہیں ہوگی وہ ایک غریب گھر سے آئے گی ہو سکتا ہے آپ کے

شاید وہ اس کا سامنا ہی نہ کرتا مگر اس سے اب کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا اب تو سامنا کرنا ہی تھا۔

وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دہن گھڑی بنی بیٹھی رہی۔ وہ بھی کھڑا تھا۔ اس کی ہمت اس کو ہاتھ لگانے کی نہیں ہو رہی تھی جیسے وہ کانچ کی گڑیا تھی۔ جیسے وہ چکی کا چنگار تھا۔ وہ کھڑا ہوا کافی دیر گزر گئی۔ گھڑی میں سے ایک باریک متلیجیاندی آواز آئی۔ ”بیٹھے جائیں تھک جائیں گے۔“

یہ جملہ بڑے معصوم غلوں کے ساتھ ادا کیا گیا تھا۔ مگر نواب باقر کے دل پر توپ کے گولے کی مانند لگا۔ ایک سکاری اس کے تنک آ کر رہ گئی۔ وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ یہ گھونگٹ تو اٹھا دیں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”یہ تو آپ کا کام ہے“ باریک کی آواز آئی۔
”میں بہت گناہ گار پیدا آدمی ہوں۔ کسی پاک چیز کو کیسے ہاتھ لگاؤں۔“ احساس ندامت اس کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

”میں تو آپ کی ہوں۔“ باریک آواز آئی۔
”دنیا کی نظر میں تم میری بیوی ہو میری شریک حیات ہو۔ میرے دکھ سکھ میں سبھی ہو مگر یہ پردہ تم خود اٹھاؤ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”میں خود ہٹائے دیتی ہوں۔“ اور دہن نے گھونگٹ اٹھا دیا۔ گھونگٹ کے اندر ایک چاند تھا۔ جو بدلیوں سے باہر آ گیا تھا نواب نے اس کو ایک دفعہ سرسری نظر سے دیکھا مگر یہ تو حسن کا بہتار یا تھا۔

اس کا احساس ندامت اور بڑھ گیا۔ احساس جرم میں اور اضافہ ہو گیا۔ ”آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر کہاں سے شروع کروں یہ سوچ رہا ہوں۔“ نواب نے کہا۔

”کہنا شروع کر دیں، سوچ کیا رہے ہیں۔“ دہن نے پھر کہا۔

”یہ کہانی دس سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ ایک چندرہ

سال کا تیار بننا ہوا درخت ایک دلدل میں گر گیا تھا اس دلدل میں بڑی رنگین مٹی تھی بھانت بھانت کی خوشبوئیں اس مٹی میں تھیں وہ مٹی درخت میں لپٹ گئی وہ بھی اس میں پڑا رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ درخت بڑے سے چوٹی تک نوکھ گیا کوئی زندگی کی رتق اس میں نہیں تھی۔ میری کہانی زیادہ ابھی ہوئی نہیں ہے میں زندگی کی بھول بھلیوں میں خود ہی الجھ گیا ہوں اس میں کسی کا قصور نہیں ہے مجھے کسی نے لوٹا نہیں ہے میں کسی کو قصور وار نہیں کہتا اگر کوئی قصور وار ہے تو وہ اس حویلی کا ماحول ہے جہاں ہر کام کے لئے نوجوان باندیاں ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتی ہیں ان گھاگ اور مزاج شناس باندیوں میں مجھ جیسا چندرہ سالہ لڑکا کیا کرتا۔ ہاں میں تمہارا مجرم ضرور ہوں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے شادی کیوں کی۔ تمہارا یہ سوال جائز بھی ہے اور فطری بھی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا میں نے ہر طرح سے اس موضوع کو ٹالنا چاہا۔ مگر میری ایک ماں بھی ہے اس کے کچھ ارمان بھی ہیں وہ خاندانی نام کو آگے بھی بڑھانا چاہتی ہے۔ مگر جس کشمی میں وہ آگے جانا چاہتی ہے وہ تو پوری کی پوری دیمک زدہ ہے مگر اس کو یہ بات کون بتائے۔ وہ اپنے معیار کے مطابق دہن لانا چاہتی تھی اس کے بعد کیا ہوتا۔ خاندانی نام برسوں سے بنی ہوئی عزت و محول ہو جاتی وہ رئیس زادی وہ نازوں کی پٹی زمین آسان ایک کر دیتی اور نواب باقر علی منہ چھپائے روپوش ہوتے یا کسی کو نہیں سے ان کی لاش برآمد ہوتی۔ یہ تھے وہ حالات جو مجھے تمہارے گھر تک لے گئے۔ میں نے قے بولنے کا عہد کیا ہے میں دس سال جھوٹ میں گزار کر اب کچھ کی طرف پلٹا ہوں۔ میں اپنے مطلب سے تمہارے گھر تک گیا تھا۔ میں نے تم کو دیکھا نہیں تھا تم جیسی بھی تھیں مجھے اس سے غرض نہیں تھی مجھے تو ایک لباس چاہئے تھا جس کو پہن کر میں اپنی ماں کے اور سب لوگوں کے سامنے جاسکوں تم چونکہ میرے ہاری کی بیٹی ہو اس لئے تمہارے منہ میں اپنی زبان ڈال سکوں۔ مگر تم کو دیکھ کر میرا ضمیر مجبور کر رہا ہے کہ سب کچھ قے بول دوں اور میں نے تم کو پوری کہانی اور اپنا رازہ بتا دیا۔

میں ایک سوکھا درخت ہوں تم چاہو تو صبح اعلان کرو دنیا کو
بتا دو اس کی فکر نہ کرو کہ میرا کیا ہوگا میں نے تمہارے ساتھ
دھوکا کیا ہے تم کو بھی یہ حق ہے کہ تم اس کا بدلہ لو۔“ نواب
خاموش ہو گیا۔

دلہن گردن جھکائے اپنی تقدیر کا فیصلہ سن رہی تھی۔
اس کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے جذبات پر برف بڑ چکی تھی
ساری انگلیں آرزوئیں دم توڑ چکی تھیں۔ مگر وہ خاموش تھی۔

نواب باقر علی کی تو کہانی ختم ہو گئی آگے کیا بیان کرتا
اس لئے خاموش تھا اور دلہن رضیہ سلطانہ کی دنیا میں اندھیرا
چھا گیا تھا۔ اس کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں
کھڑی تھی ہر طرف گھب اندھیرا کوئی راستہ نہ تھا حکیم خان کی
طرف وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ باپ نے تو دوا دے کر ہی دیا پھر

وہ میرا گھر کہاں رہا۔ یہی گھر امیرا ہے میرا شوہر تو ہے چاہے
نام کا ہے دنیا میں ہر چیز تو نہیں ملتی کہیں نا کہیں کچھ نہ کچھ کی تو
رہتی ہے مجھے اگر ایک چیز ملی تو کیا ہوا وہ ایک فیصلے پر پہنچ
گئی اس نے پہلی بھر پور نظر نواب باقر پر ڈالی اور بولی۔

”آپ نے مجھے بیوی تسلیم کر لیا ہے۔“
”ہاں دل سے میں تمہیں بیوی تسلیم کرتا ہوں۔“
نواب نے کہا۔

”میں زیادہ بڑھی لکھی نہیں ہوں مگر میں نے کہیں پر
پڑھا ہے کہ جسموں کی تسکین عارضی چیز ہے۔ اصل تسکین
روحانی ہوتی ہے اور روحانی تسکین جذباتوں میں ہوتی ہے
میں جسمانی تسکین کو ترک کرتی ہوں مگر دل سے آپ کو اپنا
شوہر جانتی ہوں۔ آپ کا راز میرے سینے میں آج دفن
ہو گیا، مرتے دم تک زبان پر نہیں آئے گا۔“

نواب کی آنکھیں جھجک گئیں اور اس نے اپنا منہ
دلہن کی گود میں ڈال دیا۔ جذبات کہ آندھیاں رک چکی
تھیں۔ بادل البتہ بھرے ہوئے تھے بہت دیر تک بارش
ہوتی رہی اور پھر صبح ہو گئی۔

دلیر کہ تیار یاں شروع ہو گئیں اور لوگ پلاؤ کھا کر
چلے گئے۔ نواب باقر بیوی کے اشارے کے منتظر رہتے۔
اس کا کہا پتھر کی لکیر تھا۔ بڑی بیگم کا حکم خلیلی پر چلتا تھا مگر

نواب باقر پر رضیہ سلطانہ کی حکومت تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ بڑی بیگم کو خوش خبری سننے کی
جلدی تھی مگر ادھر خاموشی تھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

بڑی بیگم نے کچھ ہوشیار عمر رسیدہ عورتوں سے مشورہ کیا اور
فیصلہ یہ ہوا کہ دلہن کو کسی کو دکھایا جائے مگر اس پر نواب باقر
راضی ہوئے نہ دلہن راضی ہوئی۔ اس طرح وقت گزر گیا بڑی
بیگم کی عمر کی پونجی ختم ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ادوی بننا چاہتی
تھیں مگر رضیہ سلطانہ ایک بے پھل درخت تھی ایک تو ان کے
دل میں دلہن کے لئے پہلے ہی پھانس تھی دوسرے اس کا بے

ثمر ہونا وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور ایک دن بیٹے سے بولیں۔
”تم نے اپنی ضد پوری کر لی۔ میری ناک نیچے کرا
دی۔ مگر تم کو اس کا کیا فائدہ ہوا کوئی مایہ برداشت نہیں کرتا کہ
اس کا لگایا ہوا پودا بے ثمر رہے وہ اس کو کٹ ڈالتا ہے اور دوسرا پودا
لگا دیتا ہے دو سال سے اوپر ہوئے کو آئے ہیں۔ اب تک
وارث کے انتظار میں بیٹھی ہوں تم کو اس کا کچھ خیال ہے۔“

نواب نے سکون کے ساتھ ماں کی بات سنی وہ جانتا
تھا ایک نہ ایک دن یہ مقام آئے گا اس نے جواب بھی سوچ
رکھا تھا بولا۔ ”امی جس طرح قدرت نے بہت سی باتیں
بہت سے کام اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اسی طرح اولاد دینا
اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ انسان نہ بے وقت مر سکتا
ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے اس لئے ہم صرف انتظار کر سکتے ہیں
جب اس کا حکم ہوگا تو اولاد ہو ہی جائے گی۔ اس کے لئے کیا
فکر کریں۔“

”تم صرف یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بھاگ رہے
ہو۔ اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کا علاج بھی تو کراتے ہیں
ہو سکتا ہے دلہن میں کچھ نقص ہے۔ اس کو ہوشیار معالج لکھیک
کر سکتا ہے۔ تم علاج کی اجازت تو دو۔“ بڑی بیگم نے اپنے
دل کی بات کہہ دی۔

مگر نواب نے ان کے خیال کو نہ مانا۔ کیونکہ اصل
حقیقت تو وہ وہی جانتا تھا۔ مگر بوڑھی بڑی بیگم کہاں ماننے
والی تھیں وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی بے چینی میں اضافہ ہی
ہوتا جا رہا تھا۔

گیا۔ جتنی دیر آپ چاہیں ان کو روک لیں۔ آپ کی قابلیت پر ہے۔“ اور دونوں چلی گئیں اور پھر ایک جوڑے کو لے کر آگئیں۔ نواب باقر علی جوان آدمی تھے مگر کچھ مرجھائے بچوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ان کی بیگم رضیہ سلطانہ ایک حسین عورت تھی۔ میں نے اور رولوکا نے بہت غور سے اسی کو دیکھا اور رولوکا کی تجربہ کار نگاہیں پر کھتی رہیں اور میں نے باتیں شروع کر دیں۔ اپنے دلچسپ سفر بیان کرنا شروع کر دیئے۔ مطلب ان کو زیادہ سے زیادہ روکنا تھا ان کے مشاغل پوچھتا رہا۔ علاج معالجے کی کوئی بات درمیان میں نہیں آنے دی اور پھر رات نو بجے کھانے کا اہتمام ہوا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے رولوکا کی طرف دیکھا رولوکا نے گردن ہلانے اور کھانا کھانے لگا اس کے بعد ہم نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور واپس چلے گئے۔

واپس آ کر میں نے رولوکا سے پوچھا۔ ”یہ کیا تجربہ کیا سارہ؟“

”پہلے آپ بتائیں۔“ رولوکا نے میرے کورٹ میں گیند پھینک دی۔

”ٹھیک ہے میں اپنا خیال بتائے دیتا ہوں۔ لڑکی کی چال و حال بیٹھنے اور پھر اٹھنے کا انداز اور جسم کی بناوٹ اس کو ایک شادی شدہ عورت ثابت نہیں کرتی۔ کنواری لڑکی اور شادی شدہ عورت میں جو فرق ہونا چاہیے وہ میں اس میں نہیں پاتا۔“ میں نے بات ختم کی تو رولوکا ہنس کر بولا۔

”آپ کی نظر واقعی بہت گہری ہے آپ نے بہت دور تک دیکھ لیا مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ اب رہے نواب باقر علی تو معاملہ صاف ہے خرابی تو کسی ایک میں ہی ہوگی بظاہر نواب تندرست نظر آتے ہیں مگر ان کا جوانی میں مرجھایا ہوا چہرہ بھی کچھ بیان کر رہا ہے کچھ اندرونی کرب کے آثار چہرے پر نمایاں ہیں۔ اس سے زیادہ اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا ان کے بارے میں کچھ کھوج کرنا ہوگی ان کی بیگم کے متعلق اور ان کی بابت کچھ معلومات جمع کرنا ہوں گی ان کی خلوت میں بھی جانا پڑے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو پھر بیگم کو کیا جواب دیا جائے۔“ میں نے

دلی میں ان کی ایک بہن رہا کرتی تھیں وہ ان کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ دونوں بہنوں میں سر جوڑ کر ایک خاص میٹنگ ہوئی اور ان کی بہن نے نواب باقر علی اور اس کی بیگم کی دعوت کردی اور دعوت بھی اپنے گھر دلی میں اور بڑی چالاکی سے وہ ان کو بمعہ اپنی بہن کے دلی لے آئیں۔ اصل بات کی ان کو بھٹک تک نہیں لگنے دی۔ دلی بڑا شہر اور اس میں اس کے مرحوم شوہر کی بڑی حویلی، خاندانی رئیس ساری دلی کے بڑے لوگوں سے مراسم۔ نواب باقر کی دعوت کا اہتمام بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا شہر کے تمام شرفا کو دعوت دی گئی اور اس دعوت میں مجھے بھی بلایا گیا۔ بڑی بیگم اور ان کی دہن نے دعوت سے پہلے میرے پاس آ کر تمام حالات بیان کر دیئے اور اس دعوت کا اصل مقصد بھی بتادیا۔ مجھے نواب باقر اور اس کی دہن سے ملنا تھا اور مجھے اپنے تجربے سے ہی کچھ اندازے کرنے تھے۔ کام بہت مشکل تھا کیونکہ کسی سے بھی سوال کرنے کی گنجائش نہیں تھی میں نے ان کو بتادیا تھا کہ میرے ساتھ میرے ایک دوست حکیم کامل بھی آئیں گے۔

یہ میری زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا اور ایک بڑا چیلنج بھی تھا۔ اس لئے میں نے ان کو بتادیا تھا کہ آپ صدی صدی تو قہر نہیں کیونکہ میں نے اس طرح مرض کی تشخیص کبھی نہیں کی ہے۔ تقریبات آٹھ بجے تھے میں اور رولوکا ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ ایک بہت بڑی کشادہ جگہ پر دلی کے شرفا جمع تھے۔ دو دو چار کی ٹولیوں میں باتیں کر رہے تھے ملازمین ان کی خاطر مدارت میں مصروف تھے میں دلی کا آبائی باشندہ نہیں تھا مگر میرے پیشے کی وجہ سے بہت لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں نے اور رولوکا نے سب سے ہاتھ ملایا۔ صاحب خانہ نے بڑے احترام سے ہم دونوں کو ایک بڑی میز پر بٹھادیا اس میز پر صرف چار کرسیاں تھیں دو پر ہم دونوں بیٹھ گئے صرف چار کرسیاں لگانے کا مقصد میری سمجھ میں آ رہا تھا چند ہی منٹ کے بعد بڑی بیگم اور ان کی بہن آگئیں۔ بڑی بیگم نے کہا۔ ”میں دونوں میاں بیوی کو لے کر آتی ہوں ان دو کرسیوں پر ان کو بٹھا کر میں چلی جاؤں گی ان کو آپ باتوں میں لگائیں ادھر کوئی نہیں آئے

پوچھا۔

”کہہ دیں ایک ہفتہ کے بعد ہم خود ان کی جاگیر پر حاضر ہو جائیں گے“ رولوکانے جواب دیا۔

میں نے بڑی نیگم کو بتا دیا کہ آپ کا کام ہو جائے گا ابھی ہم کچھ نہیں کہتے ہم خود ایک ہفتہ کے بعد ان کے دولت خانے پر آ جائیں گے اور وہیں پر بتائیں گے۔ بڑی نیگم کچھ ناامید ہوئیں وہ چٹ مٹکی پٹ بیاہ کے پکر میں تھیں چلی گئیں۔ دو دن کے بعد سب لوگ بھی امر وہ چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی رولوکا بھی چلا گیا۔ مگر کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے قافلے میں ایک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تین دن کے بعد رولوکا واپس آ گیا اور بولا۔ ”کام ہو گیا حکیم صاحب۔“ میں نے پوچھا۔ ”تفصیل بتاؤ تو پتہ چلے۔“

”نواب باقر علی خانی دھول ہیں وہ قابل علاج ہیں نیگم ٹھیک ہے۔ ان کی نیگم ایک غریب ہاری کی لڑکی ہے۔ نہایت نیک اور بے زبان اسی لئے نواب نے اس سے شادی کی ہے کہ وہ غریب خاموش رہے گی یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے۔ نواب کے ناکارہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت کم عمری سے وہ خرچ ہونا شروع ہو گئے تھے حوالی میں ایک سے ایک تجربہ کار اور لگا ہوا عورتیں تھیں۔ انہوں نے نواب کا آخر تک پیچھا کیا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان کا علاج ہو تو سکتا ہے اگر وہ کروائیں تو۔“ رولوکانے بات ختم کی۔

”ٹھیک ہے پھر دونوں چلتے ہیں ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اور ہم دونوں نواب باقر علی کی حوالی پہنچ گئے ہمارے حسب وعدہ پہنچنے پر بڑی نیگم بہت خوش ہو گئیں مگر نواب باقر دیکھ کر حیرت سے بولے۔ ”آپ لوگ کس طرح آ گئے حکیم صاحب۔“

”بات یہ ہے نواب صاحب کہ ہم سیلانی طرز کے حکیم ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے چلے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بہت خوب مگر یہاں تو سب تندرست ہیں۔“ نواب نے جواب دیا۔

”مگر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ سب تندرست نہیں ہیں کچھ مرض نظر آتے ہیں اور کچھ ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ ہم لوگ ان امراض کا بھی علاج کرتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔“ میں نے کہا۔

”حیرت کی بات ہے حکیم صاحب۔“ نواب نے کہا۔

”حیرت کی تو ہے مگر پیشہ ورانہ انداز میں دیکھا جائے تو اتنی حیرت کی نہیں ہے جو چیز آپ کو حیران کرتی ہے وہ میرے لئے باعث حیرت نہیں ہے اسی طرح کچھ باتیں مجھے حیرت میں ڈال دیں گی مگر وہ آپ کے لئے معمولی بات ہوگی یہ سب اپنے اپنے شعبے کی مہارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بے شک آپ نے درست فرمایا تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ یہاں پر کوئی ناکوئی بیمار ضرور ہے۔“ نواب نے کہا۔

”آپ نے درست نظریہ قائم کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر میں مریض کا نام بھی پتہ کروں گا۔“ نواب نے پوچھا۔

”میں بتاؤں گا تو آپ پریشان نہیں ہوں گے چونکہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ مریض آپ خود ہیں۔ آپ نے خود کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ اندرونی طور پر متاثر ہو گئے ہیں۔ مگر آپ فکر نہ کریں ہر مرض کا علاج ہے آپ پھر وہی توانائی حاصل کریں گے اور صاحب اولاد ہو جائیں گے انشاء اللہ۔ مگر آپ وہ کریں گے وہ کھائیں گے جو میں آپ کو بتاؤں گا۔ اس علاج پر چھ ماہ سے ایک سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے جب تک میں نہ ہوں خود پر کنٹرول کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

نواب کے چہرے پر رونق آ گئی وہ حیرت سے بولا۔ ”مگر آپ کو میری کیفیت کا کس طرح پتہ چلا۔“

”دعوت کے دن میں نے آپ کو چیک کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس دن تو آپ نے مجھ سے نہ کچھ پوچھا نہ میرے جسم کو ہاتھ لگایا تھا۔“ وہ پھر بولا۔

کرتے وہ سب کچھ نوکروں پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔“

”میرٹھ جانے کا تم کو کبھی اتفاق ہوا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے دیکھا ہوگا۔ میں تو کبھی نہیں گیا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”یہ بھی ایک شہر ہے۔ وہاں سے ایک مریض آیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”دعوت دے گیا ہوگا۔“ رولوکا نے کہا۔

”دعوت نہیں دے گیا بلکہ ایک کیس دے گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ تفصیل تو بتائیں۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”اس کا نام فرید احمد ہے اور کاروبار برتن بنانے کا ہے۔ ایک بڑے کارخانے کا مالک ہے سارے ہندوستان میں اس کے برتن جاتے ہیں اور وہ خود بھی ان کی فروخت اور وصولی کے لئے شہر وں شہروں میں پھرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ

یہ مسئلہ ہے کہ اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہو جاتی ہے جو مرچکے ہیں۔ مگر اس کو یہ نہیں ہوتا کہ وہ لوگ مرچکے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے پیغامات ان کے گھر وں پر پہنچانے جاتا ہے تو یہ چلتا ہے کہ جس کا پیغام وہ لایا ہے وہ تو ایک سال پہلے مرچکا ہے اس کے ساتھ کئی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اس کی

حالت خراب ہو گئی ہے اب وہ کسی بھی شہر میں صرف ان لوگوں سے ملتا ہے جن سے اس کو کام ہوتا ہے مگر پھر بھی کہیں تاکہیں پھنس ہی جاتا ہے کچھ عجیب سی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کیس تو دلچسپ ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کسی طرح ذہنی مریض بھی نظر نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔

”وہ ذہنی مریض نہیں ہوگا۔ مگر اسی طرح ہوتا رہا تو ایک دن پاگل خانے میں ہوگا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے پاس میرٹھ آؤں گا۔ وہ کسی نئے سفر پر نہ جائے۔“ میں نے کہا۔

”یہ حکمت ہے نواب صاحب۔ اچھا طیب شکل دیکھ کر بھی مرض پکڑ لیتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ واقعی اپنے فن کے ماہر آدمی ہیں۔“ نواب نے کہا۔

”آپ کی عزت نوازی ہے اور پاک بے نیاز کا کرم ہے۔“ میں نے کہا۔

اور نواب باقر علی کا علاج شروع ہو گیا۔ مگر آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے بڑی بیگم کو یہ بتایا کہ بیگم باقر علی کا علاج ہو رہا ہے۔ دوا میں نواب کی ہوتی تھیں اور بتایا جاتا تھا بیگم کی ہیں۔ اس طرح بڑی بیگم خوش تھیں کہ ان کے اندازے درست تھے۔ خرابی بیٹے میں نہیں بیوی میں ہی تھی۔ میں دوا میں اور خوراک کا چارٹ بنا کر واپس دلی آ گیا تھا۔ رولوکا

البتہ آتا جاتا رہتا تھا۔ دوا میں بھی وہی پوری کرتا تھا ان میں کچھ عجیب طرز کے پھل اور پھول تھے جو رولوکا ہی لاسکتا تھا۔ وہ دوا میں بہت تیزی سے اثر کر رہی تھیں۔

یہ علاج چھ ماہ تک چلتا رہا اور پھر رولوکا نے نواب کو پوری طرح تندرست قرار دے دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ضروری باتیں بھی نواب باقر علی کے گوش گزار کر دیں اور پھر وقت آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ نواب خود مٹھائی لے کر دلی آ گیا۔ اس کو وارنٹ مل گیا تھا۔

”نواب باقر علی کی کہانی صرف اتنی سی تھی مگر یہ کہانی ہر اس خاندان میں دہرائی جاتی رہی ہے جہاں دولت کی فراوانی ہے، جہاں والدین کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ہے اولاد لڑکا ہو یا لڑکی پوری توجہ مانگتا ہے اور ایک عمر کا

امدادوران پر ضرور آتا ہے کہ وہ کیوں اور کیسے کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اور جس مقام پر ان کو اس قسم کے مواقع زیادہ میسر ہوں وہاں تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ عمر کے اس نازک موڑ پر ان پر کڑی نظر رکھی جائے تو ان کے لئے ہی بہتر نہیں بلکہ وہ والدین کے لئے بھی اچھا ہے۔“ میں نے بات ختم کی تو رولوکا نے کہا۔

”آپ نے درست فرمایا حکیم صاحب۔ مگر ان خاندانوں میں جہاں پر ملازمین کی فوج ہو والدین کچھ نہیں

”تو پھر چلیں۔ میرٹھ بھی دیکھ لیں گے۔“ رولو کانے کہا۔

میرٹھ بھی یو پی کا ایک درمیانہ درجے کا شہر ہے یہاں پر برتنوں کی گھریلو صنعت ہے اور بہت بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا۔

لوگ سیدھے سادھے اور محنت کش ہیں بڑی تعداد مسلمانوں کی یہاں پر آباد ہے اور برتنوں کا سارا کاروبار بھی ان کے پاس ہے سارے ماہر کارگر مسلمان ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا بازار ہے۔

اس بازار میں ہر چیز کی دکانیں ہیں دکاندار زیادہ تر ہندو بننے ہیں۔ فرید احمد کا پتہ میرے پاس تھا ہم سیدھے اس کے پاس چلے گئے۔ فرید احمد کا مکان در منزل بنا ہوا تھا اور کافی قدیم معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی حرمت اور رنگ و روغن کا خیال رکھا گیا تھا۔ چلی منزل پر کارخانہ تھا اور اوپر پرانسی تھی۔ فرید احمد ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ صحت بھی اچھی، اس کے صرف دو بچے تھے۔ لڑکی کی شادی کر چکا تھا اور لڑکا پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اوپر مکان بہت بڑا تھا اس نے ہم دونوں کو ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ رات کھانے کے بعد وہ ہمارے پاس آ گیا۔

”مجھے بہت ضروری بڑودہ جانا تھا۔ مال گئے کافی دن ہو گئے ہیں رقم ابھی تک نہیں آئی مگر آپ نے منع کر دیا تھا اس لئے نہیں جاسکا۔“ فرید احمد نے بات شروع کر دی۔

”فرید احمد یہ میرے ساتھی اور حکیم کامل خان ہیں۔ اب ذرا تفصیل سے بتاؤ ماجرہ کیا ہے اور پہلی بار کب تمہارے ساتھ پیش آیا۔“ میں نے کہا۔

”میرا مال گجرات بھی جاتا ہے تو میں اندور گیا ہوا تھا۔ کام تو ایک روز کا ہی تھا مگر جس سے ملنا تھا وہ نہیں ملا تو رکنا پڑا تھا میں بازار سے انٹیشن کی طرف آ رہا تھا کہ سامنے سے گویا شرما آتے نظر آ گئے۔ یہ میرے والد کے زمانے کے کاہک تھے اور والد صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی میں ادب سے ان کو بچا کہا کرتا تھا۔ والد صاحب کی موت کے

بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی کیوں کہ وہ پھر نہیں آئے۔ رہنے والے وہ بھی میرٹھ کے تھے اور ان کی دکان بھی بڑے بازار میں تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو پہچان لیا میں نے بھی اچھی طرح پہچان لیا وہ بڑی شفقت سے پیش آئے میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ اندور میں کچھ کام شروع کر دیا ہے اسی لئے یہاں پر رہتا ہوں۔ جب بھی آؤ ملنا ضرور مگر پتہ نہیں بتایا۔ پوچھا کب میرٹھ جاؤ گے میں نے ان کو بتا دیا کہ ایک دو روز میں چلا جاؤں گا اچھا تو پھر میرے گھر چلے جانا کہنا میں ٹھیک ہوں امرت لال ہوشیار رہے زیادہ گانا سننے نہ جایا کرے اور دکان کا خیال رکھے نہیں مانے گا تو خود آ کر کان کچھنچوں گا۔ امرت لال ان کے لڑکے کا نام تھا میں دوسرے ہی روز واپس آ گیا اور ان کے گھر چلا گیا۔ امرت لال اور اس کی ماں دونوں ہی مجھے جانتے تھے دونوں گھر پرل گئے میں نے پورا بیغام ان کو بتا دیا۔ وہ لوگ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ امرت لال بڑی مشکل سے بولا۔

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ تم کو کوئی اور ملا ہوگا باپو سے تم نہیں ملے کوئی بہرو پیہ تم کو غریب دے گیا ہے۔“

”کیا بات کرتے ہو امرت میں نے چچا گوپال کو سینکڑوں بار دیکھا ہے میں دھوکا کیسے کھاؤں گا؟“ میں نے کہا۔

تو وہ بولا۔ ”تو پھر ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ان کو سورگ باشی ہوئے پورا ایک سال ہو گیا ہے۔“ وہ بولا۔

اب میری حالت وہ تھی جو کچھ دیر پہلے امرت کی تھی۔ میں صرف یہ کہہ رکھا تھا۔ ”نفاق کر رہے ہو؟“

”ارے میں نفاق کیوں کروں گا۔ ماں سے پوچھ لو بازار میں پوچھ لو سب کو پتہ ہے میں نے خود چتا میں آگ دی ہے۔ میرے سامنے سارا شریہ راہک ہوا ہے اور پھر میں نے وہ راہک جتنا میں پہانی ہے یہ سب جھوٹ نہیں ہے۔ تم چاہے جس سے پتہ کر لو۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ بہرو پیہ تھا تو اس کو میرا نام کس طرح دے ہوا اور میں گانا سننے جاتا ہوں یہ کس طرح پتہ ہو۔ اس کا تو گھر میں بھی کسی کو پتہ نہیں ہے۔“ امرت لال حیرت سے بولا۔

ہو گیا ہے۔ لوگ مال لیتے ہیں ادائیگی نہیں کرتے۔ میں آگے کس طرح مال بناؤں گا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فرید احمد مایوسی سے بولا۔

”یہ بتاؤ تمہارا کوئی کاروباری رقیب ہے اس شہر میں۔“ ردلوکانے پوچھا۔

”رقابت تو میں کسی سے نہیں رکھتا۔“ فرید احمد نے جواب دیا۔

”کوئی ایسا جس کا تمہاری وجہ سے کاروبار دب رہا ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ شرماجی کا بھی یہی کام ہے مگر میرے پاس مسلمان کاریگر اچھے ہیں میرا مال مارکیٹ میں پہلے اٹھ جاتا ہے ان کو دیوالی تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

فرید احمد نے جواب دیا۔

”دیوالی تک کیوں.....“ میں نے پوچھا۔

”ہندوؤں کا ایک تہوار ہوتا ہے اس میں یہ لوگ اپنے برتن خریدتے ہیں اس وقت انیس بیس سب بک جاتے ہیں مگر میرا مال سارے سال بکتا ہے۔ ہندو مسلمان سب خریدتے ہیں۔“ فرید احمد نے جواب دیا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ تمہارے شرماجی کچھ شرارت کر رہے ہوں یا کروا رہے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے لگتا تو نہیں کیونکہ اس کے علاوہ ہماری اچھی بات چیت ہے شادی بیاہ میں آنا جانا بھی ہے لین دین بھی ہے میں تو کم از کم ایسا گمان بھی دل میں نہیں لاسکتا۔“ فرید احمد نے کہا۔

”تم ایسا کہتے ہو مگر زندگی کے کھیل بڑے نیارے اور پر فریب ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو انسان کی داستان حیات ادھوری رہ جائے۔ کچھ واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں جن کے بارے میں انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ انسان کے اندر جہاں سینکڑوں خواہشیں اور جذبے ہیں وہیں پر ایک جذبہ لالچ کا بھی ہے جب اس کا یہ جذبہ انسان پر حاوی ہوتا ہے تو وہ صرف نیلے پیلے ہرے نوٹ دیکھتا ہے۔ وہ نوٹ اس کو ہر بات بھلا دیتے ہیں،

”بات تو حیرت کی ہی ہے میں نے چچا گوپال کو پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میری تو کھوپڑی کام نہیں کرتی۔“ امرت لال نے جواب دیا۔ اس کے بعد میرے ساتھ کئی واقعات اور ہو گئے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ میری بڑی بڑی رقیبیں رکنا شروع ہو گئیں گا بک رقم دینے میں ٹالنے لگے۔“

”اچھا یہ بتاؤ تم کو مر اہوا آدمی جب بھی ملا کیا وہ دن کا وقت تھا۔“ ردلوکانے پوچھا۔

”نہیں دن کے وقت مجھے کوئی نہیں ملا۔ غروب آفتاب کے بعد ہی ملا۔“

”تمہاری اب تک جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے ان کے بارے میں تم جانتے تھے کہ وہ مر گئے ہیں؟“

میں نے پوچھا۔

”نہیں مجھے کسی کے بارے میں پتہ نہیں تھا کہ وہ مر گئے ہیں۔“ فرید احمد نے جواب دیا۔

”آخری آدمی تم کو بک ملا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ مجھے رجسٹریشن پر ملا تھا۔ اس کی میرٹھ میں پان کی دکان تھی۔ میں بازار جاتا تھا تو اس کے پاس سے پان ضرور کھاتا تھا۔ اس کا نام بھرجی تھا۔ پھر اس کی دکان بند ہو گئی۔ میں بھی کبھی کبھی اس کا گاہک تھا اور پھر زیادہ تر شہر سے باہر رہا کرتا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ اس کی دکان کیوں بند ہوئی تھی۔ جیل پور میں میری اس کی ملاقات ہو گئی۔ میں نے پوچھا تم نے میرے ٹھکانے بند کر دی ہے تو اس نے بتایا وہاں کا رو بار بہت منہد تھا۔ اس لئے جیل پور آ گیا ہوں آپ تو ٹھیک ہیں میں نے جواب دیا۔ ہاں ٹھیک ہوں۔ میں میرٹھ واپس آ گیا میرے دل میں یہ بات تھی کہ کہیں یہ بھی تو نہیں مر گیا۔ میں بازار گیا اور پتہ کیا کہ بھرجی پان والا کہاں چلا گیا تو اس کے ارد گرد کے دکانداروں نے بتایا کہ وہ تو کب کا مر گیا ہے۔ میرا شک درست نکلا۔ بھرجی مرنے کے بعد مجھے ملا تھا۔ میں نے اس کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔“

”اب کاروبار کا کیا حال ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”بہت برا حال ہے مارکیٹ میں بہت سرمایہ جام

دوستی، محبت، رشتہ داری سب دھندلا جاتی ہے وہ صرف نوٹ لگتا ہے اور پھر وہ ایسا کر گزرتا ہے جس کا تم گمان نہیں کرتے۔ تم شرابی کا تاؤ وہ کہاں ہوتے ہیں ان کو چیک کرنا ہوگا۔“ میں نے تفصیل سے فرید احمد کو بتایا۔

”وہ میرٹھ کے محلے بھگوان پورہ میں رہتے ہیں وہیں ان کا کارخانہ بھی ہے۔“ فرید احمد نے بتایا۔

”تمہارا باپ رہ جانے کا ارادہ ہے۔“ رولوکانے پوچھا۔
”ارادہ تو ہے مگر صرف خرچہ ہی ہے لہواری تو ملتی نہیں۔“ چنی انتشار میں مبتلا ہوں۔“ فرید بولا۔

”تم جہاں جانا چاہتے ہو ضرور جاؤ اور اپنا ادھار وصول کرو۔“ رولوکانے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ کا حکم ہے تو احمد آباد چلا جاتا ہوں وہاں کے دکانداروں پر میرا ادھار ہے۔“ فرید نے کہا۔

دوسرے روز ہی فرید احمد روانہ ہو گیا رولوکانے کے ساتھ تھا۔ مگر یہ بات فرید کو پتہ نہیں تھی۔ گجرات کا ایک بہت بڑا صنعتی شہر احمد آباد ہے۔ اکثریت گجراتی اور مہینی بولنے والوں کی ہے۔ ٹیکسٹائل کی انڈسٹری بہت زیادہ ہے۔ ملوں کے مالکان ہندو بننے ہیں۔ مگر فی کارگر زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ بہت پر رونق بازار ہے۔ فرید احمد دن دس بجے ٹرین سے اتر کر سیدھا بڑے بازار کی طرف چلا گیا۔ ایک بہت بڑی دکان میں وہ کھس گیا۔ دکان کے اندرونی حصے کی طرف

دکان کا مالک سیٹھ ہری ہرن بڑے موٹے سے گاؤں کے سپارے بیٹھا تھا۔ اس کی پیٹھ کی طرف ایک بہت بڑی تجوری رکھی تھی۔ سیٹھ ہری ہرن بہت موٹا آدمی تھا چہرہ بھی بہت پتلا تھا۔ اس چوڑے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اس کے دہانے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اس نے فرید احمد کو آنکھیں سکڑ کر دیکھا اور بولا۔ ”ارے آؤ سیٹھ کیسے آتا ہوا۔“

”ہری سیٹھ ایک ہی کام تو آپ سے ہے۔ مال بھی ایک مہینے سے نہیں لیا اور بقیہ سے کچھ آپ نے دیا بھی نہیں۔“ فرید نے کہا۔

”دینے کا تو تم بھول ہی جاؤ۔ تمہارا مال بک ہی نہیں رہا، دوں کیا۔ دکان میں جگہ اور گھر رہا ہے۔“ ہری سیٹھ

نے جواب دیا۔

”اگر نہیں بک رہا تھا تو واپس کر دیتے۔“ فرید نے کہا۔

”لو بھلا خواہو اور خرچہ اور کرتا۔“ ہری سیٹھ نے جواب دیا۔

”یہ بات آپ نے پہلی بار بتائی ہے۔“ فرید نے کہا۔

”اب ضرورت پڑی ہے تو بتا دیا ہے۔ تم تو سر پر سوار ہو جاتے ہو رو کر لاؤ۔ ارے یہاں روٹی کے دانے ہیں تم کو کہاں سے دوں۔“ ہری سیٹھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔

اچانک فرید احمد کا لہجہ بدل گیا۔ وہ بولا۔ ”ہری سیٹھ میں قرض وصول کرنے آیا ہوں۔ قرض مانگتے نہیں آیا۔ تم سیٹھ ہو اس تجوری میں روپے بھرے پڑے ہیں اور تم روٹیوں کے دانے کہتے ہو۔ بہت بڑے ناشکرے تم ہو۔

کان کھول کر سن لو برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ تمہاری طرف میری رقم دس ہزار ہے۔ تجوری کھولو اور مجھے ادا کرو۔“

فرید احمد نے کہا۔

سیٹھ ہری نے حیرت سے فرید کو دیکھا۔ ”یہ کون ہے فرید تو اس طرح نہیں بولتا۔“ پھر غصے سے بولا۔

”تم عزت سے جاؤ گے یا بلاؤں کی کو۔“

فرید نے کہا۔ ”جب تک تم مجھے روپیہ ادا نہیں کرو گے اندر کوئی نہیں آئے گا۔“

ہری سیٹھ نے ترجیحی نگاہوں سے فرید کو دیکھا اور آواز لگانے کو منہ کھولا مگر منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اس نے پھر

کوشش کی مگر پھر نا کام ہوا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔ بھڑاسا منہ کھول کر۔ لیسی سانس لینے کے بعد پھر آواز دینے کی کوشش کرنے لگا مگر آواز کی جگہ صرف خر

خر کی بارگشت سنائی دی۔ چند منٹ میں ہی اس کی حالت خراب ہو گئی۔ فرید احمد نے پھر کہا۔

”بولو میری رقم اسی وقت ادا کرتے ہو۔“ اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا تو فرید نے کہا۔ ”جاؤ تجوری کھولو۔“

ہری سیٹھ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہو کر اس نے خود کو دیکھا جب اس کو یقین آ گیا کہ وہ کھڑا ہو سکتا

درجے لے بے ایمان آدمی ہو۔“ فرید لے لہا۔
 ”ارے یہ کیوں چر یا اندرا گیا۔“ فشی ویدواس کو باہر تو
 نکال۔“ سیٹھ گنگا مل نے غصے سے کہا۔
 مگر فشی وہیں اسی طرح کھانا پکڑے بیٹھا رہا۔ سیٹھ
 نے پھر کہا۔ ”فشی کیا مر گیا میں کیا بولا۔“
 فرید احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”اس غریب کو چھوڑ دو تو
 تیری نین رہا ہے نہ دیکھ رہا ہے۔ تو خود ہی تجوری کھول کر تم
 دے۔“

”ارے تم کیا رقم رقم کرتا ہے۔“ اور اس نے آواز
 دینے کو منہ کھولا مگر ہری سیٹھ کی طرح اس کی بھی کوئی آواز نہ
 نکلی۔ اس نے تین چار دفعہ کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ پھر غصے
 سے اٹھنے لگا مگر جسم نے ملنے سے انکار کر دیا۔ فرید احمد اس کو
 دیکھ کر مسکراتا رہا۔ سیٹھ گنگا مل اس کی مسکراہٹ سے جل اٹھا
 اس نے ہر طرح کوشش کر لی کہ اپنے جسم کو حرکت دے سکے
 مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت خراب ہونے لگی چہرہ پیلا
 پڑ گیا اور گھبراہٹ نمایاں نظر آنے لگی وہ ہری سیٹھ سے زیادہ
 چالاک اور ہوشیار تھا مگر بھی اس سے کم لگتی تھی اور اس کے
 اعصاب بھی قوی معلوم ہوتے تھے مگر موجودہ حالت اس کی
 سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ فرید احمد نے سمجھ لیا کہ اب بات
 کرنے کا وقت ہے تو وہ بولا۔ ”ہاں سیٹھ کھوپڑی ٹھکانے
 آ گئی ہے تو بول تو بات کر سکتا ہے۔“

”تو دہی میرٹھ کا برتن والا ہے یا کوئی اور ہے۔“ وہ بولا۔
 ”میں وہی ہوں مگر تو وہ نہیں ہے صرف بیس ہزار کی
 رقم کے لئے تو بے ایمان ہو گیا۔“ فرید نے کہا۔

”تو غلط سمجھا میں تو تجھے پرکھ رہا تھا۔“ وہ بولا۔
 ”اور میں نے بھی تیری بہادری کی پرکھ کی تھی تو نے
 ہاتھ پیروی ڈال دیئے۔“ فرید نے کہا۔
 ”میں تیری رقم ادا کروں گا خود بھیج دوں گا چنتا مت
 کر۔“ اس نے پھر دوا مارا۔

”اب بھی داد دے چلا رہا ہے کھڑا ہو جاو تجوری کھول
 کر میری رقم نکال کر دے۔“ فرید نے کہا۔
 گنگا جانی کے گڈے کی طرح کھڑا ہو گیا اور پھر

ہے تو وہ تجوری کی طرف کیا دھونی لی لگام سے چاپوں کا
 گھپکا نکالا اور تجوری کھول کر پورے دس ہزار روپے فرید
 احمد کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ فرید احمد روپے پا کر کھڑا ہو گیا
 اور بولا۔ ”میری یہ بات یاد رکھنا سیٹھ ابھی جو کچھ ہوا ہے
 کسی دوسرے کو پتہ نہ چلے ورنہ تم پھر فشی کے مادیوں جاؤ
 گے اچھا اب چلتا ہوں۔“

فرید احمد نے روپے جیب میں رکھ لئے۔ یہ فرید
 نے خود کیا مگر وہ خود حیران تھا میں نے یہ کیسے کیا۔ میں نے
 تو آج تک اس لہجے میں کسی سے بات ہی نہیں کی اور ہری
 سیٹھ کی آواز کو کیا ہوا تھا۔ ہری سیٹھ کی نیت تو خراب ہو چکی
 تھی اس نے کتنی آسانی سے رقم ادا کر دی وہ سوچتا رہا مگر
 سمجھ میں اس کے کچھ نہیں آیا اور وہ اسی بازار کے دوسرے
 دکاندار کے پاس چلا گیا۔ یہ بھی ایک بڑی برتنوں کی دکان
 تھی۔ کئی گاہک کھڑے تھے اور سیلز مین مال دکھا رہے تھے
 فرید نے سیٹھ کا پوچھا تو اس نے اندرا اشارہ کر دیا۔ اندر
 سیٹھ گنگا مل گاؤ تھکے کے سہارے بیٹھے تھے ان کے قریب
 ہی ان کا فشی بھی کھاتے لئے بیٹھا تھا۔ انہوں نے فرید کو
 دیکھا تو غصے سے آنکھیں سکر گئیں بولا۔

”جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہو نہ دیکھتے ہو
 کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ہر وہ بھروسہ کے کھوٹی کرتے ہو جاؤ بعد
 میں آنے کا ہے ابھی ٹائم نہیں ہے۔“ مگر فرید احمد نے اس کی
 بات نہیں سنی وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ گنگا مل سیٹھ
 کی تجوری بھی اس کے دائیں پہلو رکھی تھی۔ گنگا مل تاؤ ہی
 کھا گیا بلبلایا بولا۔

”ارے تم آدمی ہے کہ کیا ہے تم کو بولا جاؤ تم ادھر
 بیٹھ گیا ارے ہم کیا تمہارا دعوت کیا ہے۔“
 فرید احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”دعوت بھی کرو گے اور
 ادھاری بھی دو گے۔“

”تمہاری مستک میں کچھ گڑ بڑ نظر آتا ہے۔ ارے
 کون سا روپہ کیوں سا ادھاری۔“ وہ بولا۔

”تم نے مال منگوایا تھا۔ ایک دفعہ نہیں چھ دفعہ
 پورے بیس ہزار کی رقم ہے تم کہتے ہو کون سا روپہ تم تو پر لے

مر گئے۔“

رولوکا قریب تھا دونوں کی بات چیت سن رہا تھا۔ اس نے اچانک بابو بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بابو بھائی چونک کر بولا۔ ”اچھا اب چلتا ہوں ہاتھ تو چھوڑ۔“

فرید دمورہ جا کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں تو اتنی دور ہوں میں نے کہاں پکڑا ہے۔“

”تو پھر کون ہے ارے چھوڑ جانے دے۔“ بابو بھائی پھر بولا۔ فرید احمد اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ گاڑی آنے والی تھی۔

بابو خان گڑگڑا کر بولا۔ ”معاف کر دے جانے دے۔“

”تو ہے کون کا ہے اس کا چچا کرتا ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں تو سرکار نوکر ہوں جو مالک کا حکم وہی کرتا ہوں۔“ بابو خان بولے۔

”تو کون ہے یہ بتا؟“

”میں چھلاوہ ہوں میں جو کرتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

”تجھے اس کام پر کس نے لگایا ہے۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں بتا نہیں سکتا، بتایا تو بہت بری میرے ساتھ گزرے گی۔“ چھلاوہ بولا۔

”تو اور کیا کرتا ہے؟“ رولوکا نے پوچھا۔

”میں مسافروں کو راہ سے بھٹکاتا ہوں۔ کاروبار دھندہ خراب کرتا ہوں۔ خوف زدہ کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ میری طاقت نہیں ہے۔“ چھلاوہ بولا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ تیرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا تو تو آگے بتائے گا۔“

”نہیں میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”اور میں جو تیرے ساتھ کروں گا اس کا تجھے پتہ ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ چھلاوہ بولا۔

تجوری کھول کر بیس ہزار روپے فرید کے ہاتھ میں دے دیئے۔ فرید نے بغیر گئے نوٹ جیب میں رکھ لئے اور کہا۔ ”اب میں جا رہا ہوں ابھی کچھ در پہلے کچھ نہیں ہوا۔ اگر کسی کوکانوں کان خبر ہوئی تو پھر ایسا ہی ہو جائے گا اور یہ فشی اس نے تو کچھ نہ دیکھا اور نہ سنا یہ تو پتھر کا بت ہے۔ میرے جانے کے بعد یہ بت انسان بن جائے گا۔“ اور فرید دکان سے باہر نکل گیا۔

اس کو اپنے لب و لہجے پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے پہلے ایسا لب و لہجہ کبھی نہیں اختیار کیا تھا۔ اب فرید کی جیب میں بڑی رقم تھی اس سے وہ اپنی گرتی ساکھ بحال کر سکتا تھا۔ وہ واپس آنے کو اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ رولوکا اس کے ساتھ، اچانک رولوکا کو ایسا لگا جیسے کوئی عین فرید کے پیچھے چل رہا ہے مگر نہ فرید کو اس کا پتہ ہے نہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ سایہ نما اچانک غائب ہو گیا۔ فرید نکت کی کھڑکی کی طرف چلا تو ایک آدمی اس سے ٹکرا گیا۔ فرید نے اس کو دیکھا تو حیرت سے بولا۔ ”ارے بابو خان تم تھرا سے یہاں آ گئے ہو؟“

بابو خان فرید سے لپٹ گئے اور بولے۔ ”کتنے دنوں کے بعد ملے ہونیک تو ہو۔“

”ہاں ٹھیک ہوں اگراری کو آیا تھا۔ واپس جا رہا ہوں تم نے تھرا کی دکان بیچ دی ہے۔“

”میں نے نہیں لوٹو دنوں نے بیچ دی.....“ بابو خان بولے۔

”چلتی دکان تھی کا ہے بیچ دی۔“ فرید نے پوچھا۔

”ارے ہم نے کہاں بیچی۔ کیا بتائیں ہمارے مرنے کے بعد ان میں ہڈی بیٹھ ایک دوسرے کا سر بھاڑ دیا اور ہو گیا ایک مٹنا بس اسی چکر میں بیچ باج کر سب چلے گئے۔“

آگے بابو خان نے اور کیا کہا فرید کو پتہ نہیں وہ حیرت سے ان کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”تو پھر تم مر گئے۔“ بابو

خان نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔ ”ہاں مر گئے ہم بھی

”کام تو ہے اگر تھوڑا سا وقت دیں اور اکیلے میں بات کریں تو.....“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اپنے پاس ٹائم کا بہت کھوٹی ہے۔ ادھر ہی بولو کیا مانگتا ہے۔“ شرما جی بولے۔

رولوکا اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔ ”ٹائم تو تم کو دینا ہی ہوگا۔“

”تم کیسا بات کرتا ہے۔ ہم بولا ادھر ہی بات کرو۔ ادھر کیا مسئلہ ہے۔“ شرما نے کہا۔

”تم گجراتی لوگ اپنے مہمان سے ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟“ رولوکا نے دوسرا رخ اختیار کیا۔

”کون بولا اس کا نام بتاؤ.....“ شرما نے پوچھا۔

”اس کا نام شرما کیدار ناتھ ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”ارے کیا بولتا ہے سامنے سامنے جھوٹ بولتا ہے ہم کب بولا۔“

”میں تمہارے پاس دلی سے چل کر آیا ہوں اور تم ہو کہ مجھے ٹال رہے ہو۔ دلی کبھی آؤ، دیکھو ہم تمہاری کتنی خدمت کرتے ہیں۔ مگر تم سے مل کر انفسوس ہوا کیا آپ لوگوں کا یہی دستور ہے؟“ رولوکا نے دوسرا پتہ چھینکا۔

کیدار ناتھ اب ذرا سا متاثر ہوا بولا۔ ”بابا بات ایسا ہے کہ ادھر لوگ آتا ہے ٹائم خراب کرتا ہے..... ابی اپن لوگ دھندلے والا مانو ہے۔ سب کا کیا سنے گا۔ اس واسطے ایسا بولا تھا۔ آؤ دختر میں بات کرتا ہے۔“ اور وہ رولوکا کو اپنے دفتر میں لے آیا۔

وہاں پر ایک آدمی پہلے سے تخت پر بیٹھا تھا۔ تخت کے ساتھ ہی چار کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ رولوکا کی بات کا اثر شرما پر ابھی تک تھا۔ بولا۔ ”بابا بتاؤ کیا پنے گا ٹھنڈا یا گرم.....“

”بہت شکریہ سیٹھ شرما میں کسی بھی چیز کا شوقین نہیں ہوں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”ارے نہیں ایسا کیسے ہوگا تم دلی سے آیا ہے ابی ہم لوگ اتنا کنجوس نہیں ہے کہ تمہاری کچھ خاطر بھی نہیں کرتے تم

”ایک منٹ کا وقت تیرے پاس ہے اس کے بعد میں تیری وہ درگت بناؤں گا کہ.....“

”بتا دوں تو تم مجھے چھوڑ دو گے۔“ چھلا وہ بولا۔

”ہاں چھوڑ دوں گا مگر کچھ باتیں میری تجھے ماننا پڑیں گی.....“ رولوکا نے جواب دیا۔

”شرما کیدار ناتھ کا حکم چلتا ہے مجھ پر۔“ چھلا وہ بولا۔

”ٹھیک ہے میں تجھے چھوڑ دیتا ہوں اس شرط پر کہ تو اب شرما کیدار ناتھ کے پاس نہیں جائے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”اس نے جاپ کر کے مجھے پایا ہے وہ کب چھوڑے گا۔“ چھلا وہ بولا۔

”تو اس کی فکر نہ کر تیرا جاپ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”تو میں جاؤں اجازت ہے۔“ چھلا وہ بولا۔ رولوکا نے سر کے اشارے سے اس کو اجازت دے دو دی۔

رولوکا نے سوچا یہ ضرور شرما کیدار ناتھ وہی ہے جو فرید احمد سے ملتا بھی ہے دو تہی بھی رکھتا ہے اور در پردہ اس کا دشمن بھی ہے۔ یہ ہے دنیا جو دوست سے وہی دشمن بھی ہے۔

فرید احمد کو جتنی طور پر مفلوج کر کے اپنا اوسیدھا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ مالی دشواریاں بھی کھڑی کر رہا ہے واہ رے دوست۔

رولوکا فوراً فرید احمد کے پاس گیا اور پوچھا۔

”تمہارے دوست شرما جی کا پورا نام کیا ہے؟“

فرید نے بتایا۔ ”ان کا پورا نام شرما کیدار ناتھ ہے۔“

کیوں کیا ضرورت پڑ گئی؟“ فرید نے پوچھا۔

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا.....“ اور رولوکا بھگووان پورہ روانہ ہو گیا۔ جہاں شرما جی کا مکان تھا۔

بھگووان پورہ ہندوؤں کا محلہ ہے۔ یہاں کسی مسلمان کا ملنا مشکل ہے۔ سب کا رو باری لوگ ہیں۔ شرما جی اپنے کارخانے میں موجود تھے۔ رولوکا حکیم کامل کے روپ میں تھا۔ پہناوے سے مسلمان نظر آتا تھا۔

شرما جی بھی اس کو مسلمان سمجھے اور پوچھا۔ ”اپن سے کچھ کام ہے کیا۔ بولو کیا بولتا ہے؟“

دلی جا کر کیا بولے گا۔“ شرمانے لگا۔

”آپ میری بات سن لیں چند منٹ کی بات ہے۔ یہی بہت بڑی آپ کی خاطر داری ہے۔“ رولو کا نے کہا۔
 ”ہاں بولو تا میں سن رہا ہوں۔“ شرمانے جواب دیا۔
 رولو کا نے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”تنہائی ضروری ہے۔ اس میں آپ کو ہی فائدہ ہے۔“

فائدے کی بات سن کر شرمانے کہا۔ ”اے ششی تم باہر جاؤ وہاں اپنا کام کرو۔“ اس کے جانے کے بعد شرمانے کہا۔ ”ہاں اب کرو کیا فائدے کی بات ہے؟“

”شرماجی میری بات دھیان سے سننا..... میں صرف ایک بار ہی اپنی بات کہتا ہوں۔ انسان میں ایک شکتی مایا کی ہوتی ہے۔ یہ شکتی وہ دوسروں کو مار کر، دھکیل کر، دھوکا دے کر دنیا میں حاصل کرتا ہے اور ایک شکتی ہوتی ہے کایا شکتی۔ وہ اپنی جسمانی طاقت کا استعمال جائز اور ناجائز استعمال کر کے لوگوں کو بچھا دکھاتا ہے۔ مگر ان کے علاوہ بھی اس دنیا میں بہت کچھ ہے اس لئے آدمی صرف یہاں تک ہی نہیں رہتا۔ وہ کچھ اور آگے چلتا ہے اور مادرائی شکتی کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ مایا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے آدمی کو نیچے گرانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ جنون اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے دُشمن اور دوست میں تمیز نہیں کرتا۔ تم بھی اسی پھیر میں پڑ گئے ہو۔ تم نے ایک آسان جاپ کی سمجھ کر تن کرنے والے پنڈت سے سیکھ لیا اور اس کو پورا کر لیا اور اس کے پیر کو اپنے ایک متر کے ساتھ لگا دیا۔ میں تم کو زیادہ خطا وار نہیں سمجھتا کیونکہ تم بھی اسی کے بہکاوے میں آ گئے ہو جو ساری دنیا کو بہکانے میں لگا ہوا ہے۔ تم کو اس نے یہ بھلا دیا کہ سب سے پہلے آدمی انسان ہے۔ انسانوں کے کام آئے۔ کیوں کہ ہر آدمی پیدا کنشی انسان ہوتا ہے۔ دین دھرم کی باتیں اس کو بعد میں آتی ہیں۔ مگر شیطان اس کو اپنی خواہشوں کے چال میں جکڑ لیتا ہے اور اس سے انسانیت سوز کام کرواتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم وہ نہیں ہو جو تم کو شیطان بنانا چاہتا ہے۔ مگر تم نے غلطی سے ایک قدم اس کے کہنے پر اٹھا لیا ہے۔ اب وہ تم کو اور آگے لے جائے گا تم دھن

دھرم سے کٹ جاؤ گے اور صرف شیطان کے غلام بن جاؤ گے۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنا فیصلہ مجھے بتاؤ۔ اگر تم شیطانی راستے پر جانا چاہتے ہو مایا جال میں پھنسنا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ۔ مگر یاد رکھو فرید احمد کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔“ رولو کا خاموش ہو گیا اور شرما کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔

شرما کے چہرے کے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔ وہ خاموش تھا مگر چہرے پر تحریروں آ رہی تھیں، مٹ رہی تھیں کوئی تحریز زیادہ دیر نہیں رکتی تھی۔ اس کے اندر جو بھونچال آیا ہوا تھا وہی سب کچھ اس کے چہرے کی اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ کافی دیر یہ کیفیت رہی۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ رولو کا بھی کھڑا ہو گیا۔ شرما آگے بڑھا اور رولو کا کے گلے سے لپٹ گیا..... اس کی آنکھوں سے دو غمامت کے آنسو نکل کر رخساروں پر لڑھک گئے۔ رولو کا نے اس کی پیٹھ کو تھپ تھپایا اور کہا۔ ”تمہارے ان بچھتاوے کے دو آنسوؤں نے تمہاری بہت سی خطائیں معاف کر دی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ تم بھٹک گئے ہو تم ٹھیک ہو جاؤ گے اس لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔“ رولو کا نے کہا۔

”میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے مجھے گرنے سے روک لیا۔“ شرمانے کہا۔

”شکر کی ضرورت نہیں..... محنت اور دیانت داری کی روزی میں بہت مزا ہوتا ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”میں نے جو غلطی کی ہے جاپ کیا ہے اس کا کیا ہو گا۔“ شرما فکر مند ہی بولا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ایک بہت کم درجے کا پیر تھا۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے وہ اب تمہارے قریب نہیں آئے گا۔“

”یہ تم نے ایک اور مہربانی کر دی۔“ شرمانے کہا۔

”اب تم مجھے اجازت دو۔“ رولو کا نے کہا۔

”تم نے تو مجھے کوئی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“ شرمانے کہا۔

رولو کا واپس آ گیا اور اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ اصل

بات کیا تھی۔ فرید احمد کا کاروبار پھر ٹھیک ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

نام تو اس کا رام لال تھا مگر سب رامو ہی کہا کرتے تھے۔ غریب کا کیا نام جو پکارا گیا وہی نام ہو گیا۔ کسی نے کہا، ہے مایا تیرے تین نام پرسا، پرسو، پرس رام۔ تو رامو کے بھی دو نام تو تھے۔ رہنے والا تو وہ روچک کا تھا مگر ستیا ہوا اپنوں کا تھا۔ اپنے حق کے لئے بھی وہ آواز نہ اٹھا سکا اور پر دیس سدھار گیا اور ناگ پور میں جا کر رک گیا۔ دیہاتی سیدھا سدا شہری ہنر سے نا آشنا..... وہ صرف ایک ہی ہنر جانتا تھا اور وہ ہنر تھا کاشت کاری، وہ پیدا آئی کسان تھا۔ آسمان کا رنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ بارش ہوگی کہ نہیں۔ ستاروں کو دیکھ کر ٹھیک وقت بتا دیتا بھی اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ محنت مزدوری کے سوا اشہروں میں اس کو کوئی کام نہیں تھا۔ بدن کا اچھا تھا۔ لمبا چوڑا جوان تھا وہ..... کام کی تلاش میں تھا کہ ایک مالی سے اس کی ملاقات ہوگی۔ اس کو ایک آدمی کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خود بوڑھا آدمی تھا ہماری کام نہیں کر سکتا تھا وہ کسٹرن ہڈن کے بچکے پر کام کرتا تھا۔ رامو نے کبھی مالی کا کام نہیں کیا تھا مگر بوڑھے مالی کو اس کی یہ خصوصیت اچھی لگی کہ وہ ایک کسان تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسان ہی اچھا مالی بن سکتا ہے۔ بوڑھا مالی اس کو لے کر ہڈن کے بچکے پر پہنچا۔ کسٹرن ہڈن گھریلو معاملات میں نہیں بولتا تھا۔ ان کی بیگم میری ہڈن سارے معاملات دیکھتی تھیں۔ ان کو بھی رامو ٹھیک لگا اور اس کو بوڑھے مالی کا ہیلپر بنادیا گیا۔ بوڑھے مالی نے بڑی ایمانداری سے رامو کو مالی گیری کے سارے گرتا دیئے۔ پودوں کو کونج ڈال کر اگانے پھر پردوش کھاد اور پانی دینے کا طریقہ۔ موسم کے حساب سے کون سا پودا لگانا چاہئے۔ بھول سے بیج پیدا کرنا۔ رامو آہستہ آہستہ سیکھتا گیا۔ ایک تو وہ کسان تھا۔ دوسرے زمین اور آسمان دونوں سے اس کا گہرا تعلق تھا جو کہ ہر کسان کا ہوتا ہے۔ اس کو یہاں آتے ہی سروٹھ کو اڑل گیا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ ایک سال کا۔ اب اس کو کام کرتے چھ سال گزر چکے تھے۔ بوڑھا مالی مر چکا تھا

اور وہی پورے باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ بیگم ہڈن اس سے خوش تھی۔ وہ بھی بڑی محنت سے کام کرتا تھا۔ اس نے باغ میں پھولوں کی کبھی کمی نہیں ہونے دی تھی۔

ہڈن صاحب واپس جا رہے تھے۔ ان کی جگہ دوسرا کسٹرن آ رہا تھا۔ وہ بھی انگریز تھا۔ رامو نے سوچا ہمیں کیا ہمارے لئے تو وہ بھی صاحب ہی ہے۔ ہمارا کام تو بھول اگانا ہے۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ بھول اگانے والے کائنوں میں رہتے ہیں۔ ہڈن صاحب چلے گئے۔ بنگلہ خالی نہیں رہا۔ دوسرا کسٹرن آ گیا۔ اس کا نام موٹی تھا۔ اس کی بیوی کا نام موٹی تھا۔ یہ کسٹرن کم عمر تھا اور اس سے بھی کم عمر اس کی بیوی تھی۔ موٹی کو تھوڑی اردو، ہندی آتی تھی مگر موٹی تو بالکل بنی تھی۔ اس کو ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ پہلے والے کسٹرن کی بیوی میری تو فر فرار دوں میں بات کرتی تھی۔

رامو نے سوچا کہ مجھے کیا میں تو اپنا کام کروں گا۔ موٹی باغ دیکھ کر خوش ہوا اور اس نے ایک روپیہ رامو کو انعام دیا۔ رامو بہت خوش ہوا۔ انعام تو اس کو پہلے بھی مل چکا تھا مگر پہلے ہی دن صاحب اس سے خوش ہوا۔ یہ اس کے لئے بڑا اہم تھا۔ رامو کو دیکھ کر موٹی بھی خوش تھی۔ رامو مشکل و صورت کا بھی برا آدمی نہیں تھا۔ اس پر وہ سختی کا ہتھ پیر کا ٹکڑا اور موٹی سے بھی قد میں دوا بچ اوجھتا تھا۔ موٹی نے پہلی نظر میں ہی سارے پر درگرم تر حیب دے لئے۔ نیا صاحب آیا تو کچھ عرصے کام بھی رامو کے ذمے آ گئے۔ ٹھیک دس بجے ایک بڑا سا گل دستہ بنا کر موٹی کے بیڈروم میں پہنچانا پڑتا۔ موٹی تو نو بجے ہی دفتر چلا جاتا تھا۔ موٹی کمرے میں اکیلی ہوا کرتی تھی۔ وہ دبے پاؤں جاتا تھا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو اور گل دستہ سجا کر واپس آ جاتا۔ اس کی پوری ڈیوٹی میں یہ کام سب سے زیادہ مشکل تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جاتا تو اپنی نظر پلنگ پر نہیں ڈالتا تھا۔ اس کو نہیں پتہ کہ موٹی سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے اور جتنی جلدی واپس آ سکتا تھا آ جاتا تھا۔ اس کی بدحواسی موٹی روز دیکھتی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر وہ کیسا مرد ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ وہ بار بار آئینہ میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتی، اسے خود میں کوئی کمی نظر نہ آتی۔ یہ

غلامی کی زنجیروں میں جکڑے غربت اور بھوک کے ستائے ہوئے مرد ایک انگریز حاکم کی بیوی پر کیسے نظر ڈال سکتے ہیں۔ ان کی یہ جرأت بھلا کس طرح ہوسکتی ہے۔ کمنشنر صاحب بہادر کا ایک اشارہ ان کو بالکل کوٹھڑی بلکہ چھائی کے تختے تک پہنچا سکتا ہے۔ ان کے دلوں میں جو ڈر اور خوف پیدا انہی پیدا کر دیا گیا ہے اور وحشی طور پر غلامی کی جو بھڑکائی ان کے ہاتھ پاؤں میں ڈال دی گئی ہے وہ ان کو کیسے نظر اٹھانے دے گی۔ موتی نہیں جانتی تھی۔ وہ حرف یہ جانتی تھی کہ وہ ایک پورا مرد ہے اور وہ ایک عورت ہے۔ وہ اس کی ایک نظر کی منتظر تھی مگر رامو تو پتھر کی سل تھا۔ وہ صرف اپنا کام کرتا تھا۔ اس کے سامنے اس کے بچے کا مستقبل تھا۔ اس کے سامنے اپنی بیوی کی ذمہ داری تھی۔ وہ بھوک اور افلاس کے جس دریا سے گزر کر اس جنگل تک پہنچا تھا وہ اس کو کیوں نظر اٹھانے نہیں دیتی تھی۔ وہ بے حس نہیں تھا وہ بھی انسان تھا۔ آنکھوں کی زبان قدرتی طور پر وہ بھی جانتا تھا۔ موتی کے رنگ ڈھنگ، اس کی طرف دیکھنے کا انداز اس کو کوئی پیغام دیتا تھا وہ کچھ سمجھنے پر بھی تاجمبھ تھا۔ ایک تو وہ سیدھا سادہ کسان تھا وہ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی تھا۔ دوسرے اس کے حالات ایسے تھے کہ ذرا بچی غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خود کو ایک بھاری پتھر کے نیچے پناہ محسوس کرتا تھا۔ ایسا بوجھ جو اس پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے دوسری ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ادھر موتی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ صبح حسب معمول رامو گل رستہ لے کر موتی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نظر اس ٹیبل پر تھیں جہاں گل دستہ سجایا جاتا تھا۔ اس نے کسی طرف نہیں دیکھا۔ سیدھا ٹیبل کی طرف گیا۔ موتی اس کو دیکھ رہی تھی اس کے جسم پر صرف ایک ریشمی گاؤن تھا۔ رامو کو یہ بھی نہ چلا کہ موتی نے اٹھ کر کب دروازہ لاک کر دیا اور دیوانہ وار رامو سے لپٹ گئی۔

رامو نے بوکھلا کر خود کو چھڑا چا ہا مگر موتی جو تک کی طرح اس کو پکڑے ہوئے تھی۔ وقت کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح اس کو بہا کر لے جا رہا تھا۔ جس غیر متوقع انداز میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہ اس کے سر میں جستلا تھا پھر

اس نے اپنے ذہن کو آزار چھوڑ دیا۔ اس کی روح کی پاکیزگی ختم ہو گئی موتی کو سکون مل گیا۔ اور رامو تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کی زندگی کا یہ تجربہ بالکل نیا تھا اور انوکھا بھی تھا۔ اب اس کو کیا کرنا چاہیے۔ رامو نے سوچا۔ نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔ پھر سر چھپانے کا آسرا بھی نہیں رہے گا۔ دوسری نوکری کب ملے گی کچھ پتا نہیں تھا۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ کہ اگر بیگم نے صاحب سے شکایت کر دی تو زندگی اجیرن کر دی جائے گی میرے بچے کا کیا بے گامیوں پر بدر ہو جائے گی۔ بہت سے سوال اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا تو پھر میں کیا کروں۔

”تو ایک پیدائشی مزدور ہے تیرا مقدر مزدوری ہے۔ تیری ڈیوٹی میں ایک کام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ تجھے وہ ڈیوٹی پوری کرنا ہے۔“ اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ ”میں ڈیوٹی پوری کروں گا۔“ اور پھر روز اس کی روح کی پاکیزگی کو روندنا جانے لگا۔ وہ وقت مقررہ پر روز جاتا رہا۔ اتوار کو بھی وہ جاتا تھا۔ صاحب اتوار کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ حیران ہوتا کہ آج تو دفتر بند ہے۔ پھر صاحب کہاں چلا جاتا ہے۔ موتی کا جوش ویسا ہی تھا۔ ایک ناٹھتے کا جام اس کو دن بھر نشے میں رکھتا تھا۔ رامو دو دھاری تلوار کے تلے زندگی گزار رہا تھا مگر اب ذرا ڈرا اس کو اپنا فائدہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے لڑکے کو اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ موتی صاحب کے سامنے بھی رامو سے بے تکلف ہو جاتی تھی۔ رامو بھی اس کو خوش کرنے کے طریقوں سے واقف ہو گیا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ رامو موتی کی ضرورت بن گیا تھا تو بھی غلط نہیں تھا۔ رامو اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتا بھی سیکھ گیا تھا۔ ناگ پور کے مین بازار میں اس نے کئی مکان اور دوکانیں اپنے نام کروائیں جس قدر فائدہ کمنشنر بہادر سے اٹھا سکتا تھا خود کو کیش کر دیا کہ اس نے اٹھایا۔ موتی کے لئے وہ ایک اہم آدمی تھا۔ وہ بھی اپنی اہمیت جانتا تھا۔ اب وہ ایک سیدھا سادہ کسان نہیں تھا۔ انگریز کی صحبت نے اس کو بھی عیاری و مکاری سکھادی تھی۔ وہ بھی چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ کبھی

اندر آگئے۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”پہرے دار کی مہربانی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے جو گواہیاں عدالت میں کان پور سے غیر حاضر ہونے کی پیش کی ہیں وہ ٹھیک ہیں۔ جواب دینے سے پہلے میری یہ بات بھی سن لو کہ میں تمہاری ہمدردی میں آیا ہوں جو سچ ہو وہی بیان کرنا۔ جھوٹ بولو گے تو تم اپنا ہی نقصان کرو گے۔ تمہارا سچ تمہارا بچاؤ کرے گا۔ اب بولو۔“ رولوکانے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں اور میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں اور اس مدد کے بدلے مجھ سے کیا چاہیں گے اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ جبکہ انگریز سرکار میرے خلاف ہے۔“ گو بندہ نے کہا۔

”بے شک تم نے درست کہا۔ یہ دنیا مکرو فریب سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی کسی کے کام بغیر لالچ یا فائدے کے نہیں آتا۔ مگر تم یہ بھی تسلیم کر لو کہ بعض اوقات انسان ایسے سہاروں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو اس کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔“ رولوکانے کہا۔

”اس کال کوٹھڑی میں آپ کا اس طرح اچانک آجانا ہی میرے لئے باعث حیرت ہے۔ اس پر آپ میری مدد بھی کرنا چاہتے ہیں جبکہ سرکار کی پوری مشنری میرے خلاف ہے۔ آپ کس طرح میری مدد کریں گے میں تو اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں اور آپ زندگی کی نوید سنار ہے ہیں۔ میرا دماغ اس کو قبول نہیں کر رہا۔ آپ کون ہیں اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ ذرا سی وضاحت کر دیں تو سکون سے میں آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا۔“ گو بندہ نے پوچھا۔

”دیکھو دوست ہر چیز کا ایک ماضی ہوتا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ہی ہوں۔ دو ہاتھ، دو پیروں والا انسان۔ میرا سارا وجود انسانوں جیسا ہے تم جیسا ہے لیکن وقت نے، حالات نے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس دنیا نے مجھے یہ مزاج بخشا ہے کہ میں کسی بھی مصیبت زدہ انسان کی مصیبت میں ٹانگ پھنسا دیتا ہوں۔ یہ مزاج آہستہ آہستہ میری عادت بن گیا ہے۔ مگر میں صرف ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو حقیقی طور پر بے گناہ ہوتے ہیں۔ سب سے اہم

پولیس اس کو پھانسی گھر کی زینت بنادیتی۔ مقدمہ مدلی میں چلا گیا۔ گو بندہ نے بڑے پختہ ثبوت ٹانگ پور سے باہر ہونے کے دیئے۔ مگر اس کو نہیں چھوڑا گیا۔ ایک کشنری بیوی قتل ہوئی تھی اور کشنری بھی خاص ولایت سے آیا ہوا تھا۔ بھلا انگریز کس طرح گو بندہ کو چھوڑ سکتا تھا..... کیس کی تاریخیں پڑتی رہیں..... گواہیاں گزرتی رہیں..... مگر انگریز کی ٹانگ اوپر ہی رہی۔ اس نے گو بندہ کو نہیں چھوڑا۔ انگریز سچ کسی طرح قائل نہ ہوا اور گو بندہ جیل میں ہی رہا۔

یہ کیس اتنا مشہور ہوا کہ اس کی بھٹک مجھ تک بھی آگئی اور میں نے رولوکا سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ رولوکانے کہا۔ ”ہاں مجھے پتہ ہے۔ وہ لڑکا تو واقعی بے قصور لگتا ہے۔“ مگر پولیس اس کو چھوڑے گی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بے گناہ کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ رولوکانے پوچھا۔

”میں تم سے متفق ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے تو پھر کرتے ہیں کچھ.....“ رولوکانے جواب دیا۔

جیل میں گو بندہ کو ایک الگ کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا اس سے ملاقات پر بھی پابندی تھی۔ مگر رولوکا کے لئے یہ پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اسی رات گو بندہ کے پاس جیل چلا گیا۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ پہرے پر پولیس والا کوٹھڑی کے باہر بیٹھا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک بہت کم روشنی کا بلب روشن تھا۔ رولوکا اندر چلا گیا اتلا اپنی جگہ جوں کا توں لگا رہا اور پہرے دار بھی بیٹھا رہا۔ گو بندہ ایک میلے کپڑے پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، جاگ رہا تھا۔ رولوکا اس کے سامنے کھڑا تھا اور پھر رولوکا حکیم کامل کے روپ میں ظاہر ہو گیا۔ اس نے حیرت سے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رولوکانے سکون سے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“ ”آپ کون ہیں اور بند دروازے سے کس طرح

بات یہی ہے کہ میں نے کہا تھا کہ جھوٹ والا چھپ نہیں سکتا۔ اس کو ضرور سزا ملتی ہے۔ اگر تم سے غلطی ہوئی بھی ہے تو وہ بھی سچ کی پلٹ میں میرے سامنے رکھ دو۔ میں اس کو ہضم کر جاؤں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”ٹھیک ہے مہربان دوست! میں اپنی کہانی آپ کو سناتا ہوں۔“ گو بندہ نے اپنی اور اپنے باپ کی پوری کہانی بیان کر دی۔ رامو اور موئی کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے اور موئی کے تعلقات بھی بتا دیئے۔ موئی کا قتل رامو نے کیا تھا۔ یہ بات اس کو رامو نے بتادی تھی وہ بھی گو بندہ نے بتا دیا۔ کسی بات میں کہیں ذرا بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

”میں نے سچائی کی کڑوی گولی کھالی ہے۔ میں یہ سچائی کسی عدالت میں نہیں بول سکتا تھا مگر آپ کی باتیں میرے دل چھو رہی تھیں۔ اس لئے میں نے کسی مقام پر جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔“ گو بندہ خاموش ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں تم نے سچ بولا ہے۔ سچ اپنے بارے میں خود اعلان کرتا ہے کہ وہ سچ ہے۔ مگر ہر کسی کے کان اس اعلان کو نہیں سن پاتے۔ اسی طرح قتل دانش سے بڑے ایک ایسی پر اسرار دنیا کا وجود بھی ہے جہاں کی باتیں عمل طور پر انسانی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں کس طرح تمہارے پاس آیا ہوں اور کس طرح آتا رہوں گا یہ سارے پہرے دار اندھے ہیں۔ بہرے ہیں۔ تم ان باتوں پر غور مت کرنا اور کسی سے میرا ذکر مت کرنا۔“ رولوکا نے کہا۔

گو بندہ نہایت خاموش متعین اور سنجیدہ مزاج رکھتا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں سوالات پر سوالات آ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے رولوکا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقل اس کو کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ رولوکا سکرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے اندر کیا بھیو نچال آیا ہوا ہے مگر تم کو اس پر بند باندھنا ہے۔ زیادہ کرید اور حد سے زیادہ بڑھا ہوا جس نقصان بھی کرتا ہے۔ میں جا رہا ہوں پھر بہت جلد آؤں گا۔“ اور رولوکا لوہے کا بند دروازہ کھول کر چلا گیا۔ گو بندہ کے لئے یہ بھی کم حیرت ناک نہ تھا۔ گو بندہ کی رہائی میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریز جج تھا۔ وہ کمشنر موئی کا دوست تھا۔ رولوکا کے

لئے یہ پتہ چلا تا زیادہ مشکل عابت نہیں ہوا۔ وہ ناگ پور موڑ کے بنگلے پر چلا گیا۔ موئی کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر وہ کہیں نہیں جاسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رولوکا موئی کے روپ میں اس کے پاس گیا تھا۔ موئی جو مرچکی تھی جس کو رامو نے کلکڑے کلکڑے کر دیا تھا۔ رولوکا نے اس کے فوٹو وغیرہ دیکھ کر اس کی عادت و اطوار چیک کرنے کے بعد یہ روپ دھار لیا تھا۔ موئی اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ پہلے تو ذرا پھر والہا نہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ موئی اس سے دور ہو گئی اور بولی۔ ”میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ نہیں ہوں تم نے خود تابوت میں مجھے دفن کیا ہے۔“

موئی ڈر کر کرک گیا اور خوف زدہ آواز میں بولا۔ ”تو پھر تم کس طرح آ گئیں۔“

”مجھے آتا تو تھا مگر آنے میں دیر ہو گئی۔ تم نہیں جانتے تم زندہ ہو۔ مرنے کے بعد آتا ہر کچھ سختی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اپنی جگہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ زندگی بڑی بے رحم ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو زندگی گزاری..... اس میں نہ میں مخلص تھی نہ تم تھے۔ انسان آرزوؤں کی آغوش میں جا گتا ہے اور ساری عمر جس گاڑی پر سفر کرتا ہے وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جھوٹ کی اور ایک سچ کی۔ میں نے مرنے کے بعد دیکھا کہ جو لوگ سچ کی گاڑی پر چڑھ کر اوپر گئے وہ سکون سے ہیں اور جو جھوٹ کی گاڑی پر آئے وہ بے چین ہیں۔ ابھی فیصلے کا وقت آیا ہی نہیں جب فیصلہ ہوگا تو اسے کا پیہ چلے گا۔ میں نے جو کچھ کیا اس سے مجھے صرف بالائیاں اور اندھیرے ملے ہیں۔“

زندگی کی کہانی بہت مختصر بھی ہے اور بہت لمبی بھی ہے اور بہت بھیا نک بھی ہے۔ تم نے ایک بے گناہ کو سزا دینے کا پکا ارادہ کر رکھا ہے اور گناہ گار آزاد ہے۔ میں تم کو بتانے آئی ہوں کہ میرا قاتل رامو ہے گو بندہ بے قصور ہے۔ تم رامو پر قتل کا الزام لگا سکتے ہو مگر اس نے جن حالات میں قتل کیا وہ حالات میں نے خود پیدا کئے تھے..... میرے اور تمہارے معاشرے نے پیدا کئے تھے۔ بس یہی مجھے کہنا تھا۔ اب جو کرتا ہے تم کو کرتا ہے۔ اگر اب بھی تم نہ سمجھو تو یاد رکھو

اور رامو پانچ سال کے لئے جیل چلا گیا۔ اس مقدمے میں رولو کا کہیں سامنے نہیں آیا۔ رامو کے خلاف سارے ثبوت البتہ رولو کا ختم کرائے۔ مگر چوری کے مقدمے میں وہ الگ ہو گیا اور رامو ایک ناکروہ گناہ کی پاداش میں جیل چلا گیا۔ میں نے اس بارے میں رولو کا سے پوچھا۔
”تم نے آخری لمحات میں رامو کو اکیلا چھوڑ دیا..... کیوں.....؟“

رہا کرتا تھا۔ اس کا سارا وقت کوئلہ توڑنے اور جھونکنے میں گزرتا تھا۔ کوئلے کے انجن میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی وقت تھک کر بیٹھ سکے۔ اگر بیٹھا ضروری ہی ہوتا تو کوئلے کے اوپر ہی بیٹھا جاسکتا ہے۔ وہاں پر اس کا ایک ساتھی مگر ریک میں اس سے ایک درجے کم آدمی ہوتا ہے۔ اس کا کام کوئلہ کے بڑے بڑے ڈھیلوں کو اتنا چھوٹا کرنا ہوتا ہے جو پیلچے میں اٹھائے جاسکیں۔ انجن کی رفتار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پورا ایندھن دیا جائے۔ یہ ذمہ داری فائر مین پر ہوتی ہے۔ بواکس میں ایک گول کھڑکی اندر کی طرف کھلتی ہے۔ اس کے کھلتے ہی آگ کی لپٹیں اپنی زبان کھڑکی سے باہر نکالنے لگتی ہیں سخت گرمی اس کے سامنے کھڑے ہونے پر لگتی ہے۔ مگر فائر مین کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ اس کے سامنے نہ صرف کھڑا رہے بلکہ ایک بھاری پیلچے سے اس کے اندر کوئلہ بھی جھونکنے لگے۔ یہ پیلچے بھی بڑا ہوتا ہے اس میں ڈھائی سے تین سیر کوئلہ آتا ہے۔ فائر مین یہ کرتا ہے۔ انجن کی حرکت کو قائم رکھنا فائر مین کا ہی کام ہے۔ ریلوے کی تمام ملازمتوں میں یہ بہت محنت طلب اور خطرناک ملازمت ہے۔ ڈرائیور کو تو اپنی مطلوبہ اسٹیم چاہئے وہ صرف اشارہ کرتا ہے اور فائر مین اسٹیم بناتا ہے۔ امام دین جب واپس آتا تھا اس وقت وہ اتنا تھکا ہارا ہوتا تھا کہ آتے ہی لیٹ جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے پڑوس میں کون رہتا ہے۔ وہ اتنا تھکا ہوتا تھا کہ بہت سے گھر کے ضروری کام بھی نہیں کر پاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ واپس آیا تو پتہ چلا کہ اس کی بیوی سخت بیمار ہے۔ اس کا بیٹا جو کہ دس سال کا تھا۔ کیا کرتا۔ بازار سے حکیم جی سے دوائی لا دیا تھا۔ حکیم جی نے آکر دیکھ بھی لیا تھا اس سے آگے وہ اور کیا کرتا۔ امام دین بیوی کو لے کر اسپتال چلا گیا۔ ریلوے ہسپتال میں دوا کیں کم اور گھڑکیاں زیادہ تھیں۔

دودن بیوی زندہ رہی اور پھر مر گئی۔ وہ لاش لے آیا اور قریبی قبرستان میں دفن کر دیا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب گھر میں ایک بیٹا اکیلا رہ گیا۔ اسے تو گاڑی لے کر جانا ہی تھا۔ بیٹے کرم دین کی روٹی پانی کا کیا ہوگا۔ وہ بواکورا

”بہت موٹی سی بات ہے حکیم صاحب۔ اس نے گناہ تو کیا تھا۔ ماما کے حالات نے اس سے یہ سب کر لیا تھا کسی بھی انسان کا خون ہو، سب کا رنگ سرخ ہی ہوتا ہے کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی کسی کی جان لے لے۔ رامو کو سزا دینا تھی اور سزا اس کو مل گئی۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
”ہاں ایک محکوم تو کمزور تو ملتی ہی ہے رامو کا گناہ تو ہم کو پتہ ہے مگر بعض دفعہ بلکہ اکثر تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس گناہ کی سزا ہے۔ انگریزی قانون دو طرح کا ہے ایک کالی قوم کے لئے ایک گوری قوم کے لئے جو قوانین ہندوستان میں چلتے ہیں۔ وہ انگریزوں میں نہیں ہیں۔ یہ قانون صرف محکوم قوم کے لئے بنائے گئے ہیں۔ پولیس اور انتظامیہ کو بے حساب اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ ہندوستانی عوام کو دبا سکے۔“ میں نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

راجستھان میں ایک چھوٹا سا شہر بیکانیر ہے۔ یہاں پرجیوٹی لائن کی ریلوے چلتی ہے اور ساری گاڑیاں پتھر کے کوئلے سے چلائی جاتی ہیں۔ ریلوے ملازمین کے لئے ایک کالونی اسٹیشن کے قریب ہی بنائی گئی ہے۔ یہیں پر امام دین رہتا ہے۔ امام دین فائر مین کا کام کرتا ہے۔ فائر مین کا کام انجن میں کوئلہ جھونکنا ہوتا ہے۔ فائر مین کا اٹھنا بیٹھنا سب کوئلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ بھی کوئلہ نظر آنے لگتا ہے۔ پتھر کا کوئلہ چمکیلا کالا ہوتا ہے۔ امام دین جب ریلوے میں بھرتی ہوا تھا اس وقت اس کا رنگ ساٹوا تھا۔ مگر دس سال تک کوئلے کی محبت میں رہ کر وہ خود بھی کوئلے کے رنگ کا ہو چکا تھا۔ وہ دودن گھر سے دور

نگی ہے کہ کہاں جاؤں۔ ڈیوٹی سے گھر نہ آؤں تو کیا کروں۔“ امام دین نے جواب دیا۔

”تو میری ماں تو بتاؤں۔“ کورامانی نے کہا۔

”مانوں گا کیوں تاناموں گا بول تو کہات ہے۔“

”تو ایسا کر دوسری جو رو کر لے۔ ارے تو بوڑھا تو

نہیں ہو گیا۔ ایک مرگئی تو کیا ہوا۔ میں جانوں ہوں توئے

عورت کی ضرورت ہے اور سن مرد عورت کے بغیر بے لگام کا

اونٹ ہے۔ ارے گھر میں چراغ تو جلا ملے گا۔ رونی پانی تو

ملے گا تیرے سو کا م وہ کرے گی اب بول کیا ارادہ ہے۔“

امام دین گردن جھکا کر سوچتا رہا کورامانی کی باتوں

کی سچائی کو پرکھتا رہا اور پھر بولا۔ ”مائی بات تیری درست

ہے۔ دل کو لاگے ہے پر میری عمر اب کچھ زیادہ نہیں ہو گئی

ہے۔ کون اپنی چھوری دے گا۔“

کورامانی نے کہا۔ ”تو اس کی فکر نہ کر۔ تیری ذات کی

بہت سی میری جاننے والی ہیں۔ ایک کیا بہت چھوریاں مل

جائیں گی اب یہ کام میرا ہے تو فکر نہ کر۔“

اور پھر یوں ہوا کہ امام دین کا نکاح شریفین سے ہو

گیا۔ شریفین ایک بیوہ تھی۔ اس کا پہلا آدمی شٹنگ پوڑھا۔

ڈیوٹی کے دوران ہی گاڑی سے کٹ کر مر گیا تھا۔ اس کی کوئی

اولاد نہیں تھی۔ شریفین بھی کوئی نو عمر لڑکی نہیں تھی۔ پورے پانچ

سال شوہر کے ساتھ رہ چکی تھی۔ زبان کی تیز اور باتوں کی عورت

تھی اور اس کی اماں تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اس نے

صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کرم دین جہاں ہے وہیں رہے گا۔

میرے ساتھ اس کا گزرا رہ نہیں ہوگا۔ کورامانی نے امام دین

کے آگے شریفین کی جو تقریفیں اور خوبیاں بیان کی تھیں ان

سے امام دین بہت متاثر تھا اور کرم دین کا معاملہ تو نکاح کے

بعد اٹھایا گیا تھا۔ اس میں بھی کورامانی کی چالاکی تھی۔

کورامانی کرم دین کو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی تھی۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے امام دین کے گرد ایسا جال پھیلایا

کہ وہ اس میں بڑی طرح پھنس گیا۔ کرم دین کا ٹھکانا صرف

کورامانی کا گھر رہ گیا۔ امام دین اپنے بیٹے کو چاہتا تھا۔ مگر

اپنے گھر میں اس کو رکھ نہیں سکتا تھا۔ چند روز ہی میں شریفین

مائی کے پاس چلا گیا۔ کورامانی ایک ہمدرد عورت تھی۔ کرم دین کو جانتی تھی اس نے کرم دین کو روٹی کھلانے اور دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ امام دین ڈیوٹی پر چلا گیا۔

ایک سال گزر گیا۔ وہ بے پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔

بیوی زندہ تھی تو گھر میں اس کو روٹی نظر آتی تھی۔ اس کی بیوی

اس کا انتظار کرتی تھی۔ اس کے تھکے ہاتھ پیر داتی تھی اور چاؤ

سے اسے کھانا کھلاتی تھی اور اس کو ہر طرح آرام پہنچانے کی

کوشش کرتی تھی۔ مگر اس کے بعد تو گھر میں چراغ بھی کوئی

نہیں جلاتا تھا۔ کوڑا کرکٹ پورے کواڑ میں بھرا ہوا تھا۔

ریت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی کیونکہ یہاں پر ریت بہت اڑتی

تھی۔ وہ گھر آکر بڑا اداس ہو جاتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ

انجن پر ہی رہتا۔ یہاں کیا رکھا تھا اس کے لئے، ہاں ایک

کرم دین تھا جو باپ کا انتظار کرتا تھا وہ اس کے لئے شہر کی

اچھی اچھی کھانے کی چیزیں لے آتا کورامانی کو دے دیتا کہ

کرم دین کو کھلا دیا کرو۔ کورامانی بے ایمانی نہیں کرتی اور سب

کچھ کرم دین کو کھلاتی۔ امام دین ہر ماہ اس کو پانچ روپے کرم

دین کے رہنے کے کورامانی کو دے دیا کرتا تھا۔ یہ رقم اتنی تھی

کہ کورامانی خود بھی پورے مہینے اس میں کھاتی تھی۔ اس کے

لئے یہ بہت سہارا تھا۔

کورامانی ایک ہندو عورت تھی۔ امام دین نہیں سمجھ

سکتا تھا کہ اس کے پاس کرم دین اس کا بیٹا رہے گا تو آگے

چل کر اس کو کیا نقصان ہوگا۔ وہ تو خوش تھا کہ اس کا بچہ ٹھیک

رہ رہا ہے۔ اس کو کیا پیہ کہ وہ مسجد جاتا ہے یا کورامانی اس کو

مندر لے جاتی ہے۔ کورامانی جتنی سیدھی نظر آتی تھی۔ ایسی

نہیں تھی۔ وہ اندر سے کٹر ہندو تھی۔ کسی مسلمان کے بچے کو

گھر میں رکھنا اس کی کوئی توجہ ہوگی۔ اس نے ذہن میں کچھ

تو پلان بنایا ہوگا۔

امام دین ضرور سیدھا شریف آدمی تھا وہ تو کورامانی کا

احسان مانتا تھا۔ اس کی ضروریات اپنی اوقات سے بڑھ کر

پوری کرتا تھا۔ ”ارے امو تو کب تک اندھیرے گھر میں

اکھلا پڑا رہے گا۔“ ایک دن کورامانی نے امام دین سے کہا۔

”تو اور کا کروں مائی، اورے دھورے نہ کوئی ساتھی

امام صاحب نے کہا۔ ”پہلے دیکھا نہیں کہاں سے آئے ہو؟“

”میں ریلوے کالونی میں رہتا ہوں۔ ریلوے میں فائر مین ہوں۔“ امام دین نے جواب دیا۔

”کبھی مسجد بھی آ جایا کرو جو لوگ آتے رہتے ہیں ان سب کو میں جانتا ہوں۔“ امام صاحب نے جواب دیا۔

”بات یہ ہے مولوی صاحب کہ میرا ایک لڑکا ہے۔ اس کی ماں مر گئی ہے۔ میں نے دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ وہ عورت اس لڑکے کو اپنے پاس نہیں رکھتی۔ میں نے اس کو ایک عورت کے پاس رکھ دیا ہے۔ نکاح سے پہلے بھی وہ ہیں پر رہتا تھا۔ میں اس عورت کو خرچ دے دیا کرتا تھا۔ مگر اب اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ دوسرے میری پوری تنخواہ ہی رکھ لیتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کا خرچ نہیں دے سکتا۔ جس عورت کے پاس لڑکا رہتا ہے وہ ہندو ہے۔ اب میں کیا کروں۔ وہ عورت میرے بغیر خرچ دینے بھی لڑکے کو رکھنے پر راضی ہے۔“ امام دین نے بات پوری کی تو امام صاحب بولے۔

”تو پھر پریشانی کیا ہے..... وہ عورت بغیر پیسے دینے رکھ تو رہی ہے۔“

”امام صاحب میں تو جاہل آدمی ہوں۔ مذہب سے بھی دور ہوں مگر ہوں تو مسلمان نام کا ہی سہی۔ میرا لڑکا ہندو کا کھانہ کھا کر بڑا ہو گا، ہندوئیں ہو جائے گا۔“ امام دین نے کہا۔

”تم مسلمان کا کھانہ کھا کر مسلمان نہیں بن سکتے تو بچہ لڑکے کی فکر کیوں کرتے ہو۔“ امام صاحب نے جواب دیا۔

امام دین نے ان کی بات پر غور کیا اور شرمندہ ہو کر بولا۔ ”بے شک آپ کی بات ٹھیک ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان اس کو اپنے پاس رکھ لے چاہے نوکر بنا کر رکھ لے۔“

”انسان اپنی تقدیر اور رزق اوپر سے لاتا ہے اس کو بدناما نامکن ہے۔ اس لئے تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کو جن حالات میں پرورش ہوتا ہے وہ ہو گا اور اگر تم خمد کچھ کر سکو تو کراؤ۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ اور امام صاحب چلے گئے۔ وہ کتنی امیدیں اور آس لے کر ان کے پاس آیا تھا۔ اگر

نے وہ کل پرزے نکالے کہ امام دین جو گھر آ کر آرام کرنے کا عادی تھا۔ اس کو وہ عادت چھوڑنا پڑی۔ کیونکہ شریفین بازار کے اتنے کام اس کے لئے اٹھا رکھتی تھی کہ وہ بازار کے چکر بکری لگاتا رہتا۔ اخراجات میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اس کے پاس کورامانی کو دینے کو کچھ نہیں بچتا تھا۔ فائر مین کی کتنی تنخواہ ہوتی ہے۔ شریفین کو پتہ تھا وہ ایک ایک روپے کا حساب امام دین سے لیا کرتی تھی۔ کسی بھی بھول چوک کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ اس کی ماں اس کی مدد کو موجود رہتی تھی۔ امام دین بڑی پریشانی میں کورامانی سے ملا اور شرمندگی سے بولا۔ ”مائی میں اب تم کو خرچ نہیں دے سکوں گا۔ خرچ بڑھ گئے ہیں۔“

کورامانی کے پلان میں تو یہ تھا کہ امام دین اس سے ایک دن ایک دن یہ کہے گا۔ وہ بڑی ہوشیار عورت تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ”ارے تو کیا ہوا.....؟ جو میں کھاؤں گی وہی کرم دین کھائے گا۔ تو چننا کا ہے کرتا ہے۔“

”چننا کی تو بات ہے تم تو خود بے سہارا ہو۔“ امام دین نے کہا۔

”میں بے سہارا کب ہوں۔ تو نے یہ خوب کہی..... میرا سہارا تو بھگوان ہیں..... وہی سب کچھ ہندو بت کرتے ہیں۔“ کورامانی نے جواب دیا۔

”تم نے یہ احسان کم نہیں کیا کہ چھوڑے کو اپنے پاس رکھ لیا اور اب کھلاؤ گی بھی۔ تم نے دوسری جوہر کر کے تو مجھے ایک بہت بڑی دبا میں ڈال دیا ہے۔“ امام دین نے کہا۔

”ارے کیسی دبا تو چند ہو جا۔ تیرا چھوڑا آرام سے رہے گا۔“ کورامانی نے جواب دیا۔

امام دین کیا کر سکتا تھا۔ شریفین اور اس کی ماں تو کسی حالت میں کرم دین کو رکھنے پر راضی نہیں تھیں۔ اس کے اعصاب میں شدید اضطرابی کیفیت تھی۔ اس کا دل کسی طرف نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسی کیفیت میں امام صاحب کے پاس چلا گیا۔ یہ بیکانیر کی بڑی مسجد تھی۔ اندر ہی ایک حجرے میں امام صاحب رہتے تھے۔ اس نے جاتے ہی کہا میں ایک کام سے آیا ہوں۔

اسے پتہ ہوتا کہ ایسا کورا جواب اس کو ملے گا تو وہ نہ آتا۔ اب رسی کا آخری سرا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ سخت ناامید ہوا۔

اور کرم دین کورامائی کے پاس ہی رہا۔ کورامائی نے اس کو دھارمک کہانیاں سناتا شروع کر دیں۔ اس کے کچے ذہن کو اپنی لائن پر لانے لگی۔ اس نے خدائے واحد کو بھلانے کے لئے برہما، شیوا اور وشنو بھگوان کے قصے سناتا شروع کر دیئے۔ من گھڑت دیویوں کے مافوق الفطرت واقعات اور ان کی طاقت کی بابت اس کے کچے ذہن میں ڈالنا شروع کر دیا۔ اس نے ہندوؤں کی خرابیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کر دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کو مندر بھی لے جاتی۔ وہاں کا پنڈت کورامائی کا سارا پلان جانتا تھا۔ پنڈت نے دیدوں کے قصے سناتا شروع کر دیئے اور بچے کا ذہن ان کو قبول کرتا گیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے اپنا نام وکرم رکھ لیا۔ باپ کی طرف سے تو وہ بہت پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔ کورامائی نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھائی تھی کہ تو امام دین کے گھر بعد میں پیدا ہوا ہے۔ پہلا منم تو تیرا میرے گھر ہوا تھا۔ تیرا نام وکرم میں نے رکھا تھا اور پھر تو گاڑی سے کٹ کر مر گیا اور دوبارہ امام حسین کے گھر پیدا ہوا۔ اصل میں وکرم ہی ہے اور تیرا اصل دھرم ہندو ہی ہے۔ یہ بھگوان کی لیلیا ہے کہ تو مجھے پھرتل گیا ہے۔ میں ہی تیری ماں ہوں اور کرم دین نے پوری طرح کورامائی کی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا۔ کیونکہ بچہ تو ایک بیل کی مانند ہوتا ہے۔ بیل کے قریب جو ہو وہ اس کے سہارے اوپر چڑھتی ہے۔ اس کا اولین سہارا ہوتا ہے۔ وہی اس کے لئے بڑا اہم ہوتا ہے اور اس پر بچاری بھی پالش کر رہا تھا۔ وہ وحشی طور پر کورامائی کا منہ بے قبول کر چکا تھا۔

پٹری پر ریل روڑتی ہی رہتی ہے۔ اس روڑتی ریل کے ساتھ امام دین بھی دوڑتا رہا۔ اسی دوڑ بھاگ میں اس کے آگمن میں رونق بڑھتی گئی۔ وہ کئی دفعہ کورامائی کی طرف گیا بھی مگر پھر اتنی بھیڑ ہو گئی کہ شریض نے اس کو بھلادیا کہ اس کا کوئی لڑکا بھی تھا۔ شریض نے اس کو اولاد کی دولت سے

مالا مال کر دیا۔ وہ اپنے مال پر بہت خوش تھا اور پھر اس کو ریناز کر دیا گیا۔ وہ بیکار ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ ریلوے کا کوارٹر خالی کر کے قریب کے ایک گاؤں میں چلا گیا۔ کرم دین کو وہ بھول گیا اور وکرم کو تو کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ کورامائی مر گئی۔ پنڈت نے وکرم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مندر میں رہنے لگا۔

یہ تھی وکرم پنڈت کی کہانی۔ وکرم پنڈت راجستھان کا ایک بدنام آدمی تھا۔ بدنام تو اس کو میں کہہ رہا ہوں۔ ہندو اس کو نیک نام ہی کہتے تھے۔ وہ کٹر قسم کا پنڈت تھا۔ رہتا تو وہ مندر میں ہی تھا مگر اس کا واسطہ مندر سے بہت کم تھا۔ بچاری اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں کا تو وہ کٹر دشمن تھا۔ پنڈت نے اس کے ذہن میں مسلمانوں سے نفرت کا جو بیج بوایا گیا تھا وہ اب پورا درخت بن گیا تھا۔ دوست تو وہ ہندو کا بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے جو راستہ اپنایا تھا وہ شیطان کا تھا۔ سوتیلی ماں کی نفرت اس کو یاد تھی اور باپ کے بے بسی نے باپ سے نفرت کا سبق دیا تھا۔ کورامائی اندرونی طور پر وہ نہیں بھی جو نظر آتی تھی۔ وہ کالی مائی کی پجاری تھی اور پنڈت کی ساتھی۔ کورامائی کے بعد کورامائی کا سارا علم وکرم کے حصے میں آ گیا تھا۔ چھوٹے برتن میں کڑی نپٹائی جائے تو وہ ہر مال کے ساتھ برتن سے باہر نکل جاتی ہے۔ وہی حال وکرم پنڈت کا تھا۔ وہ لوگوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتا تھا اور جو فائدہ وہ کسی کو پہنچاتا تھا اس کے بدلے وہ اس سے اتنا کچھ وصول کرتا تھا کہ آدمی فلاں ہو جاتا تھا۔

یہ ساری کہانی کسی ایک روای کی بیان کردہ نہیں تھی مگر رولوکا نے جب وکرم پنڈت کے بارے میں معلومات جمع کیں تو سب ہی سچی باتیں تھیں۔ سوائے اس کے کہ وہ معمولی پنڈت ہے۔ وکرم پنڈت ایک بھاری پتھر تھا اور اس کا حجم ہر حتمی جا رہا تھا۔ وہ بے نیام سے باہر بھی پھیل رہا تھا۔ وہ شیطانی طاقت کا دل کھول کر استعمال کر رہا ہے۔ مجھے یہ جان کر از حد رنج ہوا کہ وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوا اور پھر ہندو ہو گیا۔ میں نے روکنا سے کہا تو رولوکا نے جواب دیا۔ ”بے شک وکرم پنڈت مسلمان کے گھر پیدا

ان گنت لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔“ رولوکا نے کہا۔
”تو تم چندر گونا جاؤ گے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ ایک خطرناک مہم ہے۔ کیونکہ یہ ایک جنونی شخص ہے۔ انسان عقل مند سے توفیق سکتا ہے مگر جنونی کو کیا پتہ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ پاگل کو کیا پتہ کہ وہ سر پر خاک کیوں ڈال رہا ہے۔ اس لئے اس سے ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔“ اور رولوکا بنگال کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

یوں تو سارا بنگال ہی پانی پانی ہے۔ اسی پانی کی برکت ہے کہ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ جنگلات بے شمار ہیں۔ چندر گونا علاقہ بھی بوڑھی گنگا کے قریب واقع ہے۔ یہ وہی دریا ہے جو گنگا کہلاتا ہے مگر یہاں پر اس کا نام بوڑھی گنگا ہے۔ اس کے ساحل پر بے شمار دیہات آباد ہیں۔ بہت سا علاقہ دلدلی ہے اور خطرناک جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔

مجھے جس کی تلاش تھی وہ وہ دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک ایک گاؤں دیکھ لیا۔ کنارے پر کشتیوں پر آباد ایک ایک کشتی کو دیکھ لیا مگر دم پنڈت کا پتہ نہیں چلا۔ یہ مجھے پتہ تھا کہ وہ آیا یہاں پر ہی تھا۔ میرے ہر کارے بھی کوئی خبر نہیں لا رہے تھے۔ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ مگر مجھے تلاش تو جاری رکھنا تھی۔ اس کے نہ پتہ چلنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ وہ کنڈل کے اندر بیٹھا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اس نے روپوشی کا علم سیکھ لیا ہے۔ مگر یہ جبہ اتنی آسان نہ تھی۔ میں نے اب تک ہندوستان میں ایسا کوئی ساحر نہیں دیکھا تھا جو یہ علم جانتا ہو۔ میں چندر گونا کے ارد گرد وہی رہا میرے ہر کارے میرے گرد منڈلاتے رہے۔

شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ علاقہ دلدلی تھا۔ بڑی بڑی گھاس کھڑی تھی اور زمین نرم تھی۔ اسی نرم زمین میں کہاں کہاں خوفناک دلدلیں تھیں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اسی لئے شاید کوئی بڑا جانور ادھر نظر نہیں آتا تھا۔ درختوں پر جنگلی مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ یہ علاقہ آبادی کے اتنے قریب تھا کہ مکانوں میں چلنے چراغ نظر آتے تھے۔ وہاں کے لوگ اپنی ضرورت

ہو تھا۔ آپ کو یہ تو پتہ ہوگا کہ انسان اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ماحول مسلمان گھرانوں جیسا ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے کورا لٹائی کے گھر کے ماحول کو قبول نہ کرتا۔ اس کی تربیت کا جب وقت آیا اس وقت کورامائی ہی اس کے سامنے تھی۔ اس نے جو کچھ اس کو سکھایا، پڑھایا، وہ سیکھتا گیا۔ کیونکہ جب تک سمجھ رہتا ہے وہ کورا کا غد ہوتا ہے۔ اس کے بڑے اور ماحول اس پر جو تحریر لکھتا ہے وہ پڑھتا جاتا ہے۔ کورامائی نے اس کی پرورش بلاوجہ نہیں کی تھی۔ اس کو بھی اپنا ایک جانشین چاہئے تھا۔ وہ اس کی پرورش کر کے کوئی نیکی نہیں کر رہی تھی۔ وہ زمانہ ختم ہوا جب نیکی برائے نیکی کی جاتی تھی۔ اب نیکی اپنے مفاد کی خاطر کی جاتی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”اس کا تو مطلب ہوا کہ نیکی کوئی کرتا ہی نہیں اس زمانے میں.....“ میں نے کہا۔

”کرتے ہیں مگر کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نیکی برائے نیکی کرنے والے کم ہیں۔ ختم نہیں ہو گئے۔ میں نے ایک عام بات کی تھی۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”تو تم یکا نیر جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ یکا نیر سے جا چکا ہے اور اس کا رخ بنگال کی طرف ہے۔“ رولوکا نے کہا۔
”وہاں کہاں جائے گا کچھ پتہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چندر گونا ایک جگہ ہے وہاں جائے گا۔“ رولوکا نے بتایا۔

”کوئی خاص بات ہے وہاں پر.....؟“ میں نے کہا۔
”وہاں پر ایک بہت بڑا کالی کا جنگل رہتا ہے۔ وکرم پنڈت کا جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا ساحر بننا چاہتا ہے۔ تم کون کرافٹس ہوگا کہ وہ نہ معلوم کتنے زندہ ہوجوانوں کی بلی کالی کو چڑھا چکا ہے۔ کتنی کورائی لڑکیاں اس کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں بڑی بھاگ دوڑ کی ہے۔ وہ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو

پوری کرنے یہاں پر ہی آتے تھے۔ مگر وہ گھاس کے اندر نہیں آتے تھے۔ ان کا روز کا آنا جانا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گھاس کے اندر کیا ہو سکتا ہے۔ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ مجھے دور دور نظر آ رہا تھا۔ ایک آدمی جو اوپری بدن سے تنگا تھا۔ صرف ایک دھوپتی میں لبوس تھا آتا نظر آیا۔ وہ گھاس کے کنارے بیٹھ گیا اور کچھ عین دیر میں اپنی ضرورت پوری کر کے واپس جانے کو کھڑا ہو گیا۔ میں جلدی سے درخت سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے اچانک اس کے سامنے جانے سے وہ چونک گیا اور بنگالی میں بولا۔

”کون ہے۔“

”دُورمت میں بھی انسان ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

مگر وہ ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ میں نے دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا۔ ”تجھے اپنی زندگی پیاری نہیں لگتی شاید۔“

وہ ڈری آواز میں بولا۔ ”بہت پیاری ہے اسی کارن تو بچانے کو بھاگا ہوں۔“

”اور تو بھاگ کر موت کی طرف جا رہا تھا۔ تجھے پتہ ہے ادھر کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہے بھگوان تم نے ہم کو بچا لیا۔ تم کون ہے؟ ادھر کیا کرتا ہے؟“

”میں بھی ایک انسان ہوں۔۔۔۔۔ ادھر ایک آدمی کو ڈھونڈتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ادھر تو سانپ بھی نہیں آتا تم آدمی ڈھونڈتا ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں وہ آدمی سانپ سے زیادہ زہریلا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون ہے وہ۔۔۔۔۔؟“ وہ بولا۔

”پہلے تم یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم ادھر سامنے گاؤں کا ہے۔۔۔۔۔ ہمارا نام دھری ہے۔“ وہ بولا۔

”اب دھری تم یہ بتاؤ۔ ادھر کوئی بڑا یا کالی کا مندر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مندر تو بے کالی کا۔۔۔۔۔“ دھری نے جواب دیا۔

”ادھر کالی کے مندر میں پجاری کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اس مندر میں نہیں جاتا۔ اس لئے زیادہ ہم کو پتہ نہیں ہے۔ پر یہ پتہ ہے کہ اس کا پجاری گوبند چندری ہے۔“ دھری نے جواب دیا۔

”تم ادھر کیوں نہیں جاتا؟“ میں نے پوچھا۔

”ادھر چندری کالی کا سمیٹ لیتا ہے۔ کب لیتا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم ڈرتا ہے۔“ وہ بولا۔

”سب گاؤں والا اس کو ادھر سے بھگاتا نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

دھری کا نون کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”وہ سب کو مار سکتا ہے بہت بڑا جادوگر ہے وہ۔“ دھری بولا۔

مجھے جو پتہ کرنا تھا وہ میں کر چکا تھا چندری کے پاس ہی وکر م پینٹ آیا ہوگا۔ ”اچھا دھری اب تم جاؤ تم ہم سے ملا تھا یہ بھول جاؤ۔“ دھری نے گردن ہلائی اور چلا گیا۔ ابھی صرف رات کے گیارہ کا وقت تھا مگر ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ درختوں پر پرندے تک سو چکے تھے۔ میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے باہر ہی گاؤں کے کتوں کا ایک غول پیہرے پر موجود تھا۔ مگر مجھے وہ نہیں دیکھ پائے منہ اٹھا کر انہوں نے ہوا میں کچھ ٹونگھا ضرور تھا۔

اندھیرا ہر طرف گہرا تھا۔ میرے سامنے ایک مندر کی عمارت تھی۔ مندر کا عکس زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کلس کے پاس بھی مندر کی چھت تھی۔ اس چھت پر ایک عورت کھڑی تھی وہ عورت اتنی لمبی چوڑی تھی کہ میں نے آج تک اتنی لمبی اور گڑی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اگر اس کے نسوانی اعضاء اتنا نمایاں اور واضح نہیں ہوتے تو شاید میں اس کو عورت ہی تسلیم نہ کرتا۔ وہ بڑی ہی بے فکری سے چھت پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنی بربنگی کا ذرا احساس نہیں تھا۔ میں زینے کے بغیر ہی چھت پر چلا گیا۔ وہ اب بھی مجھے نہ دیکھ سکی۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب بھی اسے ذرا احساس نہ ہوا پھر میں ایک دم

نمودار ہو گیا۔ اس نے نیرت سے جیت دیکھا اور چونک کر کئی قدم پیچھے ہو گئی۔ مگر اس نے اپنے جسم کو پھپھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کوئی کمزور ناتواں عورت نہیں تھی، مگر میرے اس طرح نمودار ہو جانے کی وجہ سے زور ضرور ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ڈر گئی.....“

”ڈر کیا ہوتا ہے رے.....“ وہ بولی۔

”ابھی میں تجھے بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”تجھے بتا ہے تو کہاں کھڑا ہے۔“ وہ بولی۔

”تیرے سامنے کھڑا ہوں..... تو تو حسن کی ملکہ لگتی

ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں حسن کی ملکہ کم اور ظلم کی ملکہ زیادہ ہوں سن لیا۔“

وہ بولی۔

”ظلم کی ملکہ یہ تو بتا تیرا نام کیا ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”نام مت پوچھ یہ بتا تو کون ہے اور کیوں یہاں

آیا ہے؟“ وہ بولی۔

”نام تو بتا ہی بڑے گا.....؟ میری ظلم کی ملکہ نہیں

بتائے گی تو کپڑے پہنا کر کسی سرکس میں چھوڑاؤں گا۔ وہاں

تجھے بڑے بچے دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ہوش کی بات کر مورو کھو تجھے نہیں جانتا۔ میں تجھے

بھنڈی کے اچار میں ڈال دوں گی۔ گرد و پو بڑے شوق سے

کھاتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”اچھا تو تیرا بھی کوئی گرو ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہے۔ نام بتاؤں گی تو دھوتی خراب ہو جائے

گی۔“ وہ بولی۔

”اور تجھے تو کچھ شراب ہونے کا ڈر ہے ہی نہیں کچھ

شرم دھیا کر اسے نکلی عورت۔ تو نے بہت باتیں کر لیں۔ اب

تیری زبان بند ہے اور سن جس طرح زبان بند ہے اسی طرح

ہاتھ پیر بھی بند ہو سکتے ہیں..... میں جانتا ہوں تو کالی کی داسی

سون چمارن ہے۔ تیرا گھٹیا انداز اور تیری بے حیائی نے

تیری پول کھول دی ہے۔“ میں نے کہا۔

سون نے منہ کھول کر کچھ کہنا چاہا مگر زبان بند ہی

رہی۔ آواز نہیں نکلی تو میں نے کہا۔ ”بچی، الگن، کالی کو آواز دے لے۔“ وہ بے بسی سے کھڑی رہی تو میں نے کہا۔

”تیری سزا ہے کہ اسی جگہ کھڑی رہنا۔ اترنے کی یا

بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر نہیں مانے گی تو تیرا بہت برا

انجام ہوگا۔“ اور میں زینے سے نیچے آ گیا۔

مندر کی چار دیواری بہت اونچی تھی۔ میں نے پورا

مندر چھان مارا۔ پورے مندر میں ایک آدمی بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ مگر ناکام ہوا۔ میں جانتا

تھا کہ وہ یہیں پر ہے مگر اس نے کنڈل ایسا سخت قائم کیا ہے

کہ اس کا وجود اس میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں پھر اوپر آ گیا

سون چمارن اسی طرح پتھر کی صورت بنی ہوئی تھی۔

”تیرا گورو کہاں ہے۔ یہ بتا.....؟“

اس کی زبان کھلی تو وہ بولی۔ ”بس ہار گیا.....“

”دھونڈ لیا۔“

”دھونڈ تو میں لوں گا۔ مگر تیرا کیا کرم پہلے کروں

گا۔“ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے ایک اشارہ کیا۔ سونے

الو نے ایک زوردار پراس کے گال پر مارا۔ کیونکہ اس کو اتنا ہی

کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔

پھر ایک غول کھینوں کا آکر اس کے ننگے بدن سے لپٹ گیا۔

یہ کھیاں کوئی عام کھیاں نہیں تھیں۔ ان پر کوئی منتر جادو اثر نہیں

کرنا تھا۔ یہ چند لمحوں میں انسانی وجود کو ہڈیوں کا پنجر بنا دیتی

تھیں۔ سون پر حملہ انہوں نے ضرور کیا تھا مگر ان کے منہ بند

تھے۔ سون کا سارا وجود انہوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ

حیران نظروں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر مٹی شگفتی

تھی۔ وہ استعمال بھی کر رہی تھی۔ مگر کھینوں پر اس کا کوئی اثر

نہیں تھا۔ کچھ دیر میں اس کا تشاد دیکھنا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”اور کوشش کر لے تو نے ایسا بھی کب دیکھا ہوگا کہ

تجھے موقع دے رہا ہوں..... کر لے اپنا بچاؤ۔ کھیاں میرے

اشارے کی منتظر ہیں۔“

”تو کیا چاہتا ہے؟ میں تیری بات پوری کروں گی،

تیرا کام کروں گی۔“ وہ مجبوری میں بولی۔

کچھ اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ پھر اچانک ان لکڑیوں میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کی لہلیں کئی فٹ اونچی ہو گئیں۔ جیل نمائیر آگ کی روشنی اور شعلے دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ گیا اور میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ فرش میں ایک گہرا گڑھا پڑا تھا۔

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پتہ چلا کہ باہر نہیں گیا۔ اطراف میں اور اوپر بھی میرا پہرا تھا مگر وہ بھاگ گیا۔ لکڑیوں میں آگ لگتے ہی وہ زمین کے راستے بھاگا۔ یہ کوئی معمولی کرب نہیں تھا۔ میرا واسطہ ہندوستان میں جن ساحلوں سے پڑا تھا یہ ان میں سب سے الگ تھا۔ حالات اور موقعہ شای کا یہ ادراک رکھتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے دو طاقتور پہرے دار ناکام ہو چکے ہیں۔ دشمن کی کسی طاقت کا اس کا اندازہ نہیں ہے تو راہ فرار ہی بہتر ہے۔ اب وہ نئے سرے سے اپنی پینش کرے گا۔ دشمن کے بارے میں معلومات کرے گا۔ اپنی صف بندی کرے گا اور نئے آلات جنگ لے کر میدان میں آئے گا۔ اس کی ہوشیاری اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ طاقت کے زعم میں نہیں آیا۔ میں نے اس کی سوچ کا اندازہ لگایا اور چھپتے پر واپس آ گیا۔

چھپتے پر صرف کافی ڈھبیاں پڑی تھیں۔ سورن کا پتہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کسی آبادی کو اپنا مسکن نہیں بنائے گا۔ میرا تجربہ کہتا تھا کہ وہ بنگال سے زیادہ دور بھی نہیں جائے گا۔ کیونکہ اس کا دشمن یہاں پر تھا۔ وہ یہ سمجھ کرے گا کہ دشمن کون ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ کیا ہے اور پھر اسی حساب سے تیاری کرے گا۔ میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں کسی کو نظر نہ آؤں..... بڑے سے بڑا ساتر بھی جب دشمن سے لاعلم رہتا ہے..... تو اس پر گھبراہٹ اور جھنجھلاہٹ سوار ہو جاتی ہے اور اسی میں وہ غلطیاں کرتا ہے۔ میدان جنگ میں جس فوج کے جاسوس بروقت دشمن کی فوج کے بارے میں اپنے کمانڈر کو بتا دیتے ہیں وہ فوج کا مایاب ہو جاتی ہے اور جو جاسوس خبریں نہیں دیتے وہ ہار جاتی ہے۔ میرے دشمن کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس سے لڑ رہا ہے۔ اس لئے میرے وار کار گر ہوتے ہیں

”تو میرا کیا کام کرے گی تو گند کی پیداوار، گندے کام کرنے والی مادرو ذات برہمن رہنے والی۔ تو صرف گندے کام کرتی ہے۔ میرے پاس تیرا کوئی کام نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تیرا گرو کرم پنڈت اسی مندر میں موجود ہے۔ مگر کنڈل کا پردہ اس نے تان رکھا ہے۔ مگر اس کو ظاہر تو ہونا ہے۔ تو بتایا نہ تھا۔ اس سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہ اسی مندر میں ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔
”یہ تو میں نے پہلے ہی تجھے بتا دیا تھا۔ تو نے نئی بات کیا بتائی؟“ میں نے کہا۔
”جس کمرے کی چھت پر ایک جیل بیٹھی ہے وہ اسی میں ہے۔“ سورن نے جواب دیا۔

”میں دیکھتا ہوں تو اسی طرح رہتا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں نہیں ہوں۔ اگر ذرا بھی ہوشیاری دکھائے گی تو تیرا وجود ان مکھیوں کے پیٹ میں ہوگا اور اب تو اپنا چوالہ بھی نہیں بدل سکتی۔ جو ہے اسی میں تیرا کلیان ہوگا۔“ اور میں پھر چھت سے اتر کر مندر کی طرف چلا۔ مندر میں ایک گول دائرے کی شکل میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میدان کے مین درمیان ایک صورتی رکھی تھی۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ صورتی کس کی ہے۔ میں اس صورتی کے پاس کھڑا ہوا گیا اور نظریں کمروں کی چھت پر دوڑائیں۔ دائیں ہاتھ پر کونے کے کمرے کے اوپر ایک بہت بڑی جیل بیٹھی پر کھول بند کر رہی تھی۔ وہ جیل نہیں تھی بلکہ ایک نہایت سفاک بیر تھا۔ وہ پہرے پر تھا۔ اس کمرے کے اندر آنے والوں کو روکنا اس کا کام تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بیر نہایت طاقت اور صرف اپنے گرد کے حکم پر کام کرنے والا ہے۔ پہلے اس کو قابو کرنا ضروری تھا۔ یہ بیر اندھیرے کا بہت طاقتور بیر تھا۔ اس کی کمزوری روشنی اور آگ تھی۔ میں نے اپنے ہر کارے کو اشارہ کیا اور چند منٹ میں ہی میدان میں لکڑیاں آنا شروع ہو گئیں۔ جس جگہ وہ صورتی تھی وہاں پر برسوں کی لکڑیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ جیل اوپر بیٹھی ہی رہی۔ اس کو کچھ نظر آتا تو وہ کچھ حرکت کرتی۔ سب

چرندے پرندے میرے دوست تھے۔ میں جب چاہوں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ میرا اشارہ یہ جانتے تھے۔ میں ان کی زبان سمجھتا تھا۔ میرا ڈسٹن لاکھ ہوشیار ہو، مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنی بڑھی ہوئی ہوشیاری میں میری پسندیدہ جگہ آگیا ہے۔ رات کو دروازہ بند ہو جاتا تھا اور تمام مزدور کھانا کھا کر جلدی سو چاہا کرتے تھے۔ پورے کمپ میں سنانا ہو جاتا تھا اور میں باہر نکل جاتا تھا۔

کمپ سے دس بارہ میل پر ایک بہت گہرا پانی کا نالہ تھا۔ اس نالے کے ساتھ ہی ایک سرخ پتھر کی پہاڑی تھی۔ نالے کا پانی اس سرخ پہاڑی سے نکل کر بہتا تھا۔ اس نالے کے قریب جانا سخت خطرناک تھا۔ کیونکہ سب ہی جانور پانی پینے اس جگہ آتے تھے اور مگر چھاپنی بھوک مٹانے کو کنارے پر تاک لگا کر ان کا انتظار کرتے تھے۔ نالے کی چوڑائی بیس گز تو ضرور تھی مگر گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میں ایک بار پہلے بھی اس نالے تک آتا تھا۔ مگر اس کے پار نہیں گیا تھا۔ میں نے چاندنی رات میں دیکھا، رات بڑی پرسکون تھی۔ کبھی کبھی مگر چھپ کے اچھل کود کرنے سے پانی میں تلاطم ہوتا تھا۔ میں نے نالہ پار کرنے کا ارادہ کیا اور پار کر گیا۔ اب میں ایک پہاڑی ٹیکری پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس کے بعد چھوٹی بڑی چوٹیاں۔ اونٹ کے گوبالوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ میں میدان میں آگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں پر کبھی انسانی قدم نہیں آئے۔ نہیں میرا خیال غلط تھا۔ کیونکہ بہت دور مجھے ایک انسانی ہیولان نظر آگیا تھا۔ میں روپوشی کی حالت میں تھا۔

وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہیولان میری طرف ہی آ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ صرف دس پندرہ قدم پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا میں انگلیاں گھماتا رہا۔ وہ ایک بالکل برہنہ آدمی تھا۔ اس کے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ اس کے سارے جسم پر بالوں کا گھنا جنگل تھا۔ داڑھی اور مونچھ کے بال آپس میں مل چکے تھے۔ اس کا وہانہ نظر نہیں آتا تھا۔ جسم زیادہ فریبہ تھا نہ ہلاتھا۔ اس کی آنکھیں ہی اس کے سارے وجود میں قابل ذکر چیز تھیں۔ بلی کی طرح گول

اور جب پتہ چلتا ہے تو اس وقت کام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ میری پالیسی اس دفعہ بھی یہی تھی۔ میرے ہر کارے اپنا کام کر رہے تھے اور میں ایک مزدور کے روپ میں جنگل کی کٹائی کا کام کر رہا تھا۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا۔ یہ ہمالیہ کی ترائی ہندوستان کے آخری ریلوے اسٹیشن تک پور منڈی سے شروع ہوا تھا۔ یہ بھلا کا جنگل کہلاتا تھا اور یہی آگے چل کر سندربھن ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر جانے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا۔ فاریسٹ گارڈ اور جنگل کی حفاظت کرنے والا عملہ بھی صرف اپنی حد تک ہی جاتا تھا۔ جنگل کے اندر جانے کے بعد سمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ماہرین اس کا اندازہ کر تو لیتے مگر پھر ان کو راستہ نہیں ملتا۔ یہاں پر ایک قسم کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ درندوں کا خطرہ، حشرات الارض کا خطرہ، موسم کا خطرہ اور تو اور معمولی چیزوں کا بھی شدید خطرہ ہوتا ہے۔ درخت بھی آدم خور ہوتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ یہاں کے انسانوں سے بھی خطرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جنگل سے باہر والوں کو ہتھیار نہیں دیتے ہیں اور بہت اندرونی طرف تو انسانوں کا گوشت بڑے شوق سے تبرک کے طور پر کھاتے ہیں۔ جس ٹیکسیدار کے پاس میں کام کر رہا تھا اس نے مزدوروں کی حفاظت کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک بڑے میدان میں گول دائرے کی شکل میں موٹے موٹے لکڑی کے لٹھے ایک لائن میں قریب قریب گاڑ دیے۔ یہ لٹھے اتنے قریب تھے کہ خرگوش بھی اندر نہیں آ سکتا تھا اور ان لٹھوں کو درمیان اور اوپر سے موٹی موٹی پٹھیاں لگا کر ایک ساتھ ملا دیتا تھا۔ اس دائرے کے اندر لکڑی کے ہی کمرے تھے کوئی جانور دروازہ بند ہونے کے بعد نہیں آ سکتا تھا اور یہ دروازہ سورج غروب ہوتے ہی بند کر دیا جاتا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد نہ کوئی باہر جاسکتا تھا نہ اندر آ سکتا تھا۔ کھانا پینا سب کچھ اندر ہی ہوتا تھا۔ دن بھر جو لکڑی کاٹی جاتی تھی وہ دوسرے دن ٹرکوں میں لادی جاتی تھی اور روانہ کر دی جاتی تھی۔

اتنے خطرات سے بھر ایہ جنگل میرے لئے گھر کے آگن جیسا تھا۔ میں خود جنگلوں کا رہنے والا تھا۔ یہ درخت

درخت کھڑے تھے۔ ان کے تنے بہت موٹے تھے۔ ان درختوں پر بندر بیٹھے تھے۔ کچھ بہت تیزی سے اچھل کود رہے تھے۔ یہ بندر عام بندر نہیں تھے۔ ان کے منہ سرخ تھے اور قد میں بہت بڑے تھے۔ ان کے چہروں پر ان کا دہانہ سب سے خوف ناک چیز تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کا ایک سردار تو ضرور ہوگا جو کہ سب سے زیادہ بہادر ہوگا اور وہ کسی بہادر کو جنگ میں ہرا کر سردار بنا ہوگا۔ ان کا بھی نظام ہے۔ اس کی یہ پہچان ہے کہ اس کے گرد مادائیں بہت ہوں گی۔ ایک درخت پر مجھے سردار کا دربار نظر آ گیا۔ مگر میں اس طرف نہیں گیا۔ کیونکہ میں اس ننگے کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جمیل میں اثر گیا۔ جمیل زیادہ گہری نہیں تھی۔ وہ کمر کمر پانی میں گیا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا ہے کہ جس جگہ وہ غائب ہوا ہے وہی جگہ ہے جو اس کا ٹھکانا ہے یا وہاں سے کوئی راستہ ہے۔ میں نے وہ جگہ نظر میں رکھ لی اور پھر بندر سردار کے حرم کی طرف چلا۔ اس درخت پر بندروں کی بڑی آبادی تھی اور زیادہ تعداد مادائوں کی تھی۔

میں نے سردار سے وقتی رابطہ کیا اور پوچھا۔ ”تیری راج دھانی کب سے ہے اور کہاں تک ہے؟“ وہ ذرا دیر کو پریشان ہوا۔ جواب نہیں دیا تو میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”تو کون ہے کیوں پوچھتا ہے؟“ اس کے دماغ نے جواب دیا۔

”میں حیرادوست ہوں۔۔۔۔۔ تجھے فائدہ پہنچانے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو کہاں پر ہے نظر تو آتا نہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں میں تجھے نظر نہیں آؤں گا۔ مگر تیرے بہت قریب ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے کیا فائدہ ملے گا؟“ وہ بولا۔

”تیری سرداری ختم ہونے والی ہے۔۔۔۔۔ تجھے کالے جنگل میں جانا ہوگا۔ سرداری ختم ہونے کے بعد ہر سردار کو جانا پڑتا ہے اور تو جانتا ہے کہ کالا جنگل کیسی خوف ناک جگہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو میری مدد کس طرح کرے گا۔“ اس نے پوچھا۔

گول اور اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مگر اندھیرے میں دیکھنے والی آنکھیں بھی مجھے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ کبھی آسمان کی طرف منہ کرتا، کبھی زمین کریدتا، کبھی ہوا میں ہاتھ لہراتا، سر جھٹکتا، واڑھی کے بال نوچتا، ان کو ہوا میں اڑاتا۔ میں اس کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

اور پھر وہ واپس جانے لگا۔ میں تھوڑا فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلا۔ میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ یہ وکرم پنڈت ہی ہے۔ اس کے دھوکے میں کسی اور سے نہ ٹکرا جاؤں۔ میں بلاوجہ کسی سے نہیں لڑتا۔ وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ بار بار رک کر اس نے ہوا میں ہاتھ لہرائے اور پھر چل پڑا اور ایک بہت اونچی چٹان کے دامن میں کھڑا ہو گیا۔ چٹان ایک دیوار کی طرح اس کے سامنے تھی۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زمین پر خود رو گھاس کا بستر بنا۔ چٹان کے قریب کوئی بڑا درخت بھی نہیں تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ اشارے کئے اور چٹان میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا وہ اس میں داخل ہونے لگا۔ میں اس سے پہلے اس میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک اندھیری سرنگ تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں اس کے عین پیچھے تھا۔ وہ سرنگ ایک میدان میں ختم ہوئی۔ یہ میدان کا نئے دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان جھاڑیوں میں گول گول، ہرے اور سرخ رنگ کے بیر کے برابر پھل لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑے نایاب پھل تھے۔ یہ جھاڑیاں ہر جگہ نہیں اگتیں۔ میں جانتا تھا کہ یہاں قریب میں ضرور تانبے اور سونے کی کان ہوگی۔ یہ جھاڑیاں ان کی موجودگی ظاہر کرتی ہیں۔ اس جھاڑی کا کانٹا سوئی کی طرح سخت ہوتا ہے اور اس کی شکل شروع کے چاند جیسی ہوتی ہے۔ اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے اور بڑی شکلوں سے بھرتا ہے۔ وہ ننگا شخص بڑی بے فکرئی سے ان جھاڑیوں سے گزر رہا تھا یا تو وہ ان جھاڑیوں کے کانٹوں کے اثرات کو جانتا نہیں تھا یا پھر وہ علاج پر قدرت رکھتا تھا۔ میں جھاڑیوں کے اوپر تھا۔ اس میدان کا آخری سر ایک جمیل پر تھا جمیل کے کناروں پر بڑے قدیم

”جتنے اتنا طاقتور بنا کر کہ کوئی تیرے سامنے آسے نہ سکے اور اگر آئے تو جیت نہ سکے۔“ میں نے کہا۔
 ”میں کس طرح اتنا طاقتور بنوں گا؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”وہ میں بتاؤں گا۔ مگر یاد رکھ، کچھ لینے سے پہلے کچھ دینا پڑتا ہے۔ تو میرا کام کر، میں تیرا کام کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”تیرا کیا کام ہے؟“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”اس جگہ بلکہ جمیل کے اندر ایک آدمی رہتا ہے، تو نے دیکھا ہے؟“

”ہاں دیکھا ہے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ ہاتھ نہیں ہلاتا اور میری قوم کو مار دیتا ہے۔ ہم اس سے دور رہتے ہیں۔“ سردار نے جواب دیا۔
 ”وہ پانی کے اندر گیا ہے۔ تم کو پتہ ہے کہ اس کا گھر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”وہ پانی کے اندر ہی جاتا ہے، اندر کہاں جاتا ہے، ہم نے پتہ نہیں کیا۔ کیونکہ ہم سب اس سے دور رہتے ہیں۔“ سردار نے جواب دیا۔
 ”اس کے علاوہ بھی تم نے کسی کو اس کے ساتھ دیکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں صرف ایک دفعہ اس کے ساتھ ایک آدمی دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح تھا۔ دونوں کے چہرے بالوں میں چھپے ہوئے تھے اور دونوں کے ہاتھ میں ایک ٹیڑھی سی لکڑی تھی۔ مجھے ان سے اس دن بڑی نفرت ہو گئی تھی۔“ سردار بولا۔
 ”کیوں؟ نفرت کیوں ہوئی تھی؟“

”اس حرامی نے میری ایک بڑی حسین رانی کو اپنی ہوس کا شکار بنایا تھا۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ سب دیکھتے رہے اور کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ انسان ہو یا اور کچھ۔ اگر انسان ہو تو مجھے بتاؤ کہ کیا کسی میری قوم نے ایسی حرکت کی ہے۔“ سردار نے پوچھا۔
 ”مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ انسان جب

گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے وہ جانوروں سے بھی زیادہ وحشی و درندہ بن جاتا ہے اور جب وہ درندہ بن جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”میں تیری مدد کروں گا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تم ان پر نظر رکھنا۔ میں تمہارے اس درخت کو محفوظ بنادیتا ہوں۔ اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہے گا تو بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں اس کی تلاش آگے کروں گا تم اس کی ایک ایک حرکت نظر میں رکھو گے۔ مجھے جب ضرورت ہوگی تم سے اسی طرح بات کروں گا۔“ اور میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ اب میں جمیل کی اسی طرف جا رہا تھا جہاں پر وہ غائب ہوا تھا۔ یہاں پر پانی سینے تک تھا۔ میں عین اس جگہ تھا جہاں پر وہ غائب ہوا تھا۔ میں نے پانی میں آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک کنواں سا نظر آیا۔ میں اس کے اندر چلا گیا مگر حیرت انگیز طور پر یہ جگہ سوکھی تھی۔ اوپر پانی بہہ رہا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے کالج کی دیوار ہے جو کنویں کے اندر پانی کو نہیں آنے دیتی مگر میں تو اسی راستے سے اندر آیا تھا۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر پانی کنویں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اندر کیوں نہیں گرتا۔ یہ حیرت کی بات تو تھی مگر میرے لئے اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میرے سامنے ایسے ہزاروں شعبدے آئے تھے۔ اس نے بے شک پانی پر کنٹرول کر لیا تھا۔ کنویں میں کوئی نہیں تھا۔ میں پھر باہر آ گیا اور جمیل سے نکل آیا۔

ہندروں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ ہند رنگور سے بھی بڑے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ غول درغول آ رہے تھے۔ ہر ہند کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کا سامان تھا۔ کسی کے پاس کوئی شکار نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ گوشت خور نہیں تھے۔ مگر شکلوں سے بہت خوف ناک تھے۔ ان سب کے ٹھکانے درختوں پر تھے۔ ان کے بچے اور مادائیں ان کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ بچے درختوں پر ٹھیل رہے تھے اور پھر رات گہری ہوتی گئی۔ جنگل دن میں جتنا خوبصورت نظر آتا ہے، رات کو اتنا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ یہاں پر طاقت کا قانون چلتا ہے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں جمیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے پانی تھا۔ ایک

مگر مجھ مجھے اپنی طرف آنا نظر آیا۔ وہ میرے سامنے آکر رک گیا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بے آواز اور آگے بڑھا اور خشکی پر آکر رک گیا۔ ایک بار پھر اس نے اچھی طرح سب طرف کا جائزہ لیا اور ایک لوٹ لگائی۔ دو تین دفعہ اس نے یہی کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک انسانی شکل میں تھا۔ چہرے پر داڑھی موجھ کے بے ترتیب بڑھے ہوئے بال، سر پر ایک بالوں کا جنگل اور جسم پر بھی ہر جگہ بال۔ وہ دونوں پیروں سے چلتا تھا۔ اگر اس طرح نہ چلتا تو اس کو انسان کہنا مشکل ہوتا۔ میں روپوش تھا۔ وہ کتے کی طرح ہر طرف بوٹکھ رہا تھا۔ اس کا علم اور دوا بھی اس کو کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو پتہ تھا کہ کوئی ہے۔ شاید اس کی حس بہت طاقتور تھی مگر علم ناکارہ تھا۔ میں اس کی پیمائش کر رہا تھا۔ اس کا اچھی طرح وزن کر رہا تھا۔ اگر میں اس کے سامنے وقت سے پہلے خود کو منکشف کر دیتا تو وہ ہوشیار ہو جاتا۔ اپنے اوزاروں کو ٹھیک جگہ مقرر کر دیتا۔ میرا دادا کہا کرتا تھا کہ کامیاب وہ ہوتا ہے جو غائب ہو۔ لڑائی سے پہلے مورچے اور چمان بنانا ضروری ہے جو کھلی جگہ لڑے گا زیادہ نقصان اس کا ہوگا۔ میرے مورچے اور چمان تیار تھے۔ میں اس کو کھلی جگہ لارہا تھا اور اس کی کمک کو بھی روکتا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر تھیل میں چلا گیا۔ صبح میں نے بندروں کے سردار سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”تم کو دو چار دن کے لئے یہ جگہ خالی کرنا ہوگی۔“

سردار نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میرا قبیلہ بڑا ہے کہاں لے جاؤں؟“

”یہ تم جانو میرا کام تم کو بتانا تھا۔ ایک بڑا معرکہ ہونے کو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو تم جانتے ہو کہ دشمن کتنا بے رحم ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ نہ ہو۔ میری ذمہ داری تم کو بتا کر ختم ہوگئی ہے۔“

”ٹھیک ہے کل سویرے یہاں سے ہم چلے جائیں گے۔“ سردار نے جواب دیا۔

دوسرے دن ایک بندر کا بچہ بھی یہاں نہیں تھا۔ سب جا چکے تھے۔ میں اسی پتھر پر بیٹھا تھا۔ ہر طرف میری

بندش تھی میں نے آنے جانے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ مگر مجھ پھر نمودار ہوا اور اسی طرح لوٹ پوٹ کے بعد انسانی شکل میں آ گیا۔ انسانی شکل میں آتے ہی میں نمودار ہو گیا۔ اس نے اپنی گول گول چمکدار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر کھردری آواز میں بولا۔ ”آخر آگیا نا سامنے کب تک چھپتا.....“

”ہاں ایک نیا ایک دن تو سامنے آنا ہی تھا۔ دیکھ لے اچھی طرح دیکھ لے۔ بہت سے تو دیکھنے کی حسرت لے کر ہی چلے گئے۔“

”میری ودیا اور خشکی نے بتا دیا تھا کہ تو آگیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے مجھے تیرے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ تیری ہر حرکت کا مجھے پتہ ہے۔ میں وکرم پنڈت ہوں۔“ وہ بولا۔

”یہاں پر بھی تو جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے تو کرم دین ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون کرم دین.....“ وہ اچھل کر بولا۔

”وہی کرم دین جو امام دین کا بیٹا ہے جسے کورامائی نے ہندو بنادیا اور پھر وہ لاندہب ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

”تو جھوٹا ہے..... میں کسی امام دین کو نہیں جانتا..... کسی کورامائی کو نہیں جانتا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تو صرف جھوٹ کا سوداگر ہے۔ تیرے پاس مکرو فریب ملے گا۔ درندگی ملے گی۔ مکاری کی تو اس پر پاش کر کے گا اور دھوکے کے کپڑے سے اس کو چکائے گا۔ تیرے جواب سے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔“

”پھر تو تجھے فرق پتہ ہی ہے تو کیوں آیا ہے میرے پاس۔“ وہ بولا۔

”تجھے یہی فرق بتانے آیا ہوں۔ تو کسی انسان کو نقصان تو پہنچا سکتا ہے مگر فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ فرق تمہارا تخریب کا ہے۔ اتنے دور برے کا ہے۔ شیطان کا چیلہ بھی کسی کو فائدہ نہیں دے گا۔ جاؤ اور روحانیت کا یہی فرق ہے جو موسیٰ اور فرعون میں تھا۔ موسیٰ حق پر تھے اور فرعون شر تھا۔ یہ وہیں سے چلا آ رہا ہے۔ دونوں طاقتیں ابتدا سے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ تجھے پتہ ہے تو اپنی روح شیطان کو بیچ چکا

جاری ہو گیا۔ وہ جھٹکا چلا گیا اور میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کی بے زبانی بڑی معتبرک زبان مٹی گئی۔ وہ کہہ رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔

وہ اپنے کئے پر نام تھا۔ اس کے کانوں میں وہی آواز گونج رہی تھی جو اس نے ماں کی گود میں سنی تھی۔ سب آوازیں بیکار تھیں۔ گرو کی آواز دنیا کی آواز وہ صرف ایک آواز پر دھیان لگائے ہوئے تھا۔ وہ پلٹ آیا تھا۔ وہ پھر اسی راستے پر آ گیا تھا جس کو وہ چھوڑ چکا تھا اور جب انسان ٹھیک راہ پر آ جائے تو پھر اس کو کچھ نہیں کہا جاتا۔ میں نے اس کو گلے لگایا۔

☆.....☆.....☆

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ طلب اور اس کا حصول زندگی کی علامت ہے۔ لیکن طلب صادق ہو، کسی کو کوئی مار کر طلب پوری نہ کی جائے۔ کسی کو روند کر آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو۔ دنیا میں صرف دولت کمالیتا ہی نفع نہیں ہے۔ بے شک دولت سب کو اچھی لگتی ہے۔ کرازے نوٹوں کی گڈیاں آنکھوں کی بینائی کو یڑھاتی ہیں۔ وقتی طور پر یہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جس کو سکون قلب کہا جاتا ہے وہ ان میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو کوئی کروڑ پتی پریشان نہ ہوتا۔ جتنی زیادہ دولت اتنی ہی بڑی پریشانی۔ جتنا زیادہ دولت کا پھیلاؤ، اتنا زیادہ اس کا کنٹرول، ہر طرف نظریں، ہر طرف کی فکر، ایک آدمی کہاں کہاں جا سکتا ہے۔ کس کس کو دیکھ سکتا ہے اگر نہ دیکھے تو نقصان کا اندیشہ۔ دولت مند سب باتیں برداشت کر لیتا ہے مگر اپنی دولت کو برادہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ دولت کو چھوڑ کر دھرنے پر بھی راضی نہیں ہوتا۔

میں نے کئی واقعات ایسے سنے ہیں کہ سینٹھ جی بستر پر ایک ماہ سے یا اس سے بھی زیادہ سے بے ہوش پڑے ہیں مگر جان نہیں نکلتی۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ یہ ختم ہو چکے مگر سانس کی ڈوری قائم ہے۔ سارے عزیز، رشتہ دار، بیٹے، بیٹیاں مرنے کا انتظار کر رہے ہیں مگر بوڑھا ہے کہ جنے جا رہا ہے۔ وہ کس اذیت میں ہے۔ اس کا دھیان کوئی نہیں کرتا۔ پھر کوئی سیانا کہتا ہے کہ یہ یوں نہیں مرے گا، اس سے ان کئی کہلوای

ہے۔ تو اب اس کا ہی کلمہ پڑھے گا۔ وہی کرے گا جو وہ حکم دے گا۔ اس کے من کو آگے بڑھائے گا مگر تو میری نظر میں ایک بے وقف آدمی ہے۔

تو نے ذرا نہیں سوچا کہ ایک قوت روحانیت کی بھی قوت ہے تو نے جتنی محنت شیطان کو مٹانے میں کی۔ اگر اتنی روحانیت کو پانے میں کرتا تو تیرا مقام کیا ہوتا۔ ذرا غور کر۔ اب تو کیا ہے۔ اب تیرے لئے کوئی برائی، برائی نہیں رہی۔ تم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ قتل سے تم نے ابتداء کی اور اس کے بعد تم اپنے گرو کے کہنے پر آ گے ہی بڑھتے گئے۔ تم نے اپنی راتوں کو حسن و شباب سے سجایا۔ درندگی میں تم جانوروں سے آگے نکل گئے۔ مگر میں تم کو یاد دلانے آیا ہوں کہ تم ایک مسلمان کی اولاد ہو۔ تمہارے پیدا ہوتے ہی تمہارے کانوں میں ایک صدا دی گئی تھی۔ وہ دیکھیں پوری زندگی کے لئے ہوتی ہے۔ غور کرو تو یہ کہے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ جب تک تمہارا سانس باقی ہے تو یہ کہے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کوشش کرو۔ جسم کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور نکل آئے گی۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں گر زمر مت رہنا۔ یاد رکھو اس بار ڈوبو گے تو پھر ابھر دو گے نہیں۔“

و کرم پنڈت گردن جھکائے میری بات سننا اور جب گردن اٹھائی تو وہ و کرم پنڈت نہیں کرم دین ولد امام دین تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک لڑی بہہ رہی تھی۔ اس کی ساری تپا اور شقی اس پانی میں بہتی نظر آرہی تھی۔ اس کے دماغ کے تاریک گوشے روشن ہو رہے تھے۔ کچھ بھول رہا ہے کچھ پرانا سبق یاد آ رہا ہے۔ پردہ اٹھ رہا ہے۔ اس کو اپنی اصلی شکل نظر آرہی ہے۔ اس کے ذہن کی موتی دیواروں میں شگاف پڑ رہے ہیں۔ اس کو اپنی ماں کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ باپ کا تھکا تھکا سا چہرہ یاد آ رہا ہے۔ کبھی گھپ اندھیرا ہو رہا ہے۔ کبھی اجالے کی کرن اس اندھیرے کو چاک کر رہی ہے۔ اجالے اور اندھیرے کا یہ ہیلل اور ایک بھونچال اس کے اندر آ گیا ہے۔ اندھیرا اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور روشنی کی کرن اس کی مدد کر رہی ہے اور پھر اچانک بہا آ گئی۔ اس کو ہوش آ گیا اور آنکھوں سے نمازت کا پانی

جائے پھر کسی ان کی سنانے والے کو بلایا جاتا ہے اور وہ اس کے کان میں ان کی کہتا ہے اور اس کے بعد چند لمحوں میں بوڑھے کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ آپ کہیں وہ ان کی کیا تھی جس نے مرنے والے کی مشکل آسان کر دی۔

پر بھو پر شاد بڑے اچھے دوکاندار تھے۔ بچے ان کی ہی دوکان میں جاتے تھے۔ سودا چار آنے کا ہو یا چار روپے کا وہ ہر بچے کو کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور دیا کرتے تھے۔ گڑ دھاتی اور پٹنہ کی بوریاں وہ سامنے ہی رکھتے تھے۔ کسی بچے کو کسی نہیں ڈالتے تھے۔ ان کا ماہانہ کا ادھار بھی گھروں پر چلتا تھا۔ دام مناسب لگاتے تھے۔ منافع لیتے تھے مگر سودا بھی کھرا دیتے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ادھار دینے میں رقم پر بیان بھی دیتے تھے۔ یہ دوکان ان کے گھر کے باہری حصہ میں تھی۔ پھر اس کا دور جبکہ کی ضرورت پڑ گئی اور اندر کا کونٹا بھی دوکان میں آگیا۔ ہوتے ہوئے پورا مکان دوکان بن گیا۔ پہلے مال ہاتھ گاڑی یا بیل گاڑی پر آتا کرتا تھا۔ پھر شکر کوں پر آنے لگا۔ پہلے سب کام خود کرتے تھے۔ اب ان کی دوکان میں دو ملازم آگئے۔ مگر ان کا رتاؤ اور زبان وہی رہی۔ ان کا لباس جو ایک میلی دھوئی اور میلی ہتھوری تھا وہی رہا۔ بیروں میں انہوں نے کبھی چیل جوتا پہنا ہی نہ تھا۔ دوکان میں سنوں بھی بھر اہرتا مگر وہ ہمیشہ سوکھی روٹی چباتے۔ ان کی کنجوسی کا یہ عالم تھا کہ دوکان کی جھاڑو دینے کے بعد وہاں کے اور چاول کے دانے خود کھرے میں سے چٹتے۔ کسی نوکر پر ان کو اعتبار نہ تھا۔

ان کے دولہ کے تھے۔ بڑے کا نام رام پرشاد اور چھوٹے کا گوتم پرشاد تھا۔ وہ بچپن سے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ بولی، دیوالی پر بھی پر بھونے لگی نیا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ لڑکوں کی ضد اور گھر والی کی باتیں پر بھو پرشاد کو دو۔ تینہ جوڑے بنانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ دیوالی ہو جاتی مگر وہ کئی دن اواس رہتا۔ بیوی جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے مگر میں اچار اور پری مرچ یا نمک کی چٹنی اور بہت خوشی ہوئی تو وہاں مگردال میں بھی نہیں ڈال دیا گیا۔ وہ کہتا۔ اری نیک بخت اس سے لڑکوں کی عادت نیکو جائے گی۔ پھر وہ روز روز گھی کھائیں گے اور بنیا گھی پیچتا ہے کھاتا نہیں۔ اگر کھائے گا تو پھر بنیا

کب رہے گا۔ یہ اس کا خاندانی فلسفہ تھا جس پر وہ بڑی سختی سے قائم تھا۔

اب اس کا کاروبار بڑھ گیا تھا۔ منڈی میں بھی شکر کی بہت بڑی دوکان تھی۔ بہت بڑا گودام تھا۔ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ لڑکوں کو بھی اس نے ساتھ لگالیا تھا۔ وہ بھی آخر چوہے کے بچے تھے۔ مل کھودتا تو ان کا کام ہی تھا۔ وہ بھی باپ سے آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں تھے۔ باپ کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ مگر پھر بھی پر بھون پر پوری نظر رکھتا تھا۔ کوڑی کوڑی کا حساب کرتا تھا۔ کیا خیال ہے کہ ایک آنہ بھی حساب سے کھک جائے۔

وہ آج بھی اپنے اسی لباس میں سب جگہ پھرتا تھا۔ وہ کہتا کپڑوں کو کون دیکھتا ہے۔ ارے جیب کو سب دیکھتے ہیں۔ جیب خالی ہوتو کوئی پوچھتا نہیں۔ بھری ہو تو کپڑوں کے نسل کی طرف کون دھیان دیتا ہے۔

پر بھو پر شاد دین دھرم کی طرف بھی نہیں تھا۔ مگر سال میں ایک دفعہ لکشمی پوجا صرف اس لئے کرتا تھا کہ کہیں لکشمی دیوی ناراض نہ ہو جائے۔ وہ ایک نہایت سستی سی مورتی خریدتا اور تجوری کے اوپر سجا کر کاغذ کے پھول ڈال دیتا۔ کاغذ کے اس لئے کہ روز روز کون تازہ پھول ڈالے گا۔ رام پرشاد شادی کے قابل ہوا۔ برادری میں کئی لڑکیاں تھیں مگر ان کو تلاش تھی اپنے جوڑی کی۔ ان کا مطالبہ بھی زیادہ تھا۔ لڑکے کو بیس ہزار نقد منہ دکھائی میں اور بیس ہزار کا جینہ دین کو اس کے علاوہ کپڑا الگ، کھانا بارہ منڈی کا، سات رنگ کی مٹھائی اور بارہات میں دن قیام کرے گی۔ یہ کوئی چھوٹا مطالبہ نہ تھا۔ برادری والے کہتے تھے پر بھونے اتنا بڑا مطالبہ اس لئے رکھا ہے کہ لڑکے کی بارہات نہ کرنی پڑے۔ ارے کون اتنی ساری باتیں مانے گا۔ پورے شہر میں کون ہاتھ رکھے گا اور ہوا بھی یہی مگر جوڑا تو اوپر بنادیا گیا تھا۔ رام پرشاد کا رشتہ آیا تو رام پور سے۔ پورن مل کی لڑکی ساوہری سے بات چلی۔ پورن مل بھی پر بھو کی برادری کے تھے۔ کاروبار میں کم نہ تھے اور انجری میں بھی کم درجہ نہ رکھتے تھے۔ بیٹھ کر بات ہوئی۔ پورن مل نے بڑے دادو پیچا مارے۔۔۔۔۔۔ مطالبوں پر بحث ہوئی مگر پر بھو ایک

کائیاں آدمی تھا۔ نقد رقم اور جہیز پر تو بر بھو اٹل ہی رہا۔ بات صرف اس پر ہوئی کہ بارات تین دن کی بجائے دو دن رکے گی۔ مٹھائی سات کی بجائے پانچ قسم کی ہوگی۔ کپڑا اتار لڑکی کا جو پسند ہو دینا مگر لڑکے کا اور اس کے گھر والوں کا قاعدے کا ہوگا۔ بارات میں سوا آدمی ہوں گے تم اپنی عزت کو ہارہ منڈی کا کھانا کرو یا صرف برادری کو کھلاؤ۔ اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہے۔

بارہ منڈی کے کھانے سے مراد یہ ہوتی تھی کہ بارہ گاؤں کے برادری والوں کو دعوت دو اور اگر اور نام کرتا ہے تو بارہ گاؤں کی عام دعوت دو۔ اس زمانے میں یہی دستور تھا۔ لڑکے والوں کا اگر دس ہزار خرچ ہوتا تھا تو لڑکی والوں کا اس سے دس گنا ہو جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ لڑکے کو یا قاعدہ بولی لگا کر بات چکی کی جاتی تھی۔ لڑکے کا باپ جتنی بڑی آسائی ہوتا تھا لڑکا بہت قابل ہوتا تھا، اس کی بولی بھی زیادہ ہوتی تھی۔ نہ لڑکے کی شکل دیکھی جاتی تھی نہ لڑکی کے ہارے میں زیادہ کرید ہوتی تھی۔ اگر دیکھا جاتا تھا تو صرف یہ کہ بولی کتنی ہے اور مطالبات پورے کرتے ہیں یا نہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ لڑکے لڑکی کا جوڑ نہیں بننا اور شادی ہو جاتی ہے اور زندگی بھر میاں بیوی ایک گھر میں بھی ایک نہیں ہوتے۔

پر بھو کیا کرتا وہ جو کہہ رہا تھا، وہی کہہ رہا تھا جو ہوتا آیا تھا۔ یہ کوئی نئی ریت نہیں تھی۔ سب برادری کو یہ پتہ تھا سب یہی کرتے تھے جس کی وجہ پر بنیاں ہو جاتیں وہ مرتے وقت قرض داری مرتا۔ اس کا قرض اس کی اولاد ادا کرتی رہتی۔ پر بھو کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اب اس کا وقت آیا تھا۔ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ بھگوان نے دو لڑکے دیئے تھے۔ جو اس نے اب تک قرض ادا کیا تھا وہ تو وصول کرنا تھا۔ پر بھو کی گھر والی جانتی تھی کہ پر بھو نے خود کو اس کھودا ہے خود کو دل ڈال کر پانی کھینچا ہے۔ ایک وقت کھا کر دو وقت کا بچایا ہے۔ اب اس کا تو حق بنتا ہے کہ اپنی محنت کی پانی پانی وصول کرے۔ ماں نے لڑکوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات بٹھادی تھی کہ باپ جو کر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ تم صرف دیکھتے جاؤ۔ یہ سب تمہارا ہی ہے۔ تمہارے کارن ہی پر بھو کر رہا ہے۔ اس میں ہم سب کا ہی

فائدہ ہے۔ آنے والی پیڑی کا فائدہ ہے۔ محنت پر بھو نے کی ہے تم فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس لئے ان کے کام میں مت بولو اور لڑکے خاموش تھے۔ سب کہتے پر بھو کے لڑکے تو گائے ہیں گائے مگر یہ گائے ایک بننے کی گائے تھی۔ بہت دور تک دیکھتی تھی۔ اب تو جو کچھ ہو گا وہ پر بھو کے سر جاتے گا۔ وہ کہتے کیا کریں باپو کے سامنے ہم بول تو نہیں سکتے۔ ان کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ آئی لکشی کو کون دھکا کرتا ہے۔ سب کچھ پر بھو کی مرضی کے مطابق طے ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنیانا پنے کھانے پر خرچ کرتا ہے نہ کی کھلا تا ہے نہ خود اچھا پہنتا ہے اور نہ کسی کو پہنتا ہے۔ مگر وہ جبکہ دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔ ایک لڑکی لڑکے کی شادی پر..... دوسرا جوئے میں۔ انڈیا میں بڑے تہواروں پر جو عام کھیل جاتا ہے اور ہر سڑک پر، گلی میں پولیس کی ٹیمز ہیں یہ ہوتا ہے۔ بڑی رقموں کا جوا ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی لکشی کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ پر بھو پر بھو سے یہ دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ بھی اسی اصول پر کار بند تھا۔

پر بھو نے اپنے وقت کا سب سے اچھا بینڈ باجا بارات چڑھانے کو بلایا۔ آتش بازی کا بہت بڑھیا انتظام کیا۔ دور قریب کے مشہور آتش بازوں کو منہ مانگے دام دیئے۔ ہر باراتی کو ایک رنگ کی پگڑیاں دیں۔ عورتوں کو بھی سرخ رنگ کے بلاؤز اور پہلی ساڑھیاں دیں۔ رشتے کی لڑکیوں کو چوڑیاں اور سنگار کا سامان دیا اور پندرہ دن پہلے ہی مہمان آگئے۔ سیٹھ پر بھو پر شاد کے لڑکے کی شادی تھی۔

گوالیار اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ پورے شہر میں اس کی دھوم تھی۔ اتنی شاندار شادیاں بہت کم اس شہر میں ہوتی تھیں۔ رام پر شاد کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد بھی شادی کی دھوم رہی۔ پر بھو کے سمدھی نے بھی کوئی کسر نہیں ہونے دی۔ پر بھو کا ہر مطالبہ پورا کر دیا۔ لڑکی کو پر بھو کی امید سے بڑھ کر جہیز دیا۔ آخر وہ بھی تو رام پور کا مشہور بن چکا تھا۔ اس کے ساتھ رام پور کے بچیوں کی پوری برادری تھی۔ اپنی بات کہاں مگر نے دیتے۔ پر بھو پر شاد اور رام پر شاد بہت خوش تھے۔ وہیں کہیں سے اس طرف کسی کا دھیان تھا نہیں۔ دولت کی تیز روشنی بنے۔ سب کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ یہ دھیان کسی کو نہیں

آیا کہ آخر سمدھی نے اتنی آسانی سے کیسے مان لی اور پورا کر دیا۔

رام پرشاد باپ پر ہی گیا تھا مگر کہتے ہیں جوانی میں تو گلدھا بھی اچھا لگتا ہے۔ ناک نقشہ کوئی خاص نہیں تھا۔ رنگ بھی کالا ہی تھا۔ ہندوکان پر بیٹھ بیٹھ کر فربہ مائل تھا۔ چھوٹی سی تو ند تو اب بھی نظر آتی تھی۔ مگر اس کی دلہن جو آئی وہ تو اس سے سو گنا نچلے درجے پر تھی۔

تقل تھل کرتا بدن، چوڑا چہرہ اس چوڑے چہرے پر چپٹی سی ناک اور پھولے پھولے گال۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں گالوں میں کچھ دھار کھا ہے۔ قد رام پرشاد کے برابر ہی تھا مگر جسم کے پھیلاؤ کی وجہ سے ٹھنکی لگتی تھی۔ چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے سڑک پر رولر بھیرا جا رہا ہو۔ آواز اتنی باریک تھی کہ سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے بھاری وجود کی یہ آواز ہے۔

رام پرشاد نے اس کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ دلہن کے باپ پورن ل نے بھاگنے کا ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہر دروازے پر روپے کے چہرے تھے اور کمرے میں وہ ایک مست تھنی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دل میں ہانپ کر خوب لٹاؤ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ”کیا کھڑے ہی رہو گے۔“ اس کے کالوں میں ایک باریک آواز آئی اور وہ دھپ سے ہلک پر بیٹھ گیا اور رات گزر گئی۔ ایک مگر کچھ کے ساتھ آدھی کی کیسی رات گزری ہوئی کون سوچے گا۔ سب لوگ چلے گئے۔ ایک نے بھی نہیں پوچھا۔ ”میاں رام پرشاد کیا حال ہے؟“ قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے دفنانے والے تو چلے جاتے ہیں۔

پر بھو پرشاد کا کاروبار اور چمک اٹھا اور دو گودام اور بنا لئے۔ اناج کی خریداری اور بڑھ گئی۔ آخر جو خرچ کیا تھا وصول تو کرنا تھا۔ سمدھی کی دی ہوئی رقم سے ہی اپنا خرچ پورا کرنا تھا۔ پر بھو پرشاد ٹھہرے پیدا انٹی کاروباری پیسے سے پیسے کی طرح بنتا ہے یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ایک دم چمکا مارنے کے قابل نہ تھے۔ وہ آہستہ رو کی کے قابل تھے اور مستقل مزاجی سے کام کرتے تھے۔ اسی لئے ہمیشہ کامیاب ہوا کرتے تھے۔

سویرے اٹھ کر سب سے پہلے وہ اپنے گوداموں کا چکر لگاتے۔ وہ اتنی خاموشی اور دبے پاؤں جاتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی اور ایسا اس لئے کرتے کہ دیکھ سکیں کہ ملازمین کیا کر رہے ہیں۔ کوئی چوری چکاری تو نہیں ہو رہی۔ ان کے جانے کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ ایک گودام میں نو بجے جاتے تو دوسرے میں گیارہ بجے جاتے۔ وہ کہتے کہ اس طرح سب چوکے رہتے ہیں۔ ڈران کے دل میں رہتا ہے اور کام پورا کرتے ہیں۔

سویرے وہ نئے گودام کی طرف چلے گئے۔ یہ گودام قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ بڑی اونچی اس کی چھت تھی۔ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ مال لانے والی تیل گاڑیاں اندر آ جاتی تھیں۔

جب وہ دروازے میں داخل ہوئے اس وقت دو تیل گاڑیاں مال اتار رہی تھیں۔ یہ قریبی گاؤں سے مال کی بوریاں لائے تھے۔ مزدور اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔ مزدوروں نے بوریوں اس طرح لگائی تھیں کہ ایک زینہ بن گیا تھا۔ وہ اس پر ہی چڑھ کر بوریاں اوپر پہنچا رہے تھے۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے وہ جگہ وہ بھی جہاں بوریاں پہنچائی جا رہی تھیں۔ مزدور اپنی دھن میں بوریوں کمر پر لا کر لا رہے تھے اور بارہ تیرہ فٹ اوپر جن رہے تھے۔ اچانک مزدور کے پاؤں کسی وجہ سے لڑکھڑا گئے اور بوری اس کی کمر سے پھسل کر زمین اس جگہ گری جہاں پر بھو پرشاد کھڑے تھے۔ دھماکی من کی بوری نے ان کے منہ سے ہائے رام بھی نہیں نکلنے دیا۔

اوپر کا مزدور گھبراہٹ میں اسی بوری پر گرا اور اس کے اوپر بوریاں گرنے لگیں اور اس غریب کا بھی رام رام ست ہو گیا۔ ابھی تک کسی کو پتہ نہیں تھا کہ پر بھو پرشاد بھی دبے پڑے ہیں۔ سب مزدور دبے ہوئے مزدور کو دکھانے میں لگ گئے دس بارہ بوریاں اٹھانے کے بعد مزدور مردہ حالت میں مل گیا۔ پھر وہ بوری ہٹائی گئیں جس کے نیچے سیٹھ پر بھو پرشاد پڑے بھگوان یا ترا کو گئے تھے۔ مزدور مر گیا۔ بس ذرا ہائے بچا رہ گیا۔ کہا گیا۔ ”سیٹھ پر بھو پرشاد مر گئے ایک شور مچا“

کرنے کی تو کوئی وجہ ہی نہ ہوتی۔ کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔ قلعہ والا گودام پر بھو پرشاد کے دیہانت ہونے کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ مگر آخری رسوم کے بعد اس میں پھر مال آنے لگا۔ ایک دن زیادہ گاڑیاں آگئیں اور مال لگاتے لگتے رات ہو گئی۔

اسی جگہ مال لگایا جا رہا تھا جہاں سیٹھ پوری سے دب کر مرا تھا۔ اندر ہوا ہو گیا تھا۔ ایک گیس کی جتنی جل رہی تھی مگر اتنے بڑے گودام میں ایک گیس کی جتنی کیا کام کرتی۔ اس کو دروازے پر لٹکا دیا تھا۔ ایک مزدور پوری لے کر اوپر چڑھا تو اس کے کان میں آواز آئی۔

”ذرا دیکھ کر ٹھوکی بجائے رکھو پھر مت گرا دے میرے اوپر.....“ مزدور نے اوپر سے ہی جھانک کے نیچے دیکھا اور فوراً پہچان لیا پھر بھوکڑا تھا۔ وہ اوپر سے گرتا پڑتا نیچے دوڑا اور دروازے سے باہر بھاگتا چلا گیا۔ سب حیران رہ گئے اور دنوں نے پوچھا ارے کا ہوا تو وہ کیا بتلاتا اس کو تو ہانپی چڑھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ سیٹھ پر بھو پرشاد کھڑے تھے کوئی نہ مانا مگر وہ یہ کہتا ہی رہا اور پھر کئی دفعہ سیٹھ گودام میں نظر آتا رہا۔ سارے مزدور ڈر کر بھاگ گئے۔ قلعہ کا گودام بدنام ہو گیا۔ وہاں مال اتارنے چڑھانے کوئی مزدور نہ جاتا۔ سارا مال نکال لیا گیا۔ پھر رام پرشاد نے سوچا کیوں نہ اس کو بچ دے بے کار پڑے۔ مگر کوئی خریدار نہ ملا۔ رات کے وقت اکثر لوگوں نے سیٹھ پر بھو پرشاد کو گودام کے اندر اور باہر دیکھا۔ ایک تو یہ جگہ آبادی سے دور ہی تھی۔ اس پر یہ مشہور ہو گیا کہ سیٹھ کی آتر یہاں رہتی ہے۔ لوگوں نے راستہ ہی چھوڑ دیا۔ وقت گزرتا رہا۔ گوتم کی بھی شادی ہو گئی اور اسی بھاگ دوڑ میں رام پرشاد بھی دو بیٹیوں کے پتائین گئے۔ مانتا جی کا دیہانت ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے الگ الگ کاروبار کر لیا۔ درمیان میں ایک گودام رہ گیا۔ وہ کوئی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں کے پاس ہی رہا۔ دونوں اس طرف نہیں جاتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی آتما سے ڈرتے تھے۔ رام پرشاد نے کئی پنڈتوں سے بات کی۔ پر بھو سیٹھ کی آتما کی شناختی کے

گیا۔ ہاں کار ہو گئی۔ دوڑ بھاگ شروع ہو گئی۔ رام پرشاد کو خبر کی گئی۔ وہ بھی آگئے۔ چھوٹا گوتم بھی آگیا۔ پورے گوالیار کو خبر ہو گئی کہ سیٹھ پر بھو پرشاد پر لوک سدھار گئے۔ لاش گھر آگئی اور آتم سنسکار کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس غریب مزدور کو کسی نے نہیں یاد کیا جو سیٹھ کے ساتھ ہی مر گیا تھا اور پھر رام پرشاد نے جتنا کنارے شمشان گھاٹ پر باپ کی چتا کو آگنی دیوتا کے حوالے کر دیا۔ چند روز گزرے کہ کاروبار زندگی پھر چل نکلا۔ اب پر بھو کی جگہ رام پرشاد آگئے۔ اس کے طریقہ میں اور پر بھو کے طریقے میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن دین بھی اسی طرح چل رہا تھا۔ گوتم ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا اور طریقہ وادرات بھی سیکھ رہا تھا۔ رام پرشاد مگر میں کم ہی نکلتا تھا اور جب تک نکلتا تھا وہ خود کو بے چین پاتا تھا۔ آخر کون ہو گا جو پانی کی گھوڑی کے ساتھ خوش ہو گا۔ یہ بات اس کی ماں جانتی تھی بھائی بھی جانتا تھا۔ مگر اس کو تو ایسا کیل دیا گیا تھا کہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بھوجی کہا کرتا تھا۔ ایک دن بھوجی نے کہا۔ ”ارے کا اپنے باپ کی چتا جلانے کے بیٹھے ہو آخری رسوم نہ کرو گے۔“

”کروں گا بھوجی ذرا فرصت تو ملے۔“ وہ بولا۔
”ارے تو تم نے کا کرنا ہے۔ تم حکم کرو۔“ ششی کو کہہ دو اور ہاں ذرا بھی کی نہ رہ جائے۔ بارہ منڈی کا معاملہ ہے۔ دوڑاؤ سب کے خبر کرنے کو دن تاریخ پنڈت کو بلائے کے مہورت نکلاؤ۔ اصلی گھس کے مال پونے نواؤ۔ تیرے پتا کا نام نہ ڈوبے، کی مت کر یو برادری میں تھو تھو نہ ہوئے اب یہ تیری عزت کا معاملہ آپڑا ہے۔ تیرے باپ پو تو رہے نہیں۔ میری بات کی گانٹھ باندھ لے اور رام کا نام لے کر آج سے ہی تیاری شروع کر دے۔“

بھوجی کا حکم تھا۔ رام پرشاد نے تیاری شروع کر دی۔ گھی کے کنستر آنے لگے۔ پکانے والوں کو بیانہ دے دیا اور پورے بارہ گاؤں کے برادری والوں کو دعوت دے دی گئی اور بڑے دھوم سے مال پونے بنوائے گئے اور برادری اور شہر میں ایک بار پھر پر بھو پرشاد کا نام روشن ہو گیا۔
پر بھو پرشاد کی کہانی یہاں پر ختم ہو جاتی تو پھر بیان

لئے اس کو پر لوک جانے پر مجبور کرنے کو کہا جائے مگر رام پرشاد کا کام نہیں ہوا۔ پھر پنڈت نے اس کو کہا۔

”اس کا پر لوک جانا مشکل ہے کیونکہ سیٹھ کی موت اچانک ہوئی ہے اور اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ایسے لوگوں کی آتماں دنیا میں منڈلاتی رہتی ہیں۔“ رام پرشاد کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان پیکروں میں پڑا رہتا۔ گوتم تو اس کو دام کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے باپ کے طریقہ پر کاروبار نہیں کیا تھا۔ اس نے پورے دیش میں اپنا کاروبار پھیلایا تھا۔ وہ بھٹی کی چیزیں یوپی میں اور یوپی کی کسی اور صوبے میں پہنچاتا تھا۔ ہر جگہ اس کے کارندے تھے۔ دفتر تھے گودام تھے۔ اس کا دلی میں ایک بہت بڑا دفتر تھا اور وہ وہیں زیادہ تر رہتا بھی تھا۔ اس کی بیوی ایک بڑی لکھی عورت تھی۔ اس نے گوتم کو اس طرح کاروبار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ تھا تو بنیا مگر روایتی بنیاد گیری اس میں نہیں تھی۔ اچھا کھاتا تھا۔ اچھا پیتا تھا اور اچھے گھر میں رہتا تھا۔ گوالیار وہ بھی کچھار بھائی کے پاس چلا جاتا تھا اور دوکان سے واپس آ جاتا تھا۔ رام پرشاد کے گھر نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بھائی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دلی میں ہی اس کی بیوی کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اچھا تندرست چھ ماہ تک وہ ٹھیک رہا اور پھر بیمار ہو گیا۔ وہ کھاتا پیتا آدمی تھا ہر طرح اس کا علاج کرایا مگر بچہ دن بدن کمزور ہی ہوتا گیا۔

اور پھر ایک دن وہ میرے مطب میں اس کو لے کر آ گیا۔ میں نے کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ بچہ تندرست پیدا ہوا تھا۔ چھ ماہ بعد بیمار ہوا ہے۔ ہر طرح کے ڈاکٹروں نے علاج کیا ہے۔ ٹھیک ہوتا ہے پھر بیمار ہو جاتا ہے تو میں نے آپ کا نام سنا تھا اس لئے آ گیا۔ میں نے اور رولوکا نے بچے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ میں نے اس کے جگر میں خرابی کا ذکر رولوکا سے کیا تو اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور پھر رولوکا ایک نایاب بوٹی لے آیا اور میں نے علاج شروع کر دیا۔ ایک ماہ کے علاج کے بعد بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ گوتم اس کی بیوی بڑی شکر گزار ہوئی اور کچھ دینا چاہا تو میں نے کہا۔ ”دیکھئے ہم جو فیس ایک عام آدمی سے لیتے ہیں.....

وہی لیں گے۔ یہ دواخانہ دولت جمع کرنے کو نہیں کھولا گیا۔ یہ خدمت کرنے کو کھولا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو ہماری خدمت کی ضرورت ہو تو ہم کریں گے۔“ اور آپ کس قسم کی خدمت کرتے ہیں.....؟“ گوتم نے پوچھا۔

میں نے رولوکا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ میرے دوست حکیم کامل روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔“ روحانی علاج پر وہ ذرا چونکا اور بولا۔ ”روحانی سے کیا مراد ہے؟“

رولوکا نے جواب دیا۔ ”آپ کا دھرم ہندو ہے اس لئے اسی انداز میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہندوؤں کے قدیم کویدوں میں لکھا ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر جنم لیتا ہے اگر کوئی انسان اپنی باتوں کی حکم عدولی کرتا ہے تو اس کا جنم حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑوں میں ہوتا ہے۔“

گوتم رولوکا کی بات سن کر بولا۔ ”میں نے بھی یہ کہیں پڑھا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرنے کے بعد ساری آتماںیں واپس جاتی ہیں جہاں سے آئی ہیں۔“

”ہاں سب کو واپس جانا ہوتا ہے۔ کچھ فوراً چلی جاتی ہیں اور کچھ دیر میں۔“ رولوکا نے بتایا۔

”دیر سے کیوں جاتی ہیں؟“ گوتم نے پوچھا۔

”دنیا کی چاہت دولت کی چاہت ادھوری خواہشات اس کے جانے میں رکاوٹ بنتی ہیں مگر پھر بھی جانا پڑتا ہے کیونکہ ان کا جنم پھر ہونا ہے خواہ کسی شکل میں ہو، میں جو بات کر رہا ہوں وہ تمہارے عقیدے اور دھرم سے کر رہا ہوں۔ میں اس کو ماننا ہوں کہ نہیں یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ہمارے پاس بار بار جنم لینے کا قلفہ نہیں ہے۔“ رولوکا نے بتایا۔

”میرے خاندان کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو آپ کو بتاؤں۔“ گوتم نے کہا۔

”ضرور بتاؤ..... اگر ہم کچھ کر سکتے تو ضرور کریں گے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میرے چا کی موت اچانک ایک حادثے میں

پہننا تھا، اس کو دھوتا تک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس کی آتما کی خواہشات تو ادھوری ہی رہیں اور وہ اسی لئے زمین سے بڑی ہوئی ہے۔ ”رولو کا بولا۔

”اب تم کیا پروگرام رکھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”پر بھوک آتما سے ملاقات کرنا ہوگی۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کسی زندہ آدمی سے ملاقات کرنے چاہے ہو۔“ میں نے کہا۔
”بے شک یہ ایک حیرت کی بات ہے۔ آپ کے لئے بھی اور عام آدمی کے لئے بھی اور یہ بھی نہیں کہ ان معاملات کو سمجھنے اور حل کرنے کو فوق البشر ہونا ضروری ہے۔ رب کائنات نے انسان کو اشیائے طاقت اور ہمت دی ہے کہ وہ اپنے طور پر یہ سب کر سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ذاتی لالچ یا فائدہ اس میں نہ ہو۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”اچھا ایک بات کا جواب دو۔ یہ سوال بہت دنوں سے میرے ذہن میں تھا۔ کیا تمہارا علم معمولی احاطہ انسانی سے بالاتر ہے یا تمہارے پاس کوئی افریقین جادو ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”تم نے بہت دیر کی اس سوال کے کرنے میں۔ یہ سوال تو تم کو بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ اس سے مجھے آپ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اب جواب یہ ہے کہ احاطہ انسانی کی حدود کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ انسان آسمانوں میں سیر کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میل کا سفر کھوں میں کرتا ہے۔ اب رہا جادو تو جس کو لوگ یہاں کا جادو کہتے ہیں، ہم اس کو علم کہتے ہیں۔ اس علم سے انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ظلم ختم کرتے ہیں۔ حق دار کو حق دلاتے ہیں۔ اپنی ذاتی ضرورت کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ یہی شرط ہے۔ جس دن میں اپنی خواہش پوری کرنے کو اپنا علم استعمال کروں گا، اس دن میرا آخری دن ہوگا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”بہت اچھا جواب تم نے دیا۔ یہ بتاؤ کب گوالیار جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”بس شام کو چلا جاؤں گا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

ہوئی تھی۔ جس جگہ ان کی موت ہوئی تھی اس مقام پر ان کی آتما رہتی ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اور سنا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کچھ میری مدد کریں گے۔“ گوتم نے کہا۔
”آپ یہ بتائیں کہ ان کی کوئی تمنا تھی، خواہش تھی جو پوری نہیں ہوئی۔“ رولو کا نے پوچھا۔

”وہ ایک کامیاب کاروباری آدمی تھے۔ گوالیار شہر میں ان کا کاروبار تھا۔ بہت پیسہ بھی ان کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ اولاد بھی ان کی تھی۔ میں اور میرا بڑا بھائی۔ پھر کیا خواہش تھی میں نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آتما آج بھی اسی گودام میں رہتی ہے۔ اب تو وہ ویران پڑا ہے۔ ڈر کے مارے لوگ ادھر سے گزرتے بھی نہیں۔“ گوتم نے جواب دیا۔

”آپ نے اپنے دھرم کے پندرتوں سے مشورہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔
”میں نے نہیں مگر بڑے بھائی نے مشورہ کیا تھا مگر کوئی کام نہیں بنا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی آتما کو شانتی مل جائے اور وہ پر لوک سدھار جائیں۔“
”وعدہ نہیں کو شش کریں گے۔ کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا نیا کیس سامنے آیا ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا۔“ گوتم نے کہا۔
”تو پھر آپ کو ہمارے ساتھ گوالیار چلنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ جب حکم کریں میں چلوں گا۔“ گوتم نے جواب دیا۔
”تم یہ بتاؤ پر بھوک آتما کا کیا کرو گے؟“ گوتم کے جانے کے بعد میں نے رولو کا سے پوچھا۔

”پر بھو زندگی میں بہادر کب تھا جو مرنے کے بعد اس کی آتما بہادر ہوگی۔ اس کی دولت نے اس کو نہیں جانے دیا۔ میرے خیال میں اپنی زندگی میں وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنے اوپر خرچ کرتا تو اس کی آتما آسودہ ہو جاتی۔ مگر وہ اس قدر بچوں تھا کہ صاف کپڑے تک نہیں پہننا تھا جو

کچھ بتانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔“ رام پرشاد نے جواب دیا۔
 ”رات کو میں اس گودام میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم
 دونوں بھی میرے ساتھ رہو گے۔“ میں نے کہا۔
 ”ہمارا ساتھ رہنا کیا ضروری ہے؟“ رام پرشاد نے
 پوچھا۔

”ہاں ضروری ہے، اس لئے کہ معاملہ تمہارا ہے۔ جو
 کچھ بھی ہوگا وہ تمہارے سامنے ہوگا اور تم اس کے گواہ
 ہو گے۔“ میں نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے آپ ہیں تو ہم ساتھ ہوں گے۔“ گوتم
 نے کہا۔

”یہاں پر کوئی بڑا مندر ہے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”بہت بڑا مندر ہے۔“ گوتم نے بتایا۔
 ”تو پھر آؤ میرے ساتھ پہلے ہم اس مندر میں چلتے
 ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”وہاں جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“ رام
 پرشاد نے پوچھا۔

”تم نے بے شک ساری رسوم جو تمہارے دھرم کی
 تھیں، پوری کر دی تھیں۔ مگر اب پھر دوبارہ سے اس کی
 ضرورت پڑ سکتی ہے؟ اور وہ میں نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے
 ضروری ہے کہ ایک ہوشیار پنڈت ساتھ ہو۔“ میں نے
 جواب دیا۔

اور ہم تینوں شہر کے سب سے بڑے مندر کی طرف
 چل دیے۔ یہ مندر شیوا بھگوان کا مندر تھا۔ کچھ تھوڑی سی
 وضاحت میں پڑھنے والوں کے لئے کر دیتا ہوں۔

یوں تو ہندو دھرم میں بے شمار دیوی دیوتا ہیں۔ لیکن
 برہمنوں نے محسوس کیا کہ دیوی، دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی
 کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس احساس کے نتیجے میں ہندو دھرم
 میں تین بڑے خدا مقرر کئے گئے۔ ایک نمبر پر برہما، دوسرا
 شیوا اور تیسرا ششون۔ ان تینوں کو تری مورتی یعنی تین شکلیں
 کہتے ہیں۔ ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کر دی
 گئی ہیں۔ ان تینوں کے کام اور اختیارات کی ایک الگ
 تفصیل ہے۔

اور رولو کا گوالیار روانہ ہو گیا۔ گوالیار زیادہ بڑا شہر نہیں
 ہے۔ ایک بہت بڑا کسی راجہ کا بنایا ہوا قلعہ یہاں پر موجود
 ہے۔ یہ چونکہ ہندو اسٹیٹ ہے، اس لئے آبادی بھی
 ہندوؤں کی زیادہ ہے۔ ذہنیت کے اعتبار سے جی ضروری
 کرنے والے زیادہ ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ
 اکثر ریاستی لوگوں کی ذہنیت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ
 یہ ہوتی ہے کہ ریاست کوئی بھی ہو اس میں راجہ یا نواب کی
 عملداری ہوتی ہے اور صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کے جو
 قریبی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ نواب یا راجہ کی توجہ اپنی طرف
 کرنے کو خوشامد کرتے ہیں اور اس کے نور نظر ہو جاتے ہیں
 ۔ ان نور نظر لوگوں کو بھی خوش کرنے والے مل جاتے ہیں اور
 یہ سلسلہ لمبا ہوتا جاتا ہے اور لوگوں کا یہ مزاج ہی بن
 جاتا ہے۔ یہ صرف میرا اندازہ ہے۔ کوئی کلمہ نہیں ہے۔ ایسے
 بھی ضرور ہوں گے جو اپنا الگ انداز رکھتے ہوں۔ ہر بات پر
 گردن نہیں ہلاتے ہوں گے۔ مگر بات وہ کی جاتی ہے جو
 جزل و خواص تو پھر خاص ہوتے ہیں۔

میں گوتم کے ساتھ تھا۔ رام پرشاد گوتم کا بھائی ایک
 کھانا پیتا آدمی تھا۔ گوتم نے آنے کی وجہ بھائی کو بتائی تو وہ
 بھی خوش ہوا بولا۔ ”باپو کی آتما کو شانی مل جائے اس سے
 بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔“

”مجھے تم یہ بتاؤ تم نے اپنے دھرم کے مطابق ان کا
 کیا کرم کر دیا تھا اور آخری رسومات بھی پوری کر دی تھیں؟“
 میں نے پوچھا۔

”ہاں میں نے وہی کیا تھا جو پرکھوں سے ہوتا آیا
 تھا۔“ رام پرشاد نے جواب دیا۔

”تمہارے پتا پر کوئی قرض تھا۔“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں کوئی قرض نہیں تھا۔ کاروباری لینا دینا سب
 کھاتوں میں موجود تھا۔ ان پر جو لکھا تھا اس پر میں نے عمل
 کیا تھا۔“ رام پرشاد نے جواب دیا۔

”کوئی ایسی رقم جس کا ذکر کھاتوں میں نہیں ہوا اور
 پرچھو سیٹھ نے کسی کو دی ہو۔“ میں نے پوچھا۔
 ”اس کے بارے میں مجھے پتہ نہیں ہے کیونکہ ان کو

میں کھڑکی کی راہ سے نکل آیا اور مندر کی طرف چلا۔ سڑک
سنسان بڑی تھی۔ ایک دو تانگے البتہ نظر آئے۔ مگر میں
چونکہ روپوشی کی حالت میں تھا۔ اس لئے وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔

مندر میں پجاری کی رہائش کے لئے ایک مکان
بنا ہوا تھا اور پجاری اپنی دھرم بتی کے ساتھ اپنے کمرے میں
سورہا تھا۔ میں سیدھا اندر چلا گیا اور جاتے ہی اس کی ٹانگیں
پکڑ کر گھسینا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ یہ جگہ شیو بھگوان کی
مورتی کے عین سامنے تھی۔ مندر میں اندھیرا تھا۔ پجاری
جاگ گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔
گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ اس کے قریب
کوئی نہیں تھا اور اس کو گھسینا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ کھڑا
ہوا اور بولا۔ ”ارے کون ہے سامنے تو آکا بات ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میں پرہو پرشاد..... تو نہیں آیا تو میں
چلا آیا۔“

”وغلی ہو گئی سیٹھ جی سر کے بل آؤں گا۔“ وہ ہڑبڑا
کر بولا۔

”اور اگر نہ آیا تو جتنا میں ڈبو کر تیرا کلیان کر دوں گا۔“
میں نے کہا۔

”ضرور آؤں گا، شریمان جی مجھے معاف کر دو۔“
وہ بولا۔

”ٹھیک ہے، کل رام پرشاد کے پاس چلے جانا۔“
میں نے کہا۔

”ضرور چلا جاؤں گا۔“ وہ پھر بولا اور میں اس کو چھوڑ
کر واپس آ گیا۔ ہم ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ پجاری
آ گیا۔ گوتم نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ
کی بات ٹھیک تھی۔“

میں نے کہا۔ ”اس کو اندر بلا لو۔“ اور پجاری اندر
آ گیا تو میں نے کہا۔ ”تم نے دیکھا۔ پجاری تمہارا شیو
بھگوان سامنے تھا اور آتما نے تمہاری کیا درگت بنائی۔ کیسی
زبردست آتما ہے، سیٹھ پرہو پرشاد کی۔ میں تاکہتا تھا مگر
تمہارے دماغ پر چہی چڑھ گئی ہے۔ ہر کسی سے ایک سا
سلوک نہیں کیا جاتا۔ تم انسانوں کی پرکھ بھول گئے ہو۔ کہو تو

تو یہ شیو بھگوان کا مندر تھا۔ جتنا بڑا مندر تھا اس کا اتنا
ہی بڑا پجاری بھی تھا۔ اس کے اتنے ہی بڑے نخرے بھی
تھے۔ اس نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور جانے سے
انکار کر دیا۔ اکڑ کر بولا۔

”ہم کا اسی کام کر رہے ہیں۔ ہم شیو بھگوان کے
بھگت ہیں۔ کوئی ایلے میلے نہیں ہیں۔ جاؤ جاؤ کسی اور مندر
میں جاؤ۔“

اس کی بات سن کر دونوں بھائیوں نے میری طرف
دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، اب کیا کریں۔ پنڈت جانے لگا
تو میں نے اس کو روک لیا اور کہا۔ ”پجاری جی دھرم کے کام
کرنا تو پین ہے اور تم پین کے کام کرنے سے جی چار ہے ہو
اور خود شیو بھگوان کا بھگت بھی کہتے ہو۔“

”ارے اور بہت ہیں پین کے کام۔ کاہے آتماؤں
سے ملنا ہی رہ گیا ہے۔ ہم نہیں جانیں گے کہہ جودیا ہے۔“ وہ
پھر جانے لگا میں نے پھر روک لیا اور کہا۔

”میری ایک بات غور سے سن لو پجاری۔ اگر نہیں
جاؤ گے تو سیٹھ پرہو پرشاد سورگباشی کی آتما جو گودام میں اب
بھی موجود ہے یہاں مندر میں آجائے گی اور تم سے پوچھے
گی۔ پھر بتاؤ کیا کرو گے؟“ میں نے کہا۔

”آگئی آتما رہے کیا چلتے چلاتے ہو۔ یہ شیو کا مندر
ہے کوئی دھرم ٹالہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”اچھا تو پھر جاؤ، آج رات کو وہ آتما تم سے پوچھے
گی، جواب دے دینا۔“

اور میں نے گوتم اور رام پرشاد کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔
پجاری حیرت سے کھڑا دیکھتا رہا اور ہم مندر سے باہر آ گئے۔
باہر آتے ہی گوتم نے حیرت سے کہا۔ ”یہ آپ نے پجاری کو کیا
کہہ دیا۔ باپو کی آتما پجاری کے پاس کیوں جائے گی؟“

”جائے گی اور کل یہ پجاری خود چل کر ہمارے پاس
آئے گا۔“ میں نے کہا۔ گوتم اور رام پرشاد کی سمجھ میں بات
نہیں آئی مگر خاموش ہو گئے۔

رات کھانا وغیرہ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے
میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ لاک کر لیا۔ ٹھیک بارہ بجے

ابھی اسی جگہ پر بھوسٹھ کی آتما کو بلا لوں۔“

میں نے ذرا غصے سے کہا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔
”بھول ہو گئی مہاراج، معاف کر دو، حکم کرو۔“

”پر بھو پر شاد کی آخری رسوم کی تیاری کرو۔ آج رات آخری رسوم ادا کرنی ہیں۔ تم اپنا کام کرو، غلطی مت کرنا نہیں تو آتما تم کو الٹا لٹکا دے گی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں مہاراج..... بار بار غلطی نہیں ہوتی۔ کچھ سامان کی ضرورت ہوگی۔“ وہ بولا۔

”تم بتاؤ سب سامان آجائے گا۔“ رام پر شاد نے کہا۔

پنڈت نے کہا۔ ”گیندے کے پھول، موسسری کے پھولوں کے دو بار اور ہرل کے دانے کچھ لو بان بڑھیا والا بس یہی چیزیں منگوادیں۔“ پنڈت نے کہا۔
”کام پورا کرنا نہیں تو آتما ناراض ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”سو بھاگے ہیں میرے کہ میں یہ کام کروں گا۔“ وہ بولا۔

”خوشی سے کرتا تو اور زیادہ سو بھاگ ہوتے۔“ میں نے کہا۔ پنڈت خاموش ہو گیا۔

رات کو ٹھیک دس بجے ہم چاروں گودام کی طرف جا رہے تھے۔ چاروں میں دونوں بھائی گوتم اور رام پر شاد، پنڈت اپنی پوٹلی کے ساتھ اور میں، ہم لوگ پیدل ہی گودام کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ پورا سسنان تھا۔ گودام کی چابی رام پر شاد کے پاس تھی۔ اس نے جاتے ہی تالا کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کئی چگاڑیں بھر مار کر باہر اڑ گئیں۔ گوتم اور رام پر شاد ہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ گودام بہت دنوں سے بند تھا۔ اس میں ٹھن اور بد بو تھی۔ چہ ہے بھی منر گشت کر رہے تھے۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ ہمارے پاس بھی کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر روشنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈت کو کہا۔ ”تم اپنا کام شروع کر دو۔“

پنڈت کے پاس اگر بتیاں تھیں۔ اس نے پیکٹ سے کہا۔

نکال کر سب میں آگ دکھادی۔ تھوڑی سی روشنی ہوئی۔ میں اس روشنی میں اور اندر چلا گیا اور روپوش ہو گیا۔

”پر بھو پر شاد تم کو پر لوک جانا ہے۔ اب دنیا میں تمہارا کام نہیں ہے۔ اگر رہو گے تو اسی آتما کی شکل میں آوارہ پھرتے رہو گے۔ پر لوک چلے جاؤ۔ پھر سے تم دنیا میں آؤ جاؤ گے۔“

آتما بولی۔ ”میری رقم ماری جائے گی۔“
”کتنی رقم ہے اور کس پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دوار کا تھ لے کر گیا تھا اور اسی دن میرا شیر ختم ہو گیا۔“ آتما کی آواز آئی۔

”دوار کا تھ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”دوار کا تھ جلتا پورا کا ایک سیٹھ ہے۔ اس کی طرف رقم ہے۔ دس ہزار روپے۔“ آواز آئی۔

”وہ رقم تمہارا میٹرا رام پر شاد وصول کر لے گا۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر میں پر لوک جانے کو تیار ہوں۔“ آواز آئی۔
پنڈت اشلوک پڑھ رہا تھا اور پھر کچھ دیر میں پنڈت نے اعلان کیا کہ آتما چلی گئی ہے۔ میں نے ہر طرف گھوم پھر کے تسلی کر لی اور بتایا کہ وہ نہیں ہے۔

”تم سیتا پور کے دوار کا تھ سیٹھ سے دس ہزار کی رقم وصول کر لیتا۔“ میں نے کہا۔

پنڈت نے گیندے کے پھول اور موسسری کے پھول زمین پر بکھیر دیے۔ لو بان کی جگہ پھر ایک پاکٹ اگر بتیاں جلا دیں۔ ہرل کے دانے سارے گودام میں پھیلا دیئے اور پھر بولا۔ ”اور حکم کیا ہے وہ بھی کر دوں گا۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”بس اتنے کام سے تھک گئے۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے تو آتما کو بلانے کو کچھ کیا ہی نہیں اور آتما آگئی اور تم سے مان بھی گئی۔ یہ بات اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کیسے ہو گئی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے۔“ پنڈت نے حیرت سے کہا۔

گاڑیاں دھوتے تھے۔ ابھی تک بے فکری کی زندگی گزار رہی تھی۔ ہاتھ پیر کے اچھے تھے۔ عمر بے زیادہ لگتے تھے۔ جو کما تے کھا جاتے۔ سونے کی نگر ندر بننے کی، کسی بھی گاڑی میں سو جاتے اور صبح پھر وہیں سے کام شروع کر دیتے۔ کام میں پھرتی اور زبان باز رہتی تھی۔ اچھے برے سب سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ سڑک کے کالج کے اسٹوڈنٹ تھے جو کچھ اس کالج میں پڑھایا جاتا ہے۔ وہ اچھے نمروں میں پاس کر رہے تھے۔ مارکنائی، گام گلوچ کے درجے پاس کر چکے تھے۔ تعلیم کے بعد عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر یہ سڑک چھاپ کالج دنیا کا واحد کالج ہوتا ہے۔ جہاں پر تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں ملتی ہے اور جو زیادہ تر ترقی کرتا ہے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے دو چار سال جیل کالج میں پڑھتا ہے۔ یہاں پر نہایت اعلیٰ درجے کے استاد کے تجربوں سے وہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ کلومیان نے بھی پندرہ سال کی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا، پڑھ لیا اور پھر ایک ڈرائیور کوڑی کرنے کے الزام میں دو سال کا ڈپلومہ کرنے جیل کالج میں داخلہ ہوا۔ یہاں پر اس کو استاد کوئی سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ استاد کوئی جوئے کے اڈے اور شراب کے کاروبار کے ماہر تھے۔ اتفاق سے دونوں کی رہائی بھی ایک ساتھ ہی ہو گئی اور کلومیان لاری اڈے جانے کے بجائے کوئی استاد کے اڈے پر آ گئے۔ مارکنائی گام گلوچ کے تو وہ ماہر تھے۔ ان کا یہاں پر بھی یہی کام تھا کہ دن بھر مہتری سے نئی کالیاں ایجاد کریں اور عام کریں۔

دو سال تک وہ کوئی استاد کے فرسٹ اسٹنٹ بنے رہے اور پھر ترقی کر کے جھہ دار بن گئے۔ ان کا رتبہ بڑھ گیا۔ کوئی استاد کے بعد وہی مالک تھے۔ وہ دن بھر شراب بنوانے اور بکوانے میں لگے رہتے۔ رات بھر اڈے پر جواہر ہوتا رہتا۔ مگر نہ کبھی کلومیان نے شراب پی اور نہ تاش کھلا۔ بات تھی تو حیرت کی۔ کسی نے پوچھا۔ ”جھوٹے استاد جھوٹے تو شغل کر لیا کرو۔ بالکل ہی سنیاسی بنے ہوئے ہو۔“ تو جواب ملا۔

”اے بھوتی کے شراب بنانا اور پیچنا ہمارا دھندہ

”تمہاری سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ اس لئے کہ تم نے اپنا زیادہ وقت کھانے میں اور عیش میں گزارا ہے۔ اگر تم کچھ محنت کرتے اور علم حاصل کرتے تو یہ سوال نہ کرتے۔“ میں نے کہا۔

پنڈت کھانا ہو کر خاموش ہو گیا اور ہم واپس آ گئے اور کہانی ختم ہو گئی۔ میں نے واپسی کی اجازت لی اور چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

نام تو اس کا کلومیان تھا مگر سب کو ہی کہتے تھے۔ باپ کا انتقال پیدائش سے پہلے ہو گیا تھا اور اماں کا پیدائش کے وقت ہو گیا نہ کوئی بھائی بھانہ بہن۔ پیدا ہوتے ہی اماں کو مارا دیا اور پہلے باپ پر ہاتھ صاف کر دیا۔ پیدا ہوا تو لگتا تھا جیسے پتھر کے کولے کا ڈھیلا ہو۔ والی بھی دیکھ کر چونک گئی۔ اب نام کیا رکھنا تھا۔ پیدا ہوتے ہی کلومیان مشہور ہو گئے۔ والی عورت خدا ترس تھی۔ اس نے دیکھا کہ باپ پہلے مر گیا اور ماں کو یہ جنم چلا پیدا ہوتے ہی ڈکار گیا تو منہوں ہونا تو ثابت ہو گیا۔ مگر ہے تو بچی ہی کوئی اس پر ہاتھ دھرنے پر راضی نہیں تو وہ بلا والی کیرن کے سر آ گئی۔ وہ تھی بھی بے اولاد۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے لگا تھا۔ اگر منہوں سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مرجاؤں گی تو کیا ہوا۔ کوئی پہلے کوئی بعد میں مرنا تو ہے۔ تو کلومیان کو والی کیرن لے گئی اور جب کلومیان گیارہ سال کے ہوئے اس وقت والی کیرن بھی مر گئی۔

اب کہاں جائیں۔ اب تو خود ہی کمانا ہے اور پیٹ پانا ہے۔ انسان کا پیٹ بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ کلومیان بھی کمانے کو چل دیئے۔

مراد آباد ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں پر گھر گھر نقشین برتن بنائے جاتے ہیں اور پھر ان کو بڑے بیوپاری خرید کر دوسرے شہروں کو روانہ کر دیتے ہیں۔ یہاں کا لاری اڈہ بہت بڑا ہے۔ یہاں سے سامان بھی دوسرے شہروں کو لوڈ کیا جاتا ہے۔ مسافروں کا بھی ہجوم ہوتا ہے۔ لمبے سفر سے آنے والی لاریاں خالی ہونے کے بعد ایک طرف کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ان کی مرمت اور صفائی وغیرہ ہوتی ہے۔ پانی سے دھویا جاتا ہے۔ کلومیان بھی ان لڑکوں میں شامل ہو گئے جو

ہے۔ جتنی چاہیں پلیس مگر تم نے کبھی حلوائی کو مٹھائی کھاتے دیکھا ہے اور راجا تو وہ ہم کمانے کو چلاتے ہیں۔ خود کھیلے گئے تو ہاریں گے بھی۔ اب بے جب کمائی ہو رہی ہو تو ضرورت کیا ہے کہ خود بھی کھیلے، بولتاؤ۔“

کولی استاد ایک مقابلے میں مارے گئے۔ ان کے ساتھ کلومیان بھی تھے۔ اگر وہ ذرا زور باندھتے تو شاید کولی استاد نہ مارے جاتے مگر کلومیان زور کیوں باندھتے۔ ان کو تو پورا اذ نظر آ رہا تھا۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ کولی استاد کیسے مارے گئے۔ اب سارا کاروبار کلومیان کے پاس تھا۔

اس کاروبار کو چلانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کا رابطہ علاقے قے پولیس اور اسٹی آفسران سے ہو۔ اس کے لئے کلو میان نے تھوڑا تھوڑا کر کے خود کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کی حد تک تو ان کی تعلیمی زبان چل سکتی تھی۔ مگر اس سے اوپر کے لئے کچھ اور بھی تعلیم کی ضرورت تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے اندر تبدیلی لانا شروع کر دی اور مزید دو سال گزر گئے۔ اب کلو میان اڈے والوں کے لئے صرف میاں جی ہو گئے اور سرکاری لوگوں کے لئے سنے خان بنی گئے۔ روپیہ انسان کا نام پیدا کرتا ہے۔ کبھی کوئی ہاتھ گونو بن جاتا ہے اور کبھی گونو کوئی ہاتھ۔ انسانی معاشرے میں روپے کی بڑی اہمیت ہے۔ کلو میان کی تبدیلی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔ ذات برادری کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر جیب میں رقم ہے تو برادری والے بڑے فخر سے کہتے ہیں۔ یہ اپنا ہی بچہ ہے اور اگر کنگال ہے تو کہتے ہیں ہم کیا جائیں ہوگا کوئی۔

کلو میان نے اپنا ٹھکانا بدل لیا۔ نام بدل لیا مگر اندرونی طور پر کام وہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب ذرا قاعدے قرینے سے اور بڑے پیمانے پر ان کے کارندے یہ کام کرتے تھے اور وہ صرف ان کی رکھوالی کرتے تھے۔ ان کو ان کی محنت کے مطابق رقم ادا کرتے تھے۔ شہر کے سب ہی اعلیٰ افسران ان کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ ان سب کو خوش رکھنے کا گر جانتے تھے۔ اڈے اب بھی چل رہے تھے مگر ان کا نام کہیں نہیں تھا۔ مگر بڑی ایمانداری سے رقم بینک میں پہنچ

جاتی تھی۔ ذرا سی بے ایمانی کی سزا کتنی بڑی ہوگی۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ سنے خان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ جو کوئی نہ کر سکے، وہ سنے خان صاحب کر دیا کرتے تھے۔ مراد آباد کے سب بڑے کارخانے دار خان صاحب کو جانتے تھے اور خان صاحب کا کہا پتھر کی لکیر ہوا کرتا تھا۔ معاملہ سرکاری ہوا غیر سرکاری، سب جگہ خان کا کہا چلتا تھا۔

خان کا بینک بینکس بوھتا جا رہا تھا۔ جب انسان پر دولت کا بوجھ بڑھ جاتا ہے تو دماغ نئی نئی راہیں دکھاتا ہے۔ مراد آباد خان کو اپنی حیثیت چھوٹا نظر آنے لگا تھا۔

اب اس نے میرٹھ میں پاؤں پھیلا دیئے اور چند روز میں ہی وہاں کے سرکاری اہلکار اس کی منشی میں آ گئے۔ قانونی کم اور غیر قانونی زیادہ کام اس نے ان سے کروائے اور سب کو اپنا دوست بنالیا۔ وہ دینے میں کمی بخنوی نہیں کرتا تھا اور پھر اسی طرح ایک کے دو وصول بھی کر لیا کرتا تھا۔

دولت نے اس کی عقل کے درپچوں کو پوری طرح کھول دیا تھا۔ اپنے کارندوں پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ شہر کا بڑے سے بڑا غنڈا اس کے سامنے آ کر گردن جھکا کر بات کرتا تھا۔ کوئی بھی غیر قانونی کام اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ بات قتل کی ہو یا ڈاکے کی، کسی کی مجال نہ تھی کہ خان صاحب کو بتائے بغیر گزرے۔ سب ہی جانتے تھے کہ خان صاحب کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ پولیس سے بچ جائیں تو بھی سنے خان سے بچنا مشکل ہے۔ اس لئے پہلے آشیر باد پھر واردات۔ یہی فارمولا میرٹھ اور مراد آباد میں چل رہا تھا اور اب دلی میں بھی آ گیا تھا۔ دلی میرٹھ اور مراد آباد نہیں تھا۔ یہاں پر بڑے بڑے سر پھرے پڑے تھے۔ خان سے مقابلے ہوئے، کبھی خان کے آدمی بھاگ گئے، کبھی دلی کے دلیر دوڑ گئے۔ مگر اب تک مراد آباد اور میرٹھ والی بات خان کی نہیں تھی۔

یہاں پر اس نے دوسرا کارڈ ڈھکیلا۔ لڑائی جھگڑوں سے وہ چیز حاصل نہیں کر سکا اور نہ سرکاری اہلکاروں سے میرٹھ اور مراد آباد جیسے تعلقات پیدا ہو سکے۔ اس کا دوسرا کارڈ نوٹ تھا۔ ہر کاروبار کرنے کے لئے پہلے لگانا پڑتا ہے اور فوراً ہی کمائی

رہے ہیں۔ ہمارا مال پڑا رہ جاتا ہے اور ان کا فروخت ہو جاتا ہے۔“ نہال چند نے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو۔ ان کا مال کوئی نہ خریدے یا وہ مال ہی نہ بنائیں۔“ خان نے پوچھا۔

”میرے خیال میں تو دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں۔“ نہال چند نے کہا۔

”تم صرف اپنا مقصد بتاؤ، کام کرنا میرا کام ہے۔“ خان نے کہا۔

”اگر پنجاب سے مال آتا بند ہو جائے تو لازمی ہمارا ہی مال مارکیٹ میں ہوگا۔ وہی کہے گا۔“ نہال نے جواب دیا۔

”اگر بننا بند ہو گیا تو مال نہیں آئے گا۔ اگر صرف آنے سے روکا گیا تو کبھی نہ کبھی آجائے گا۔ کام وہ کرنا چاہئے کہ ہمیشہ کے لئے ہو۔“ خان نے کہا۔

”یہ کس طرح ہوگا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ نہال چند نے کہا۔

”یہ کام میرے کرنے کا ہے۔ میں کیسے کروں گا۔ اس کو تم چھوڑو۔ بات کرو، کاروباری۔“ خان نے کہا۔

”خان صاحب، صاف بات کرو، میں سمجھا نہیں۔“ نہال نے پوچھا۔

”پنجاب کی ساری فیکٹریاں مال نہ بنائیں، تم یہی چاہتے ہو۔“ خان نے پوچھا۔

”ارے بھائی وہاں پر صرف دو ہی فیکٹریاں ہیں۔“ نہال نے کہا۔

”دونوں بند کرادی جائیں تو ٹھیک رہے گا۔“ خان نے پوچھا۔

”ٹھیک کیا بہت ٹھیک ہوگا۔“ نہال نے جواب دیا۔

”تم جتنا مال فروخت کرو گے اس کے منافع میں چونی میرا حصہ ہوگا۔“ خان نے کہا۔

”کیا کہا؟ چونی بہت زیادہ ہے۔“ نہال نے کہا۔

”تو پھر گھانا اٹھاتے رہو یا فیکٹری بند کر دو۔ دونوں طرح تمہارا ہی نقصان ہے۔“ خان نے کہا۔

”کچھ کم کرو، پھر بات کرتے ہیں۔“ نہال نے

نہیں ہوتی۔ صبر کرنا پڑتا ہے۔ کتنا عرصہ صبر کرنا پڑے گا۔ یہ تو حالات پر منحصر ہے۔ اس کے بعد کمانے کا وقت آتا ہے۔

دلی شہر میں قدم جمائے کو اس نے یہ کاروبار کرنا تھا۔ اس نے شرافت کا لباس پہن لیا۔ اچھے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا اور ایک بہت بڑی دوکان دلی کے چاندنی چوک میں کھول لی۔ یہ ایک دکھاوے کا کاروبار تھا۔ اس کا اصل کاروبار اب بھی میرٹھ اور مراد آباد میں چل رہا تھا مگر دلی میں اس نے جو نقاب اوڑھنا تھا اس کے لئے یہ دکھاوہ ضروری تھا۔

وہ دلی کے شرفاء میں شامل ہو گیا۔ اس کے پاس مراد آباد اور میرٹھ کا کوئی کارندہ نہیں آ سکتا تھا۔ وہ خود ان سے ملتا تھا۔ دلی میں اس نے خود کو تنک نام بنانا شروع کر دیا تھا۔

فلائی اور رہائی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ چندہ کی مسجد کا یہاں مندر کا وہ دل کھول کر دیا کرتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ دوکان سچاتا گیا۔ رقم لگاتا گیا اور پھر لوگوں نے مان لیا کہ خان صاحب بے لوث خدمت گزار ہے۔ بغیر کسی لاچ کے سب کی خدمت کرتا ہے۔ وہ اپنے چہرے پر یہی چہرہ بچانا چاہتا تھا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ دوکان میں جو خرچ کیا وہ سود و سود کے ساتھ وصول کرے۔ زندگی کے ہر شعبے میں دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی سب سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔

کاروباری لوگ بھی ایک دوسرے سے رقابت رکھتے ہیں۔ سیٹھ نہال چند نے بہت پہلے ایک فیکٹری فرید آباد میں ڈالی تھی۔ یہاں پر وہ سائیکل کے پرزے بناتے تھے۔ مگر اس فیکٹری نے کبھی کمائی نہیں دیا۔ ہر سال ان کو کچھ نہ کچھ نقصان ہی ہوا کرتا تھا۔ ایک شادی میں سیٹھ نہال چند کی ملاقات خان سے ہوئی، بات چٹری۔

”میں تو فیکٹری بند کر دوں گا۔ ارے میاں ہر سال گھانا ہی ہو رہا ہے۔“

”ہوں! گھانا ہو رہا ہے۔ کچھ پتہ تو چلے۔“ منے خان بولے۔

”بات یہ ہے کہ ہماری کاسٹ روف پر ڈکشن زیادہ ہے۔ پنجاب والے کم دام میں مال مارکیٹ میں بیچ

☆ (133) ☆

جواب دیا۔

چھوڑتا تھا۔ مگر وہ خود پردے میں رہتا تھا۔ دلی کا ہر بڑا آدمی اور بڑا سرکاری آفیسر اس کو جانتا تھا۔ مگر اس کی اصلیت سے کوئی واقف نہ تھا۔ سب ہی اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ایک خدا ترس اور نیک نام آدمی مشہور تھا۔

میں نے بھی خان کا نام سنا تھا۔ مگر میرا واسطہ اس سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تو زیادہ تر دلی سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ دوسرے نے خان بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا۔ بڑے لوگوں میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لوگ اس کا نام عزت سے لیتے تھے۔ کیونکہ وہ کام آتا تھا۔ لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ غریب لڑکیوں کی شادیاں کروا یا کرتا تھا۔ غریب کھلوں میں جس چیز کی ضرورت ہو، پہنچا دیا کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک بخیر آدمی تھا۔

”جب صرف تمہارا مال ہی مارکیت میں ہوگا تو تم کچھ دام بڑھا کر بھی نقصان پورا کر سکتے ہو۔“ خان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ نہال نے کہا۔

”تو پھر کل کا غذات تیار کروالو۔ منافع میں چوٹی کا میں حصہ دار ہوں۔“ خان نے کہا۔

”تم کھریا کرو گے۔“ نہال سیٹھ نے پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ میرا کام ہے۔“ پنجاب سے مال نہیں آئے گا اور تمہاری طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔“ خان نے بات ختم کی۔

تین دن کے بعد پنجاب کی سائیکلس بنانے والی فیکٹری میں ایک دروازہ کھلا ہوا اور پوری فیکٹری میں آگ لگ گئی۔ اس دن ایک دوسری فیکٹری بھی تباہ ہو گئی۔

خان صاحب دلی سے باہر نہیں گئے۔ یہ سب کس نے کیا، کچھ پتہ نہ چلا اور مارکیت میں نہال سیٹھ ہی رہ گئے۔

نہال سیٹھ کو اندازہ تو ہو گیا کہ یہ کالیا جو بڑا سیدھا سادھا نظر آتا ہے۔ ایسا ہے نہیں۔ اس نے ڈر کے مارے بڑی ایمانداری سے خان کا حصہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ خان پردے میں رہ کر وہ کام کر رہا تھا جو کوئی نہیں کر سکتا۔ بڑے لوگوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ کس سے کام کرواتا ہے، یہ بات وہ کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ اس کے کارندے بھی سب کی نظروں میں نہیں آتے تھے۔ وہ بھرپور معاوضہ ادا کرتا تھا۔ ہر کارندے پر کارندہ رکھتا تھا۔ صرف چند ہی اس کو جانتے تھے۔ وہ لوگ جو اس کے کام کرتے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ جو کام سے انکار کرتا تھا۔ اس کا بہت برا اثر ہوتا تھا۔ پولیس تھا نہ سب کچھ اس کے لئے تیار ہوتا تھا اور جو اس کے کام کرتے ان کو پولیس والے چائے پلاتے اور عزت سے پیش آتے تھے۔

جو کارندہ ایک بار اس کے کام کرتا وہ پھر اسی کا ہو جاتا تھا۔ اس سے بھاگنے کا مطلب موت یا جیل تھا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہر کارندے کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ ان کو اکیلا نہیں

رہا۔ دلی میں کم ہی رہتا تھا۔ ہم دونوں ہی ساتھ بھرا کرتے تھے۔ ہم اکثر ساتھ ہی ہوتے تھے۔ کوئی دعوت ہو، شادی ہو یا کوئی اور تقریب۔ کھانا باولی ایک بڑا بازار تھا۔ وہ ہر سال ایک دعوت کیا کرتے تھے۔ یہ دعوت کسی ایک دو کارندہ کی طرف سے نہیں ہوتی تھی۔ سارا بازار اس میں حصہ لیتا تھا اور شہر کے بڑے لوگوں کو بلا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد محفل میوزک ہوا کرتی تھی اور دور دور سے گانے والے بلائے جاتے تھے۔ بڑا اچھا پروگرام ہوتا تھا مگر میں نے کسی پروگرام میں شرکت نہیں کی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ میں دلی سے باہر ہوا کرتا تھا مگر اس دفعہ ہم دونوں ہی موجود تھے۔ دعوت نامہ آیا تھا۔ میں نے رولو کا سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

”آپ جائیں گے تو ساتھ چلوں گا۔ آپ جانتے ہیں، میں گانے بجانے والوں سے دور رہتا ہوں۔“

”ارے تو گانا کون سنے گا۔ ہم کھانا کھائیں گے۔ شہر کے لوگوں سے مل لیں گے اور آجائیں گے۔“ میں نے کہا۔

یہ پروگرام ہفتہ کی رات کو تھا۔ ہفتہ کی رات کا پروگرام اس لئے رکھا گیا تھا کہ انگریزی کی افسران بھی آنے والے تھے۔ تو صاحب ہم دونوں بھی رات ٹھیک نو بجے اسٹیشن کے قریب میدان میں پہنچ گئے۔ سارا میدان

ضرور آئیں گے مگر ہم بلاوجہ نہیں آتے۔ کام ہوگا تو ضرور آئیں گے۔“

”تو پھر آپ کو بلانے کے لئے بیمار ہونا پڑے گا۔“
خان صاحب ہنس کر بولے۔

رولوکانے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چہرے کو دیکھا۔ آنکھوں میں دیکھا اور پھر کہا۔ ”آپ کا مرض بہت پرانا ہے۔ اس کا علاج چالیس سال کی عمر سے پہلے کرنا ضروری ہے۔ وقت کا خیال رہے۔ اگر آپ چالیس سے اوپر کے ہو گئے تو پھر مزید فائدہ علاج سے نہیں ہوگا۔“

خان نے حیرت سے رولوکانے کی بات سنی اور بولا۔
”مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔“
”یہ مرض اسی قسم کا ہے کہ مریض خود کو مریض نہیں سمجھتا۔“ رولوکانے کہا۔

”اس کی علامات کیا ہیں۔ مجھ میں تو بیماری کی کوئی علامت ہی نہیں۔“ خان نے جواب دیا۔

”ایک علامت تو یہی ہے کہ آپ خود کو تندرست سمجھتے ہیں۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”آپ مجھے چکرائے دے رہے ہیں۔ مجھے آخر کیا مرض ہے، کچھ بتائیں تو۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا علاج بھی ہے اور مرض بھی بتاؤں گا مگر یہ مقام مناسب نہیں ہے۔ ویسے فکر کی بات نہیں ہے۔ آپ کبھی ہمارے مطب میں تشریف لائیں گے تو پھر ملاقات ہوگی۔“ رولوکانے بات ختم کرنا چاہی۔

مگر خان کے اندر تو کل بھلی بچی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ”حکیم صاحب آپ نے میرے دل میں دوسو ڈال دیئے ہیں، کچھ تو بتائیں۔“

”آپ اپنے دل سے دوسو کو نکال دیں اور کسی قسم کی فکر نہ کریں۔“ رولوکانے کہا۔

”آپ نے ہی دوسو ڈالا ہے اور آپ ہی کہتے ہیں کہ اس کو میں نکال دوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دوا کھاتے وقت بندر کا خیال دل میں نہیں آنا چاہئے۔ اگر دوا کے ساتھ بندر کا ذکر نہ ہوتا تو ہرگز خیال نہ آتا۔ مگر چونکہ اس کے خیال

روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ پورا میدان سجا ہوا تھا۔ زمین پر ہرے رنگ کی دریاں پڑی تھیں۔ بڑا سا خوب صورت گیٹ بنا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک اونچا پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ ان کرسیوں پر دلی شہر کے معززین بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ قات کی دوسری طرف کھانے کا بندوبست تھا۔ کھانے کی خوشبو پورے میدان میں گردش کر رہی تھی۔ سفید اور سرخ وردیوں میں حیرے ہاتھوں میں ٹرے پکڑے آ جا رہے تھے۔ ہر قسم کی شراب ان کے پاس تھی جو جس کی خواہش کرتا، وہ دوڑ کر لے آتے تھے۔ انگریز مرد سگار منہ میں لگائے آقا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

رنگ برنگی ساڑیاں اور ماتھے پر سرخ بندیاں بھی جلوہ افروز تھیں۔ ان کے مرد گوری چڑی اور کھلے گلے کے پھیر میں تھے۔ خوب نگارہ تھا۔ ہر کوئی اپنا الو سیدھا کرنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک ہمارے درمیان کے منے خان آ گئے۔ ان کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا اور رنگ چمکدار کالا سیاہ تھا۔ چہرے کے مقابلے میں آنکھیں سرخی مائل سفید تھیں۔ پہلی نظر میں وہ باکسریا پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔

”اٹھ حکیم صاحب۔ بڑی خواہش تھی، آپ سے ملنے کی۔ آپ کا نام سنا تھا۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی۔“

”آپ نے درست فرمایا۔ دراصل میں دلی سے باہر زیادہ رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں اس کی کیا وجہ ہے؟“ وہ بولے۔

”ایک تو دوا دار کوئی تلاش اور دوسرے یہ میرے دوست حکیم کامل سیر پائے کے زیادہ شوقین ہیں۔ اس لئے مختلف شہروں میں کام کرتے ہیں۔ دلی بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔“

خان صاحب نے آگے بڑھ کر رولوکا سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”کبھی غریب خانے پر بھی تشریف لائیں۔“
رولوکانے جواب دیا۔ ”آپ بلائیں گے تو

پر پابندی لگادی ہے تو دوا کھاتے وقت اس کا خیال ضرور آئے گا۔ آپ کو بتانا ہوگا کہ مجھے کیا مرض ہے۔“ سنے خان بولے۔

”مجھے آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک چیز دیکھی اور ازراہ اخلاق بیان کر دی ہیں۔ یہاں پر میں کسی کے علاج کے لئے نہیں آیا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو مطب میں آجائیں۔“ رولوکانے اپنی بات ختم کی اور آگے بڑھ گیا۔

سنے خان کو ذرا اپنی سکی کا احساس ہوا۔ چہرے کے تاثرات میں تناؤ پیدا ہوا مگر یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ اس نے خود پر قابو کیا۔ چہرے پر مسکراہٹ کی چادر چڑھا کر مجھ سے بولا۔

”خوب آدمی ہیں آپ کے دوست بھی۔ مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

”بات یہ ہے خان صاحب کہ ان کا طریقہ علاج اور مرض کی تشخیص کرنے کا انداز ان کا اپنا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی چکرا جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ شاید مجھے جانتے نہیں ہیں۔ اگر ازراہ مذاق انہوں نے کہا ہے تو یہ بہت خطرناک مذاق ہے اور اگر واقعی میں بیمار ہوں تو وہ بتاتے کیوں نہیں؟“ خان نے پوچھا۔

”آپ کے سوال کا جواب میں کیا دوں۔ آپ خود ہی پوچھ لیں۔“ میں نے جواب دیا۔

کھانے کے بعد ہمارا رکنے کا پروگرام نہیں تھا۔ جبکہ ابھی محفل جوان تھی۔ خان صاحب اور دوسرے شوقین گانے کے پروگرام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے میزبانوں سے اجازت لی اور خاموشی سے واپس آگئے۔ واپس آکر میں نے رولوکا سے پوچھا۔ ”یہ تم کیا شوشہ چھوڑ آئے؟ خان تو پریشان ہو گیا ہے۔“

”اس کو پریشان کرنے کو ہی میں نے شوشہ چھوڑا ہے۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ جو نظر آتا ہے وہ اس کا اصل چہرہ نہیں ہے۔ میں ہو چکا۔“

نے میرے ٹھہ میں اس کو دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ اور زبان ایک سفاک اور ظالم آدمی کی تھی اور اس کے کام سارے ہی غیر قانونی اور انسانی سوز تھے۔ مجھے اس کی کھوج کرنا پڑی اور پھر میں مراد آباد پہنچ گیا۔ کلو میاں سے سنے خان تک کی کہانی مجھے پتہ چل گئی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ دلی میں ہے مگر ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ دعوت میں ملاقات ہو گئی تو میں نے اس کی بیماری کا شوشہ چھوڑ دیا تاکہ یہ خود میرے پاس چل کر آئے۔ اگر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جائے گا تو اسے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ وہ لازمی طور پر ایک نہ ایک دن میرے پاس آئے گا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ آدمی کتنا ظالم اور خود غرض ہے۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”اس کو تو کھاری باولی میں بہت بڑی دوکان ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ دوکان ایک پردہ ہے۔ اس کا اصل کاروبار تو دلی کے بوئے لوگوں کو بلیک میل کرنا، ان کی کمزوریوں کی قیمت وصول کرنا ہے اور جو اس کے مطالبات پورے نہ کرے، ان کو قتل کرنا ہے۔ یہ خود قتل نہیں کرتا، نہ کسی پارٹی کے سامنے آتا ہے۔ اس کا طریقہ کار ایسا ہے کہ یہ سب کچھ کرتا ہے مگر اس کا نام درمیان میں نہیں آتا۔ اس کے چہرے پر شرافت کا بھاری نقاب پڑا ہوا ہے۔ اس کی پوزیشن دلی شہر میں یہ ہے کہ اگر کوئی رکنے ہاتھوں بھی اس کو پکڑ لے تو کوئی اس کو مجرم نہیں سمجھے گا۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس کے ساتھ ایک نفسیاتی کھیل کھیلتا چاہتا ہوں۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”ذرا وضاحت تو کرو اس کی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ واقعی پتہ نہیں ہے۔ مگر میں اس کو بیمار کروں گا۔ وہ خود محسوس کرے گا اور پھر علاج کرائے گا۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”تو کھیل کب شروع ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

رولوکا زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”کھیل تو شروع

میری سمجھ میں آگیا۔ ”ہاں کھیل تو شروع ہو چکا۔“
میں نے کہا۔

دوبی روز گزرے تھے کہ منے خان مطب آگئے۔
رولو کا موجود تھا۔ آپ کی فرمائش پر میں مطب آگیا ہوں۔“
وہ بولے۔

”آپ اپنی ضرورت سے آئے ہیں۔ میری فرمائش
پر نہیں آئے۔“ رولو کا بے جواب دیا۔

”چلو ایسا ہی سہی.....“ خان نے جواب دیا۔

”دیکھئے خان صاحب! انسانی زندگی پانی کا بلبلہ
ہے۔ ابھی بنا اور غائب ہو گیا۔ اتنی سی زندگی کے لئے
انسان کیا کچھ کرتا ہے۔ انسان ایک بے بس وجود ہے۔ وہ
آنے والے حوادث کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس
کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی جدوجہد
اس کو کامیابیاں دلارہی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہی کامیابیاں اس کا امتحان بھی ہو سکتی ہیں۔ انسان جو راستہ اپنے
چلنے کو بناتا ہے وہ ہی اس کے خیال میں اچھا ہوتا ہے۔ مگر
ایک راستہ وقت بھی اس کے لئے بناتا ہے۔ وہ آگے
بڑھتا جاتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس قدر پاتا جاتا
ہے، اسی قدر اس کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اور پھر فاصلے کم
ہوتے ہیں اور اصلی چہرے نظر آتے ہیں اور کردار ننگے
ہو جاتے ہیں۔ میری باتیں آپ کی سمجھ میں آجائیں تو آپ
کا مرض آسانی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ سمجھ آئیں گی تو یہ
مرض بڑھتا جائے گا اور ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ خود
اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر دنیا کو بتائیں گے کہ میں
مراؤ آباد کا کلو میاں ہوں، جس کا باپ پیدائش سے پہلے
مر گیا تھا اور ماں پیدائش کے وقت مر گئی تھی اور میری پرورش
ایک دایا نے کی تھی۔ لاری اوڑے پر پڑا رہتا تھا اور کچھ
بتاؤں؟“ رولو کا نے پوچھا۔

خان صاحب منے خان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا
تھا۔ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ کبھی غصہ نظر آتا تھا،
کبھی بے بسی کے تاثرات آ جاتے تھے۔ ہونٹ مل رہے
تھے۔ ہزاروں سوالات منہ تک آرہے تھے مگر آواز ساتھ نہیں

دے رہی تھی۔ سات پردوں میں پوشیدہ رہنے والا اب
برہنہ کھڑا تھا۔ اس کے پاس اپنی برہنگی دور کرنے کو کوئی
کپڑا نہیں تھا۔ وہ خود کو چھپانے کو کون سے الفاظ کا پیرہن
لائے کہ اس کی پوزیشن برقرار رہ جائے۔ آخر اس کا اصلی
روپ سامنے آگیا۔ منے خان پیچھے رہ گیا اور کلو میاں نے
آگے آکر کہا۔

”تو یہ بتا یہ ساری کھوج تو نے کیوں کی ہے؟“
رولو کا مسکرا کر بولا۔ ”آخر اترا گیا نعلی چہرہ۔ تیری
اصلی حقیقت سامنے آگئی۔“

”ہاں آگئی اور تو بھی یہ سمجھ لے کہ تیری زندگی کے
دن گئے گئے۔ میرے ساتھ بہت لمبے ہیں۔ اب تو یہ دواخانہ
نہیں چلا سکے گا۔ تو نے مجھے نہیں پہچانا۔“ اور کلو اٹھ کھڑا ہوا۔
”جانے سے پہلے اپنی بیماری کے بارے میں تو سن
لے۔“ رولو کا نے کہا۔

”تو مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات
آگئی ہے۔ میں اپنی انگلیوں پر بڑے بڑے طرم خانوں کو
نچاتا ہوں اور جو نہیں ناچتے ان کی کٹی کر دیتا ہوں۔ تو دو کوڑی
کا حکیم مجھے پکد دے رہا ہے۔“

”دیکھو کلو! میری بات غور سے سن لو۔ کیونکہ تم کو پھر
اس کا موقع نہیں ملے گا۔ انسان کو عقل اس لئے دی گئی ہے کہ
وہ انسانیت کے ضابطہ اخلاق کی حفاظت کرے۔ انسانی برائی
اور بھلائی میں تیز کر سکے۔ جو اپنی عقل کو دوسری طرف استعمال
کرتا ہے، انسانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرتا
ہے، وہ جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ تم خود کو بہت طاقت
ور سمجھتے مگر تم ایک بیمار آدمی ہو۔ تم میں تم کو اب بھی مریض سمجھنا
ہوں۔ تم منے خان سے کلو میاں کے روپ میں میرے سامنے
ہو۔ یہی تمہارا اصل ہے۔ تم پھر سے منے خان نہیں بن
سکو گے۔ اگر بنو گے تو تمہاری بیماری تم کو آدہ بچے گی۔ اس
سے تم کو کیا تکلیف ہوگی، یہ وقت بتائے گا۔“

کلو میاں نے غصے سے رولو کا کو دیکھا اور تیزی سے
واپس چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی رولو کا نے کہا۔ ”یہ اپنی کمینگی سے

کمرے میں کسی اچھی خبر کا منتظر تھا۔ مگر اس کے سامنے خبر لانے والا ردو لکا تھا۔ کلو نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کے اس کو دیکھا اور بولا۔ ”تو کیوں آیا ہے۔ بھاگ کے کہاں جائے گا بچے گا یہاں پر بھی نہیں۔“

ردو لکا نے اس کو رحم کی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ”تو بڑا بد بخت ہے۔ تو نے اپنی انا کی خاطر پچاس آدمیوں کو اندھا کر دیا۔“

کلو نے غصے سے جواب دیا۔ ”کیا بکواس کرتا ہے۔

ارے تیرا گھر اور مطلب سب راکھ ہو چکا ہوگا۔“

”یہ تیری بھول ہے۔ تیرے سب آدمی اندھے ہو چکے ہیں۔ تجھے پتہ نہیں ہے شاید۔ بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے تو دولت کے نشے میں یہ بات بھول گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تجھے بتانے ہی آیا تھا۔“ اور ردو لکا پلٹ گیا۔

خان نے حیرت سے ردو لکا کو دیکھا ضرور..... مگر وہ اس کو روک نہ سکا۔ رات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کو سب پتہ چل گیا۔ یہ کیا ہوا، یہ اتنی ساری چلیں کہاں سے آگئیں اور وہ بھی رات میں۔ یہ ضرور کچھ اور ہی چکر ہے۔ یہ حکیم جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں۔ میرے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بھیدی تو میری پوری انکا کوڈھا ہے گا۔ اس کو ڈھیل دینا تو بہت خطرناک ہوگا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر کیا کروں، اتنا بھاری پتھر اس نے کتنی آسانی سے جھیل لیا اور اٹھا کر میرے منہ پر ہی پلٹ دیا۔ شاید میرے طریقہ کار میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ میرے اعزازے درست نہ تھے۔ میں نے اس کی باتوں سے اس کا ذہن کم لگایا تھا۔ مگر بیٹا حکیم اب کے غلطی نہیں کروں گا۔ تو نے میرے سارے ہتھیار تو کند نہیں کر دیئے ہیں۔ ابھی اور بہت کچھ میرے پاس ہے۔ میں بھی مراد آبادی ہوں، بھاگوں گا نہیں۔

اور سنے خان نے نیا پتہ تر ابدلہ۔

دودن کے بعد وہ مطلب آ گیا اور بڑے ادب سے

بولا۔ ”حکیم کامل سے ملنا ضروری ہو گیا ہے، ملاقات ہو سکتی ہے۔“

باز نہیں آئے گا۔ اس کے اندر طوفان سا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج رات ہی یہ کچھ کرے مگر آپ فکر نہ کریں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، اپنی لائی مصیبت میں خود گرفتار ہوگا۔“

کلو میاں بہت بڑے بدمعاش تھے۔ ان کو آدمیوں کی کیا کمی، ایک سے ایک بڑا غنڈہ ان کے زیر اثر تھا۔ مراد آباد اور میرٹھ سے بھی آدمی بلائے تھے۔ ایک پوری فوج تیار کر لی گئی۔ کس کو آگے جانا ہے، کس کو کیا کیا کام کرنا ہے، تیل کون چھڑکے گا، آگ کون لگائے گا اور پھر بچھانے آنے والوں کو کون روکے گا۔ پورا دوا خانہ اور مکان جب تک نہ مل جائے، بھاگتے ہوئے لوگوں کو پھر آگ میں ڈالتا، پوری شیعہ ہندی کی گئی تھی۔ کسی کے بچنے کی کوئی راہ نہ چھوڑی گئی تھی۔ برنگی کے موٹر پر پہرے موجود تھے۔

یہ تیار ہوا معمولی نہیں تھیں۔ آٹھ روز اس تیاری میں صرف ہوئے اور آٹھ روز کے بعد جب پوری طرح ٹھوک بجالا کہ سب لوگ گھر میں ہیں تو رات بارہ بجے کلو میاں کے پچاس جوان آگئے۔ ساری گلی اور مکان کی دیواروں، دروازوں پر اچھی طرح مٹی کا تیل ڈالا گیا۔ یہ کام کرنے والے اپنا کام کر کے گلیوں میں چلے گئے۔ ہر طرف رات کا اندھیرا تھا۔ سب سو رہے تھے مگر ردو لکا اپنا کام کر رہا تھا۔ آگ لگانے والا آدمی آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک چیل اس پر چھٹ پڑی اور اس کے ہاتھ سے ماچس لے گئی۔ وہ پھر دوسری ماچس لیتے کو واپس آ ہی رہا تھا کہ چیل اندھیرے کی چادر سے نکل کر اس پر حملہ آور ہوئی اور ٹھیک اس کی آنکھوں پر آگئی اور پھر اس شخص نے ایک زوردار چیخ ماری۔ اس کا چہرہ ہلکا ہوا تھا۔ وہ ایک طرف کو اندھیرے میں دوڑنا چلا گیا۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا۔ مگر وہ کیا جواب دیتا۔ اس کی جگہ دوسرا آ گیا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ آسمان پر اب بہت چلیں نظر آ رہی تھیں اور وہ پچاس جوان اندھیرے میں گرتے پڑتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف مٹی کے تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کھیل صرف دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ کلو میاں کے نامی گرامی بدمعاش سب اندھے ہو گئے۔ یہ کھیل ختم کر کے ردو لکا کلو کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ کلو اپنے

”آج تو شاید نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ دلی میں نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
”مگر میری معلومات کے مطابق صبح تک وہ دلی میں تھے۔“ وہ بولا۔

”آپ اپنی معلومات پر بھروسہ کرتے ہیں تو پھر انتظار کریں۔ میری بات پر کرتے ہیں تو دو دن کے بعد تشریف لائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے آپ کی بات پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ میں پرسوں اسی وقت آؤں گا۔“ اور خان چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی رولو کا نمودار ہو گیا اور بولا۔ ”یہ پرسوں تک آپ نے کیوں ٹال دیا۔“

”میرے خیال میں وہ کوئی دوسرا حربہ استعمال کرنا چاہ رہا ہے۔ دو دن، ہم کو بھی مل جائیں گے اور ہم بھی کچھ غور و فکر کریں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ نے ٹھیک سوچا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ دو دن تک اس کی نگرانی کرتا ہوں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
”جو کچھ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

شام کو رولو کا نے بتایا کہ خان یہاں سے اٹھ کر سیدھا کا لگا گیا تھا۔ یہاں پر ایک بہت قدیم مندر ہے۔ اس کے چاروں طرف آبادی نہیں ہے۔ یہ مندر پارتنی دیوی کا ہے۔ ہندی دیو مالاؤں میں پارتنی کیلاش پر بت کی بیٹی ہے۔ اس کا نام پارتنی یعنی پر بت کی بیٹی اسی لئے رکھا گیا ہے اور یہ شیو بھگوان کی بیوی ہے۔ اس قدیم مندر میں پارتنی کی ایک بہت بڑی مورتی بنی ہوئی ہے۔ یہ مورتی سرخ پتھر کی ہے۔

مندروں پر ان کے اور یہ جس مقام پر ہے وہاں پر دور دور آبادی بھی نہیں ہے۔ مگر ایک شخص اس مندر میں رہتا ہے، وہ بھی بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جھریوں سے بھرا چہرہ جس کا رنگ چھٹک کے پیٹ جیسا ہے اور ہاتھ ہیر لکڑی کے ڈنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔ وہ کیا کھاتا ہے اور کہاں سے کھاتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ پجاری کب سے یہاں پر ہے۔ کسی کو پتہ نہیں

ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی ادھر آ جائے تو وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ صرف اشارے سے واپس جانے کو کہتا ہے۔ اس کی شکل اور ماحول آنے والے کو خوف زدہ کر دیتے ہیں اور دلیر سے دلیر بھی اس ویران مندر کے قریب رہنا پسند نہیں کرتا۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ خان کا اس مقام پر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔“

”اس نے وہاں جا کر کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔
”کچھ نہیں کیا۔ وہ شاید پجاری کی تلاش میں ہی گیا تھا۔ کھنڈرات میں بھٹکتا رہا۔ مندر کے اندر جانے کی کوشش اس نے نہیں کی۔ ایک بات اور آپ کو بتا دوں کہ ان کھنڈرات میں حشرات الارض بے شمار ہیں اور سانپ تو قدم قدم پر پائے جاتے ہیں۔ دلی سے گھوڑے پر سز کر کے تو دو ڈھلی کھنڈے کا سفر جنوب کی طرف ہے۔ دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہیں۔ علاقہ پتھر پلا ہے، کاشت کے لائق نہیں ہے۔ رات ہونے سے پہلے یہ واپس آ گیا تھا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہوا کہ گوہر مقصود نہیں ملا۔“ میں نے کہا۔
”مگر اس سے یہ اندازہ تو ہوا کہ وہ کس لائن پر سوچ رہا ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔ دوسرے آدمی جاہل ہے مگر حالات کی نزاکت اور اندازے درست سمت میں لگتا ہے۔ اس کے اتنے آدمی اندھے ہو گئے، ایک رات میں۔ یہ واقعہ ہوائی ساری چیلیں رات کے وقت کہاں سے آ گئیں۔ اس نے درست اندازے لگائے ہیں اور وہ اب ان اندازوں کی بنیاد پر تو ذکر تاجا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بالکل درست یہی بات ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
”تم نے اس پجاری کو دیکھا ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”ہاں میں نے صرف ایک جھلک اس کی دیکھی تھی۔ میں خان کے ساتھ نہیں تھا۔ خان کھنڈرات میں پھر رہا تھا اور میں مندر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

”گلتا ہے تم اس حکیم سے ڈرتے بہت ہو۔“ پجاری نے کہا۔

”میں لڑائی بھڑائی سے نہیں ڈرتا۔ میں کسی اور لائن کا آدمی ہوں۔ سامنے بہادر سے بہادر آجائے، میں بھڑ جاؤں گا مگر بتاؤ چیل کووں سے کون لڑے گا؟“ خان نے کہا۔

”تیری دبدبا اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر بھیا بات یہ ہے کہ ہم تو صرف پنڈت پجاری ہیں۔ کسی کی جنم کنڈلی بنادی۔ دان دکھنا مل گئی۔ بھجن کرتن ہوا تو بلائے گئے۔ بڑی بڑی لیلواؤں میں تو مہمان سادھوؤں کو ہی بلایا جاتا ہے۔ تم نے اپنی منو کا مننا بتائی، ہم نے رستہ بتادیا۔ اس سے زیادہ کی امید نہ کرنا۔“ پجاری نے کہا۔

”تم سے بڑی امید تھی۔ اتنے بڑے مندر کے پجاری ہو کچھ تو کرو۔“

”تم کہو تو ست نارائن برت کتنا سنا دیں۔ مگر طاغوتی شکستی سے لڑنا ہمارا کام نہیں ہے۔ پرنتو ہم نے تجھے ایک منش بتاؤ دیا۔ کوشش کرو اور اپنی گھنٹائی اس کو بتاؤ۔ وہ راضی ہو گیا تو تیرا بیڑا پار ہو جائے گا اور جو نہ ہوا تو کوئی چیل آ کر تیرا بھی صفایا کر جائے گی۔“

خان پجاری کی باتیں سن کر بڑا پریشان ہوا۔ اب کیا کرے۔ وہ پھر دروازے کا لکا کی طرف۔ ذن کا وقت تھا۔ وہ گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ مندر سے کچھ فاصلے پر اس نے گھوڑا روک لیا اور ایک کیکر کے درخت سے گھوڑے کی لگائیں باندھ دیں اور چلا مندر کی طرف۔ مندر پر آج بھی ویسی ہی دشت برس رہی تھی۔ ٹوٹی دیواروں کے پتھر ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ زمین پر گھاس اور دوسرے پودے بکثرت تھے۔ وہ پتھروں پر پھیر رکھتا، مندر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ مندر کی عمارت بھی کوئی رنگ رکھتی ہوگی مگر اب تو کالی تھی۔ کالی جی ہوئی دیواروں پر پودے اگے ہوئے۔ دروازہ بہت بڑا اور بہت اونچا تھا۔ شاید کبھی کواڑ بھی لگے ہوں مگر اب تو ان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ خان ایک نڈر آدمی تھا۔ اس لئے بڑھا چلا جا رہا تھا مگر خوف تو انسانی فطرت کا حصہ

پجاری مورتی کے پیروں میں بیٹھا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس کی کھوپڑی پر کوئی بال نہیں تھا۔ چوٹی تک نہیں تھی۔ بدن پر صرف ایک لنگوٹی نما ڈھنجی تھی۔ اس نے صرف ایک دفعہ دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کو پتہ چل گیا تھا کہ دروازے پر کوئی ہے۔ مگر وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ میں نے ایک نظر خان کی طرف گھنڈرات میں کی تھی اور پھر پلٹ کر پجاری کی طرف دیکھا تھا مگر وہ اس مقام پر نہیں تھا۔ مورتی کے سامنے بہت بڑا مال تھا جو کہ آدھا گرچھا تھا۔ دیواروں پر درخت اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی میں دور دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر پجاری کا پتہ نہ تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں پر ضرور کوئی تہہ خانہ بھی ہے یا پجاری اپنے کسی کرتب سے روپوش ہو گیا ہے۔ میں نے اس کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میرا اس سے کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔

”اب تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”خان پر کڑی نظر رکھنا ہے۔ اس کی سوچ اس کو کہاں لے جا رہی ہے، یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہے۔ آپ میرا انتظار نہ کرنا۔ کام ذرا میڑھا ہے، غفلت نہیں کر سکتا۔“ اور رولو کا چلا گیا۔

خان کی بے چینی کا اندازہ اس کی چلت پھرت سے ہوتا تھا۔ خان کے پاس ایک بہت بڑے مندر کا پجاری بیٹھا تھا اور وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ ”میں نے تو کوشش کر لی، وہ مندر تو بڑا ہیسا تک ہے اور وہاں پر کوئی نہیں ہے۔ تم کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ خان نے کہا۔

”ارے مہاشے جی تم نے ایک دفعہ جا کر ہی اندازہ کر لیا۔ میں نے نہ جانے کتنے چکروں کے بعد اس مہمان پرش کے درشن کئے تھے اور پھر دوبارہ نہ کر سکا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ اب نہ آتا، آئے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ تم ایک پھیرے میں ہی ہار گئے۔ ارے اتنی آسانی سے کوئی کچھ پاتا ہے۔“ پجاری نے کہا۔

”تو پھر تم ہی کچھ کرو۔ یہ تو تم کو پتہ ہے کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ آخر وہ حکیم ہے کیا بلا۔“ خان نے پوچھا۔

اور دھتکار کر بھگا دیا۔ مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اس کا اندازہ تو کر سکتا ہوں کہ وہ اگر دیکھ نہیں رہا تھا تو محسوس ضرور کر رہا تھا۔ اس نے اس پر بھی میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نہ صرف خان کے بارے میں جانتا تھا بلکہ میرے بارے میں بھی اس کے سوچنے کی سمت درست تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خان سے پہلے ہی میرا احوال ضرور پوچھتا۔

ایک دن کے بعد خان میرے پاس آ گیا اور بولا۔
”میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”ضرور کرو۔“ میں نے جواب دیا۔

”حکیم صاحب میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔“
”شرمندہ! تم شرمندگی کے معنی بھی نہیں جانتے۔“ میں نے کہا۔

”آپ جتنا چاہیں، مجھے ذلیل کر لیں۔“ وہ بولا۔
”تم شرمندہ نہیں ہو۔ مجبور ہو اور دو چار سو بد معاش پورے ہندوستان سے جمع کر لو اور کروڑوں حملہ مگر یاد رکھو! آسان پر ہزاروں پرندے موجود ہیں۔ کسی اور مہمان پرش کے پاس جاؤ، اپنی دکھ بھری داستان سناؤ۔ اگر وہ تم جیسا ہی ہو تو ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ اگر آنکھ دالا ہوا تو دھتکار کر بھگا دے گا۔ تم جس طاقت کے نشے میں بدست ہو، وہ طاقت ہر جگہ اور ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی۔ تم بذات خود اتنی گہرائی میں گر چکے ہو کہ تم کو اٹھانا بھی آسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میں بے شک گردن تک کچھو میں دھنسا ہوا ہوں۔ میری مدد کریں۔“ خان نے جواب دیا۔
”ایک تم ہی نہیں بہت لوگوں کو بعض اوقات بڑے سخت مرحلوں سے گزرتا پڑتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ ذرا خود پر نظر ڈالو تم نے گناہ یوں کئے ہیں جیسے وہ گناہ نہ ہوں۔ تمہارا حق ہو۔ تم دوسروں کے مال پر اترتے رہے۔ دوسروں کے حق مارتے رہے۔ تم پر کتنا فرض ہے، تم کتنوں کا کھائے بیٹھے ہو۔ پہلے اس کی ادائیگی تو کرو، یاد رکھو بغیر

ہے۔ کیسا ہی بہادر آدمی ہو، ان دیکھی راہوں پر اندر سے خوف زدہ تو ہوتا ہی ہے۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ دروازے تک پہنچ گیا مگر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ اس کے سامنے ایک ہڈیوں کا پنجر کھڑا تھا۔ ہڈیوں کا پنجر میں نے اس لئے کہا کہ اس کے بدن پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہڈیوں پر کھال چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گہرے گڑھے تھے اور آنکھیں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ تن کر کھڑا تھا۔ خان اس کو دیکھ کر ایک دم سہم گیا۔ ایک انک کر بولا۔ ”بابائی! ملاقات کرنے آیا ہوں، پریشان ہوں۔“ ”مرد کہے تو۔ تیرا کیا تیرے سامنے آنے کو ہے۔“ اب سب دوڑ بھاگ بیکار ہے۔ چالا چالا پس۔“

مگر خان ایک ڈھیٹ، دروازے پر ہی بیٹھ گیا اور گڑگڑا کر بولا۔ ”اب تو تمہارے شرن میں آ گیا ہوں۔ اب کہاں جاؤں گا۔ یہیں مر جاؤں گا۔“
”ڈھانچے میں تھر تھری سی ہوئی اور غصے سے کہا۔“
”اب سر پر ہڈی ہے تو شرن میں آ رہا ہے۔ اپنے کڑو تو یاد کر، اب تک کیا کرتا رہا ہے؟“

خان گردن جھکائے اس کے قدموں میں بیٹھا رہا۔
”ڈھانچے کی لکڑی نمائنگوں میں حرکت ہوئی اور اس نے ایک لات خان کی کر پر لگا دی اور بولا۔ ”تجھے سزا نہ ملے تو تیرے جیسے اور بن جائیں گے۔ اپنی مصیبت ساتھ لئے پھرتا ہے اور کہتا ہے شرن میں آ گیا ہوں۔ تیرے جیسے میری شرن میں آگئے تو دیوی کو کیا جواب دوں گا۔ چل اٹھ، اپنی مصیبت کو بھی لے جا۔“

خان اس کی زبان کیا سمجھتا، میں پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کو میرے وہاں ہونے کا احساس تھا۔ وہ بلا وجہ کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا اور خان کے کردار کے بارے میں بھی اس کا قیاس درست تھا۔ خان کمزور قدموں سے اٹھ کر واپس چل دیا اور گھر آ گیا۔ وہ ہمارے ماننے والا آدمی نہ تھا مگر اس کو کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
”وہ ڈھانچہ کوئی بھی ہو، ماننا پڑتا ہے کہ اس کی نظریں بہت دور تک دیکھتی تھیں۔ خان کی اس نے پذیرائی نہیں کی

مگر چونکہ آدمی ایماندار تھا اور اس مکان کے بارے میں جانتا تھا تو اس نے کہا۔

”مکان تو خالی پڑا ہے اور ایک زمانے سے خالی ہے۔ خالی مکان میں تو آپ کو پتہ ہے کہ خود بخود گندگی کے ذہیر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس مکان کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس مکان کو کوئی آباد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لئے کوئی اور مکان تلاش کر لیں۔“

عورت نے یہ سن کر اپنی سر آواز میں فیصلہ سنا دیا۔
 ”میں یہی مکان لوں گی..... تم منع کرو گے تو بھی۔“
 ”میں منع کب کر رہا ہوں۔ آپ کے علاوہ اور کتنے لوگ آپ کے خاندان میں ہیں۔“ خورشید نے پوچھا۔

”میں اکیلی ہوں۔“ وہ بولی۔
 ”پھر تو اور مشکل ہوگی۔ کیونکہ اس مکان کی صفائی کرانا ہوگی۔ سفیدی چونا بھی ضروری ہے۔ پانی کا کنواں تو ہے مگر ایک زمانے سے استعمال نہیں ہوا۔ اس کی بھی صفائی ضروری ہے۔ یہ سب آپ تو نہیں کر سکیں گی۔“
 ”یہ سب تمہاری درد ساری نہیں ہے۔ میں مکان میں کس طرح رہوں گی۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ تم چاہی میرے حوالے کر دو اور کرایہ بتاؤ۔“

خورشید نے حیرت سے کہا۔ ”ضروریات زندگی بھی تو ضروری ہیں، آپ کس طرح رہیں گی؟“
 ”تم بار بار ایک بات کو مت دہراؤ، صاف بتاؤ، چاہی دے رہے ہو کہ نہیں۔“ اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ خورشید پر تو کچھ طاری ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے، لائے دیتا ہوں، آپ اپنی ذمہ داری پر اس مکان میں رہیں۔“

”اور کرایہ کیا لو گے؟“ وہ بولی۔
 ”جو مناسب خیال کریں، ادا کر دیا کریں۔ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔“ خورشید نے جواب دیا۔

اور جو مکان آسیب زدہ مشہور تھا اور ایک زمانے سے بند پڑا تھا، اس کو ایک عورت نے آباد کر دیا۔ اس نے کس

ادائیگی کے معافی نہیں ملے گی۔ یہ ادائیگی تم کس طرح کرو گے۔ یہ سوال تم مجھ سے نہیں، اپنے اندر خود سے کرو۔ یقین رکھو کہ بتانے والا اندر ہے۔ پوچھو گے تو جواب ضرور ملے گا۔ مجھ سے یا کسی سے بھی معافی طلب نہ کرو۔ خود سے معافی طلب کرو، تمہارے ہر سوال کا جواب تمہارے اندر موجود ہے اور جب تم کو جواب مل جائے تو وہ کرو جو اندر سے حکم ملے۔ تم کو کسی حکیم کی ضرورت ہے نہ کسی مہمان پرش کی ضرورت ہے۔ اپنی خواہشوں کے جال کو اپنے اوپر سے اتار کر پھینک دو، بس اب جاؤ۔“

خان کے چہرے پر غدا مت کے بادل چھا رہے تھے اور آنکھوں سے جھری لگی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک حسین اور دراز قد عورت تھی۔ اس کا سراپا بہت دلکش تھا۔ دور سے وہ بہت حسین لگتی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر شگفتگی اور علامت قریب آنے پر نظر نہیں آتی تھی۔ خشونت اور کڑھکی محسوس ہوتی تھی۔ لوگ بتاتے تھے کہ اس کا چہرہ رات کے وقت انتہائی سفاک نظر آتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی پتھر کی مورتی کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری..... اس کی آواز عجیب تاثر پیدا کرتی تھی اور سننے والے پر کچھ طاری کر دیتی تھی۔ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ اس کا نام کیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ جس مکان میں کرائے پر آئی تھی۔ اس کا مالک خورشید علی تھا۔ یہ مکان ایک عرصہ سے بند پڑا تھا۔ اس مکان کو کرائے پر کوئی نہیں لیتا تھا۔ خورشید نے کئی دفعہ اس کو فروخت کرنے کی کوشش کی مگر خریدار مکان دیکھنے کے بعد پلٹ کر نہ آیا اور یہ مکان خالی ہی رہا۔ خورشید کے پاس یہ مکان ورثے میں آیا تھا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک قصائی سے خریدا تھا مگر سنا ہے وہ بھی اس میں رہا نہیں تھا۔ اس قصائی نے کسی نائی سے خریدا تھا، وہ نائی ہندو تھا۔ مگر اس مکان کی قسمت میں آباد ہونا لکھا ہی نہ تھا۔ سب لوگ جانتے تھے اور پھر اچانک کئی سال کے بعد یہ عورت خورشید سے ملی اور مکان کرائے پر پینے کی خواہش کا اظہار کیا تو ظاہر ہے وہ تو حیران ہوا،

اس کی آواز سن کر خورشید کو گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ جلدی سے بولے۔ ”میں نے تو آپ کو کہہ دیا تھا کہ جو مناسب ہو، آپ دے دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مکان کو آباد کر لیا ہے۔“

”خوشی اور غم کی بات نہ کرو، کرایہ بتاؤ۔“ وہ بے تاثر آواز میں بولی۔

”آپ اصرار کرتی ہیں تو پانچ روپے دے دیں۔“ خورشید نے جواب دیا۔ عورت نے پانچ کا نوٹ خورشید کے ہاتھ پر رکھا اور چلی گئی۔

خورشید علی اس کو جاتا دیکھتے رہے۔ مگر حیرت سے ان کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔

وہ عورت جتنی جسارت کی نظر آتی تھی۔ اس حساب سے اس کے کولے بھی ہونا چاہئیں تھے۔ مگر یہ کیا۔ وہ تصویر کی طرح تھی۔ پلٹ کر دیکھو تو سیدھی سیٹ کوئی خم، کوئی دراڑ کچھ نہیں اور سامنے سے رنگین تصویر۔ ”یہ کیسی عورت ہے؟“ خورشید نے سوچا۔

”کون آیا تھا؟“ خورشید کے کان میں اس کی بیوی کی آواز آئی۔

”وہ کرایہ ادا کرنے آئی تھی۔“ خورشید نے جواب دیا۔ ”یہ کون عورت ہے، سنا ہے اکیلی رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں، تمہاری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ تم نے اکیلی عورت کو وہ آسیب زدہ مکان دے دیا۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو بدنامی اس کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی ہوگی۔ دنیا ہزاروں باتیں بنائے گی۔“ بیگم خورشید نے کہا۔

”بات تمہاری اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر اس نے زبردستی مجھ سے یہ مکان لیا ہے۔ میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر اس کا اصرار تھا کہ وہ یہ مکان ضرور کرائے پر لے گی مگر اب مجھے اس پر شک ہونے لگا ہے۔“ خورشید نے کہا۔

”کیا شک، ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔“ بیگم نے کہا۔

”سامنے سے وہ عام عورتوں جیسی ہی ہے۔ بس ذرا آواز عجیب سی ہے۔ مگر آج میں نے دیکھا کہ وہ پیچھے سے تو ایک تصویر کی گئی ہے۔“ خورشید نے کہا۔

طرح اس کی صفائی کی، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دراصل یہ مکان تھا بھی ایسی جگہ پر کہ لوگوں کی یہاں پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ یہ پچھلی شہر کی آبادی تھی۔

پچھلی شہر ایک قصبہ ہے۔ اس کی آبادی ایک گھوڑے کے نال کی طرز پر ہے۔ ساری ہی آبادی مسلمانوں کی ہے۔

اس میں شیعہ اور سنی دونوں ہیں۔ آبادی کے بعد کھیت ہیں۔ یہ مکان آخری ٹکڑ پر تھا۔ کھیتوں میں جانے والے کسان ہی اس کے سامنے سے گزرتے تھے۔ اور وہ بھی ذرا فاصلہ رکھ کر گزرتے تھے۔ اس مکان کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ مگر اس عورت نے اس مکان کو آباد کر کے ساری کہانیاں کا دم نکال دیا تھا۔

”بڑی دلیر عورت ہے بھی، اکیلی رہتی ہے کوئی کہتا۔“

سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ ”ہاں بھیا لاگت تو ایسی ہی ہے۔“

رات کے وقت مکان کے ایک کمرے میں روشنی نظر آتی تھی۔ باقی پورا مکان اندھیرے میں ڈوبا رہتا۔ وہ عورت کب اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتی تھی، کہاں سے خریدتی تھی، کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اس نے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ دن اور رات لوگوں نے نوہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کے پاس کون آتا ہے، کون جاتا ہے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ سب نوی حیرت تھی۔ ایک اکیلی عورت اس آسیب زدہ مکان میں رہتی ہے، کیا کھاتی ہے، پانی کہاں سے لاتی ہے۔ خوراک کیا کھاتی ہے نہ اس کا کسی سے واسطہ تھا نہ کسی سے لینا دینا تھا۔ آخر وہ کس طرح زندگی گزارتی ہے۔ کھوج سب کچھ تھی مگر پتہ نہ پتہ نہ، ایک مہینہ گزر گیا کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ خورشید علی کہیں جانے کی تیاری میں تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ خورشید نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سامنے وہی عورت کھڑی تھی۔ وہ ایک طرف ہو گئے اور بولے۔ ”آئیے اندر آ جائیے۔“

مگر اس عورت نے اندر قدم نہ رکھا۔ اپنی سپاٹ آواز میں کہا۔ ”میں کرایہ ادا کرنے آئی ہوں۔ بتاؤ کیا دوں؟“

☆ 143 ☆

طرف سے یہ حکم ملا ہے کہ کراہیہ وصول کریں گی، اب بتاؤ میں کیا کروں؟“

”میاں بات یہ ہے کہ تم کون سے عورت شناس ہو۔ میاں ایک عورت قسمت سے تم کو مل گئی ہے۔ تم نے تو وہی دیکھی ہے۔ ارے دنیا میں ہزاروں قسم کی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ امریکہ کی عورت الگ ہے تو چین، جاپان کی الگ ہے۔ ان سب کے بدن اور حسن کے پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔ کیا یہ وہ کہاں کی عورت ہے۔ تم کو چاہئے تھا کہ پہلے اس کے بارے میں معلومات کرتے اور ٹھوک بجا کر مکان دیتے۔ وہ تو تم نے کیا نہیں۔ اب ہوئے روبرو پریشان۔“ نبو میاں خاموش ہوئے تو خورشید نے کہا۔

”یاد تم بھی بیگم کی طرح مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا ہے ہو۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔“ خورشید نے بھنا کر کہا۔

”ہم کیوں کرتے ارے اللہ نے عقل دی ہے۔ اچھے برے کو پرکھ سکتے ہیں۔“ نبو میاں بولے۔

”تم نے اس آفت کی پرکالہ کو دیکھا جو نہیں ہے۔“ خورشید نے کہا۔

”اچھا تو کیا وہ بہت حسین ہے۔ اپنے حسن سے متاثر کرتی ہے یا اس کے ماتھے پر سیگن ہیں، عجیب الخلق ہے۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، میاں۔ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔“ نبو میاں نے جواب دیا۔

”یار میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ شکل سے تو وہ بہت اچھی لگتی ہے مگر پہلی نظر کے بعد دوسری نظر میں وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی لگتی ہے اور جو کسر رہ جاتی ہے۔ وہ اس کی آواز پوری کر دیتی ہے۔ کیا بتاؤں اس کی آواز کے صوتی اثرات کیسے ہوتے ہیں۔ بس انہی کا کہا ہی کرنا پڑتا ہے۔“ خورشید نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ہاضمہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھ سے چورن لیتے جانا، خواب بھی ڈراؤنے آتے ہوں گے۔ میاں ذرا دیکھ بھال کے کھایا کرو۔ کھانے کے معاملے میں تم سدا کے اندیدہ واقع ہوئے ہو۔“ نبو میاں نے فس کہہ کر کہا۔

”ارے ذرا صاف صاف بتاؤ، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ بیگم نے الجھ کر کہا۔

”تم نے کوئی بڑی سی تصویر دیکھی ہے، جیسی کہ کیونوس پر بنائی جاتی ہے۔ لائیک پیل اور خوبصورت مگر اس کیونوس کو پلٹ کر دیکھو تو کچھ نہیں ہوتا، نہ کوئی غم نظر آتا ہے، نہ رنگ وہ بالکل ایسی ہے۔ وہ جتنی جان دار عورت نظر آتی ہے۔ اسی حساب سے اس کے کولے اور کاندھے ہوتا چاہئیں۔ مگر پیچھے تو کچھ نہیں ہے۔ ایک دیوار سی لگتی ہے۔ یہ کیا بات ہے!“

”یہ تو تم نے خوب کہی۔ تم عورتوں کو اتنی گہری نظروں سے دیکھتے ہو۔ اب یہ چلا مجھے۔“ بیگم بات کو کہیں اور لے گئیں۔

خورشید سٹ ہٹا گئے اور بولے ”بتاؤ تو مصیبت، نہ بتاؤ تو پریشانی بیگم تم تو ہر بات کو گھما پھرا کر دین لے جاتی ہو۔ تم کو کچھ بتانا ہی مشکل ہے۔“ خورشید زری سے بولے۔

”اچھا اب چڑی چڑی باتیں نہ کرو۔ میں سب جانتی ہوں، مردوں کے کر تو اور سن لو اچھی طرح، اب اگر آئے تو میں کراہی لوں گی۔ تم نہ دوڑ کے آ جانا۔ میں بھی دیکھوں، ذرا تصویر کا دوسرا رخ۔“

تو جی خورشید صاحب، بجا رہے بیگم کی نظر میں مشکوک ہو گئے۔ مگر ان کی بے یقینی تم نہ ہوئی۔ ان کے ایک ہی دوست تھے۔ نبو میاں۔ نام تو ان کا نواب علی تھا مگر سب نبو میاں پکارتے تھے۔ خورشید دوڑے ان کے پاس، ڈیوڑھی میں وہ پیٹھے حقہ گڑا کر رہے تھے۔ بولے۔

”کہو میاں دو دن کے بعد شکل دکھا رہے ہو اور وہ بھی اتنی بری ہانکے ہو! یاں اثر ہی ہیں ایمان سے۔“

”ہو! یاں تو اڑیں گی، بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

خورشید نے جواب دیا۔

”کیوں کیا آفت ٹوٹ پڑی؟“ نبو بولے۔

اور خورشید نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آخر میں بولے۔

”یار میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ شاید میں نے مکان کراے پر دے کر کوئی مصیبت کھڑی کر لی ہے اور اب بیگم کی

اکیلی۔ خورشید ماموں کے آسیب زدہ مکان میں کرائے پر آگئی اور ہم کو پتہ ہی نہ چلا۔“
سالار خان نے جواب دیا۔ ”ارے اکیلی نہیں ہوگی کوئی تو ساتھ ضرور ہوگا۔۔۔۔۔“

”میاں ہماری معلومات کے مطابق اب تک اکیلی ہی ہے۔“ باقر علی نے جواب دیا۔

شوکت علی کہاں چپ رہنے والے تھے، بولے۔ ”یہ بات سمجھ میں آنے والی ہرگز نہیں ہے۔ وہ مکان تو ایک زمانے سے بند پڑا ہے۔ دنیا جہاں کا کوڑا پکڑا بھرا ہوگا، رہتی کہاں ہوگی؟“

”تم کو پتہ نہیں ہے، رہتی ہے، ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا۔“ باقر علی نے جواب دیا۔

”تم نے بازار میں کبھی اس کو دیکھا ہے؟“ شوکت علی نے سوال جڑ دیا۔

”میں نے کیا کسی نے نہیں دیکھا۔ صرف ماموں خورشید نے دیکھا ہے۔“ باقر علی نے جواب دیا۔

”اچھا تو بتاؤ کیسی ہے؟“ جھنم میاں بھی بولے۔
”یاد تم ہو ایک نمبر کے نیدے۔ کیا بتاؤں، میں نے دیکھا تھوڑی ہے۔“ باقر علی نے جھنجھلا کر کہا۔

”تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ پہلے اس کو دیکھا جائے۔“ آخر مٹی چند سے خاموش نہیں رہا گیا۔

”تو جاؤ، دروازہ پیٹ ڈالو، اکیلی ہی رہتی ہے۔ وہی دروازہ کھولے گی۔ دیکھ لیتا اور اگر وہ پوچھے کہ کیوں آئے ہو تو کہہ دینا، دیکھنے آتا ہے پھر وہ سویرے بے خبر ماسٹر صاحب کو پہنچا دے گی اور پھر تیرے ساتھ ہم سب کی چندیا کے پال گشتی ہو جائیں گے۔ اے جب کرے گا، گھامڑوں جیسی بات کرے گا، کوئی اور ترکیب نکالو۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے اور ہم لوگ اس کو دیکھ بھی لیں۔“ باقر علی نے مٹی چند کا مذاق اڑا دیا۔ وہ بچارہ دبک کر خاموش بیٹھ گیا۔

شوکت علی بولے۔ ”ایسا نہ کریں کہ دن میں پانی پینے کے بہانے دروازہ کھٹکنا دیں۔ گھر میں اکیلی ہے تو ظاہر ہے، وہی دروازے پر آئے گی، چاچی، پھوپھی کچھ بھی

”اچھا بھئی نہ مانو میری بات میں نے جو کچھ کہا۔ وہ نہی کو اس تھی۔“ خورشید جھنجھلا کر بولے۔

”ارے ارے تم تو بالکل ہی سنجیدہ ہو گئے۔“ نبو میاں نے کہا۔

”ایک بات ہم بتائے دیتے ہیں۔ آگے کچھ بھی ہو، میں تم سے آکر نہیں کہوں گا بلکہ کسی سے نہیں کہوں گا۔ ارے جب تم دوست ہو کر مذاق اڑا رہے ہو تو دوسرے تو نہ جانے کیا کہیں اس لئے اب چلتے ہیں۔“ نبو میاں آوازیں دیتے رہ گئے مگر خورشید غصے میں تھے رکے نہیں۔

پورے محلے کو تشویش تھی۔ آخر یہ عورت کیا کھاتی ہے۔ بازار میں کبھی نظر نہیں آتی۔ خرید و فروخت کرتی نہیں۔

کسی سے آج تک اس نے رابطہ نہیں کیا۔ صرف خورشید علی کے پاس کرایہ دینے ایک دفعہ آئی تھی۔ اب لوگوں کو لگ گئی تھو۔ ہر جگہ کچھ منچلے تو ہوتے ہیں۔ یہاں پچھلی شہر میں بھی ایک ٹولہ ایسا تھا۔ ہر کسی کے پھندے میں ٹانگ اڑانا ان کا مشغلہ تھا۔ بات ان تک پہنچ گئی۔ باقر علی اس ٹولے کے

سرغنہ تھے۔ چار چھ سر پھرے ان کے ارد گرد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مگر رات عشاء کے بعد تو باقاعدہ ان کا اجلاس ہوتا تھا۔ اس اجلاس میں دوسرے دن کے پروگرام بنائے جاتے۔ کس باغ کے آم تیار ہیں۔ کس طرح دھوا دھارانا ہے۔

کبڑی کے بیچ کی تیاریوں پر بحث ہوتی۔ کھلاڑی تیار کئے جاتے اور ایک سے ایک بڑی شرارت کی پلاننگ کی جاتی۔

اس چھوٹے سے قصبے میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بزرگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر یہ لوگ شرارت کرتے تھے۔ ان میں یہ خوبی ضرور تھی کہ حد ادب کو پار نہیں کرتے تھے۔ سب لڑکے نوجوان تھے۔ زیادہ تر تو مسلمان لڑکے تھے

مگر چند ایک اس ٹولی میں ہندو بھی تھے۔ جن میں ماسٹر دھنی چند کا لڑکا مٹی چند بھی تھا۔ وہی چند چونکہ اسکول میں ماسٹر تھے۔ اس لئے سب لڑکے ان سے ڈرتے تھے اور ادب بھی کرتے تھے۔

آج کے اجلاس میں ایجنڈہ وہ عورت تھی۔ باقر علی نے بات کا آغاز کیا بولے۔ ”لودیکھو ایک عورت وہ بھی

☆ (145) ☆

کہہ دیں گے اور پانی مانگیں گے۔“

سالار خان نے گردن ہلا کر کہا۔ ”یاری تیری کھوپڑی خوب چلتی ہے۔ ترکیب تو قابل عمل ہے۔“

باقر علی نے بھی اس کو قابل عمل قرار دیا اور متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا کہ باقر علی، سالار خان اور شوکت تینوں کل دوپہر کھانے کے بعد اس آسیب زدہ مکان کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ دوسرے دن بارہ بجے ہی تینوں دوست جمع ہو گئے۔ ابھی وقت تھا وہ مکان کے سامنے سے گزرتے آئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ کچھ ہی دور آسموں کا بارغ تھا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ بارغ کے رکھوالے رجمو چچا کی نظر جوان پر پڑی تو وہ ان کے پاس آ گئے، بولے۔ ”یہ آج چندال چوکڑی اس طرف کیسے آگئی، ابھی تو بور بھی نہیں آیا۔“ باقر علی بولے۔ ”ہم کو پتہ ہے چچا، ہم تو ایسے ہی سیر کرنے آئے ہیں۔“

”یہ دوپہر میں سیر کرنے کی کیا سوچھی۔ اب سیدھے گھر چلے جاؤ، نہیں تو پھر میں شام کو خود ہی تمہارے گھر سیر کرنے آ جاؤں گا۔“ رجمو نے لتاڑا۔

”ٹھیک ہے چاچا۔ چلے جاتے ہیں۔ تم کہاں ہمارے گھر خانے کی تکلیف کرو گے۔“ شوکت علی نے کہا۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔“ سالار خان بولے۔ ”مگر چند منٹ تو ذرا پانی پتہ کر لیں، دھوپ سے آئے ہیں۔ پھر چلے جائیں گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پی لو پانی کوٹھریا کے اندر گھڑے میں بھرا ہے اور ہاں اب دوپہر میں تم کو اس طرف کبھی نہ دیکھوں۔“ یہ کہہ کر رجمو بارغ میں چلے گئے تو باقر علی نے کہا۔

”یار یہ بہت برا ہوا۔ اگر چچانے گھر بتا دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کیا جواب دیں گے؟ اموں کا موسم ہوتا تو ایک بہانہ بھی تھا۔“

”شوکت نے ہمارے پلان میں رجمو چچا کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ادھر آتے ہی نہیں جو ہوا سو ہوا۔ آگے کی سوچو۔“ سالار خان بولے۔

”پر گرام تو وہی چلے گا۔“ باقر علی نے کہا۔

”تو پھر آؤ اب چلتے ہیں کچھ پہلے پہنچ جائیں گے اور کیا ہوگا۔“ شوکت نے جواب دیا۔ اور تینوں بارغ سے نکل آئے۔ بارغ کے ختم ہوتے ہی کھیت تھیں اور ان کھیتوں کو پار کر دو مکان سامنے تھا، وہ تینوں دروازے پر پہنچ گئے۔

دور دور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ دروازے کے باہر بھی جھاڑ جھکڑاگا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے مدت سے بند پڑا ہے۔ تینوں دروازے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ باقر نے اشارہ کیا اور سالار نے دروازے پر ہاتھ مارا پھر اور زور سے ہاتھ مارا مگر کچھ نہ ہوا۔ باقر نے بھی دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ بہت کوشش کر لی مگر جواب نہ ارد۔ باقر نے کہا۔ ”یار لگتا ہے اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔“

”اگر کوئی نہیں تو تالہ وغیرہ تو لگا ہو، وہ بھی نہیں ہے۔“ شوکت نے کہا۔

”ارے یار، ادھر کون آتا ہے۔ سوچا ہوگا کہ ضرورت کیا ہے تالے کی۔“ سالار نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ واپس چلتے ہیں۔ خالی گھر میں جانا مناسب بات نہیں ہے۔“ باقر نے کہا۔

”تو پھر آؤ۔“ اور تینوں پلٹ پڑے۔ دو قدم ہی چلے تھے کہ دروازے کی چرچراہٹ کی آواز پر پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر پھر دروازے کے قریب آ گئے تو اندر سے آواز آئی۔ ”اندر آ جاؤ، باہر کیوں کھڑے ہو۔“

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سب سے پہلے باقر نے قدم دروازے کے اندر رکھ دیے۔ باہر سے یہ مکان جتنا گندا اور کوڑے کرکٹ سے بھرنا نظر آتا تھا۔ کرہ ایسا نہ تھا۔ یہ ایک بہت کشادہ کرہ تھا۔ کمرے میں قالین پڑا تھا اور قدیم زمانے کے اشکال کا فرنیچر بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر باریک جالی کے سفید پردے پڑے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے ہوا اندر آرہی تھی۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں

لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں کسی باہر مصور کی بنائی ہوئی لگتی تھیں۔ نہایت صاف اور واضح نقوش بنائے گئے تھے۔ خاص طور سے ہر تصویر کی آنکھیں تو زندہ آنکھیں لگتی تھیں۔ تینوں حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ایک نسوانی آواز سب کے کانوں میں آئی۔ مگر وہ حیرت کی تصویر بنے کھڑے ہی رہے تو پھر حکم ہوا۔ ”سنائیں بیٹھ جاؤ۔“ تینوں نے جلدی سے اس حکم پر عمل کیا اور بیٹھ گئے۔ پھر نسوانی آواز نے کہا۔ ”بہت عرصہ کے بعد اس گھر میں کوئی سہمان آیا ہے۔ بولو تمہاری کیا خاطر کی جائے۔“ مکران کی زبان تو تالو سے چپک گئی تھی۔ کہتے کیا خاموش تھے۔ ”ملاقات کرنے آئے تھے بولو۔“ پھر آواز آئی۔

”باقر علی بکلا کر بولے۔“ جی جی جی ہاں۔“ ”ملاقات کے بعد تم کیا کرو گے۔ سب کو جا کر بتاؤ گے اعلان کرو گے۔“ آواز آئی۔

”نہیں آپ منع کریں گی تو نہیں بتائیں گے۔“ سالار نے ہمت کر کے جواب دیا۔

”تم بتا کر بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ یہ بات سمجھ لو کہ مجھے تمہاری ضرورت تو تھی مگر تم خود آ جاؤ گے، اس کا پتہ نہیں تھا۔ میں کون ہوں، تم یہی کہو ج کرنے آئے ہو تم کو پتہ نہیں کہ اس گھر میں آنے کا تو راستہ ہے مگر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب تم یہاں پر ہی رہو گے..... تمہاری بھی ایک تصویر لگ جائے گی۔ تم بھی سب کو دیکھ سکو گے مگر رہو گے فریم کے اندر ہی۔“

تینوں نے ڈرتے ڈرتے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمت کر کے باقر نے کہا۔ ”ہمیں معاف کر دو، غلطی ہو گئی۔ پھر کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔“

”ایسا تو آج تک ہوا نہیں۔ کھڑے ہو جاؤ اور دوسرے کمرے میں چلو۔“ یہ سنتے ہی وہ غنودگی کی سی حالت میں کھڑے ہو کر دوسرے کمرے کی طرف چلے۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے اندر آتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ یہ کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔

کھڑکیاں کھلی تھیں اور ہوا آ رہی تھی۔ اس کمرے میں تین چمک اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ تینوں چمکوں پر صاف بستری لگے تھے اور میز پر کھانا چڑھا ہوا تھا اور کھانے کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ آواز کس طرف سے آئی، یہ پتہ نہیں چلنا تھا۔

”کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔ اب تمہارا بیکی کام ہے۔“ ”ہمیں جانے دو۔ پھر پھر آئیں گے۔“ شوکت نے گڑ گڑا کر کہا۔

”جانے والی بات بھول جاؤ۔ تم کو بتایا تھا کہ آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں ہے۔“ باقر نے ہمت کر کے کہا۔ ”تم کہاں ہو، سامنے تو آؤ۔“

”یہ خواہش بھی پوری کر دوں گی۔ جلدی کیوں ہے۔ اب تو تم کوڑھنا ہی یہاں پر ہے۔“ آواز آئی۔

کوئی کچھ نہ بولا تو پھر آواز آئی۔ ”کھانا اگر نہ کھایا تو پھر کبھی کھانا تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ میں تم کو بھوکا نہیں رکھنا چاہتی۔ اس لئے کھاؤ۔“

تینوں یہ سن کر میز پر آ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانا تازہ تھا اور نہایت لذیذ تھا۔ خاص طور سے گوشت سے بنی ہر چیز بے حد لذیذ تھی۔ تینوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ایک مشروب سرخ رنگ کا جگ بھر کر میز پر آ گیا۔ پہلے تو وہ اس بات سے حیران تھے کہ مشروب میز پر کس طرح آیا۔ دوسرے مشروب بھی اتنا خوش ذائقہ تھا کہ تینوں نے خوب پیا۔ اس کے پینے ہی ان پر غنودگی سی سوار ہو گئی اور وہ بستروں پر لیٹ گئے اور چند منٹوں میں ہی وہ بے خبر پڑے۔ سو رہے تھے۔ کب رات ہوئی اور ختم ہو گئی۔ ان کو پتہ نہ چلا۔ صبح پھر ان کو بہترین کھانا کھلایا گیا۔ اتنا مرغین اور اچھا کھانا کھا کر بھی ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ ان میں دن بدن تبدیلی ہو رہی تھی۔ ان کے قدم کہ ہورے ہو اور جسم چپٹا ہوتا جا رہا تھا اور وہ گھٹتے گھٹتے اتنا ہو گیا کہ ایک فریم میں آ جائے۔ پھر ان کو ایک فریم میں دیوار پر آویزاں کر دیا گیا۔ اب ان کے جسم کی حرکت بند ہو گئی اور وہ ایک تصویر کی مانند دیوار پر لٹک گئے۔

سراغ نہ ملا۔

پولیس واپس آگئی۔ تینوں گمشدہ لڑکوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بات خورشید کے اوپر آگئی۔ اس عورت کا پورا حلیہ خورشید نے پولیس کو بتادیا۔ SP نے خورشید کو پابند کر دیا گیا کہ وہ عورت اب آئے تو وہ اس کو روک لے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ حسب دستور آئی اور کرایہ ادا کر کے چلی گئی۔ خورشید نے یہ بھی پولیس کو بتادیا۔ اب صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ اس کی آمد کے دنوں میں خورشید کے گھر خفیہ طور پر کچھ آدمی مقرر کر دیئے جائیں۔ وہ عورت آئے تو اس کو چھاپ لیں۔ مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ وہ دن کے وقت آئی اور چلی گئی جو آدمی مقرر تھے وہ سوئے رہ گئے۔ اب ذرا SP پریشان ہوا۔ وہ آتی ہے کوئی نہیں دیکھتا اور چلی جاتی ہے، کوئی نہیں روکتا۔ SP کے سامنے ایسا عجیب و غریب کیس پہلی بار آیا تھا۔ وہ ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر اب سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ واقعات جس غیر متوقع طریقہ پر پیش آرہے تھے اس نے اس کا دماغ چکر کر رکھا تھا۔ وہ ایک دلیر آفسر تھا مگر دلیری اپنی جگہ الگ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پراسرار واقعات اور اس عورت کا کردار کس خانے میں رکھا جائے۔ وہ اب اس لائن پر سوچ رہا تھا جس پر اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ قائل ہوتا جا رہا تھا۔ دنیا میں طاعون تو تین بھی ہوتی ہیں۔ ان سے دست گریبان ہونا مشکل ہوتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک بدمذہب تھا۔ اس نے جس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا، اس کو کامیابی سے ختم کیا تھا اور یہاں پر وہ اب تک اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس نے اس مکان کی نگرانی ختم نہیں کی تھی اور خورشید کے ساتھ بھی آدمی لگائے ہوئے تھے۔ مگر کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آرہی تھی۔ اوپر سے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ SP کو ہر حال میں مجرموں کو پکڑنا تھا۔ وہ جادو یا سحر کو نہیں مانتا تھا کیونکہ اس کی پرورش اور تعلیم جس ماحول میں ہوئی تھی وہ مادہ پرست ماحول تھا۔ اس نے ان لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جو جادو یا سحر کے جانے والے تھے۔ پنڈت شکلا پروفیسر تھے۔ کانج

صرف آنکھیں ہی تھیں جو صرف سامنے کے رخ پر دیکھ سکتی تھیں۔ ان کو بھی حرکت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سارا کام پورے ایک ماہ میں ہوا۔ ان تینوں کے غائب ہونے پر بڑا ہنگامہ مچا رہا۔ ان تینوں کو آخری دفعہ رجیو نے دیکھا تھا اور اس نے جود دیکھا تھا سب کو بتادیا۔ مگر فائدہ کچھ نہ ہوا۔ ہر ماہ وہ عورت خورشید غلی کو کرایہ ادا کرنے آتی رہی مگر ہر دفعہ ایسا ہوا کہ اس کی بیوی گھر پر نہ ہوئی۔ اس عورت کو صرف خورشید نے دیکھا۔ بیویاں بھی عورت کو دیکھنے کے مشتاق تھے مگر وہ جب بھی آئی، صرف خورشید ہی اکیلے ہوتے تھے۔ خورشید کی زبانی جو کچھ لوگوں کو پتہ چلا وہ وہی جانتے تھے۔ آخر پولیس کو تو پوری تحقیقات کرنا تھیں۔ تین جوان لڑکے اچانک غائب ہوئے تھے۔ ہوتے ہوتے بات خورشید تک آگئی اور اس نے کرائے پر مکان اٹھانے کے بارے میں جو حقائق تھے، پولیس کو بتا دیئے۔ الہ آباد کا SP انگریز تھا۔ وہ خود کیس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے اس مکان پر چھاپے مارنے کا پروگرام بنالیا۔ اور ایک رات اچانک وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ اس مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان کے چاروں طرف پولیس کے چوکس جوان بچے، ہتھیاروں کے ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار کھڑے تھے۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ SP کے اشارے پر دروازے پر دستک دی گئی۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر کوئی سانس روکے خاموش تھا۔ دروازہ بند تھا۔ پھر زور سے بجایا گیا۔ جواب نہ ملا اور پھر چار جوانوں نے زوردار دھک دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ ایک جڑے اہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مدت کے بعد اس کو کھولا گیا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک چمکاؤڑوں کا جھٹھا بھرا اندر کا باہر نکلا اور باہر پرداز کر گیا۔ اندر روشنی ڈالی گئی۔ کمرے کے اندر کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا اور اس میں کیڑے مکوڑے مڑگشت کر رہے تھے۔ اس مکان میں چار کمرے نیچے تھے اور چار اوپر ہر کمرے کی حالت خراب تھی۔ کوئی یہاں رہ سکتا ہے۔ ایسی کوئی علامت نہیں تھی۔ سارے کمروں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ مگر کچھ

بتادوں گا۔“

مگر پروفیسر نہ آسکا۔ وہ رات کو ہی مچھلی شہر چلا گیا تھا اور اُدھی رات کے بعد وہ اس مکان کے دروازے پر تھا اور وہ بھی دروازے کے اندر چلا گیا اور پھر واپس نہ آسکا۔ پروفیسر جانے سے پہلے اپنے پروگرام کی تفصیل تحریر کر گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پروفیسر بھی اسی مکان کی مصیبت چڑھ گیا ہے۔

SP کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔

یہ واقعات اخبارات میں آرہے تھے۔ مگر میری نظر سے صرف پروفیسر کی خبر گزری اور جو تفصیل لکھی تھی، وہ میں نے رولو کا کو بتائی تو اس نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہوا یہ سلسلہ ابھی آگے بھی چلے گا۔“

”کیا خیال ہے، ایس پی اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔ معاملہ بہت خطرناک لگتا ہے۔“

”تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ الہ آباد چلتے ہیں۔ وہیں پر ملاقات کریں گے۔“

اور پھر ہم دونوں الہ آباد کی طرف چل دیے۔ SP

اینڈرسن نے فوراً ہم کو بلا لیا اور پوچھا۔ ”آپ کو کس طرح پتہ

چلا کہ مچھلی شہر میں یہ انوکھے واقعات پیش آرہے ہیں۔“

”مجھے گزشتہ واقعات کا تو علم نہیں ہے مگر پروفیسر شکلا والا

کیس میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔“ میں نے جواب دیا

تو SP نے پوچھا۔ ”آپ ضرور میری مدد کر سکتے ہیں اسی

لئے آپ نے رابطہ کیا ہے۔“

”میں تو صرف حکیم ہوں۔ یہ میرے دوست حکیم

کامل ہیں۔ ان کو پوری تفصیل آپ بتائیں۔“ میں نے

رولو کا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”دل حکیم کامل میں ملتا ہوا۔“ اور پھر اس نے

پوری کہانی بیان کر دی۔ ”خوشہیدی ابی آدمی ہے جس نے

اس عورت کو کئی بار دیکھا ہے۔ آپ اس سے ملنا چاہیں تو اس

کو بھی بلایا جاسکتا ہے اور جو ضروری مدد میں کر سکتا ہوں،

کروں گا۔ آدمیوں کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی دوں گا۔“

SP نے تفصیل بتادی۔

”میں صرف خورشید سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔“

میں پڑھاتے تھے مگر شوقیہ طور پر وہ جادوگر بھی تھے۔ وہ بہت کم اپنے بارے میں بتاتے تھے۔ ان کی رہائش الہ آباد میں تھی۔ SP نے ان کے بارے میں کسی سے سنا تو خود ان سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر گیا۔ اپنا تعارف کرایا اور پھر آئے کہ مقصد بیان کیا۔ اپنی پریشانی بتائی تو پروفیسر شکلا نے جواب دیا۔

”جادو کیا ہے۔ یہ سوال بہت پرانا ہے۔ اس کا

جواب ہر کوئی اپنے انداز میں دیتا ہے۔ میں بھی اپنے انداز

میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ جادو ایک علم ہے۔ یہ علم ارادے

کی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی منشاء کے مطابق کسی بھی چیز

میں تبدیلی ہوتی ہے۔ وہ کس طرح ہوتی ہے۔ یہ بے شک

پر اسرار ہے۔ اس کی مناسب اور ضرورت کے مطابق مقدار

کو مناسب ذریعہ سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ پھر مطلوبہ

تبدیلی واضح ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عامل اس

قابلیت اور صلاحیت کا جو ضروری قوتوں کو استعمال کرنا

جانتا ہو۔ دوسری صورت میں خود عامل نشاندہ بن سکتا ہے۔

دوسرے عامل کو جن حالات اور ماحول میں کام کرنا ہے اس

کا بھی پورا پورا اندازہ ہو۔ اگر نئی جگہ، نئے ماحول میں ہے تو

نا کام بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک دماغی کاوش ہے۔“

”یہ واقعات جو اس مکان میں ہوئے، ان کا تعلق

کسی جادو یا سحر سے ہے۔“ ایس پی نے پوچھا۔

”قدرت کے ہزار ہا انوکھے عجوبوں کی طرح جو

ازل سے آج تک ہیں۔ انسانی سمجھ میں یہ اب تک نہیں

آئے ہیں اور سمجھ میں آئیں گے بھی نہیں۔ اس نے کوئی ایسی

مخلوق بھی پیدا کی ہو اور اس کو کچھ مخصوص قوتیں بھی دی

ہوں۔ میری عقل اور علم یہاں آکر خاموش ہو جاتی ہے۔ نہ

صرف میں بلکہ دنیا کا کوئی آدمی اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔

بہر حال میں وعدہ نہیں کرتا۔ کوشش ضرور کروں گا کہ کچھ کھوج

لگاسوں۔“ پروفیسر شکلا نے جواب دیا۔

”اس کے لئے آپ کو کتنی مدت درکار ہوگی؟“

SP نے پوچھا۔

”صرف آج کی رات، صبح میں آکر آپ کو

رولوکا نے جواب دیا۔

”اس کو میں ابھی بلوائے لیتا ہوں۔ اس۔ ملاوہ آپ کو کس چیز کی ضرورت ہوگی؟“ SP نے۔ یہ۔
”میرا کام کرنے کا اہلگ انا۔“ یہ۔ مجھے کئی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ رولوکا۔ ۰۔ ب دیا۔

”بت۔۔۔ ہم کمال کہ میں اب کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ پروفیسر کی گمشدگی میرے کھاتے میں ڈال جا رہی ہے میرے اوپر بھی بہت دباؤ ہے۔ آپ کو میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔“

SP نے جواب دیا۔

”میں اکیلا کام کرنے کا عادی ہوں۔ میں جس انداز میں کام کروں گا۔ آپ میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔

آپ اطمینان رکھیں۔“ اور خورشید کو بلوائیں۔“ رولوکا نے کہا۔

کچھ دیر میں خورشید علی بھی آگئے۔ رولوکا نے اس عورت کا چلنے پھرنے کا انداز اور حلیہ سب پوچھ لیا اور خورشید کو واپس کر دیا۔ ”اب آپ آرام کریں۔ میں کل صبح ملاقات کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”کیا آپ کا ارادہ آج اس مکان میں جانے کا ہے؟“ SP نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے چلا جاؤں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میرا مطلب تھا کچھ آپ کی مدد کا بندوبست کر دیا جائے۔“ SP نے کہا۔

”اس کی ضرورت ہوگی تو بتاؤں گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

ہمارے رہنے کا بندوبست سرکاری سطح پر SP نے

کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد رولوکا نے کہا۔ ”اچھا حکیم

صاحب میں تو چلتا ہوں ڈیوٹی پر۔ آپ آرام کریں۔“ اور

رولوکا روپوش ہو گیا۔

مچھلی شہر زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے مگر ضروریات زندگی

کی ہر چیز یہاں پر ہے۔ بازار بھی اچھا ہے مگر آٹھ بجے ہی

سب دوکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ دوسرے ان تین لڑکوں کی

گمشدگی نے لوگوں کو اور ڈرا دیا ہے۔ اس لئے اور جلدی

گھروں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

میں اس گھر کے قریب آموں کے باغ میں کھڑا

تھا۔ نظریں البتہ اس مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پوری

طرح دروازے کو دیکھ سکتا تھا میں اس کے کھلنے کا انتظار

کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ دروازہ کھلا۔ میں تیزی سے

اس کی طرف بڑھا۔ ایک عورت سیاہ لباس میں دروازے پر

کھڑی تھی۔ میں اس کے بالکل سامنے تھا مگر وہ مجھے نہیں

دیکھ پا رہی تھی۔ اب وہ دروازے سے چند قدم آگے آگئی

تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ پھونک پھونک کر کیوں قدم آگے

بڑھا رہی ہے۔ وہ اور چند قدم آگے آگئی۔ اب اس کو پکڑنا

آسان تھا۔ میں نے جاگتے الو کو اشارہ کیا۔ اور وہ ہوا کی

طرح اس پر آیا، مگر وہ بھی لمحہ بھر میں زمین پر لیٹ گئی اور الو

اس کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ لینے لینے تیزی کے ساتھ لوٹ

لگاتی دروازے کے اندر چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں

نے گھر کا چاروں طرف سے اچھی طرح معائنہ کیا۔ کمروں

کے درمیانی حصہ پر چھت نہیں تھی۔ رات اس قدر سیاہ تھی کہ

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی کین گاہ میں بند ہو چکی

تھی۔ ظاہر ہے وہاں پر اس کی طاقت زیادہ ہوگی۔ میں کھلے

میدان میں تھا۔ اس کی طاقت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بھر

اس کو باہر لانا تھا۔ مگر اب وہ ہوشیار تھی۔ آسانی سے تو باہر نہیں

آئے گی۔ میں نے سوچا۔ میں نے اپنے کارندے چاروں

طرف لگا دیے۔ کوئی بھی نکلے، اس کو گرفتار کرنا ہے۔ یہ

ہدایت کردی اور میں وہاں سے چلا گیا۔ میرا سفر بہت لمبا

تھا۔ اگر کسی سواری پر کریں تو مہینہ لگ جائے۔ میری واپسی

بھی دوسری رات ہوئی۔ اس دوران کوئی باہر نہیں آیا۔

میں ایک بوٹی لینے گیا تھا۔ اس بوٹی میں یہ خاصیت

ہے کہ جہاں اس کو پھیلا دیا جائے وہاں پر کوئی بدروح اور

جنات نہیں رہتے۔ کیونکہ اس میں اس قسم کی بو ہے جو آدمی کو

تو محسوس نہیں ہوتی مگر ماریائی تو توں کو محسوس ہوتی ہے۔ میں

نے مکان کے ہر سمت اس کو پھیلا دیا۔

دن میں بھی میرا قیام وہیں پر رہا۔ دوسری رات دس

بجے آسمان پر کچھ ہلچل معلوم ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ

جودار کر رہا ہے۔ تم اندر کیا کر رہے ہو۔ جاؤ لڑو اس سے۔“
ان میں سے ایک بولا۔ ”کس سے لڑیں، سامنے
کوئی ہو تو لڑیں۔ نظر تو آتا نہیں۔“
وہ بولی۔ ”ہاں یہی تو خرابی ہے وہ ہم کو دکھ رہا ہے
اور ہم اندھے ہیں۔“
”تو کیا ہمیں پھر زمین کے اندر جانا ہوگا۔“ ایک
پھر بولا۔

”اتنی آسانی سے تو میں ہار نہیں مانوں گی۔“ وہ بولی۔
”تو پھر ہم مرتے رہیں گے۔ اب ہمارا پروگرام تو
آگے نہیں چلے گا۔“ پھر کوئی بولا۔
”صبر کرو، کوئی راستہ میں نکالوں گی۔ کون ہے؟ میں
پتہ چلاتی ہوں۔“ وہ بولی۔

اس نے میز کے اوپر آسن بجالایا اور جسم کے سارے
کپڑے اتار دیئے۔ سامنے کے رخ سے وہ ایک بھر پور
عورت نظر آتی تھی۔ مگر پیٹھ کی طرف سے وہ ایک کیڑوس کی
طرح سیدھی اور سپاٹ تھی۔ ان سب میں وہی قد آور تھی۔
باقی سب کے قد بہت چھوٹے تھے۔ اس نے اپنے لباس
میں سے ایک دیا نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ اس دیئے میں اپنے
بالوں کی ایک لٹ لگادی اور اپنی انگلی کو دانتوں سے چبا کر
زخمی کیا اور خون دیئے میں بھرے لگی۔ جب دیا پورا بھر گیا تو
اس نے انگلی منہ میں ڈالی۔ پھر ایک بوتل موم بتی لے کر آگے
بڑھا اور اس عورت کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

”تم سب دیکھو گے کون ہے جودار کر رہا ہے۔ اس
دیئے کے روشن ہوتے ہی سب کچھ سامنے آجائے گا۔ میں
زمین کی ساتویں تہہ کی شہزادی ہوں۔ یہ زمین کے اوپر بسنے
والی کمزور مخلوق میرا پروگرام کیا گاڑے گی۔ میں اس زمین پر
راج کرنے آئی ہوں۔ ابھی تو میں نے آغاز کیا ہے۔“ اور وہ
موم بتی کو چراغ کے قریب لے گئی مگر وہ اس چراغ کو جلا نہ سکی
کیونکہ ہوا کا ایک تیز جھونکا ایسا آیا کہ چراغ الٹ گیا۔ اس پر
بڑی بالوں کی لٹ انگلی اور خون میز پر پھیل گیا۔ موم بتی اس
کے ہاتھ میں البتہ جلتی رہی۔ وہ غصے سے میز پر کھڑی تھی۔
اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کو اپنی برہنگی کا ذرا

لوگ آموں کے باغ کے پاس اترے ہیں وہ زیادہ بڑے نہ
تھے۔ ان کے قد چھوٹے اور چپٹے چپٹے تھے۔ ان کی چال
ایسی تھی جیسے وہ سائیکل پر ہوں۔ میں نے اپنی فوج کو اشارہ
کر دیا۔ الو نے ان کو اندھا کرنا شروع کر دیا اور ایک خوشخوار
ٹڈی دل ان پر ٹوٹ پڑا۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ چند
منٹوں میں ہی ان کا صفایا ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا
کہ حملہ کس نے کیا۔ ان کی نظریں میرے حملہ آوروں کو نہیں
دیکھ سکتی تھیں۔ باہر کی ملک تو ختم ہو گئی۔

میں مکان کے اس حصہ کی طرف چلا۔ جدھر چھت
نہیں تھی۔ میرے ساتھ دونوں الوداعیں بائیں موجود تھیں۔
میں اس کھلے حصے کی طرف سے مکان کے اندر کود گیا۔ اندر
گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں نے
ایک کمرے کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے
اندر چلا گیا۔ اندر سخت بدبو تھی۔ گوشت کے سڑنے کی بدبو،
ہر طرف کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایسی
جگہوں پر چگاڑیں اپنا پیرا کرتی ہیں وہ بھی نہیں تھیں۔ پھر
میں نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ یہاں پر بھی یہی
حال تھا۔ سارے کمروں میں کوئی نہیں تھا۔ ایک دروازہ اور
نظر آیا۔ اس میں کوڑا نہیں تھا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ وہ
زیلہ تھا اور سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ہریڑھی ایک فٹ
سے زیادہ کی تھی اور میرے اندازے کے مطابق پچیس تیس
سیڑھیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا میں زمین کے اندر تیس
فٹ نیچے تھا۔ یہ مکان جس نے بھی بنایا تھا، حیرت انگیز تھا۔
زمین میں اس قدر نیچے ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اس ہال میں
ایک بڑی سی موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف
دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں بڑی تھیں جن پر وہی چھوٹے
چھوٹے اور چپٹے لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں انسانوں
جیسی ہی تھیں مگر دہانے ضرورت سے زیادہ بڑے تھے اور
ماتھے ابھرے ہوئے تھے۔ وہ سب خاموش تھے جیسے کسی
سوگ میں بیٹھے ہوں۔ میں بھی ایک کونے میں کھڑا تھا۔ کچھ
یہ دیر میں ایک کچھ شیم قد آور عورت اندر آگئی اور بولی۔
”ساری محنت ضائع گئی۔ سب مارے گئے۔ کون ہے

احساس نہیں تھا۔ وہ دھاڑ کر بولی۔ ”کوئی ہے، چھپ کر وار کرتا ہے، سامنے تو آ.....“

ہر طرف خاموشی رہی تو وہ پھر بولی۔ ”کمائی سامنے آ۔“ مگر کسی طرف سے حرکت نہیں ہوئی تو وہ پھر زور سے دھاڑی۔ ”کمائی کیا سنتا نہیں سامنے آ۔“ مگر ہر طرف خاموشی رہی۔

وہ میز سے اتر آئی اور ایک بونے کے پاس جا کر اس کو ہلایا۔ وہ ایک طرف گر گیا۔ پھر دوسرے کو ہلایا۔ وہ بھی ایک طرف گر گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح جیتی۔ ایک وار اور وہ لمحہ بھر میں سیڑھیاں پھلانگی اور دوڑ گئی۔ میں بھی تیزی سے اوپر آیا مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ سارے گھر میں اس کو تلاش کیا گیا مگر اس کا پتہ نہ تھا۔ صبح تک میں وہیں رہا۔ سورج کی روشنی میں گھر کی تلاشی لی مگر کوئی نہیں تھا۔ رات کو جو بونے مارے گئے تھے وہ بھی نہیں تھے۔ ان کی جگہ پر تازہ مٹی جیسی کہ زمین کھودنے پر نکلتی ہے، بڑی تھی۔ سارے کمروں میں کچھ نہیں تھا۔ صرف تہہ خانے کے ایک طرف کچھ فریم پڑے تھے۔ سالنوردہ تصویر کسی میں نہیں تھی۔“

ساری وروداد سننے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”وہ تو زندہ ہے۔ کسی اور صورت میں پھر نمودار ہو سکتی ہے۔“

”یہ بات تو خطرناک ہے۔“ SP نے بھی کہا۔ ”ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔ دوسرے ان کے آنے کے راستے کو بھی بند کرنا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”ایک بات اور تم نے بتایا کہ وہ ہوا میں اڑ کر بھی آئے تھے وہ کیا تھا۔“

”ان کے پاس ایسا کوئی علم ہے کہ وہ آسمانوں میں پرواز کر لیتے ہیں مگر میرا خیال ہے، وہ زمین کے اندر سے ہی آتے ہیں۔ سراغ صرف یہ لگانا ہے کہ یہ آتے کہاں سے ہیں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ SP نے پوچھا۔ ”آپ مالک مکان خورشید سے وہ مکان حاصل کر لیں۔ گزربڑ مجھے اسی مقام پر لگتی ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

خورشید علی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ مکان سرکاری تحویل میں آ گیا اور رولوکا نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس مکان کو ڈھانے کا بندوبست کیا۔ یہ کام چند روز میں ہو گیا۔ ملبہ وغیرہ ہٹا دیا گیا۔ پھر کھدائی کروائی گئی اور پورے تہہ خانے کو ختم کر دیا گیا اور پھر اس میں مٹی بھرادی گئی اور پانی چھوڑ دیا گیا۔ اب مکان کی جگہ میدان تھا مگر ایک کنواں اب بھی باقی تھا۔ کنواں اچھا بڑا تھا، مگر پانی وغیرہ کچھ نیچے نظر نہیں آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی دیواروں پر خود رو جھاڑیاں بے تحاشا لگی ہوئی تھیں۔ ہر روز رسول کی مدد سے لوگ لٹکتے اور جھاڑیاں کاٹتے۔ کام کے دوران ہر وقت رولوکا وہاں موجود رہتا۔ پچاس فٹ تک جھاڑیاں صاف ہو گئیں۔ مگر اب بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کام جاری رہا۔ پچاس فٹ اور جھاڑیاں صاف کر دی گئیں۔ کنویں کے اندر ہوا کا دباؤ کم ہو گیا اور بڑے بڑے پتے اوپر لگا کر کام جاری رکھا گیا۔ مگر سب حیران تھے کہ یہ کنواں تو شیطان کی آنت کی مانند تھا کہ گہرائی کہیں ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ پچاس فٹ اور کوشش کی گئی مگر کنویں کا آخر نہیں ملا۔ اندر کام کرنا دشوار ہوتا گیا۔ مزدور بے ہوش ہونے لگے تو کام بند کرنا پڑا۔ رولوکا اور سب کو یقین آ گیا کہ یہی وہ راستہ ہے جہاں سے یہ چھپے لوگ زمین کے اوپر آتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ راستہ زمین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور ابھی کتنی گہرائی باقی ہے۔ اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے اندر کون کام کرے گا، سب مزدوروں کو فارغ کر دیا گیا۔ اس میدان میں جہاں وہ گھر تھا، پولیس کے جوان مورچہ لگائے تھے اور کنویں کے گرد رولوکا کے اپنے کارندے موجود تھے۔

رولوکا اس راستے کو بند کرنے سے پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کتنا لمبا راستہ ہے۔ اس نے سب کوراثت میں رخصت کر دیا۔ پولیس کے کسی جوان کو میدان میں نہیں رہنے دیا اور کنویں کے اندر اتر گیا۔ وہ روپوشی میں تھا۔ اس حالت میں وہ بے وزن اور تیز رفتار بھی ہو جاتا تھا۔ وہ ہوا کی طرح نیچے جا رہا تھا۔ وہ جتنا اترتا جاتا تھا، جھاڑیاں گھنی ہوتی جاتی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں ایک بیر کی شکل کا پھل بھی لگا

وایسے سورخ سے ایک چپٹا بونا نکلا اور اس نے اپنی پیٹھ دیوار پر لگا دی اور چٹان کی دیوار کے ساتھ پھسلا ہوا بڑے آرام سے زمین پر آگیا۔ ان کی سپاٹ پشت کی افادیت اس کی سمجھ میں آگئی۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ نرالی دنیا تھی۔ وہ گھومتا رہا۔ عورتیں سب عورتیں تھیں۔ نہ ان میں کوئی بوڑھی تھی نہ جوان۔ سب ایک جیسی تھیں۔ مرد سب مرد تھے۔ ان میں بھی عموں کا فرق نہ تھا۔ بچے ضرور بچے نظر آتے تھے۔ ان سب کے رنگ ایک جیسے تھے۔ سب مٹیالے رنگ کے تھے اور سب ایک ہی قد کے تھے۔

رولوکا ایک نہ تھکنے والا انسان تھا۔ وہ ان کے مکانوں کے اندر بھی گیا۔ ہر سورخ میں کئی کئی مرد اور کئی کئی عورتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ مرد ایک طرف چٹانوں کے پار جاتے تھے۔ وہ وہاں سے کھانے کو کچھ لاتے تھے۔ پانی کی وہاں کی نہیں تھی۔ ایک فٹ گڑھا بنالیا اور پانی نکال لیا۔ مرد جو بڑا کوئی چیز لاتے تھے۔ وہ سب مل کر اس کو کھاتے تھے۔ یہ سب ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔

ان کا معاشرہ دنیا سے نرالا تھا۔ یہاں پر سونا ایک بہت معمولی چیز تھا۔ وہ وہاں تلاش کرتے تھے۔ یہ ان کے لئے بہت قیمتی دھات تھی۔ اس سے یہ لوگ ہتھیار بناتے تھے۔ زمین کھودنے کے اوزار بناتے تھے۔ آگ ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی تھی۔ ہر کوئی آگ نہیں جلاتا تھا۔ آگ سے یہ لوگ بہت ڈرتے تھے۔ یہاں پر کسی لباس کا تصور نہیں تھا۔ عورتیں اور مرد سب قدرتی لباس میں رہتے تھے۔

رولوکا کو تلاش تھی یہاں کے سردار کی، مگر سب ہی ایک جیسے تھے۔ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ان کی زبان نہیں جانتا تھا۔ ہاں اپنے علم اور چہرے کے تاثرات سے بہت حد تک بات سمجھ جاتا تھا مگر اپنی بات ان تک پہنچانے کو اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے چہروں اور جسم کی طرح ان کی زبان بھی چپٹی اور ٹیڑھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کی زبان میں بہت کم الفاظ تھے اور وہ زیادہ تر کام اشاروں کی زبان سے لیا کرتے

تھا۔ رولوکا نے پہچان لیا کہ یہ پھل پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں لگتا ہے۔ یہ زمین کی اتنی زیادہ گہرائی میں بھی لگتا ہے۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر جو پھل لگتا ہے اس کو کھانے سے بھوک اور پیاس دونوں ختم ہو جاتے ہیں اور توانائی بڑھتی ہے۔ یہ خاصیت زمین کے اندر پیدا ہونے والے پھل میں ہے کہ انہیں یہ دیکھنا ضروری تھا اور رولوکا کو رکنے کی فرصت نہیں تھی، وہ برق رفتاری سے زمین کے اندر سفر کر رہا تھا۔

آخر یہ سفر ختم تو ہوا تھا۔ کنواں نما سرنگ کے ختم ہوتے ہی وہ ایک میدان کے علاقے میں کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پرت دار چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی پرتوں کے رنگ الگ الگ تھے۔ کوئی پہلی پرت تھی، کوئی سرخ اور کوئی پرت ہری تھی۔ ہر پرت اپنی جگہ چمکدار تھی۔ یہاں نہ رات تھی نہ دن۔ سورج کی روشنی نہیں تھی۔ مگر اندھیرا بھی نہیں تھا۔ اس کو نہ دن کہہ سکتے ہیں نہ رات۔ دور دور کوئی نظر نہ آتا تھا۔

وہ اپنی روپوشی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ نئی دنیا تھی۔ اس کو سمجھنا ضروری تھا۔ دیکھنا ضروری تھا۔

ان کا علم کیا ہے، ان کی طاقت کتنی ہے۔ ان کے پاس کیا ہتھیار ہیں۔ یہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ یہاں اس کا کوئی کارندہ نہیں تھا۔ سب کچھ اس نے اکیلے کرنا تھا، ضروری تھا کہ خود کو چھپا کر رکھے۔

وہ چٹانوں کی طرف چلنے لگا۔ یہ قریب نظر آنے والی چٹانیں اتنی قریب نہ تھیں۔ اس نے دیکھا۔ چٹانوں کے اندر گول گول سورخ بنے ہوئے تھے۔ وہ ان کے اور قریب چلا گیا۔ اب اسے ان سوراخوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہر سورخ میں عورتیں اور مرد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ سورخ زمین سے زیادہ اونچے نہ تھے۔ مگر ایسے بھی تھے جو زمین سے بہت اوپر تھے مگر نہ کوئی سیرھی تھی نہ کوئی زینہ تھا۔ یہ لوگ اتنی اونچائی پر کس طرح جاتے ہیں۔ ابھی رولوکا یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بہت اوپر

تھے۔ یہاں پر سب کا صرف یہ کام تھا کہ غذا لانا۔ اس کو دھونا اور کھانا اور آپس میں کھیلنا۔ شرم و حیا، رشتے ناٹے کا یہاں پر کوئی تصور نہیں تھا۔ مرد صرف مرد تھے اور عورتیں صرف عورتیں تھیں۔

رولوکا کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس کو یہاں آئے، کتنا عرصہ گزرا ہے۔ واپس تو وہ کسی وقت بھی جاسکتا تھا مگر ابھی کام پورا نہیں ہوا تھا۔ اپنی دنیا سے رابطہ کرنے کا اس کے پاس ایک ذریعہ تھا۔ اس نے اپنا علم غلی پیٹھی استعمال کیا اور حکیم وقار کے ذہن تک پہنچ گیا۔

”میں رولوکا ہوں۔ آپ پریشان نہیں ہونا، میں آپ کے دماغ میں ہوں۔“

حکیم وقار چونک پڑے۔ ”تم واقعی رولوکا ہو۔۔۔۔۔“

انہوں نے پوچھا۔

”ہاں میں رولوکا ہوں، میری بات سننے میں زمین کے ساتویں پرست کے بیٹے ہوں، یہاں پر ایک دنیا آباد ہے مگر ہماری دنیا کی طرح مذہب اور ترنی یافتہ نہیں ہے۔ پوری تفصیل تو آکر بتاؤں گا آپ یہ بتائیں، وہاں کے کیا حال ہیں، وہ عورت دوبارہ اپنی جگہ نمودار ہوئی۔“

حکیم وقار نے بتایا۔ ”نہیں اس عورت کا کوئی پتہ نہیں ہے، یہاں پر امن چھینی ہے۔“

”میں پھر ضرورت پڑی تو رابطہ کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

میں پھر اسی مقام پر آیا، جہاں پر کنواں ختم ہوتا تھا، یہاں پر میں نے ایک کچی نشانی لگائی یہ نشانی ایسی تھی کہ کوئی اس راستے کو بند کرنا چاہے تو بھی بند نہیں کر سکتا۔ یہاں پر میں نے ہر آدمی کو چیک کیا، وہ سادہ لوگ تھے۔ ان میں کوئی ماورائی طاقت نہیں تھی تو پھر وہ کون لوگ تھے جو ہماری دنیا میں آئے تھے، وہ تو اڑھی رہے تھے اور وہ عورت تو کوئی جادوگر لگتی تھی۔ اب میرا ارادہ اور آگے بڑھنے کا تھا۔

میں چٹانوں کے اوپر چلا گیا۔ یہاں پر بھی دور دور اسی قسم کے سوراخ تھے اور ان میں لوگ آباد تھے۔ میں اور آگے چلا چٹانیں متواتر تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ میں اوپر کی بجائے اور

نیچے جا رہا ہوں۔ ہر جگہ چٹانوں پر ایک نیل نما پودا کثرت سے اگا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں پر میں نے اب تک کوئی پرندہ نہیں دیکھا تھا۔ جانوروں میں صرف بکری نما ایک جانور تھا جس کی دم بہت موٹی تھی اور اس میں سے ایک رس جیسا لگتا تھا اور اس کو یہ لوگ پیتے تھے۔ اس بکری نما جانور کی چھ ٹانگیں تھیں۔ چار پر یہ چلتا تھا اور دو کو ہاتھوں کی طرح استعمال کرتا تھا۔ چٹانوں میں میں نے ایک بہت بڑی بکری جیسا جانور بھی دیکھا جس کے لاتعداد جیر ہاتھ تھے اور یہ لوگ اس کا شکار کرتے تھے۔ یہ بڑا خطرناک اور طاقتور جانور ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے قابو آتا ہے، میں آگے بڑھتا گیا۔ اب میں ایک وادی نما جگہ پر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ایک کنوڑے میں آ گیا ہوں۔ میرے چاروں طرف چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ چٹانوں میں بڑے چھوٹے سوراخ نظر آرہے تھے۔ درمیان میں بہت بڑا میدان تھا اور اس سبزرار میدان کے درمیان ایک گول اور زمین سے دس بارہ فٹ بلند گیند نما ٹیکری ہے۔ میدان خالی پڑا ہے، میں اس ٹیکری پر چڑھ جاتا ہوں اور آرام کرنے کو آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور پھر میری آنکھ جب کھلتی تو دیکھتا ہوں۔ سارا میدان یہاں کی مخلوق سے بھرا ہوا ہے۔ ان لوگوں میں صرف مرد اور عورتیں ہیں۔ کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔ حیرت اس پر ہے کہ اتنے لوگ جمع ہیں اور کوئی شور نہیں ہے۔ سب لوگ آرام سے اپنی اپنی عورتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں کی عورت ہماری دنیا کی عورت کی طرح نہیں ہے۔ یہ بہت کم بولتی ہے اور مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اس کے لئے ہر مرد ایک جیسا ہے یہ کسی کو ناراض نہیں کرتی اور مرد بھی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ اس سے یہاں پر لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔ زرد زمین زن کے جھگڑے کو کوئی نہیں جانتا۔ ہماری دنیا میں صرف ان باتوں پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ میں نے اب تک کسی کو آپس میں لڑتے نہیں دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک طرف سے ایک شخص آنا نظر آیا وہ قد میں ان سے ذرا بڑا تھا۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی، اس کے

بالوں میں کچھ چندار چیز لگی ہوئی تھی، وہ بھی عام عورتوں سے زیادہ لمبی تھی۔ اب میں ان کی زبان پوری طرح سمجھ لیتا تھا۔ تھوڑی بولنے کی خود سے مشق کرتا تھا تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو کام چلا سکوں۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ وہ ٹیکری پر آگیا اور آتے ہی اس نے اپنے ساتھ آئی۔ عورت کو اپنے کندھے پر اٹھالیا۔ وہ عورت بھی برہنہ تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ سب لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے اور سب نے اپنی اپنی عورتوں کو کندھوں پر اٹھالیا اور جب اوپر والے مرد نے اپنی عورت کو کندھے سے اتار دیا تو سب نے اس کی تقلید کی اور خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اوپر والا مرد کھڑا رہا اور بولا.....

”اے دھرتی کے اندر بسنے والی مخلوق خوش ہو جاؤ کہ اب ہم دھرتی کے اوپر جانے والے ہیں۔ وہاں پردہ عیش و آرام ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں کھانے کو بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ طرح طرح کے جانور ہیں۔ ان کا نرم اور ذائقہ دار گوشت ہے۔ زمین کے اوپر بہت درخت ہیں۔ ان میں بڑے اچھے پھل ہوتے ہیں۔ ہماری دنیا میں کیا رکھا ہے۔ وہاں سورج ہے، گرمی ہے اور سمندر کا پانی ہے۔ وہاں جو کچھ ہے وہ تمہارے خواب ہیں۔ میں نے وہ دنیا نہیں دیکھی مگر میری بیٹی وہاں پر ہے۔ وہ وہاں کام کر رہی ہے۔ میں نے اپنی ساری طاقت اس کے اندر ڈال دی ہے۔ وہ ایک پل میں میرے پاس آ سکتی ہے۔ وہ زمین کے اوپر راج قائم کر رہی ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرو، کیونکہ ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے اوپر جانے کے راستے بنائے جا رہے ہیں۔ کئی موجود ہیں اور کئی غقریب بن جائیں گے۔ میرے ساتھیو! میں اب جا رہا ہوں۔ زمین کے بارویں پر ت کی طرف کیونکہ میری ہماری طاقت تو میری بیٹی نے لے لی ہے۔ میں اور بیٹی اور نرمی طاقت اندر سے نکال کر لاؤں گا اور پھر زمین کے اوپر راج بناؤں گا.....“ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے کیا پروگرام ہیں۔ صرف چند کے پاس ساحرانہ طاقت تھی۔ باقی لوگ تو عام سے لوگ تھے۔ مجھے اس کو رونا ضروری تھا۔ نہ

معلوم زمین کے اور اندر سے یہ کیا لے آئے اور دنیا کے لئے نئی مصیبت کھڑی کر دے۔ میں نے کھڑے ہو کر ایک تیل سے اس کے دونوں پیر جلدی سے باندھ دیئے اور اتنی ہی بھرتی سے اس کے ہاتھ بھی باندھ دیئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بیٹیل اس سے کیوں لپٹی جا رہی تھیں۔ کیونکہ مجھے تو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی عورت حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر میری آواز ان تک پہنچی۔

”اے زمین کے اندر کے باسیو میری بات غور سے سنو۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ مگر سن سکتے ہو۔ یہ جو تمہارا سردار ہے، یہ تم سب کو فریب دے رہا ہے۔ تم اس اور چین سے زندگی گزار رہے ہو زمین کے اوپر تمہارا گناہ نہیں ہوگا۔ وہ دنیا تم سے بالکل الگ دنیا ہے۔ اس دنیا کے پاس جو کچھ ہے تم ان کی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ آگ کا گولا چھوڑیں گے اور تم ختم ہو جاؤ گے۔

تم ان کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکو گے۔ یہ اور اس کی لڑکی تم لوگوں سے دھوکا کر رہی ہے۔ تم سب ختم ہو جاؤ گے۔ اس کا اندازہ یوں کرو کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ تم میری آواز سن رہے ہو مگر تمہاری آنکھیں اس قابل نہیں کہ دیکھ سکیں۔ میں تم سب کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں اور یہ شخص تم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

یہ وہاں راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کو پتا نہیں کہ لوہر کی دنیا کتنی بڑی ہے۔ وہاں بے حساب انسان رہتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ترقی یافتہ ہے۔ وہ آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ پانی کے اندر سفر کرتے ہیں۔ ہزاروں میل دور باتیں کرتے ہیں تم نے تو ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ ذرا سی ساحری وہاں کچھ کام نہیں آئے گی۔ یہ تمہارے سامنے بے بس پڑا ہے۔ میں چاہوں تو اس کو مار دوں مگر میں یہ نہیں کرنا میں تم کو بتا رہا ہوں۔ اس کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا اور اس کی بیٹی بھی اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تم صرف یہ کرو کہ یہ جو رستے اوپر جانے کے بنا رہا تھا۔ ان کو ختم کر دو، ورنہ یاد رکھو، اگر اوپر کی مخلوق یہاں آگئی تو تم سب مارے جاؤ گے۔ بولو تم کیا کہتے ہو، اس کی بات مانو گے یا میری

کی چال میں لہراہٹ تھی۔ اس کا سینہ ہر قدم پر رزش کرتا تھا۔ ہماری دنیا کا مرد اس کو دیکھ کر دیوانہ ہو سکتا تھا۔ وہ سیدھی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اعزاز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے خوف ہے۔ پہلے وہ حسب عادت مکان کی طرف مڑ گئی، مگر مکان نہ پا کر ٹھک کر کھڑی ہو گئی اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر پالقی مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔ زمین پر اس نے اپنی انگلی سے کچھ بنایا اور ایک باریک آواز حلق سے نکالی۔ اس کے آواز نکالنے کے چند لمحوں میں اس کے سامنے کئی بونے اور چھپے آدمی نظر آنے لگے۔

اس نے اپنی زبان میں ان سے کچھ باتیں کیں اور وہ بونے میدان میں پھیل گئے۔ وہ عورت اسی انداز میں زمین پر بیٹھی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سارے بونے واپس آ گئے اور کچھ بتانے لگے، میں اتنی دور تھا کہ ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

اب عورت کھڑی ہو گئی اور زمین کھودنے لگی۔ میں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بونے بھی ہاتھوں سے زمین کھود رہے تھے۔ میں چاہتا تو اس کو روک بھی دیتا مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ وہ ساری رات یہ کام کرتے رہے، صبح کے آثار نظر آتے ہی وہ عورت باغ کی طرف چلی گئی اور وہ بونے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

سورج نکل آیا تھا۔ میں میدان کے اس طرف گیا جہاں پر یہ لوگ کھدائی کر رہے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ بغیر کسی اوزار کے اور صرف ایک رات میں صرف ہاتھوں سے میرے اندازے کے مطابق چالیس پچاس فٹ کنواں وہ کھود چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ واپس جانے کا راستہ بناری تھی۔ اس کو پتا تھا کہ پرانا راستہ بند ہو چکا ہے اور اس میں چونا بھرا ہوا ہے۔

SP صاحب کو بلا کر میں نے دکھایا۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئے کہ یہ کنواں صرف ہاتھوں کی مدد سے ایک رات میں بنایا گیا ہے۔

دن میں میں نے یہ کام کیا کہ مزدور لگا کر اس کو بند

بات پر اعتبار کرو گے۔“
ایک ایک سب کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے۔ ”ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ یہ سردار عدا رہے۔ یہ ہم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“ اور میں خاموشی سے ٹیکری سے اتر کر واپس اس طرف چل دیا۔ جدھر میرا وہی کا راستہ تھا۔ میں اس میں داخل ہوا اور اوپر جانے لگا۔ میں نے اوپر آتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے کارندوں کو طلب کیا اور اس کنویں کو بھرتا شروع کر دیا۔ چونے کی پہاڑی سے چونا منگوا یا اور وہ ڈالنا شروع کر دیا۔ راتوں رات یہ کام پورا ہو گیا۔ ”اگر یہ کام عام مزدور کرتے تو مہینوں کا کام تھا۔ رولو کا کی رو داؤ ختم ہو گئی تو میں نے کہا۔“

”اب اس عورت کی تلاش کرنا ہوگی۔۔۔۔۔۔“
”یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اوپر آنے کے جو راستے بنائے جا رہے تھے۔ وہ تو اب بند ہو جاتی تھیں گے۔ ایک ہانا بنایا راستہ یہی رہ جاتا ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آئے گی۔ کیونکہ اس کو آخراہٹوں سے رابطہ بھی تو کرنا ہوگا اور میں یہاں پر اس سے ملاقات کر دوں گا۔۔۔۔۔۔“
”تو اس کا مطلب ہوا تم یہیں پر ڈیرہ ڈالو گے۔“
میں نے مذاق کیا۔

”کام تو پورا کرنا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے، میں بھی رکتا ہوں۔ واپس تو ساتھ ہی چلیں گے۔“ میں واپس ٹھکانے پر چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

تین دن کے بعد میرے کارندے نے بتایا وہ ادھر ہی آ رہی ہے۔ آج بھی اماؤں کی کالی رات تھی۔ پوری آبادی سوئی ہوئی تھی۔ باغ اور کھیت کی طرف ہو کا عالم تھا۔ میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے وہ میدان تھا۔ جس میں کبھی ایک بھیا نک مکان ہوا کرتا تھا۔ میں روپوشی کی حالت میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی بڑی سارہ نہیں کہ مجھے دیکھ سکے۔ وہ باغ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کی دنیا کا یہ قومی لباس تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ دور سے بڑی پرکشش نظر آتی تھی۔ اس

کمدانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ کالائیل منگولیا اور مٹی کے ساتھ ساتھ وہ بھی ڈلوایا۔ جب کواں بند ہو گیا تو پا ہوا چونا ایک ایک فٹ میدان میں پھیلا دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ باغ میں موجود ہے اور ساری کارروائی ضرور دیکھ رہی ہے۔ مگر شاید اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو دوبارہ نہ آتی مگر رات میں وہ پھر آئی۔ آج اس کے ساتھ زیادہ بونے تھے۔ یہ بونے کہاں سے آ گئے، کچھ پتا نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پاس ایسی طاقت تھی جو بونے لے آتی تھی۔ اس نے آتے ہی سارے میدان کا چکر لگایا۔ زمین کو کھود کر دیکھا۔ چونا اس کے ہاتھوں پر لگ گیا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ سارے بونے میدان کے باہر چلے گئے۔ وہ بھی جانے لگی تو میں نے زوردار آواز میں کہا۔ ”پھر کوشش کر لے، پھر نہ کہنا موقع نہ دیا۔“

”تو کون سے سامنے آ۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ہماری دنیا کا یہ دستور ہے کہ ہم کسی بھی عورت کے

سامنے نہیں آتے، سخت بے حیائی سمجھی جاتی ہے۔ تو اور تیری قوم تو تنگی پیدا ہوتی ہے اور تنگی مر جاتی ہے۔ تیرا باپ بھی تنگا تھا۔ اور تیری قوم کو کبھی میں نے دیکھا ہے تو خود کو بڑا ہوشیار اور چالاک سمجھتی ہے۔ تو نے یہ دنیا بھی پوری کہاں دیکھی ہے۔ تیرا علم اور چالاک ایک میتھڈ کی طرح ہے جو چنڈ

کے جو ہز میں رہ کر اس کو بہت بڑا خیال کرتی ہے۔ بے وقوف اس روشن دنیا میں ایک سے ایک عقل مند رہتا ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر غذا انید کرتا ہے تو نے وہ کچھ کھایا ہوگا، یہاں جس کا تصور تیری قوم نہیں کر سکتی۔ اگر تو اور تیرا بے وقوف باپ اچھی اور نیک نیت سے آئے ہوتے تو ہم تجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ تجھ کو علم و ہنر سکھاتے، اپنا مہمان بناتے، مگر تو تو ران کرنے آئی ہے۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ چند بونے اس ترقی یافتہ زمین پر حکومت کرنے آئے ہیں۔ تیرا علم صرف اتنا ہے کہ یہاں کے بچے بھی تجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ بونے اور تو سب ہی اپنی جان سے جائیں گے۔ اب بول کیا کہتی ہے۔“

”میرا اور میرے باپ کا اندازہ غلط تھا۔ یہ دنیا بہت

بڑی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔“ وہ بولی۔

”تو نے صرف اس چھوٹے سے قصبے کو ہی دنیا سمجھ لیا تھا۔“

”شروع میں ایسا ہی تھا۔ بھروقت کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہوتا گیا۔ مگر میرا باپ یہی کہتا تھا کہ میرا علم میری مدد کرے گا۔ میں کامیاب ہو جاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”تو تو اپنی علم اور طاقت کو استعمال کر لے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں سب بے کار ہے۔ یہاں کا آدمی صرف ہاتھ ہی نہیں رکھتا۔ عقل بھی رکھتا ہے۔ یہاں وہ ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اب میں لڑ نہیں سکتی، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”وایسی کے سارے دروازے بند ہیں تو نے کچھ

انسانوں کی جان لی ہے۔ یہاں پر جان لینا جرم ہے جو جان

لیتا ہے، اس کو مرنا ملتی ہے۔ تو خود کو میرے حوالے کر دے اور

یاد رکھ، تیرا جو علم تو لے کر آئی تھی، وہ سب ختم ہو چکا ہے تو ایک

عورت ہے اور ہر عورت کے لئے لباس ضروری ہے۔“ اور

پھر اس عورت کا وجود ختم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

ہر تصور کا ایک وجود ہے لیکن انسانی دماغ محدود ہے۔ ہر چیز کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتا۔ بے شک وہ اپنے طور پر مصروف عمل رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا سنات میں کروڑوں پر اسرار کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ ہر کہانی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ مگر انسانی دماغ نہ تو ہر کہانیاں کو سمجھ سکتا ہے نہ وہ اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ رب کا سنات نے انسان کے لئے ہر چیز مخر کر دی ہے، علم کا خزانہ انسان کو دیا ہے مگر قدرت نے کچھ باتیں صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں۔ جو علم انسانوں کی بھلائی کے لئے ہیں وہ سب دیئے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ کچھ بندشیں، کچھ پابندیاں بھی رکھی ہیں، کہاں تک جانا ہے۔ جو لوگ بتائے محض طریقوں اور راستوں پر چلتے ہیں، وہ منزل پالیتے ہیں اور جو اپنا عقلی گھوڑا استعمال کرتے ہیں وہ بھٹک جاتے ہیں

اور اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ مہاراج کرشن گوپال کا بڑا نام تھا۔ بات کا رد باری ہو، سیاست کی ہو، معاملہ شادی بیاہ کا ہو یا عدالت پچھری کا چکر آپس کا دنگا فساد ہو، سب کے بارے میں مہاراج کرشن گوپال جوش گویاں کر دیا کرتے تھے اور اپنے علم کے زور پر عدالت کے فیصلے بدل دیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جو کام نہ ہونے کا ہو، وہ مہاراج کر دیا کرتے ہیں۔ پورے انبالہ شہر میں کون تھا جو ان کو نہیں جانتا۔ یوپی اور پنجاب کے علاوہ ان کو دلی اور اس کے اطراف میں بھی لوگ جانتے تھے، ان کا کام پکا ہوتا تھا۔ ان کے پاس جو آتا تھا وہ اس کو پہلے بتادیا کرتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کو بدنام ہے تو یہ شرطیں ہوں گی، وہ پارٹی دیکھ کر بات کرتے تھے۔ کوئی معمولی آدمی ان کے در تک جانے کی کوشش نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ان کی طلب پوری نہیں کر سکتا تھا۔

حکیم خان یوں تو خاندانی آدمی تھے۔ کچھ زمینداری بھی تھی اور انبالے میں کاروبار بھی تھا۔ اس شہر کے پرانے شرفاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے سکون اور آرام کی زندگی انہوں نے گزاری تھی۔ بزرگوں کے بتائے رہتے پرہل کر وہ بڑھاپے کی منزل پر آچکے تھے۔ ان کی چار لڑکیاں بڑی تھیں۔ ان کی بڑی دھوم سے شادیاں کر چکے تھے۔ لڑکیوں کے بعد دوڑ کے تھے۔ بڑے کی شادی ہو چکی تھی اور وہ صاحب اولاد تھا۔ چھوٹا ذرا کھلنڈرا واقع ہوا تھا۔ شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ اس کے تصور میں بیوی کا جو خاکہ تھا، ویسی لڑکی اس کو اب تک نظر نہیں آئی تھی۔ سب بھائی بہنوں نے کوشش کر لی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ جب میرا آئیڈیل مل جائے گا میں سب کو بتا دوں گا۔ حکیم خان گوکہ روایتی باپ تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کے حکم کے آگے سر جھکا یا تھا۔ ان کی ساری اولادوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مگر سخت گیری حکیم خان کے مزاج میں نہیں تھی۔ ان کو یہ تو بہت اچھا لگتا تھا کہ ان کی سب اولادیں ان کے کہنے کو حرف آخر مانتی ہیں۔ وہ اسی لئے اپنی سب اولادوں سے محبت کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اب تک اپنے چھو

ٹے بیٹے اجمل خان سے براہ راست گفتگو نہیں کی تھی۔ ان کے دل میں یہ خوف تھا کہ کہیں میری بات کو وہ ٹھکرانہ دے۔ پھر میں کیا کروں گا۔

اس پر کوئی بڑی ذمہ داری بھی نہ تھی۔ سیر و تفریح اور تقریبات میں شرکت اس کو اپنی آئیڈیل کی تلاش تھی۔ شکر خور ہے گوشر مل ہی جاتی ہے۔ آخر اس کو بھی ایک حسین صورت لڑکی اس کے تصور کے عین مطابق نظر آگئی۔ وہ اس کی طرف اس طرح چلا جیسے وہ ایک چھوٹی سی کیل ہو اور وہ لڑکی بڑا ساقنا طیس۔ وہ اس کے قریب جا کر شپٹا سا گیا۔ کیا بات کرے، سلسلہ کلام کہاں سے شروع کرے۔ ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ جاتے ہی بولا۔

”تم یہاں ہو، جیلہ! میں تم کو وہاں تلاش کر رہا تھا۔“ لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں جیلہ نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

اب باتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ مذاق اچھا کرتی ہیں۔“

لڑکی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ غصے سے بولی۔ ”میرا تھو بھی، بہت بھاری ہے۔“

”آپ تو ناراض ہو رہی ہیں۔ میں تو آپ کو اپنی جیلہ ہی سمجھا تھا۔“

”تو اب آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ میں جیلہ نہیں ہوں۔“ وہ بولی۔

”اگر آپ جیلہ نہیں تو پھر کون ہیں؟“ اجمل نے موقع کے اعتبار سے سوال کر دیا۔

”میں کون ہوں؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہوئی چاہئے۔ آپ کے لئے میرا پہلا جواب ہی کافی ہونا چاہئے اور ہاں اس طرح کسی سے راہ و رسم نہیں بڑھائی جانی۔ یہ نہایت پیچھور اور گھٹیا طریقہ ہے۔“ اور وہ لڑکی ایک طرف چلی گئی۔ اجمل کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ منزل نظر تو آئی مگر پھر اور دور ہو گئی۔ اتنے بڑے شہر میں اس کو تلاش کرنا مشکل کام ہے۔

اب اجمل کو صرف اس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ دن بھر

شہر کے چکر کاٹا رہتا۔ ہر اس مقام پر جانا، جہاں پر عورتیں جانا پسند کرتی ہیں۔ مگر گوہر مقصود اس کو پھر بھی نظر نہیں آیا۔ دن بدن اس کی حالت بدلتی گئی۔ بڑے بھائی نے اس کے بدلتے رنگ ڈھنگ باپ کو بتائے پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو بھائی نے پوچھا۔

”کیا بات ہے اجمل تم آج کل بہت پریشان پریشان لگ رہے ہو؟ وہ خاموش رہا، بھائی کا اصرار بڑھا تو وہ بولا۔
”بھائی جان مجھے میرا آئیڈیل نظر آ گیا تھا مگر پھر چند منٹوں میں اس شہر نے اس کو نگل لیا۔ میں اس کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اچھا وہ کون سی؟ اس کا نام پتا کچھ ہو تو بتاؤ، بات ہم آگے چلاتے ہیں۔“
”مجھے سنیا پتا ہوتا تو پھر تلاش کی ضرورت کیا تھی۔“
اجمل نے جواب دیا۔
”اس طرح تو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔“ بھائی نے کہا۔

”ہاں ہے تو مگر میری طلب صادق ہوئی تو میں ضرور تلاش کروں گا۔“

”عقل کی بات کرو اجمل۔ یہ شہر ہے اور کیا پتا وہ شہر میں کسی سے ملنے آئی ہو، واپس چلی گئی ہو۔ ذرا ہوش کرو، ایک سے ایک اچھی لڑکی تم کو مل جائے گی۔ تمہاری بھابی تمہاری پسند کی لڑکی تلاش کرے گی۔ تم ان چکروں کو چھوڑو اور اپنا گھر بساؤ۔ اب ابھی تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کچھ ان کا ہی خیال کرو۔“ بھائی نے سمجھایا۔ مگر اجمل کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ وہ بولا۔

”اب تو میں اسی سے شادی کروں گا، وہ کون ہے ایک نہ ایک دن تو ملے گی میں ساری عمر اس کو تلاش کروں گا۔ اس نے مجھے ضدی بنایا ہے۔ میں اس کی دی ہوئی چیز کو ٹھکراؤں نہیں۔“ وہ بولا۔

”تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ بھائی بولا اور اس نے اجمل کی پوری کیفیت باپ کو بتادی۔ اب تو حکیم خان کے طوطے اڑ گئے۔ یہ کیا ہوا۔ بیٹا عشق کا روگ لگا بیٹھا ہے۔ جس

لڑکی کا اتنا پتا نہیں۔ اس کو تلاش کرنا ہے۔ وہ بیٹے کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مگر کس طرح مدد کریں گے۔ یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے بہت غور کیا۔ بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر انہوں نے اجمل سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ ایک دن صبح ہی صبح وہ اس کے کمرے میں چلے گئے۔ اجمل موجود تھا۔ وہ بولے۔ ”بیٹا تمہاری پریشانی اور تلاش کا مجھے پتا ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا بھی چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمہارے لئے میں کیا کروں۔“ اجمل کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

”دیکھو بیٹا انسان اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ مگر جب وہ آجاتا ہے تو اس کو زندگی تو گزارنی ہوتی ہے۔ زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور قاعدے اللہ نے بتائے ہیں اور کچھ ہمارا معاشرہ ہم کو سکھاتا ہے۔ ہم ہر معاملے میں خود مختار نہیں ہوتے۔ ان اصولوں اور قاعدوں پر چلنا پڑتا ہے۔ جوان سے انحراف کرتے ہیں۔ ان کا مقام کچھ نہیں ہوتا۔ انسان اس دنیا میں آکر تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ کچھ تکلیف اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے وارد ہوتی ہے اور کچھ تکلیف قدرت کی طرف سے آتی ہے۔ ان تکلیفوں کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی زندگی میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان توکل کا دامن نہ چھوڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک انعام اور ہے۔ وہ ہے صبر کا دامن نہ چھوڑنے کا اپنی عقل کو استعمال کر کے بے جا اور بے قاعدہ کسی سمت دوڑ نہ لگائے۔ پہلے نشان در دست کرے اور پھر کوشش کرے۔ تمہارے پاس نہ منزل کا نشان ہے اور نہ نام ہے تم خود غور کرو۔ اس صورت میں تمہاری مدد کرنے والے بھی کیا کریں گے۔ دیوانہ ہی بننے کا شوق ہے تو کسی عورت کا دیوانہ نہ بنو۔ رب کا دیوانہ بنو۔ اتنی چاہت اور لگن رب کے پانے میں صرف کرتے تو شاید کچھ نہ کچھ پالیتے۔ رب کا کچھ نشان تو تمہارے پاس ہے بے نشان تم کب تک بھاگو گے۔ فضول کی دوڑ بھاگ سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ میرے بڑھاپے کا خیال نہیں کرتے تو نہ کرو مگر اپنی جوانی کا تو خیال کرو۔“ اجمل باپ کی

جی کھری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

مگر یہ بھوت اترنے والا نہ تھا۔ وہ جتنی کوشش اس کے بھولنے کو کرتا تھا۔ وہ ظالم اتنی ہی اس کے قریب آتی تھی۔ اجمل دن بدن گرتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے پورا گھرانہ پریشان تھا کہ اچانک حکیم خان کے ذہن میں مہاراج کرشن گوپال کا خیال آ گیا۔ بے شک ان کا علاج بہت مہنگا تھا۔ مگر مئی کی زندگی سے زیادہ نہیں تھا اور وہ ان کے پاس چلے گئے۔ مہاراج نے پوری روداد سننے کے بعد کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو، لڑکا اس لڑکی کو بھول جائے یا لڑکی کو تلاش کیا جائے۔“
 ”دونوں صورتیں مجھے منظور ہیں۔“ حکیم خان نے جواب دیا۔

”پہلی صورت ذرا خطرناک ہے۔ کیونکہ لڑکا عشق کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ اس کو اس کا ماضی بھلا یا جاسکتا ہے مگر زندگی کے کسی بھی دور میں اس کو پھر کبھی بھی یاد آ سکتا ہے۔ اس وقت بڑی خطرناک صورت حال ہوگی۔ شعور سے۔ تو اس کے ماضی کو مٹایا جاسکتا ہے مگر لاشعور میں تو رہے گا اور کبھی نہ کبھی پھر شعور میں پلٹ سکتا ہے۔“
 ”اور دوسری صورت بھی بتائیں۔“ حکیم خان نے پوچھا۔

”لڑکی کو تلاش کرنا ہوگا۔“ مہاراج نے جواب دیا۔
 ”اس کو کس طرح تلاش کریں گے۔“ حکیم خان بولے۔

”یہ کام تم خود کرو گے۔“ مہاراج بولے۔
 ”اگر ہم کر سکتے تو ہم کراچکے ہوتے۔“ حکیم خان بولے۔

”دیکھو یہاں سے لڑکی کا کوئی لباس یا اس کے استعمال کی کوئی چیز آپ کے پاس ہوتی تو میں کچھ کر سکتا تھا۔ اب تو بھوسے کے ذمیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔“ مہاراج بولے۔

حکیم خان ناامید ہو کر واپس آ گئے اور اجمل کی

حالت گرتی گئی اور وہ اس کو لے کر دلی آ گئے اور مجھ سے ملاقات کی۔ عجیب کیس تھا۔ نہ نام نہ پتا اور عشق انتہائی درجے پر آ گیا تھا۔ رولوکانے اجمل کو دیکھا تو فوراً کہا۔

”اجمل مرد بنو! وہ لڑکی ضرور ملے گی مگر شرط یہ ہے کہ تم اس کے قابل بنو۔“
 اجمل نے آہستہ سے کہا۔ ”میں کیا کروں۔“
 ”تم یہ کر دو کہ خود کو صحت مند کرو۔ جیسے تھے ویسے بنو اور پھر میں تلاش کرتا ہوں۔ انبالہ تو کیا پورے ہندوستان میں دیکھا جاسکتا ہے۔“

اور اجمل کی اس کی ڈوری جو ٹوٹنے کے قریب تھی۔ پھر جڑ گئی اور وہ تیزی سے صحت مند ہوتا گیا اور پھر وہ پہلے والا اجمل تھا۔ رولوکا اس کو لے کر انبالہ آ گیا اور بولا۔

”اب بتاؤ وہ لڑکی کس تقریب میں ملی تھی اور وہ تقریب کس کے گھر ہوئی تھی۔“

اجمل نے بتایا۔ ”وہ ایک شادی کی تقریب تھی اور سیٹھ پتالال سائیکل والے کے گھر تھی۔“ اور رولوکا اس کو ساتھ لے کر پتالال کے خوبصورت بنگلے میں پہنچ گیا۔ اس گھر کے لوگوں کے لئے وہ دونوں ہی اجنبی تھے۔ رولوکانے کہنا شروع کیا۔

”ہم لوگ جس غرض سے آئے ہیں آپ ضرور اس کو سن کر حیران ہوں گے مگر ہماری مجبوری سمجھ کر آپ ہمیں معاف کر دینا۔ بعض اوقات انسان اس مقام پر آ جاتا ہے کہ نہ بولے تو زندہ نہیں رہتا اور بولتا ہے تو بے عزتی کا ڈر ہوتا ہے۔ آپ اگر ہمازی مدد کر دیں گے تو اس سے ایک زندگی بچ جائے گی۔ آپ نے سنا ہوگا، بعض بیماریوں کے جراثیم اتنی تیزی سے اثر کرتے ہیں کہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یہ لڑکا بھی اسی قسم کے ایک جراثیم کا شکار ہوا ہے۔ اس کا علاج جاری ہے مگر اس بیماری کا تریاق نہیں ملا ہے۔“ رولوکا آگے کچھ اور کہتا کہ صاحب خانہ پنا لال کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بولا۔ ”میری سمجھ میں اب تک آپ کی بات نہیں آئی، صاف صاف بات کریں تاکہ میں کچھ سمجھ سکوں۔“

”آپ کے گھر ایک تقریب ہوئی تھی۔“ رولوکانے پوچھا۔

”ہاں ہوئی تھی۔“ پنالال نے جواب دیا۔
وہ تقریب سات ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس میں حکیم خان اور یہاں کا لڑکا بھی شریک تھے۔“ رولوکانے کہا۔
”ہاں میں حکیم خان کو جانتا ہوں۔ ضرور شریک ہوں گے۔“ پنالال نے کہا۔

”اس تقریب میں کچھ خواتین لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ لڑکا کسی لڑکی کو دیکھ کر پاگل ہو گیا ہے۔ وہ کون تھی، کیا نام تھا، کچھ بتائیں۔“ چند جملوں کی ان کی بات چیت ہے۔
میں نے عرض کیا تھا۔ وہ مشتق کا جراثیم اثر کر گیا ہے۔ یہ موت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ایک امید کی ڈوری نے اس کو بچھڑھک کر دیا ہے آپ ایک زندگی بچانا چاہتے ہیں تو جو کچھ مدد کر سکتے ہیں، کر دیں۔ اس کا اجر ہم تو کیا دیں گے مگر آپ کو ملے گا ضرور۔“ رولوکانے کہا۔

”آپ ذرا انتظار کریں۔ میری لڑکی نے مہمانوں کی لسٹ بنائی تھی، اگر وہ لسٹ مل گئی تو شاید آپ کے کچھ کام آجائے۔ اور ان کی لڑکی ایک ڈائری اٹھلائی اور بولی۔
”باپو ان کی قسمت اچھی ہے۔ میں نے سب کے نام اس ڈائری میں لکھے تھے۔“ وہ کوئی ایک سونام تھے اور سب ہی انبالہ شہر کے معزز شہری تھے۔ رولوکانے وہ سب نام لے لئے۔

پنالال کا شکر یہ ادا کیا اور چلے آئے۔ اب نمبر وار سب کو چیک کرتا تھا۔ رولوکا کے کام کرنے کے انداز کو حکیم خان نے بھی سراہا اور کہا۔ ”کمال ہے، یہ طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔“

نمبر ایک پر ایک ریٹائرڈ کرنل اور ان کی دھرم بختی تھی۔ وہ دونوں اس کے مکان پر چلے گئے۔ رولوکانے کہا کہ سات مہینے پہلے آپ ایک تقریب میں گئے تھے۔ وہ تقریب سیٹھ پنالال کے گھر پر ہوئی تھی۔ رولوکانے بات شروع کی۔

کرنل کردار سنگھ فوجی آدمی تھے سے اکھڑ گئے، غصے سے بولے۔

”پھر اس کی گناہ کر لیا۔ دعوت آئی سی تاں اسیں گئے ساں۔“

”آپ ناراض نہ ہوں صرف یہ بتا دیں، آپ اپنی بیگم کے ساتھ گئے تھے آپ کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔“ رولوکانے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔
”ہور کون ہوگا ساڈی تو کوئی اولاد ہی نہیں، کلے ہی ہیں۔“ کرنل صاحب اداسی سے بولے۔

اور رولوکا اٹھ کھڑا ہوا۔
بیچاس لوگوں کو چیک کر لیا۔ جن کے ساتھ عورتیں لڑکیاں ساتھ گئی تھیں۔ ان سے بھی کسی نہ کسی طرح ملاقات کر لی مگر ابھی منزل دور تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، ہر روز وہ دونوں لوگوں کے گھروں پر جاتے رہے۔ آخر نوے کے بعد بشر کے گھر پر تھے۔ رولوکانے اپنی پرانی تقریر دہرائی تو بشر خان نے کہا۔ ”میاں ہمارے گھر پٹنہ سے کچھ مہمان آئے تھے، وہ بھی ہمارے ساتھ گئے تھے، ہم سب تو تمہارے سامنے ہیں، ان کو تو پیش نہیں کر سکتے۔“

”آپ ان کا پٹنہ کا پتہ بتا دیں تو ہم ان سے خود ہی رابطہ کر لیں گے۔“ رولوکانے بولا۔

اور پٹنہ کا پتہ رولوکا کو مل گیا اور وہ دونوں پہلی فرصت میں پٹنہ روانہ ہو گئے۔ آدم پور ایک اچھی اور پڑھ لکھے لوگوں کی آبادی ہے۔ یہاں اختر حسین بزاز کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اختر حسین خود گھر پر تھے۔ رولوکانے بتایا کہ ہم انبالہ سے آئے ہیں۔ اختر حسین نے ان کو عزت سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پوچھا۔ ”اب بتائیں کیسے آتا ہوا۔“

رولوکانے کہا۔ ”بات بڑی سنجیدہ ہے۔ یہ نوجوان جو میرے ساتھ ہے، اس کا نام اجمل ہے اور اس کے باپ کا نام حکیم خان ہے۔ انبالہ کے کھاتے پیٹے گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ سلسلہ اس کی زندگی اور موت کا آن پڑا ہے۔ سات مہینے پہلے یہ ایک تقریب میں گیا تھا۔ آپ کا خاندان بھی اس تقریب میں گیا تھا۔ آپ لوگ پنالال کے مہمان تھے۔“

ہوگی کہ یہ خود پر قابو رکھیں اور آداب کا خیال کریں۔“ اختر حسین نے کہا۔

”میں اس بات کی گارنٹی لیتا ہوں، نہ ہم تماشا بنیں گے نہ آپ کو بچھتا پڑے گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”آپ ذرا انتظار کریں، چائے وغیرہ سے شوق کریں۔“ اور وہ اندر چلے گئے اور اس کے بعد ایک نوکر نما عورت بڑے قریب سے چائے اور کچھ کھانے کی اشیاء رکھ گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد اختر حسین آگئے، آتے ہی بولے۔

”معافی چاہتا ہوں، میری لڑکی جس کا نام رونق ہے، اس کو سسرال سے لانا تھا اور بھائی کی لڑکی جس کا نام

ایمنہ ہے۔ اس کو بھی لانا تھا۔ اس لئے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں ان دونوں کو بلاتا ہوں۔ برائے مہربانی میری بات کا خیال رکھئے۔“ اور اختر حسین نے آواز دی۔ ”بٹی رونق

آ جاؤ۔“ پہلے جولڑکی کمرے میں داخل ہوئی، وہ رونق تھی۔ اس کے آنے سے اجمل کے چہرے پر کوئی تبدیلی واقع نہیں

ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ اس کے بعد جولڑکی کمرے میں آئی۔ اس کو دیکھ کر اجمل بے چین ہو گیا۔ وہ

ایک نازک لڑکی تھی، جیسے موم کی گڑیا۔ میرے ساتھ ساتھ اختر حسین بھی اجمل کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہے

تھے۔ اجمل نے خود کو کس طرح کنٹرول کیا۔ اس کی ذہنی کش مکش اور بے چینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ کچھ کہنا

چاہتا تھا مگر پاس ادب اس کو روکے ہوئے تھا۔ چند منٹ یہ کیفیت رہی۔ دونوں لڑکیوں کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا

۔ ایمنہ بھی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو کیا پتا تھا کہ اس کی تلاش میں ہم نے کتنی پریشانی اٹھائی ہیں۔ اس

نیک آنے میں کہاں کہاں کی دھول جھونکی ہے۔ وہ معصومیت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس سکوت کے پردے کو

اختر حسین نے چاک کیا اور کہا۔ ”اچھا میٹام جاؤ اور ایمنہ میٹام بھی کھانا کھا کر جانا۔“ وہ دونوں چلی گئیں تو اختر حسین نے

ایک لمبی سانس لی اور بولے۔

”آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ میں پل صراط سے گزرا ہوں۔ ایمنہ کی جگہ رونق ہوتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔ میں

”ٹھیک کہا آپ نے، وہ میرے کاروباری ساتھی ہیں۔ میں اکثر ان کے گھر جاتا رہتا ہوں۔ آگے فرمائیے۔“

اختر حسین نے جواب دیا۔

”آپ بھی نو جوانی کے دور سے گزر رہے ہیں، جانتے ہوں گے۔ اس دور میں نو جوان اپنی شریک حیات کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بنالیتے ہیں۔ یہ سب نہیں

کرتے مگر جو ذرا آرٹسٹک ذہن رکھتے ہیں وہ تو ضرور ایسا کرتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے تو وقت کے ساتھ

ساتھ ڈھل جاتے ہیں اور وہ خیالی خاکہ یاد پارینہ بن جاتا ہے مگر کچھ اس کو پانے کے لئے سالوں بلکہ زندگی بھر

انتظار کرتے ہیں۔ یہ نو جوان بھی ان میں شامل ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کو اپنا خیالی آئیڈیل نظر آیا اور صرف

چند منٹ کے لئے کچھ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ اس کو نہیں پتا وہ کون تھی، کیا نام تھا، کہاں سے آئی تھی اور اس نے اس کی

تلاش شروع کر دی مگر کچھ پتا نہ چلا، جس کا کچھ اچھا ہی نہ ہو۔ اس کو تلاش کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یہ تھک گیا اور

بیمار پڑ گیا۔ اس کی حالت دن بدن خراب ہوئی گئی۔ اس کا علاج صرف اس کا آئیڈیل تھا۔

یہ مریض کی شکل میں میرے پاس آیا۔ میں دلی میں مطب کرتا ہوں۔ مریض کا اگر مرض ختم کر دیا جائے تو وہ ٹھیک

ہوتا ہے۔ مرض برقرار رہے تو صحت دیتی ہوئی۔ اس کا مرض مجھے پتا چل گیا اور میں اس کی دوائی کی تلاش میں پھرتا رہا۔

انہالے کے نوے گھروں کے چکر لگانے کے بعد آپ کا پتا ملا اور دم دوڑے آپ کی طرف۔ بات ذرا لمبی ضرور ہو گئی ہے۔ مگر

یہ سب آپ کو بتانا بھی ضروری تھا۔ آپ صرف یہ سمجھ لیں کہ یہ لڑکا عاشق کا مریض ہے اور اس کا مرض بہت خطرناک منزل پر

ہے۔“ رولو کا نے بات ختم کی تو اختر حسین نے ایک گہری اور لمبی سانس لی۔ چند منٹ خاموشی رہی اور پھر بولے۔

”میری بیوی کے علاوہ میرے ساتھ دوا لڑکیاں تھیں۔ ایک میری لڑکی تھی جس کی شادی ہو چکی ہے اور ایک

میرے بھائی کی لڑکی تھی۔ ان کی ملاقات کس لڑکی سے ہوئی، پتا نہیں مگر میں دونوں کو ان کے سامنے لے آتا ہوں۔ شرط یہ

کیا کرتا، یہ سوچ کر ہی دماغ بھک سے اڑ جاتا ہے۔“ اختر حسین نے کہا۔

”میں آپ کی پوزیشن کو سمجھ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے آپ اتنی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوئے۔“ ردولکانے جواب دیا۔

اب تک اجمل خاموش تھا۔ لڑکیوں کے جاتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے تھے۔ مگر چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔ آخر وہ منزل پر پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دو بارہ اس کو دیکھا تھا۔ وہ حسرتوں کا شکار اب بھی تھا۔ اس کے جذبے کی گہرائی شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ بس اب اس کی ذات کی تسکین کے لئے اتنا بھی کافی تھا۔ اس کی مرکز نگاہ کا کچھ تو چلتا آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ اس کی قسمت پر ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا سہارا ہی کافی تھا کہ اس کا نام امینہ ہے اور وہ پٹنہ شہر میں رہتی ہے۔ وہ اتنے پر ہی صبر کر سکتا تھا۔

”اب بتاؤ تم نے کس کو دیکھا تھا۔“ اختر حسین نے جانتے بوجھے یہ سوال اجمل سے کر دیا۔

اجمل خاموش رہا تو وہ پھر بولے ”زبان سے کچھ تو بولو۔“

”میں نے امینہ کو دیکھا تھا۔“ اجمل نے جواب دیا۔

”مگر اس نے تو تم کو نہیں پہچانا۔“ وہ بولے۔

”چند منٹ کی ملاقات کو وہ کیونکر یاد رکھیں گے۔“ اجمل نے کہا۔

”مگر تم نے تو چند منٹ کی ملاقات کے بعد زندگی تک ہارنے کا ارادہ کر لیا۔“ اجمل خاموش رہا تو میں نے کہا۔

”کسی کو چاہتا ہوں کہ نہیں ہے مگر ذہن آلودہ نہ ہو۔ خیال کی پاکیزگی بہت ضروری ہے۔“

”بے شک آپ نے درست کہا۔“ اختر حسین نے جواب دیا۔

”اختر صاحب یہ ایک خاندانی لڑکا ہے۔ اگر اس کو اس کا مرکز نگاہ آئیڈیل نہ ملا تو یہ کچھ نہیں کرے گا۔ کسی بدنامی کا باعث نہیں بنے گا۔ کسی کو ہاتھ نہیں چلے گا کہ اس بات

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ ابھی تک امینہ کا رشتہ نہیں ہوا ہے۔ میں بھائی صاحب سے ذکر گروں گا مگر اس میں دو چار روز لگ سکتے ہیں۔ آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔“ اختر حسین نے جواب دیا۔

”ہم دو چار کیا۔ جب تک آپ فرمائیں گے، انتظار کریں گے۔“ ردولکانے جواب دیا۔

”تو پھر آپ غریب خانے پر آرام کریں۔ ہمارا شہر پٹنہ دیکھیں۔“

اختر حسین شام کو ہی اپنے بڑے بھائی انور حسین کے پاس چلے گئے اور سلام دعا کے بعد بولے۔ ”بھائی صاحب آپ نے امینہ کا رشتہ تو کسی کو نہیں دیا۔“

”نہیں ابھی تو نہیں دیا کیوں؟“ انور حسین نے پوچھا۔

”ایک نہایت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا انبالہ کا ہے۔ گھرانہ کھانا پیتا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ میں نے لڑکے کو دیکھا ہے۔ اچھی جوڑی بنتی ہے۔ عمر کا بھی میل ہے۔“ اختر حسین نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اس کے چچا ہو۔ اچھا ہی سوچا ہو گا مگر انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ تم کیا، کوئی میری مجبوری نہیں جانتا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ کسی کو بتائی بھی نہیں جاسکتی اور وہ بات میں تم کو بھی بتانے سے قاصر ہوں۔ تم صرف یہ سمجھ لو کہ اگر وہ مجبوری میرے ساتھ نہ ہوتی تو امینہ کی شادی رونق سے پہلے ہی ہو جاتی۔ میں نے اپنے تئیں کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ مجبوری آڑے آگئی اور اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔“ انور حسین نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”بھائی صاحب! آپ نے بھی کچھ بتایا نہیں، کچھ تو

اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ وقت اور حالات گھٹن محرومیاں اندر ہی اندر پکے والا آتش گیر مادہ جب انسان کے ذہن اور دماغ کی طرف بڑھتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور انسان اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ تمام دور اندیشیاں اور سودزیاں کا حساب کتاب دھرا رہا جاتا ہے۔ اگر اس پکے لاوے کا رخ موڑ دیا جائے اور کسی پر بھروسہ کر لیا جائے تو پھر حالات یہ نہیں ہوتے۔ بے شک اور خطرناک حالات سامنے آ جاتے ہیں۔ پھر لڑائی آئے سامنے کی ہوتی ہے۔ اس میں فتح اور شکست دونوں کے مواقع ہوتے ہیں۔ آپ شاید میرے کہنے کا مطلب پوری طرح نہ سمجھ سکتے ہوں تو عرض ہے کہ آپ کا جو بھی مسئلہ ہے، آپ مجھے بتائیں جو ذرہ خوف آپ کے ذہن میں ڈالا گیا ہے، اس کو بھول جائیں۔ دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔ دنیا میں ایک ایسی قوت بھی ہے جو دنیاوی ہر قوت سے زیادہ قوی ہے۔ ساری کائنات اس کے اشارے پر چلتی ہے۔“ رولو کا خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کرے میں سکوت رہا۔ پھر انور حسین کی آواز آئی۔ ”ہاں میں ڈر اور خوف میں مبتلا تھا۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ ایسا کب تک چلے گا۔ میں کب تک کرب برداشت کروں۔ اس کا کچھ تو فیصلہ ہونا چاہیے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ کالج کی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ایجنڈہ میری سرگرمی تھی۔ شام کو وہ واپس آ گئی تھی۔ اس کے آنے کے بعد ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے اپنا نام جنناداس بتایا تھا۔ وہ پینڈہ کا نہیں تھا۔ زبان سے وہ گجرات کا لگتا تھا۔ اس نے آ کے کہا تھا کہ میں سیٹھ جنناداس ہوں۔ آج میں نے اپنی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر مجھے بتانے کیوں آئے ہو، کرلو شادی سب کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تھا۔

”میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ نہیں ملتی تھی، اب ملی ہے اور وہ تیرے گھر میں رہتی ہے۔“ وہ بولا۔

مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زور دار تہا نچ لگا دیا تھا اور کہا تھا۔ تیری یہ جرأت کیونکر ہوئی تو ہندو

ہے میں مسلمان تیرا میرا کیا جوڑ۔“

بتائیں میرے ذہن میں تو آندھیاں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔“ اختر حسین نے بے چینی سے کہا۔

”تم میری پوزیشن کا خیال کرو۔ میں کس کرب میں مبتلا ہوں۔ یہ کرب دورہ اس لئے ہے کہ کسی کو بتائی نہیں سکتا۔ بتانے پر جو مجھے جھیلنا ہوگا۔ اس کا سوچ کر ہی میں بے حال ہو جاتا ہوں۔“ انور حسین نے جواب دیا۔

”بھائی صاحب، یہ سن کر میرا تو برا حال ہے۔ آپ اتنے بڑے کرب میں مبتلا ہیں اور آپ اکیلے ہی یہ مصیبت اٹھا رہے ہیں۔ میں کتنا بد نصیب ہوں کہ آپ کے کام نہیں آ سکتا۔“ اختر حسین نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”میاں تم صرف میرے حق میں دعا کر لیا کرو۔“

اختر حسین نے ہر طرح کوشش کر لی کہ انور حسین کچھ بتائیں مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ آگے بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ پا کر اختر حسین مایوس واپس آ گئے اور پوری روداد رولو کا تو بتائی تو رولو کا نہ کہا۔

”انسان پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اکثر حالات میں انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے۔ اور بعض دفعہ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو اپنی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے۔ کسی کی بھی شرکت یا مدد اس کی انا کو مجروح کرتی ہے یا اس کو اور زیادہ حالات خراب ہونے کا ذریعہ ہے۔ آپ میری ملاقات انور حسین صاحب سے کرادیں۔“ رولو کا نہ کہا۔

”میرے خیال میں تو بے کار ہی ہوگی۔ میں ان کا بھائی ہوں اور وہ نہ جانے کب سے یہ مصیبت جھیل رہے ہیں اور انہوں نے اس کا ذرا کرب تک کسی سے نہیں کیا ہے۔ آپ کے سامنے وہ کیا بتائیں گے۔“ اختر حسین بولے۔

”آپ کے اندازے درست ہیں مگر بعض اوقات

اپنوں سے زیادہ غیروں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہوتا ہے۔“ رولو کا نہ جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، آپ کل میرے ساتھ چلیں۔“ اختر حسین بولے اور دوسرے دن وہ دونوں انور حسین کے سامنے بیٹھے تھے۔

”انور صاحب آپ جس کرب میں مبتلا ہیں، میں

وہ تانچہ کھا کر بھی پرسکون تھا، بولا۔ ”جوڑا تو اوپر بندھا ہے اور اپنے دین، دھرم یہ سب بے کار چیزیں ہیں۔ انسان پیدا انکی کچھ نہیں ہوتا۔ زمین پر آ کر دھرم کے مجید بھاد پیدا کرتے ہیں۔“

”چل اٹھ اور بھاگ یہاں سے، میں مسلمان ہوں اور میری لڑکی بھی مسلمان ہے۔ میں کسی ہندو کو کیوں لڑکی دوں گا۔“ یہ سن کر وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔
”دے گا تو ضرور میں پھر آؤں گا۔“ اور اس وقت وہ

چلا گیا تھا۔

تین دن کے بعد وہ پھر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ آتے ہی بولا۔ ”آج یہ فیصلہ ہوگا کہ تو لڑکی دیتا ہے کہ نہیں۔“

”میرا فیصلہ تو سن چکا ہے، غیرت مند ہوتا تو نہ آتا۔“ میں نے کہا۔

اس کے ساتھ جو آیا تھا وہ بولا۔ ”زیادہ اونچا مت بول۔ تو لڑکی والا ہے، تیری لڑکی اسی کے گھر جائے گی اور اگر تو نے کسی اور سے اس کی شادی کرنے کی کوشش کی تو لڑکی پہلی رات ہی بیوہ ہو جائے گی۔ سوچ لے میں وقت دے رہا ہوں اور ہاں یہ بات کسی کو پتا نہ چلے، کسی کو تو نہیں بتائے گا۔“ اگر بتایا تو پھر میں جلدی آ جاؤں گا اور لڑکی کو لے کر ہی جاؤں۔ یہ میرا چیلہ ہے۔ اس کا سن تیری لڑکی پر آ گیا ہے۔ شادی صرف اس سے ہوگی۔ سوچ لے راضی یا غیر راضی۔“ اور وہ دونوں چلے گئے تھے۔

میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ کس سے کہتا اور کہتا تو ڈر تھا وہ شیطان آ جائے گا۔ کیا بتاؤں، وہ دونوں مجھے کتنے خطرناک لگتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ملاقاتوں میں ان دونوں کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ”انور حسین خاموش ہو گئے۔“ اس کا مطلب ہوا کہ وہ اب تمہارے پاس آئے گا۔“ میں نے کہا۔

”اس نے یہی کہا تھا۔“ انور حسین نے جواب دیا۔ میں نے اختر حسین سے کہا۔ ”آپ واپس جائیں، اجمل آپ کے پاس ہے۔ میں انور صاحب کے ساتھ

رہوں گا۔“ اور وہ واپس چلے گئے تو میں نے کہا۔

”انور صاحب میں اسی جگہ رات گزاروں گا۔ آپ لوگ آرام سے سو جائیں۔ اب یہاں پر کوئی نہیں آئے گا۔“

میرا کھانا انور صاحب نے بھیج دیا۔ میں کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ مگر اب میں روپوشی کی حالت میں تھا۔

میں نے دیکھا کہ رات کے پچھلے پہر ایک سایہ باہر نظر آیا۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ سایہ گھر کے اندر داخل ہو گیا

اور انور حسین کے کمرے کی طرف چلا۔ گردروازے تک ہی پہنچا تھا کہ میں نے چھاپ لیا۔ اس کی کمزور جگہ پر میرا ہاتھ

گیا تھا اور وہ بے بسی سے ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ میں اس کو اسی

کمزور جگہ سے ناکارہ کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

میں اپنے کمرے میں اس کو لے آیا اور زمین پر پھینک دیا۔

”اب بتا تو کون ہے اور کیوں آیا تھا۔“ وہ گرنے

کے بعد پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ڈراؤنی آواز میں اس نے

ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

”ارے ہم، ہم سے پوچھتا ہے کہ کون ہے۔ ارے ہم

ہیں تیرے باپ۔ ذرا سا پکڑ لیا کہ شعلتی دان بن گیا۔ اب

کے تو پکڑ بھر بتائیں۔“

”زیادہ لمبی مت سنا۔ یہ بتا تو کون ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”ہم پورن بھگت کے غلام ہیں۔ ایک سوا کہتر ہیں

ہم، کس کس لڑے گا مورکھ، جو کرتے ہیں، کرنے دے

نہیں تو بولی بولی ہو جائے گا۔“ وہ غرور سے بولا۔

”اور پورن بھگت کس کے کہنے میں ہے۔ ذرا یہ بھی

بتا دے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم تیرے غلام ہیں کہ سب کچھ بتاتے رہیں۔“

وہ بولا۔

”نہیں بتائے گا تو جائے گا سمندر کے بیچ۔“ میں

نے کہا۔

”کتوں کو ڈالے گا۔“ وہ بولا۔

”سب کو ڈال دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”بڑا آیا ڈالنے والا، تمہارے گورو کو نہیں جانتا۔“

”مشکل ہے وہ جاپ میں ہیں۔ رات آٹھ بجے جاپ ختم ہوگا۔ اس کے بعد چار آدمیوں کو وقت دے چکا ہوں۔ آج اور کل تو ملاقات مشکل ہے۔ پرسوں رات آٹھ بجے کا وقت دے سکتا ہوں۔ ملاقات کی فیس جمع کرادو۔“

”فیس کیا ہوگی؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”500 پانچ سو روپے اور سو روپے میرے۔“ وہ

بول۔

”اگر میرے پاس نہ ہوں تو پھر کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ وہ مختار سے بولا۔

”دیکھو بھائی! اپن کا اور دھرم کا کام ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔“ میں نے مصحومیت سے کہا۔

”ہم دھرم کا کام کرنے بیٹھے ہیں! اپن کا کام ہے تو کسی آشرم میں جاؤ۔ وہاں پر بہت دیوانے بیٹھے ہیں۔ کوئی تو تمہارا کام کر دے گا۔ چلو ہوا آنے دو۔“ وہ نفرت سے بولا۔

میں جو پرکھ سکتا تھا، پرکھ چکا تھا۔ کرشن گوپال کا کاروبار کچھ میں آگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس سرخے کی تیوریوں پر ایک دم کئی مل پڑ گئے۔ وہ غصے سے بولا۔ ”ابے تو جاتا ہے کہ کروں تیرا بندہ دست۔“

”بندہ دست تو میں کروں گا تو بس طرح ہے، اسی طرح میرے آنے تک رہے گا۔“

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور میں اندر کی طرف چلا۔ میں سیدھا کرشن کے پاس بھی جا سکتا تھا مگر میں پہلے یہاں کے ماحول کو فضاء کو جانچنا چاہتا تھا۔

ایک بہت بڑے کمرے میں میں جا پہنچا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور کالے پردے پڑے تھے۔ ان کالے پردوں پر ڈراؤنی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ کمرے میں رنگ بھی کالا کیا ہوا تھا۔ لوہان کی خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی اور پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا اس کمرے کا ماحول اس طرح بنا ہوا تھا کہ کوئی بھی مسائل اندر

”بتا تو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”مہاراج کرشن گوپال کو تو نہیں جانتا، تو جان لے اور ہمیں جانے دے۔“

انہالے کا کرشن گوپال اس کا مطلب تھا کہ اس کو سب پتا تھا۔ کتنا گھناؤنا کام وہ کر رہا تھا۔ دونوں پارٹیوں سے دولت کمانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ ”ٹھیک ہے کرشن گوپال میں انبالہ آ رہا ہوں۔“ میں نے ایک کارندہ انور حسین کے گھر چھوڑا اور میں انبالہ روانہ ہو گیا۔ میری جیب میں پورن بھگت کا چیلہ بھی تھا۔

میں کرشن گوپال کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتا تھا۔ بنگلے کا احاطہ بہت بڑا تھا اور بنگلے کے چاروں طرف باغ لگا ہوا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑے ایک آدمی سے کرشن گوپال کا پتا کیا تو وہ بولا۔

”مہاراج ابھی نہیں ملیں گے۔ ان کی ملاقات کا وقت شام چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ اگر ان سے ملنا ہے تو اپنا نام بتاؤ اور کام لکھو۔ ان کی آگیا ہوگی تو ملاقات ہو جائے گی۔“

”میرا کام ارجنٹ ہے، مجھے ابھی اسی وقت ملنا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”ارے کیا دیوانہ ہو رہا ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا کہ مہاراج کی آگیا کے بغیر کوئی ان سے ملا ہو۔“

میں اندر جانے لگا تو وہ بولا۔ ”وہ سامنے جو آدمی گاؤں تک لے سہارے بیٹھا ہے، اسی کو رضی کر لے، وہ اگر چاہے گا تو جلدی ملو دے گا۔ میں نے یہ سن کر گردن ہلائی اور اس دھونی پوش کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر تین پیلی لکیریں پڑی تھیں۔ دونوں کانوں میں سونے کی ہندیا پڑی تھیں اور جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ چہرہ خون کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں اس کی صحت اور حالت سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی کتنی آمدنی ہوگی۔ جب اس کا یہ حال ہے تو کرشن گوپال کا تو کیا کہنا۔ وہ اکثر کہتا۔ ”کیا کام ہے کیوں آئے ہو؟“ وہ بولا۔

”مہاراج سے ارجنٹ ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔

نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ ماورائی قوت حاصل کرنا چھٹنا مشکل ہے۔ اس سے زیادہ مشکل ان کا استعمال ہے۔ یاد رکھ اندھیرے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔ صبح ضرور ہوتی ہے۔ تجھے ابھی سے یہ ڈر لگتا ہے کہ قوت چھین نہ جائے۔ یاد رکھ یہ ڈردن بدن بڑھتا جائے گا اور تیری غلامی کی زنجیریں مضبوط ہوتی جائیں گی۔ تیری واپسی کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ تیرے پاس آخری موقع ہے۔ اپنے من کو اجلا کر لے، مایا کے پھیر سے نکل آ اور منش کی سید کو اپنا رہم بنالے۔ تیری منو کا منائیں، خود بخود پوری ہو جائیں گی۔ یاد رکھ تیرے ارد گرد ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ تجھے اس جال کو توڑنا ہوگا۔“

اس نے گردن سیدھی کر لی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند منٹ اس نے خود کو سنبھالا اور پھر بولا۔

”چھپ کر اپدیش دیتا ہے۔ مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتا ہے تو اگر بٹ ہے تو یاد رکھ میرا نام بھی مہارنج کرشن ہے۔“ وہ غصہ بھری آواز میں بولا۔

”مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ کیا کرے گا اتنی مایا کا، تیرے آگے ناتھ نہ پیچھے پکھا۔ سب بیکار جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”تو اس کی فکر نہ کر تو اپنی فکر اس کمرے میں آ تو گیا ہے، جائے گا کیسے۔“ وہ بولا۔

”میں جس طرح آیا تھا، چلا جاؤں گا تو کیا روکے گا۔“ میں نے کہا۔

”میری ہنسی کا اندازہ تو نے غلط لگایا ہے۔ میری ہنسی اپریم پار ہے۔“ وہ بولا۔

”تو اب بھی نادانی کی باتیں کرتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ بڑی خود اعتمادی اکثر انسان کو لے ڈوٹتی ہے۔ تیرا بھی یہی حال ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جس کی جب میں رقم ہوگی تو بولے گی بھی۔ خالی جیب کیا بولے گی۔“ وہ غرور سے بولا۔

”تیری آدمی رقم تو خرچ ہوگئی۔ تو نے کالی کا جاپ

آ کر ڈر جائے۔ مجھے اندر آنے کو دروازے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا تو ایک چوکی درمیان میں پڑی ہے اور اس پر ایک آدمی آسن جمائے بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے لوہان بل رہا ہے اور ایک مٹی کا چراغ جل رہا ہے۔ کچھ پھول گیندے کے اس کے سامنے پڑے ہیں اور ایک پھولوں کا ہار اس کے گلے میں پڑا ہے۔ بدن سے وہ ننگا ہے اور زیر جائے کے طور پر صرف لنگوٹی باندھے ہوئے ہے۔ جسم سے وہ سائڈ کی طرح تنگڑا ہے۔ اس کی نگاہیں مٹی کے چراغ پر ہیں۔

میں خاموشی سے اس کے سامنے چلا گیا۔ دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے دیکھ سکتا ہے کہ نہیں۔ مگر وہ میری آمد سے بے خبر تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چراغ اٹھایا اور پھر پھونک مار کر بجھا دیا۔ چراغ کے بجھتے ہی وہ زور سے ڈکرایا۔ ”ارے مار ڈالا..... کون ہے رے تو؟“

میں خاموش رہا اور سب کھڑکیاں کھول دیں اور پردے سرکا دیے۔ چاند کی روشنی اندر آنے لگی تو ماحول تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ وہ منہ اندھا کئے چوکی پر پڑا تھا۔

میں اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔ ”زیادہ غریب نہ کرو تو مرے گانہیں۔“

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی اور کمزور آواز میں بولا۔ ”سامنے تو آ! تو کون ہے چھپ کر وار کر گیا۔“

”میں نے وار کب کیا ہے، صرف تجھے جاپ سے روکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس دنیا کے ریت روان نہیں جانتا۔ جاپ اٹھو رہ جائے تو سزا بھی ملتی ہے۔ تو نے مجھے فی البدا میں ڈال دیا ہے۔ اس جاپ کا میرا دشمن ہو جائے گا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تو نے بہت مایا جمع کر لی ہے۔ تیرے نوکر کھا کھا کر ساٹھ ہو رہے ہیں۔ کیا کرے گا، اس مایا کا۔ تیری اڑتھی کے ساتھ جائے گی۔ تو نے جو راستہ اپنایا ہے وہ غلط ہے۔ اس راستے پر انسان، انسان نہیں رہتا۔

پورا نہیں کیا۔ وہ تو گئی اب چالیس دن تیرے قریب نہیں آئے گی اور تیرا ایک میر میری جیب میں پڑا ہے۔“
میں نے آٹے کی گولی اس کی طرف اچھال دی۔
اس کے باقی ساتھی بھی اس جیسے بودے اور کمزور ہیں۔ ”تو اب کیا کرے گا؟“

”میرے پاس اور بہت کچھ ہے۔ دیوانے میں ایک دو پر بھر ورس نہیں کرتا۔“ وہ بولا۔

”اور اسی لئے تو کمزور ہے۔ میں جارہا ہوں۔ میری باتوں کو غور کرنا۔ پھر آؤں گا تو جواب تیار کر لینا، روک سکتا ہے تو روک لے۔“

اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی میرے سامنے ایک بہت بڑا بچھو آ گیا اور تیزی سے وہ بوہنا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ راستہ بند ہوتا، الو نے اس کا ڈک توڑ دیا۔ ڈک توٹنے ہی وہ دھواں بن گیا اور میں واپس آ گیا اور راتوں رات واپس انور حسین کے پاس پہنچا اور میں نے اس سے کہا۔

”آپ یہ بتائیں کہ اگر میں اجمل کی شادی امینہ سے کرنا چاہوں تو آپ راضی ہیں؟“

انور حسین نے جواب دیا۔ ”میں نے اب تک لڑکے کو دیکھا تک نہیں، ہاں کس طرح کروں۔“

”آپ کی بات مناسب ہے۔ لڑکا اسی شہر میں موجود ہے۔ میں آپ کے پاس لے آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ اور شام کو اختر حسین کے ساتھ اجمل آ گیا اور انور حسین نے لڑکے کو پسند کر لیا۔

”پھر آپ شادی کی تیاری کریں۔“ میں نے کہا۔
”مجھے کیا تیاری کرنا ہے مگر اس ساپ کا کیا کریں۔“

وہ بولے۔

”اس کا میں انتظام کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔
اختر حسین اور اجمل چلے گئے، میں وہیں پر تھا۔

آدھی رات گزری تھی کہ ایک آدمی دروازے پر آ گیا اور بولا۔
”میرا نام جمنا داس ہے۔ میں گجرات سے آیا ہوں۔ میری منگیت یہاں رہتی ہے۔ اس سے ملنا ہے۔ اندر آنے دو۔“

میں سب سے پہلے دروازے پر پہنچا اور میں نے کہا۔
”تم ہندو ہو، کس ذات کے ہو؟“ بتاؤ۔

”میں کھتری ہوں کھرا۔“ وہ اکثر کر بولا۔

”مگر یہاں آ کر کھوٹے ہو گئے، کیونکہ یہ گھر ایک مسلمان کا ہے، تم غلط گھر آ گئے ہو، واپس جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”تم کون ہو، لڑکی کے پتا کو بلاؤ۔ اس نے وعدہ خلائی کی ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا وعدہ خلائی کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا اور اب لگن کسی اور کے ساتھ کر رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا، تم سے وعدہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کی لڑکی ہے، وہ جس سے چاہے شادی کر دے، تم کون ہو روکے ٹوکنے والے۔“ میں نے کہا تو وہ غصے میں بولا۔

”میرے گرو سے اس نے وعدہ کیا تھا اور وقت مانگا تھا۔“

”تو اور تیرا گرو کون ہوتے ہیں، اس کے گھر کے معاملات میں دخل دینے والے۔“ میں نے کہا۔

”تو کون ہے اس کے پتا کو بلا، اس سے بات کروں گا۔ وہ لڑکی میری پسند ہے، ہم کو جو پسند آ جائے، وہ ہماری ہو جاتی ہے۔ گرو کی کرپا سے تو بھی سمجھ لے کہ ہمارا گرو مہاراج کرشن ہے۔ اب بول کیا بولتا ہے؟“

”ارے ہم کیا بولیں تم نے تو نام لے کر ڈرا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس کھسک گئی پھونک، لڑکی کے پتا کو بلا کے لا، جلدی کر۔“ وہ غرور سے بولا۔

”لاتے ہیں تم اندر تو آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔
وہ اکثر ہوتا کمرے کے اندر آ گیا۔ اندر اس کا استقبال ایک تیز ہوانے کیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ ہوا صرف اس کو لگ رہی تھی اور پھر وہ ایک

منتر کا ایک پیر ہوتا ہے۔ کالاعلم حاصل کرنا نہایت خطرناک کام ہے۔ پیر اگر الٹ جائے تو عامل بڑی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور اگر تباہ آجاتا ہے تو بھینٹ مانگتا ہے۔ اس کو خوش کرنا پڑتا ہے، جب وہ کام کرتا ہے۔ جو جو کام کرتا ہے، وہ بدی کے ہوتے ہیں۔ نیکی کے کام اس کو بتائیں سکتے۔ اول تو وہ کرے گا نہیں اور اگر کر دیا تو جس کا کام ہوگا، اس کو نہیں چھوڑے گا۔ ہر صورت خراب ہوتی ہے۔ مگر یہ دولت اور طاقت کے لالچی پھر بھی باز نہیں آتے اور ان کا انجام بھی بہت بھیا نک ہوتا ہے۔

وہ پیر ایک بندر کی شکل کا تھا۔ اس کی طاقت کا سر چشمہ وہ چراغ میری جیب میں تھا۔ وہ اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کو بھی پتہ نہیں تھا کہ ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ وہ ضرور کرشن گوپال کا کام تمام کر دیتا مگر میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میرا اصول ہے کہ میں کسی کو بھی مارتا نہیں چاہتا۔ پانی سر سے اونچا ہو جائے اور کوئی صورت باقی نہ رہ جائے تو دوسری بات ہے مگر یہاں ایسی صورت حال نہیں تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بندر منیر کرشن سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے جیب سے چراغ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ چراغ دیکھ کر چراغ پر جھپٹا۔ مگر میں نے ہاتھ اوپر کر لیا۔ چراغ اس کو نظر آ رہا تھا مگر وہ چراغ ہوا میں معلق کس طرح تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ ذکر اتا ہوا اچھل کود کر رہا تھا۔ کرشن نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ بھی بندر کی اچھل کود دیکھ رہا تھا۔

”ٹھہر جا، زیادہ نہ اچھل کود کر، یہ تیرا ہے، تجھے مل جائے گا، تیری شکتی اس میں ہے۔“ مجھے خبر ہے۔ ”بندر کھوں کھوں کرنے لگا۔ وہ ایک بہت بڑا بندر تھا۔ کھڑا ہوا تو آدمی کے قد کے برابر ہو جائے۔ اس کا دہانہ خوشفا حد تک چوڑا تھا۔ شکل بھی بھیا نک تھی اور رنگ سیاہ کا لاکھا۔ چہرے کے اطراف سفید بالوں کی جھاری تھی۔ میرے کہنے سے وہ ایک جگہ ساکت ہو گیا۔

”دیکھ لے، کرشن گوپال تیرا بندر میرے اشارے پر ناچتا ہے تو اپنی جھوٹی شکتی پر کب تک گھمنڈ کرنے لگا۔ تیرے

بگولے کی شکل اختیار کر گئی اور اس کو اڑا کر باہر لے آئی اور پھر بگولے کے چکر میں آگئی اور چکر نے اس کو اوپر لے جانا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا۔ بگولے کے چاروں طرف پھیلنے لگیں اڑ رہی تھیں۔ کوئی کوئی پھلجھڑی اس کے قریب بھی آئی مگر بگولے کا پکراتا تیز تھا کہ کوئی اس کو چھو نہیں سکتا تھا اور پھر کبھی دیر میں وہاں کچھ نہیں تھا۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ ابھی کیا ڈرامہ ہوا۔ مہاراج کا لاڈلا کہاں چلا گیا۔

اجمل کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہاراج کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جننا اس کی گمشدگی کرشن گوپال سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ وہ اس کی شبہ پر ہی آیا تھا۔ اس کی حفاظت کا بھی انتظام کیا گیا تھا مگر وہ غائب ہو گیا۔ مہاراج تاؤ کھار ہا ہوگا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ انور حسین کا گھر خطرناک ہو گیا ہے۔ وہ نئے سرے سے نئی تیاریوں کے ساتھ وار کرنا چاہے گا۔ جنگ کا میدان کہاں ہوگا۔ اس کا بھی اس کو اندازہ نہیں تھا۔ ساتویں روز میں روپوشی کی حالت میں کرشن گوپال کے بنگلے میں گیا۔

ماحول وہی تھا۔ صرف پہرے سخت تھے مگر پہرے دار اندھے تھے۔ وہ میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ میں ایک کے بعد ایک کوسلاتا ہوا اس کے کمرے میں تھا۔ اس کا کالا کمرہ حسب معمول اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور کرشن ایک دیا جلانے آسن جمائے ہوئے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آج پھر وہ کوئی جاپ کر رہا ہے۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اپنے کارندوں کو ہوشیار کیا۔ حالانکہ وہ کبھی غافل نہیں ہوتے تھے اور میں اس کے سامنے چلا گیا۔

میرے جاتے ہی دینے کی لوتھرائی اور کرشن نے آنکھیں چاروں طرف گھمائیں مگر وہ کچھ بھی نہ دیکھ کر اور پھر منہ ہی منہ میں بد بدانے لگا۔ میں نے اچانک اپنا ہاتھ دینے کی لو پر رکھ دیا۔ دیا بڑی زور سے بھڑکا ضرور مگر سمجھ گیا اور میں نے دیا جیب میں رکھ لیا۔ اندھیرا ہوتے ہی کرشن کی آواز آئی۔

ہائے مار ڈالا، ارے چھوڑ دے۔ ”چشم زدن میں کرشن گوپال اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کا غلام ہونے والا پیر اس پر سوار تھا اور اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ ہر

آئے اور چلے گئے اور ہاں تیرا وہ چیلہ بھی اپنے گھر آ گیا ہے
اس کا دماغ بھی اب ٹھیک ہے تو بھی اپنا چلن ٹھیک کر لے۔
”میں نے کہا۔
”میں اب کچھ نہیں کروں گا۔ میں نے سبق پڑھ لیا
ہے۔“ وہ بولا۔

اور کچھ کرنے کے تو اب لائق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ
تیرے سارے کبوتر بگولا اڑا کر لے گیا ہے۔ انسانوں میں
رہو اور انسانوں کی زندگی گزارو۔“

اور پھر چند دن بعد ایمنہ اور اجمل کی شادی سادگی
سے ہو گئی۔ سارے لوگ خوش تھے اور خاص طور سے انور
حسین جن کی جان عذاب سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ میرے
بڑے شکر گزار تھے۔

☆.....☆.....☆

دنیا میں انسان کا آواز اور ہٹا ایک دلکش اور پرفریب
خواب ہے۔ صرف ایک لمحے کا خواب مگر انسان اس کو سمجھ
نہیں پایا۔ وہ اس لمحے کو ابھی سمجھنے لگتا ہے اور وہ کچھ کرنے
لگتا ہے جو کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اتنی
موٹی بات نہیں آتی کہ وہ کتنا محدود ہے نظر محدود ہے، دماغ
محدود ہے، سماعت محدود کہاں پر لا محدود ہے۔ ہر مقام پر
پابندی ہے۔ انسان ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ اس
کے باہر جانے پر پابندی ہے مگر انسان یہ نہیں سمجھتا، اس کی
خواہشات لامحدود ہیں۔ وہ کسی مقام پر رکتا نہیں آگے اور
آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ آگے دیوار ہے وہ اس کو بھی
پھلا لگنا چاہتا ہے اور پھر منہ کے بل زمین پر گرتا ہے اور لمحہ ختم
ہو جاتا ہے۔ خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ شاید تب وہ سوچتا ہے
کہ جواب تک تھا وہ تو خواب تھا۔ کاش پھر میں وہی خواب
دیکھ سکوں۔ وہ لمحہ پھر بیٹھ مل جائے۔

جو لوگ عقل و دانش والے ہیں وہ یہ سب جانتے
ہیں۔ ان کے طور طریقے زندگی کی آخری سانس تک مسافرا
نہ ہوتے ہیں۔ وہ خود کو دوران سفر ہی خیال کرتے ہیں اور
وہی لوگ فائدے میں ہوتے ہیں۔
دنیا میں دولت کا حصول ایک بنیادی خرابی ہے۔

سارے بندر میرے اشارے پر تاجیں گے اور جو بودے
رکھوالے تو نے کھڑے کئے تھے، وہ سب آرام سے سو رہے
ہیں۔ میں اگر چاہوں تو تیرا یہ بندر ہی تیرا کام تمام کر دے،
میں تیرے اس بندر کو آزاد کر رہا ہوں۔“ اور پھر میں نے کہا۔

”سن رے ہنومان کی قوم کے جیالے، کہنا ہنومان
سے کہ آئندہ دیکھ بھال کر کسی کی سہانچا کیا کرے۔ یہ لے
چراغ اور بھاگ جا۔“ اور میں نے اس کے اوپر چراغ ڈال
دیا اور بندر نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس دوران مہاراج
کرشن نے یہ کام دکھایا کہ وہ ایک چیل کی شکل میں آسمان پر
اڑ گیا۔ مگر پھر اسی کمرے سے ایک بگولا اٹھا اور آسمان تک
اوپر چلا گیا اور کرشن کو پال جو چیل بنا ہوا تھا، اس کو اپنی پلیٹ
میں لے لیا۔ اب وہ چیل بگولے میں اتنی تیزی سے چکر
کھاتی تھی کہ ایک نقطہ نظر آتی تھی اور پھر بگولے کی اونچائی
کم ہونے لگی اور کم ہوتے ہوتے پندرہ بیس فٹ رہ گئی اور
اچانک وہ بگولا ختم ہو گیا اور کرشن مہاراج زمین پر دھم سے گر
پڑا۔ اس کا حال خراب تھا۔ اس نے آسمانوں میں اتنی تیزی
سے گردش کی تھی کہ اس سے کھڑا تک نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ
زمین پر ایک مردے کی طرح پڑا تھا۔ میرے اشارے پر
ایک کارندے نے اس پر پانی ڈالا تو اس نے کروٹ لی اور
آنکھیں کھول پھر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔
”تو نے دیکھ لی اپنی کشتی، اسی پر اترتا تھا۔ جب برا
وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ نہیں دیتا تو ہوائی کشتی پر ناز کرتا
تھا۔ اس کے بل پر دولت کے ڈھیر لگا رہا تھا۔ وہ دولت
تیرے کچھ کام آئی۔ اب بول۔“ میں نے کہا۔

”میں ہار گیا تو کیا ہے، کون ہے میری سمجھ میں کچھ
نہیں آیا۔ میں کس سے مقابلہ کروں، کس پر وار کروں،
میرے پیراںدھے ہو گئے ہیں۔ میں اندھا ہو گیا۔ میں ہار
گیا۔“ وہ بولا۔

”دنیا میں ایک سے ایک بڑی شکتی موجود ہے۔
سب سے بڑی شکتی اس کی ہے جس نے اس کائنات کو بنایا
ہے، سجایا ہے، کوئی بھی اس کی بنائی کائنات کو ہزاروں،
لاکھوں سال سے بگاڑ نہیں سکا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے

”ارے یہ تو میری کاٹھی ہی ایسی ہے۔ باپ کے گھر کی کھائی آئی ہوں۔ تم کیا کھلاؤ گے۔ تین آنے روز کما تے ہو اور باتیں نظامِ سقہ والی کرتے ہو۔“

”سن لے اچھی طرح یوں ہمارے بزرگوں کو سچ میں نہ لانا۔ ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔“ رستم خان چمن بھٹنا کر بولتے۔

”ارے مجھے کیا پڑی ہے کہ نام لوں ان کچھوں کا۔“ بیوی جواب دیتی۔

”کم بخت ہوگی تو اور تیرا خاندان۔“ رستم خاں جواب دیتے۔

یہ سلسلہ روز کا تھا۔ رستم خاں کمائی کے نئے سے نئے طریقوں پر غور کرتے مگر قابلِ عمل کسی کو نہ پا کر شک اٹھالیتے۔ مگر جس قدر کمزور مسکین سے نظر آتے تھے، اندر سے ایسے نہ تھے۔ ہر وقت ان کی کھوپڑی میں کچھ نہ کچھ پروگرام ہنتر ہوتا۔

انسان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو سوچوں کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر اس طریقہ پر غور کرنے لگتا ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکتی ہو۔ اگر رستم خان پڑھا ہوتا تو اس کے سوچنے کا انداز بھی تعلیم کے مطابق ہوتا مگر یہ بچارہ ایک جاہل آدمی تھا۔ اس کی سوچ محدود تھی۔ وہ اگر جرائم پیشہ ہوتا تو کسی کے بھی گھر سے کچھ چرا لیتا۔

مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ روز روز کی درنہ کل کل کرنے اس کو بہت سے راستے بتائے مگر اس کی اہمیت ساتھ چھوڑ گئی۔ گوالیار میں راجہ کا راج چلتا ہے۔ یہاں پر زیادہ تر آبادی کسانوں اور دربار کے ملازم اور فوج کی ہے۔ ہندو ریاست میں مسلمانوں کی کون سنتا ہے۔ ان کی معاشی حالت یوں بھی خراب رہتی ہے مگر جو مسلمان پشت پاشت سے یہاں رہتے ہیں وہ کہاں جائیں۔ یوں تو ہر ماہ ہندوؤں کا کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا ہے مگر ان تہواروں پر میلے بھی لگتے ہیں۔ موسمِ بہار کی آمد پر ان کا ایک تہوار ہوتا ہے اور اس خوشی میں ایک بڑا میلہ بھی لگتا ہے گو کہ یہ علاقائی تہوار ہے اور علاقائی میلہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ گوالیار شہر اور آگرہ کے درمیان

دولت کو صرف ایک مقام پر ایک کے پاس محدود کر دینا خرابی کی جڑ ہے۔ پھر اس کو حاصل کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک سلسلہ جرائم کا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر طاقت کا زور چلتا ہے۔ ناتواں ہارتا ہے اور طاقتور جیتتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ کسی بھی چیز سے مخرومی اس چیز کی طلب بڑھاتی ہے اور شدت بڑھاتی ہے اور پھر یہ ایک ضد بن جاتی ہے۔ نام تو ان کا رستم خان تھا مگر وہ ایسے نظر نہیں آئے تھے۔ ان کے باپ دادا نے زندگی بھر کمر پر مشک لا کر لوگوں کے گھروں پر پانی بھرا تھا۔ اپنا رشتہ نظام سقہ سے جوڑتے تھے۔ وہی نظام سقہ جس نے ڈوبنے سے ہمایوں کی جان بچائی تھی اور پھر دھائی دن کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور اس نے چڑے کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔

وہ خود بھی لوگوں کے گھروں میں پانی بھرا کرتے تھے۔ مشک لے کر دروازے پر جاتے۔ آواز لگاتے بی بی پانی اور پھر ان کو اندر آنے دیا جاتا۔ وہ شرفاؤں کے گھروں کے اندر جانے والے آدمی تھے۔ ان کے رہن بہن اور گھر بن کی سجاوٹ اور طوطیوں کو دیکھتے تو دل پر سانپ لٹھ جاتے۔ سارے دن کمر پر مشک لا دے گھروں میں پانی ڈالتے تو شام کو دو چار آنے ملتے۔ گھر آتے تو بیوی بھری پیٹھی ہوتی۔ وہ دن بھر بنی سنوری تاک نقشہ سے اچھی عورتوں کو دیکھ کر خواب دیکھتے، گھر آتے تو میلی بدبودار کپڑے پہنے بیوی سے سامنا ہوتا، ان کا مزاج ہی بدل جاتا، وہ ہر سامنا بنا کر دن بھر کی پانی کی کمائی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور بیوی روز ہی کہتی۔

”بس سارے دن میں تین آنے اس میں کیا تم کو کھلاؤں اور کیا لوٹنیا اور لوٹنہ کے کھلاؤں۔ میں تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہوں۔“ رستم خان حل کر کہتے۔

”پہلے کے جھوٹے مر جاتے تھے، اب تو بخار بھی نہیں آتا۔“

”اے لونہ میں نے کیا جھوٹ بول دیا۔“ بیوی کہتی۔

”نہیں کھانی تو ساڑھ کیسے ہو رہی ہے، نیک

بخت۔“ رستم خان جواب دیتے۔

گوپی کشن نامی گاؤں کے قریب لگتا ہے۔ اس میں غریب امیر ہندو مسلمان سکھ عیسائی کسی پر پابندی نہیں ہوتی۔ سب لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تفریح کے دن سب سامان ہوتے ہیں جو کہ میلوں میں ہوتا ہے۔

غریب لوگوں کے لئے یہ مفت کی تفریح ہوتی ہے۔ دو چار دن پہلے ہی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ کپڑے پرانے بھی ہوں تو بھی ان کو صابن سے دھویا جاتا ہے۔ پھنوں کو مرمت کر لیا جاتا ہے۔ اگر جامت بڑھ گئی ہے تو بنالیتے ہیں۔ میلے والے روز تہا دھو کر صاف کپڑے پہن لئے۔ سرمیں اور ہاتھ پیروں پر خوب تیل لگالیا۔ کاہل بھر پور طریقوں پر آنکھوں میں بھر لیا اور چھیلا بن کر ٹولیوں کی شکل میں مذاق دل گئی کرتے چلے، میلے کو کوئی دس میل پیدل چل کر آیا کوئی پندرہ میل، میلا گاؤں آنے سے پہلے پھر اپنی جھاڑ پونچھ کی اور چھیل چھیلے بن گئے۔

اب ہنسی مذاق اور مرستی شروع ہو گئی۔ نہ اتنی دور آنے کی تھکن نہ واپس جانے کی تھکن کا احساس..... نیلی چلی پکڑ پاپاں اور رنگین ساڑیوں کی بہار کوئی پکڑے کھا رہی ہے کوئی لٹکھی چوٹی کا سودا کر رہی ہے۔ دوکانداروں کی دو کانوں پر مردوں سے زیادہ عورتوں کی بیھڑ ہے۔

مزخرفیاری کم اور نظارہ بازی زیادہ کر رہے ہیں۔ لڑکوں کے وعدے پورے ہو رہے ہیں۔ لڑکیاں گھونگھٹ کی اوٹ سے حرکات اور سکناات سے اپنا مدعا بیان کر رہی ہیں۔ میلے کا مصروف بہت ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ایک طرف سادھو اپنا وحدنا کر رہے ہیں۔ نجوی اور فال نکالنے والے خوب بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کوئی اپنی جادوگری دکھا رہا ہے اور دیہاتی حیرت کی تصویر بنے دیکھ رہے ہیں۔

رستم خاں بھی میلے کے شوقین تھے۔ ان کی جیب میں ایک آنا تھا۔ ایک آنا پہلے ہی خرچ کر چکے تھے۔ اس ایک آنے میں میلا بھی دیکھنا تھا اور واپسی پر کچھ سوغات بیوی بچوں کے لئے بھی لے کر جانا تھا۔ اگر دوستوں کے ساتھ ہوتے تو وہ فلاح ہو چکے ہوتے۔

ہر چیز کو دیکھ کر دل لپکار ہاتھا۔ کھانے کی چیزوں کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ان کا دل مچلا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ اس طرف چل دیئے۔ جھڑ رنق کلم بھی اور بازار سے دور جگہ تھی۔ یہاں پر کچھ چھو لدا ریاں پڑی تھیں۔ زمین پر آگ جل رہی تھی اور آگ کے پاس دو چار سادھو ٹاپ کے لوگ جسم پر دھول بھوت ملے ننگے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزرنے لگا تو کسی نے اس کو آواز دی۔

”ٹھہر جا بچہ بڑا اکڑا پڑا ہے۔ جیب میں ایک آنا لے کر اتنی اکڑ ٹھیک نہیں ہے۔“

رستم خاں ٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر آواز آئی۔ ”کھڑا کیا ہے ہمارے پاس تیرا ہی فائدہ ہے۔“ رستم خاں تو پہلے ہی ایک آنے والی بات پر حیران تھا، کھڑا رہا تو پھر کہا گیا۔

”ارے ہم لئے نہیں، دینے کو بلاتے ہیں۔“

اب رستم سے کھڑا نہ رہا گیا اور وہ چھو لدا ریا کی طرف چلا گیا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی اور اس کے گرد پانچ بھوت ملے سادھو ننگے بیٹھے تھے۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس کو کس نے بلایا تھا۔ وہ ان کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ تو ان میں سے ایک کھڑا ہو گیا۔ اس کی داڑھی سب سے لمبی تھی اور ان میں عمر مریدہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چاروں آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ لمبی داڑھی والے نے رستم کو چھو لدا ریا کے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پہلے خود اندر چلا گیا۔ رستم خاں ذرا سا بھیگا مگر پھر چھو لدا ریا کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اندر ایک چٹائی پڑی تھی۔ اس پر وہ سادھو بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رستم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو رستم بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی پھر سادھوی آواز آئی۔

”تیرے برے دن جانے کو ہیں اور مایا تیرے پاس آنے کو ہے۔ بول تجھے مایا کی ضرورت ہے۔“

رستم تو یہ سن کر نہال ہو گیا۔ سادھو کے پیر پکڑ کر بولا۔

”ہاں مہاراج ضرورت تو بہت ہے۔“

”تو پھر تو وہ کرے گا جو ہم بتلائیں گے۔“ سادھو نے کہا۔

”میں تیار ہوں، آپ حکم کرو۔“

رستم کو بیوی پر رعب جھاڑنے کا موقع چاہئے تھا۔
اکڑ کر کہا۔ ”تو آم کھا، پیڑوں سے کیا لیتا ہے۔“
”تم تو ناراض ہونے لگے۔ پوچھ لیا تو کیا گناہ کر دیا
۔“ وہ ناک سکڑ کر بولی۔

”تو بھی سن لے اچھی طرح میں کسی طرح
کھاؤں، یہ مت پوچھنا، میرا کام ہے کھانا اور تیرا کام ہے
کھانا تو اپنا کام کر، میں اپنا کروں گا۔ ہرگز مت پوچھنا۔“
رستم خان اکڑ گئے۔

”اچھا ٹھیک ہے نہیں پوچھوں گی۔ آج تو تم کچھ
نئے سے لگ رہے ہو۔“ وہ بولی۔

”ہاں تو کھر میں رہنے والی عورت ذات بس اپنی
میں رہنا۔ مجھ سے سوال جواب مت کرنا۔ تیرا کھانا پینا
پورا کرنا آتا ہوں اور آگے بھی پورا کروں گا۔“

ابھی ایک روپے نے ہی بیوی پر رعب جمادیا۔ رستم
خاں کی جیب میں اب بھی تین آنے بڑے تھے اور وہ خود کو
بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ آخر تین آنے کی رقم کے
مالک تھے۔ دوسرے دن انہوں نے تین آنے بیوی کے
ہاتھ پر رکھ دیئے اور چل دیئے۔ گولی کشن گاؤں کی طرف
جہاں پر کل میلا اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ آج یہاں پر میلے کے
بچے بچے کچھ کچھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر ایک چھولداری اور
جگہ لگی ہوئی تھی اور اس کے دروازے پر آگ جل رہی تھی اور
آگ کے اطراف پانچ سادھوکل کی طرح بیٹھے آگ تاپ
رہے تھے۔ سردی زیادہ نہیں تھی اور دھوپ بھی پھیل چکی تھی
مگر یہ لوگ شاید رات سے اسی طرح بیٹھے تھے۔

رستم ان کے قریب چلا گیا تو وہی بوڑھا لمبی داڑھی
والا اٹھ کر چھولداری کی طرف چلا اور اپنے ساتھ رستم کو آنے
کا اشارہ کیا۔ پہلے بوڑھا اندر گیا۔ اس کے بعد رستم بھی اندر
چلا گیا۔ اندر وہی چٹائی اسی طرح پڑی تھی۔ سادھو بیٹھ گیا تو وہ
بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر
سادھو نے اپنی کپکپاتی آواز میں کہا۔

”کل کا سبق سنا۔“ رستم کو ساتوں لفظ اچھی طرح یاد
تھے۔ اس نے فر فر سنا دیئے۔

”ہم کچھ شہد بتاتے ہیں۔ ان کو یاد کر لیتا۔ یاد کر لیا
تو آگے بتائیں گے۔“ سادھو نے کہا۔
”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ رستم نے کہا۔

اور سادھو مہاراج نے ایک ایک لفظ بتانا شروع
کر دیا۔ رستم کے لئے یہ انوکھی زبان تھی۔ نرالے الفاظ تھے،
اس کی زبان سے بڑی مشکلوں سے ادا ہو رہے تھے۔ یہ
صرف سات لفظ تھے۔ مگر بڑی مشکلوں سے رستم کی زبان
پر چڑھ اور پھر آہستہ آہستہ روانی آئی گئی۔ سادھو نے بڑی
آہستگی سے اور بڑے صبر سکون کے ساتھ رستم کو یہ الفاظ یاد
کرا دیئے اور بار بار ان کو سن لیا۔

”تجھے پہلا سبق یاد ہوا۔ کل میلا ختم ہو جائے گا۔
سب چلے جائیں گے مگر ہم تجھے نہیں پرلیں گے۔ تیرا دوسرا
سبق بتایا جائے گا۔ مگر ایک بات ہماری یاد رکھنا، ہمارے
بارے میں یا اس سبق کے بارے میں کسی سے ذکر مت کرنا
اور اگر تو نے ذکر کیا تو بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائے
گا اور اگر نہ کیا تو مایا تیری ہوگی تو اس دھرتی کا دھنواں ہوگا۔
میرے کہے کو بھڑکی لکیر کھنا اب جا۔“

شام تو ہو ہی رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک آٹا خرچ
کر کے کچھ سوغات خرید لوں اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا
تو پورا ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر اس روپے کو دیکھا۔ ایک تو ایک زمانے کے بعد
پورے روپے کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے آنے کے بدلے پورا
روپیہ اس کے پاس تھا۔ وہ تو آج کا امیر آدمی تھا۔ اس نے
گھر کے لئے خوب خریداری کی۔ اس نے وہ کچھ خرید لیا جو
کبھی نہیں خرید تھا اور پیدل کی بجائے تانگے میں گھر آیا۔

بیوی تو دیکھ کر خوش ہوئی۔ آج پہلی بار اس نے رستم
کو کچھ نہیں کہا۔ واری صدقے جاتی رہی۔ رستم نے دل میں
سوچا کہ مایا تیرے تین نام، برسا، برو، برس رام۔ ابھی تو
ابتدا ہے۔ آگے تو یہ عورت نہ جانے کیا کرے گی۔

بیوی کی مارے خوشی کے ساری ہنسی نظر آرہی تھی۔
وہ بولی۔ ”اے تم تو پورا میلا لوٹ کے آگئے۔ اتنی رقم کہاں
سے ملی، یہ تو بتاؤ۔“

”شباباش۔“ سادھو نے کہا۔ ”ان سات شبد کو تو معمولی نہ سمجھنا، ان میں بہت بڑی شکتی چھپی ہے۔ وہ شکتی دھرتی کے اندر کی ہے۔ دھرتی کے اندر بے شمار خزانے دبے پڑے ہیں۔ جن کے بارے میں اب کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس کے اندر رہنے والا ایک پیر جانتا ہے۔ وہی ان خزانوں کو نکال سکتا ہے۔ تیری کایا پلٹ جائے گی۔ تو مگرمی کا راجہ بن جائے گا۔ ہزاروں تیرے نوکر چاکر اور غلام ہوں گے تو سونے چاندی کے بستر پر سونے گا اور من چاہا کھائے گا۔ من چاہا پینے گا۔ باندیاں ہاتھ باندھے تیرے چاروں طرف کھڑی ہوں گی اور تو اپنی من چاہی کے ساتھ عیش کرے گا۔ تیری ہر خواہش پوری ہو جائے گی۔ مایا ہی ایک چیز ہے جس کے سب غلام ہیں۔“

مگر ہر چیز کا ایک مول ہوتا ہے۔ قیمت ہوتی ہے۔ کوئی چیز مفت میں نہیں ملتی۔ کچھ نہ کچھ تو دینا پڑتا ہے۔ تجھے یہ سب ملنے والا ہے۔ اتنا ہماری خزانہ لونڈی، باندیاں، نوکر چاکر، عیش و آرام مفت تو نہیں ملے گا۔ میں کچھ نہیں مانگتا، تیرا نام بدلنا چاہتا ہوں، بول راضی ہے۔“

سادھو نے بات ختم کی۔

”کیا میرا نام اچھا نہیں ہے۔“ رستم نے معصومیت سے پوچھا۔

”اچھا برا میں نہیں جانتا تو تیرا بدل دوں۔“ سادھو نے کہا۔

”مگر سب تو مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔“ رستم نے جواب دیا۔

”میں زیادہ نہیں بدلوں گا تیرا نام رستم خاں سے رستم

ال کر دیتا ہوں تو خود کو رستم لال کہے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ رستم تو اپنی جگہ برقرار ہے تجھے کیا فرق پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے سادھو مہاراج، رستم تو ہوں نا۔“ وہ

اولا۔

”تو بہت کامیاب ہوگا، بہت فرماں بردار آدمی

ہے۔“

اب میں دوسرا سبق بتاتا ہوں، غور سے سن اور اچھی

جب پکا ہو گیا تو پھر سادھو نے کہا۔

☆ (174) ☆

طرح سمجھ لے، بار بار پوچھ لے۔ جب اچھی طرح سمجھ جائے تو آگے قدم بڑھانا۔ تو نے جو شبد یاد کئے ہیں، وہی خزانے کی کنجی ہیں۔ ان شبدوں کو کسی پرانے مرگھٹ میں دریا کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا ہے اور اماؤں کی رات سے شروع کرنا ہے اور چالیس رات پڑھنا ہے۔ دن میں بھی مرگھٹ سے باہر نہیں آتا ہے۔ تیرے کھانے کا بندوبست ہم کریں گے۔ جسم کے کسی جگہ کے بال نہیں کاٹنے اور کوشش یہ کرنی ہے کہ تیرے اوپر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اگر مردے جلانے والے آجائیں تو چھپ جانا کسی کی نظر تجھ پر پڑے تو آنکھیں بند کر کے یہی شبد دل میں یاد کر لینا اور رات ہوتے ہی پھر پڑھنا شروع کر دینا۔ کتنی دفعہ پڑھے گا اس کی پابندی نہیں، جتنا زیادہ پڑھے گا، اتنا ہی جلدی تیرا کام ہوگا۔ تین رات، کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد تجھے بھلاوے میں ڈالنے کو تجھے ڈرایا جائے گا۔ تیری عورت کے روپ میں کوئی آئے گا، کوئی تیرے بچے کے روپ میں آئے گا مگر یہ سب صرف تجھے بھٹکانے کو ہوگا۔ ہر طرح تیری توجہ ہٹانے کو، ہر روپ بدل کر تیرے سامنے متاڑے ہوں گے مگر تجھے ہمت سے بیٹھے رہنا ہے اور شبد بولنے رہنا ہے۔ تیرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ جہاں پر تو آس جمائے گا، وہیں پر میں کنڈل قائم کر دوں گا۔ بڑی سے بڑی شکتی بھی اس کنڈل کے اندر نہیں آسکتی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لے، پوچھ لے۔ صرف ایک بات بہت ضروری ہے۔ وہ ہے کنڈل کے اندر رہنا اور شبد پڑھتے رہنا۔ کنڈل کے باہر کچھ ہو تو اس کی پروا نہیں کرے گا اور کنڈل کے اندر ہے گا۔ جب سورج نکل آئے تو کنڈل سے باہر آسکتا ہے۔“

یہ سبق رستم کے لئے ذرا بڑا تھا۔ مگر اس نے سادھو کی باتوں کو غور سے سنا تھا۔ اس کے سامنے خزانہ پڑا تھا۔ وہ اس کو حاصل بھی کرنا چاہتا تھا۔ پھر سادھو کی بات کیوں نہ غور سے سنتا۔ اس نے ایک ایک بات کو گہرے میں باندھ لیا تھا۔

کئی دن وہ سادھو کے پاس جاتا رہا۔ سادھو اس کو پھیر کر کے سوالات کرتا رہا اور وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتا رہا۔

جب پکا ہو گیا تو پھر سادھو نے کہا۔

☆ (174) ☆

”بس اب تیری گانتھ پکی ہے۔ ادا اس کی رات کل ہے تو تیاری کر۔“

اور پھر رستم مرگھٹ کی طرف چل دیا۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ دریاے جنا کے کنارے گوالیار شہر سے باہر ایک قدیم مرگھٹ تھا۔ یہاں پر صرف ضرورت کے لئے ہی لوگ جاتے تھے۔ ایک تو یہ عام گزرگاہ سے ہٹ کر تھا۔ دوسرے اس مرگھٹ کی ہیبت بہت تھی۔ بہت بڑے کچھوے دریا کے کنارے پڑے رہتے تھے۔ وہ مردوں کو منٹوں میں کھا جاتا تھے۔ وہ اس قدر بے باک اور بے دھڑک ہو گئے تھے کہ زندوں پر بھی حملہ کر دیا کرتے تھے۔ بڑی ذات کے ہندو اور کھانے پیتے لوگ تو مردے جلا دیا کرتے تھے مگر عام طور پر اتنا خرچ نہ اٹھانے والے مردے کو دریا میں بہاتے تھے اور یہ کچھوے ایسے مردوں کی تلاش میں کنارے پر بیٹھ رہتے تھے۔

رستم کو یہ سب پتہ تھا۔ سب سے پہلے تو دریا کنارے ایسی جگہ تلاش کرنا چھی، جہاں پر یہ کچھوے نہ ہوں اور پھر کام کرنا تھا۔ اسی لئے وہ دن کے وقت ہی مرگھٹ پر چلا گیا تھا۔

مرگھٹ میں دن کے وقت بھی ویرانی تھی۔ دریا کنارہ بھی بھیا نک نظر آتا تھا۔ ویرانی اور نحوست برس رہی تھی۔ آسمان پر چلیں اڑ رہی تھیں اور ایک طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی مردہ جلا یا جا رہا تھا۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے کنارے ہوشیاری سے چل رہا تھا۔ کنارے پر ہی اس کو ایک چوڑا سا بنا نظر آ گیا۔ یہ ذرا زمین سے اونچا تھا اور سوکھا ہوا تھا۔ یہ جگہ اس کو پسند آ گئی۔ وہ وہیں پر بیٹھ گیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔..... اور ادا اس کی بھیا نک رات آ گئی۔ راتیں تو اندھیری ہی ہوتی ہیں مگر ادا اس کی رات تو ایسی ہوتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ جھانکی نہیں دیتا۔ مرگھٹ میں دور دور روشنی کا نشان نہیں تھا۔ پانی بھی بے آواز بہہ رہا تھا۔ ہر طرف تہائی اور ہیبت طاری تھی۔ ایک لاکھودو خاموشی نے پورے مرگھٹ کو بہت پر اسرار بنادیا تھا۔ یہ رستم کی پہلی رات تھی۔ اس لئے اس پر کچھ زیادہ ہی اثر تھا۔ مگر

سادھو کے بتائے طریقوں پر اس کو چلنا تھا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر ساتوں الفاظ کی گردان شروع کر دی۔ اس کی نظر دریا پر تھی اور زبان پر سادھو کا بتایا ہوا منتر وہ اسی مقام پر بیٹھا رہا اور رات گزر گئی، کچھ نہ ہوا۔ سورج نکل آیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مرگھٹ سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ وہ سائے کی تلاش میں چل پڑا۔ یہ مرگھٹ بہت بڑا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ ایک جگہ اسے چار دیواری نظر آ گئی۔ یہ چار دیواری نہایت بوسیدہ حالت میں تھی۔ اس کو کیوں بنایا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے قریب چلا گیا۔ دیوار نے سایہ کر دیا تھا۔ پہلے وہ چار دیواری کے اندر گیا مگر وہاں پر کچھ نہیں تھا۔ وہ دیوار کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا، وہ آدمی اس کے قریب آ گیا اور ایک پولی اس کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے اس سے کچھ نہیں پوچھا نہ آنے والے نے کچھ بتایا۔ رستم نے پولی کھول لی، پولی کے اندر ایک مٹی کا کٹورہ نما برتن رکھا تھا اور اس کے اندر کچھ تھا۔ رستم نے انگلی ڈال کر تھوڑا سا زبان پر رکھا نہ وہ نمکین تھا نہ میٹھا تھا۔ بھوک تو رستم کو لگ رہی تھی۔ وہ کھانے لگا۔ تھوڑا سا کھانے کے بعد وہ اس کو ٹھیک معلوم ہوئے لگا اور وہ سب کھا گیا۔ اس نے کھایا کیا تھا، یہ یہ نہیں تھا۔ وہ اسی دیوار کے کنارے لیٹ گیا اور شام تک سو تا رہا۔ رات ہوتے ہی وہ پھر اسی چوڑے پر چلا گیا اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس رات بھی کچھ نہ ہوا، رات سکون سے گزر گئی۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ کچھوے دور دور منڈلاتے رہے، اس کے قریب کوئی نہ آیا۔

چوتھی رات رستم نے منتر شروع ہی کیا تھا کہ دریا کی طرف سے ایک مگر چمھ آتا نظر آیا۔ وہ سیدھا اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ بہت تیزی سے رستم کی طرف آتا تھا مگر چوڑے کے قریب آ کر رک گیا۔ رستم نے توجہ نہ دی اور منتر کا جاپ کرتا رہا۔ وہ مگر چمھ صبح تک اس کے قریب ہی پھرتا رہا اور صبح ہوتے ہی غائب ہو گیا۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ مجھے صرف ڈرانے آیا تھا۔ سورج چڑھتی ہے، وہ دیوار کے سائے میں چلا گیا۔ وہ پر اسرار آدمی جو اس کا کھانا لاتا تھا،

اٹھائے ہوئے تھے۔ آنے والوں نے وہ لاش چبوترے کے قریب رکھ دی۔ پھر کسی نے کہا۔ ”میاں اپنی بیوی کا آخری دیدار کرلو۔“ اور اس نے لاش پر سے کفن ہٹا دیا۔ یہ کون عورت ہے، رستم نے سوچا، دیکھا تو ہے کہیں، وہ خاموش سے دیکھتا رہا اور منہ سے جاپ کرتا رہا۔ دوسرا آدمی بولا۔

”بڑا بے غیرت ہے، اپنی بیوی کو نہیں جانتا۔“ تو رستم کو یاد آیا گیا۔ ارے ہاں تو میری بیوی ہے مگر بھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی اور وہ زور زور سے جاپ کے الفاظ بولنے لگا۔ ایک منٹ کے بعد ہی چبوترے کے پاس کچھ نہ تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد پھر لوگ آ گئے۔ ان کے ساتھ دو بچے تھے۔ رستم نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ تو میرے ہی بچے ہیں مگر فوراً ہی وہ سمجھ گیا کہ ابھی کچھ ڈرامہ لوگ کریں گے، یہ سب مجھے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ متواتر جاپ کرتا رہا۔ وہ لوگ چبوترے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

ایک بولا۔ ”دیکھ لو یہ بے غیرت تمہارا باپ، یہ تم کو نہیں بچائے گا۔“ دوسرا آگے بڑھا اور اس نے ایک تیز دھار چھری نکالی اور بولا۔ ”اس کی کبلی میں کھاؤں گا۔“ دوسرا بولا۔ ”لڑکی کی کبلی میں کھاؤں گا۔“ تیسرا بولا۔ ”بس اب تیاری کرو، یہ بے غیرت باپ جو خزانے کے لالچ میں بیٹھا ہے، ان دونوں کو نہیں بچائے گا۔ ہم کیوں اپنی دعوت خراب کریں۔“

اور ان لوگوں نے دونوں بچوں کو زمین پر لٹا دیا اور دونوں کے گلے پر چھری پھیر دی۔ رستم نے سب کچھ سمجھ کر بھی ایک جھٹکا کھایا مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی زبان پر جاپ کے شدید آواز آتے رہے۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ جسم میں تھراہٹ پیدا ہو گئی۔ وہ پھر بھی اپنی جگہ جمنا اور پھر زور سے ایک طرف سے کسی نے کہا۔ ”بھاگو!“ اور وہ سب بھاگے اور دونوں بچے جن کے گلے کٹ چکے تھے، وہ بھی اپنے اپنے سراٹھا کر بھاگ گئے۔ رستم کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ آگئی۔ رات کا آخری پہ ہو گیا۔ آوازیں آنے لگیں۔ گھانے کی آوازیں، ڈھول اور نفیری کی آوازیں، خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے۔ ہر طرف سے مبارک

وہیں پر تھا۔ رستم نے پوٹلی کھولی اور کھانے لگا۔ وہ چار روز سے کھا رہا تھا مگر اب تک اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کھا رہا تھا۔ کھانے کا مزہ بھی نہ لایا تھا۔ کبھی وہ نمکین لگتا، کبھی کچھ میٹھا، کبھی پھیکا، کبھی سخت بدبو محسوس ہوتی، کبھی زعفران کی تیز خوشبو آنے لگتی، وہ صرف صبح کھاتا تھا۔ سارے دن اس کو بھوک نہیں لگتی تھی اور رات کو بھی کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی اور کسی قسم کی کمزوری بھی نہیں تھی۔ اب مرگھٹ کو دیکھ کر اسے خوف نہیں آتا تھا۔ وہ دن میں چاروں طرف گھومتا پھرتا تھا۔ اس کی توانائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جسم فربہ رہ رہا تھا جو کپڑے وہ پہن کر آیا تھا، وہ اس کے جسم پر چپک گئے تھے۔ یہ صرف چند دن میں ہوا تھا۔ جسم کی رنگت میں بھی فرق پڑ رہا تھا۔ وہ صاف گلر کا تھا مگر اب کالا ہوتا جا رہا تھا۔ چہرہ بھی ہینٹ بدل رہا تھا۔ گال پھول رہے تھے، سر کے پادار رہے تھے۔ مگر جسم پر بال بڑھ رہے تھے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ رستم اس ایک ماہ میں بالکل بدل گیا۔ بہت قریب کے لوگ بھی اس کو بہت غور سے دیکھنے پر ہی پہچان سکتے تھے۔ اس ایک ماہ میں رات میں اس پر کیا گزری وہی جانتا تھا۔ اب خزانہ صرف دس راتوں کی دوری پر تھا۔ رستم خاں جواب رستم لال تھا، بڑی ثابت قدمی سے اپنا جاپ پورا کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب صرف ایک جالیکہ رہ گیا تھا۔ یہ جالیکہ کبھی پا جامہ ہوا کرتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، جاپ مشکل ہو گیا۔ جسمانی ساخت کے فرق کے ساتھ ساتھ رستم خاں، رستم لال بننا گیا اور پھر جاپ کی آخری رات آگئی۔ وہ ایک ایک رات کا حساب رکھ رہا تھا۔ وہ اس آخری رات میں سورج غروب ہوتے ہی چبوترے پر آ گیا اور وقت سے پہلے ہی جاپ کرنا شروع کر دیا۔ جاپ شروع کرتے ہی اس کے چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”ارے ہم بھی چلیں گے، دوسرا بولا۔“ میں جاؤں گا۔“ پھر عورتوں کی آوازیں، بچوں کی آوازیں ایک شور مچا رہا تھا۔ ہر طرف مگر رستم اپنے کام میں مصروف تھا۔ رات بارہ بجے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ایک طرف سے کچھ لوگ آتے نظر آئے، وہ ایک لاش

ایک گینڈے کی طرح مضبوط ہے مگر کھوپڑی بہت چھوٹی ہے۔ وہ رستم کو دیکھ کر چبوترے سے اتر آیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ رستم نے اس کو تعظیم کرتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ یہی ہے جس کے کارن چالیس راتیں میں نے یہاں گزاری ہیں۔ پھر بھی اس نے رعب سے کہا۔ ”تو کون ہے رے۔“ اس نے گردن اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”ہوں گے کون وہی ہیں جس کو تم نے یاد کیا ہے۔“

”کوئی تو تیرا نام ہوگا۔“ رستم نے پوچھا۔
 ”ہاں نام ہے ہمار، ہجرت بھنڈاری۔“ وہ بولا۔
 ”ہجرت بھنڈاری، اب تیرا میرا تو ساتھ رہے گا، اپنے بارے میں سب کچھ بتادے نا کہ بار بار پوچھنا پڑے۔“ رستم نے کہا۔

”ہم ہجرت بھنڈاری ہیں۔ دھرتی کے بھنڈار میں جو کچھ چھپا ہے، اوکے بارے میں ہم سب جانتے ہیں۔ کون بادشاہ کہاں مایا گاڑا ہے۔ ہم کا پتہ ہے۔ دو سو سال کے بعد ہم دھرتی سے باہر آئے ہیں۔ کوئی بلایا ہی نہیں۔ اب تو ہم تیرا غلام ہیں تو جو بولے گا کریں گے۔“ وہ بولا۔
 ”اچھا بھنڈاری تجھے سارے خزانوں کا پتا ہے۔“ رستم نے پوچھا۔

”ہاں جی سب پتا ہے۔ تم حکم کرو تو رانی جو دھابائی کے گہنے نکال کر لے آؤں۔ کہو تو شکنٹا کا پٹارہ نکال لاؤں۔ جھانسی کی رانی کا سارا زیور میری نظر میں ہے اور جس کا ہو، لے آؤں گا۔۔۔۔۔ سب کچھ تیرا ہے۔ ایک بات یاد رکھنا، سب کچھ تیرا تو ہوگا مگر کسی پن کے کام میں ایک وزمی خرچ مت کرنا، کرے گا تو سب پانی بن جائے گا اور تو پھر نکال بن جائے گا اور میں پھر دھرتی کے اندر چلا جاؤں گا۔ تو راجہ ہے، عیش کر سب کو عیش کرا۔ ایک سے ایک تار دھرتی پر موجود ہے تو جس کو چاہے گا، تیرے بستر پر آجائے گی، سونے کی چمک ان سب کو اندھا کر دے گی۔ سارے بھارت پر تیرا سکے چلے گا۔ مگر میری بات کو گرہ میں باندھ لے۔ کرنا تجھے وہ پڑے گا جو میں کہوں گا۔۔۔۔۔ اور میرا پٹ بھرنا ہوگا۔“ وہ بولا۔
 ”تو پھر تو میرا غلام تو نہیں ہوا، میں تیرا غلام بن گیا۔“

مبارک ہونے لگی اور پھر سورج کی آمد کے ساتھ ہی رات کے سارے رانی غائب ہو گئے اور رستم چبوترے سے اتر کر دیوار کی طرف چل دیا۔

آج اس کا جاپ پورا ہوا۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اب ہندوستان کے بادشاہوں کے پوشیدہ خزانوں کا وہ اکیلا مالک ہے۔ وہ خوشی میں سرشار دیوار کے سائے میں بیٹھا تھا۔ آج کھانا لانے والا آدمی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ سامنے سے سادھو آنا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ رستم کے قریب آگیا اور بولا۔ ”مبارک ہو، رستم لال تو کامیاب ہو گیا ہے۔“

تیرا غلام ہیر رات کو تیری خدمت میں آجائے گا۔ یہ تیرا آخری چھوچن ہے جو تو یہاں کھائے گا، آج کے بعد تو اپنا بندوبست خود کرے گا۔ میں نے اپنا کام پورا کر دیا۔ تیرے پاس اب کسی چیز کی کمی نہیں رہے گی۔ پر تو میری یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تیرا ہیر تیرا کام کرے گا مگر اس کو کسی مسجد میں، مندر میں یا کسی بھی دھرم کی جگہ ہرگز نہ بھیجنا، وہ نہیں جائے گا۔ تجھے دولت چاہئے، یہ تجھے مالا مال کر دے گا۔ اب میں نہیں ملوں گا۔“

اور سادھو چلا گیا۔ وہ دیوار کے زیر سایہ اکیلا بیٹھا رہا۔ کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اپنی رانوں پر رکھ کر اس نے اس کو کھولا اور کھانے لگا۔ اب وہ اس مزے کا عادی ہو گیا تھا۔ مٹی کے کنوڑے سے وہ انگلیوں کے ذریعہ یہ حلوا نما چیز کھا رہا تھا۔ اب شاید پھر یہ چیز اسے کھانے کو نہیں ملے گی۔ پورے چالیس کنوڑے اس نے اس اتمول اور انوکھی چیز کو کھائے۔ اس میں گوشت کا مزا بھی تھا اور تاج کا بھی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سادھو سے پوچھا بھی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کتنی حیرت انگیز چیز ہے۔ میں واقعی رستم پہلوان بن گیا ہوں۔ رستم آنے والے دنوں کے پلان بنا رہا۔ اس کو نہ بیوی یاد آ رہی تھی نہ بچوں کا خیال تھا۔ شام ہو گئی۔ وہ چبوترے کی طرف چلا۔ مگر یہ کیا چبوترے پر پہلے سے کوئی موجود تھا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ کون ہے، جس کا جسم

رستم نے کہا۔

کنارے پر لگ گئی۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دور دور کسی انسان کا وجود نہ تھا۔ کشتی والے نے جال ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ ”کاہے بھیا کا مچھلی لوگے..... ابھی آئے ہیں، زیادہ نہیں ہے۔“

رستم اس کے قریب چلا گیا اور اچانک اس نے کشتی والے کا گلہ دیونج لیا۔ عورت چلائی۔ ”ارے کا کرت ہو ہمارے مرد کے ساتھ۔“ مگر پھر دوسری آواز کچھ نہ آئی۔ پوری کشتی خون سے بھر گئی۔ دونوں میاں بیوی کے اندرونی

اعضاء دونوں نے مل کر ایک منٹ میں کھائے اور پھر پیٹ بھر کر گوشت کھایا۔ پیٹ بھرنے کے بعد رستم نے دریا میں خود کو صاف کیا اور چل دیا۔ سب کے لئے وہ اکیلا تھا مگر

بھرت اس کے ساتھ تھا۔ بھرت کا پیٹ بھر چکا تھا اور رستم کو بھی کئی روز تک کچھ کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج اس کو

دگنی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو بہت چاک و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اس کے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ گوالیار شہر میں آتے ہی اس کا رخ ایک دھرم شالہ کی

طرف ہو گیا۔ اس دھرم شالہ کو سوامی شردھانند چلاتے تھے۔ لوگوں کی دان پن سے یہ کام کرتے تھے۔ رستم سیدھا ان کے پاس گیا اور جاتے ہی بولا۔

”سوامی شردھانند تم ہی ہو۔“

سوامی نے حیرت سے اس کا لے بھنگ ننگے کو دیکھا اور کہا۔ ”ہاں جی میں ہی ہوں۔“

”تو پھر سن رکھ، اب کوئی دان پن کسی سے نہیں لے گا۔ تیرا سارا خرچ ہم دیں گے۔“ رستم نے کہا۔

آپ ہاشے سوامی حیرت سے بولا۔

”ہاں ہم اے حیرت کیا کرتا ہے، بول کتنا چاہئے۔“

”چاہئے تو بہت پات شالہ چلانا بہت خرچ ہوتا ہے۔ شکشا کو کتا میں اور کھانا پینا بہت خرچ ہے۔ دھرم کے کام اتنے آسان نہیں ہیں۔“ سوامی نے جواب دیا۔

”تو پھر سن لے، تجھے یہاں سے جانا ہوگا، آج سے یہ سب بند، کوئی شکشا یہاں پر نہیں ہوگی۔ کسی دھرم کی بات نہیں ہوگی۔ یہاں پر صرف کھانا پینا ہوگا۔ تجھے جو ضرورت

”یہ تو لالو پہلے سوچنا تھا۔ اب تو تو ہماری دنیا میں آچکا ہے۔ یہاں کے چلن پر ہی چلنا ہوگا اور پریشان کیوں ہوتا ہے۔ ارے آدھا تو ہمارے رنگ میں رنگ ہی چکا ہے۔ تو نے اب تک جو کھایا ہے وہ انسانوں کا کھانا کب تھا۔ تو نے ہمارا کھانا کھایا ہے۔ تیرا وجود اب انسانوں کا وجود نہیں رہا۔ تجھے خود وہی کھانا کھانا ہوگا، نہیں تو بھوکا مر جائے گا.....“ بھر

ت بھنداری نے جواب دیا۔

”میں نے کیا کھایا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”تو نے انسانوں کا ماس کھایا ہے۔ اگر نہ کھاتا تو ایک دن میں یہاں سے اٹھ کر بھاگ نہ جاتا۔“

”اوہ وی تو بہت برا ہوا۔“ رستم کے منہ سے نکل گیا۔

بھرت بھنداری اچھل کر دور چلا گیا اور بولا۔ ”بول اچھا ہوا، نہیں تو تیری سب آشنائیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر کبھی ایسا شبد زبان پر مت لانا۔“ جلدی بول۔

رستم نے ڈر کر کہا۔ ”اچھا ہوا، میں نے انسانوں کا ماس کھایا، اسی لئے میں بلوان ہوں۔“

”ہاں اب ٹھیک ہے، تیری اور میری من بھاتی غذا ایک ہی ہے جو تو کھائے گا، میں بھی وہی کھاؤں گا۔ تو اور میں ساتھ ساتھ ہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، پرنتو مجھے صرف تو ہی دیکھے گا۔“

تو نے تو روز کلپو (ناشتہ) کیا ہے اور میں دوسو سال کا بھوکا ہوں۔ پہلے میرا پیٹ پوچھا کر۔ پھر کام، پیٹ پوچھا کر کے بعد کریں گے۔“ بھرت پیٹ پر ہاتھ پھر کر بولا۔

رستم کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”بھرا ب مرگھٹ میں رکنا لے کار ہے۔“ اور وہ دریا کے کنارے سے چلنے لگا۔ دور ایک کشتی جا رہی تھی، بہت چھوٹی سی ناؤ تھی۔ اس میں ایک عورت چپو پکڑے بیٹھی تھی اور ایک ننگا آدمی جال ڈال رہا تھا۔ رستم وہیں کھڑا ہو گیا اور اس نے کشتی والے کو اشارہ کیا۔ وہ مرگھٹ سے آگے آچکا تھا۔ کشتی والا شاید سمجھا کہ کوئی تازہ مچھلی کھانے کا شوقین ہے۔ اس نے جو رو کو اشارہ کیا اور کشتی کنارے کی طرف آنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں کشتی

ہے، پوری کریں مگر دھرم کی بات تیری زبان پر نہ آئے۔
غور سے سن رکھ۔“ رستم نے کہا۔

”دھرم کے بنیہ سب تو بے کار ہے، کچھ کرنے کی
ضرورت کیا ہے۔“ سوامی نے جواب دیا۔

رستم نے ہاتھ بڑھا کر سوامی کا گلہ پکڑ لیا اور بولا۔
”پھر تیری زبان پر دھرم آیا۔“

سوامی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سارے بدن پر پسینہ پانی
کی طرح بہہ رہا تھا۔ زبان پر کانٹے اک آئے تھے، وہ کیا
کہتا۔ رستم نے کہا۔ ”زندگی بیماری ہے تو ایک طرف کو بیٹھ جا
اور تماشا دیکھ۔ زبان کوتا لومیں چکا لے۔“

جو لوگ دھرم مثال میں پھرے ہوئے تھے، اس نے
سب کو نکال دیا۔ سوامی کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور بھرت
سے بولا۔ ”یہ ٹھکانا ایک عارضی ٹھکانا ہے۔ اب تو جا اور دس
میں ہزار کا بندوبست کر اور بھرت یہ سن کر ہوا ہو گیا۔

شام کو بھرت نوٹوں کی گڈیاں لے کر حاضر ہو گیا اور
بولا۔ ”ایک سیٹھ کی تجوری سے لایا ہوں۔ بڑا کام پھر کروں گا
اور حکم کرو۔“ رستم نے جواب نہیں دیا اور وہ سوامی کے پاس

چلا گیا۔ اس کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں ڈال کر بولا۔ ”یہ
لے اور کام کر، ہر کام کرنا، کسی بھوکے کو روٹی مت کھانا،
شراب پلانا، عورت دے دینا، جو کھینے کو رقم دے دینا۔ یہ
سب تو ہی خرچ کرے گا، زندگی عیش کا نام ہے، خود عیش کر
اور مجھے بھی عیش کروا۔ مگر دان پن کی بات نہ کرنا۔ کرے گا تو
الٹا لٹکا دوں گا اور سن میرے لئے پٹروں کا انتظام کر خود بھی
چھیلا میں جا۔ یہی زندگی ہے۔“

سوامی شروہانند نے آنکھ کھولتے ہی دھارمک ماحو
ل دیکھا تھا۔ مانتا پتادونوں مندروں میں جاتے تھے۔ اس کی
ساری تعلیم دھارمک تھی۔ زندگی میں پہلی بار یہی آفت اس
پر پڑی، اندر سے وہ کڑھری تھا مگر زندگی کے خوف سے
خاموش تھا۔ اب جو آزادی ملی تو اس نے سوچا نہ معلوم یہ کیوں
شیطان ہے۔ میرا تو دھرم ہی نشٹ کرے ڈال رہا ہے۔

آگے اور نہ جانے کیا کیا حکم دے گا۔ بھاگ چلو اور وہ سیدھا
انٹیشن چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دلی کا ٹکٹ لیا اور روانہ

ہو گیا۔ اس نے دلی جانے کا اس لئے سوچا کہ بڑا شہر ہے۔
کہیں بھی چھپ جائے گا۔ روپے اس کے پاس بہت تھے۔
”بھاگ گیا، اب نہیں آئے گا۔“ بھرت بھنداری
نے کہا۔

”جانے دے ہمارا کیا لے گیا ہے۔“ رستم نے
جواب دیا۔

”بول تو پکڑاؤں سرے کو۔“ بھرت بولا۔
”کیا کریں گے اس کا یہ۔۔۔۔۔ آشرم تو ہمارے لئے
چھوڑ گیا ہے۔“ رستم نے جواب دیا۔

”ایک بات بتاؤں تیری ودیا اھوری ہے، کوئی تیری
اس کمزوری کا فائدہ اٹھا لے گا اور ہم تو ہیں، اڑتے پتھیں جو
دانہ ڈالے گا، اس ڈال پر چلے جائیں گے۔ تیرے بھلے کی
کہتا ہوں، مان نہ مان۔“

”میرے گورو نے جو بتایا تھا وہی ہے میرے پاس
اور کہاں سے لاؤں۔“ رستم نے کہا۔

”راستہ میں بتاؤں گا، کرنا تجھے پڑے گا۔“ بھرت
بولا۔

”اچھا تو پھر بتاؤ ہی بتا۔“ رستم نے پوچھا۔

”بدی ناتھ جانا ہوگا۔ وہاں پر ایک دنیا سے الگ
تھلگ ایک پہاڑ کے اوپر پیڑ کے سائے میں ایک منش
پڑا ہے۔ وہ بہت گہرے گھاؤ کھا کے پڑا ہے۔ بہت بڑا شکتی
دان ہے وہ مگر اس کو کسی نے باندھ دیا ہے۔ وہ زندہ ہے مگر

کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ باندھ دیا گیا ہے۔
مگر مجھے یہ پتا ہے کہ اس کی ودیا اب تک اس کے پاس ہے،
وہ خود سے استعمال نہیں کر سکتا۔ کیوں یہ راز میں ہے۔ میں

تجھے دولت دے سکتا ہوں مگر وہاں تو نہیں دے سکتا۔ وہ تجھے
خود حاصل کرنا ہوگی۔ وہ آدمی تیرے پاس نہیں آئے گا، خود
جانا ہوگا۔“ بھرت نے کہا۔

”میں جانے کو تیار ہوں۔“ رستم نے جواب دیا۔

”میں تیرے ساتھ جاؤں گا مگر اس کے سامنے نہیں

جاؤں گا۔“ بھرت نے جواب دیا۔

”کیوں سامنے کیوں نہیں جائے گا۔“ رستم نے

انسانوں والی کب تھی۔ اس کا ساتھی بھی تو شیطان تھا۔ وہ اس کو آگے لا رہا تھا۔ اس کو ڈھارس دے رہا تھا۔ طاقت دے رہا تھا اور رستم چلتا جا رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ ایک کشادہ میدان میں کھڑا تھا۔ اس نے نشیب کی طرف دیکھا، زمین نظر نہیں آتی تھی۔ سورج کے نکلنے کی تیاری تھی۔ صبح کی سفیدی نمایاں ہو رہی تھی۔

اور پھر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس میدان میں زمین پر گھاس تھی اور کچھ درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کو پتا تھا کہ وہ کسی درخت کے نیچے پڑا ہے۔ اس لئے رستم درختوں کی طرف چلا۔ جو درخت قریب نظر آتے تھے وہ اتنے قریب نہ تھے۔ وہ ان کی طرف چلتا گیا اور پھر درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔ ان درختوں پر کوئی پرندہ نہیں تھا۔ ان درختوں کے پتے بہت چوڑے اور پانچ کونوں والے تھے اور ان درختوں پر ہرے اور گلابی گلر کے سب کے برابر پھل لگے ہوئے تھے۔ کچھ زمین پر بھی پڑے تھے اور بھنی بھنی خوشبو ان پھلوں سے اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ رستم کو بھوک نہیں تھی مگر اس خوشبو نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ پھل کھا کر دیکھے۔

اس نے جھک کر زمین پر گرا ہوا ایک پھل اٹھالیا۔ مگر وہ اس کو منہ میں نہیں ڈال سکا۔ ایک طرف سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور جھپٹ کر وہ پھل لے گیا۔ اس نے حیرت سے اس پرندے کو دیکھا مگر نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہ غائب ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ پیڑ کی جڑ کے پاس بیٹھ گیا۔ درخت بہت بڑا تھا۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا۔ وہ جڑ کے ایک موٹے حصے کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ کے بعد بڑے زور سے بادل گرا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ درخت کی موٹی ٹہنی پر کوئی بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔

ایک بہت چھوٹا سا بچہ بیٹھا پھل کھا رہا تھا۔ وہ اس کو بچہ ہی سمجھا تھا کیونکہ اس آدمی کا قد اور ڈیل ڈول ایک پانچ سالہ بچے جتنا تھا۔ اس نے رستم کی طرف دیکھا اور پھر کھانے لگا۔ رستم اس کو دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

پوچھا۔ ”ایک تو یہ کہ میں خزانوں کا راز دار ہوں۔ سب شکتی دان یہ جانتے ہیں۔ کسی کے دل میں بھی لالچ آ سکتا ہے۔ میں تیرے پاس ہوں، تیرا وفاداری رہوں گا۔ تیرا نقصان نہیں کرنا چاہوں گا۔ دوسری بات یہ کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس نے جس سے مکر لی تھی، اس کے سامنے دھرنی کا کوئی منہ رک نہیں سکتا تھا۔ اب وہ اس کی سزا بھگت رہا ہے مگر زندہ تو ہے، یہ کتنی بڑی اس کی کامیابی ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں، سامنے نہیں جاؤں گا۔“ بھرت نے کہا۔

”اچھا تو مجھے اس تک پہنچا دینا، پھر میں جانوں اور وہ“ رستم نے جواب دیا۔

اور وہ دونوں بڑی ناتھ روانہ ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑا تیرھ استھان ہے۔ مگر ان کو تو اس پہاڑی پر جانا تھا۔ یہاں پر وہ آدمی مل سکتا تھا۔

”اب میں اس پہاڑی کے اوپر نہیں جاؤں گا۔ اوپر تجھے اکیلے جانا ہوگا۔“ بھرت نے کہا۔

”ہاں میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ مجھے اس شکتی دان کا نام تو بتادے۔“ رستم نے پوچھا۔

”میں کیا کوئی اس کا نام نہیں جانتا۔“ بھرت نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اور رستم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کوئی معمولی چڑھائی نہیں تھی مگر رستم بھی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس میں بھی کسی گیندے کی طاقت تھی۔

ساری رات وہ بغیر رکے اوپر چڑھتا رہا۔ یہ ایک عجیب پہاڑ تھا۔ جتنا چڑھتے جاؤ، نظر اٹھا کر دیکھو تو اتنا ہی نظر آتا تھا۔ اس پر سیدھا چڑھنا تو ناممکن تھا۔ چکر دے کر ہی اوپر جانا ہوتا تھا۔ ہریالی کا نام نہیں تھا۔ رات میں بھی سخت گرمی تھی۔ پتھر دن بھر کی دھوپ سے گرم ہو رہے تھے۔ صبح ہو گئی، سورج نکل آیا۔ گرمی میں اور اضافہ ہو گیا مگر رستم رکا نہیں چلتا رہا۔ دن بھر اس کا یہ سفر جاری رہا۔ پھر رات آ گئی مگر رستم پھر بھی نہیں رکا۔ وہ بھی انسان کب تھا۔ اس کی غذا

پیر پھیلانے کی کوشش کرے گا تو چادر پھٹ جائے گی، میرا
حشر یاد رکھ۔“ وہ بولا۔

رستم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”کہاں جاؤ گرو، مجھے کچھ
نشان تو بتاؤ میری آشنائے توڑو۔“

”تو نیا کھلاڑی ہے۔ میرے مہرے پٹ پکے،
دنیا کی بساط پر جس کے مہرے پٹ جاتے ہیں وہ ہار
جاتا ہے۔ یہاں پر صرف ایک بازی کھیلنے کو ملتی ہے۔ میری
بازی ختم ہو چکی، تیری اب شروع ہوتی ہے۔ جتنی کھیل
سکتا ہے، کھیل لے مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ اچھا کھلاڑی
کسی دوسرے کے کھیل میں مداخلت نہیں کرتا۔ اتنی سی
بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ اب اٹھ اور واپس چلا جا
یہاں کی آب و ہوا تجھے راس نہیں آئے گی تو بھوکا مہر جائے
گا اور وہ بھنڈاری بھی کسی کی گود میں بیٹھ جائے گا، تیری
چالیں راتیں بے کار چلی جائیں گی۔“

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو اپنی پونجی کی فکر
پڑ گئی۔ واپس چل پڑا اور پلکارا ہوا پہاڑی سے اترنے لگا
اور پھر پہاڑی ختم ہو گئی۔ چڑھنے میں جتنا وقت اور محنت لگی
تھی اس سے بہت کم وقت میں وہ اتر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا
تھا، ناامیدی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

اس کے اترتے ہی بھنڈاری اس کے قریب آ گیا
اور بولا۔ ”بڑی جلدی آگئے، کام بنا۔“

”تو نے ایک ہارے ہوئے جواری کے پاس مجھے
بھیج دیا تھا۔ ارے وہ تو خود پھنسا ہوا ہے، تجھے پتہ نہیں تھا،
اس نے مجھے نراش کر دیا۔“ رستم نے کہا۔

”میں نے تو تیری مدد کرنا چاہی تھی۔ وہ نہ مانا تو میں
کیا کر سکتا ہوں۔“ بھنڈاری نے کہا۔

”اب بتا کیا کروں۔“ رستم نے پوچھا۔

”اب میں کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ یہ میرا طریقہ
ہے۔ اب تجھے ہی کرنا ہے جو کرتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو اب ایسا کر، کسی کنجوس سٹھک کا دبایا روپیہ نکال لا،
پھر آگے کی سوچیں گے۔“ رستم نے کہا۔

”یہ تو میرا کام ہی ہے۔ شام کو تو لکھ پتی ہو جائے

”کھائے گا۔“ اس نے پوچھا۔ رستم نے گردن ہلا کر
ہاں کیا تو پھر بولا۔

”ایک منٹ میں مرجائے گا تجھے پتہ ہے۔“
رستم نے انکار میں گردن ہلا دی۔ اس آدمی کی آواز

بھی بچوں کی طرح ہی تھی۔ گوکہ بات کرنے کا انداز پچکانہ
نہیں تھا۔

”طوطے کی طرح گردن ہلاتا ہے، زبان نہیں ہے۔
مرگٹ میں تو فر فر زبان چلاتا تھا۔“

رستم کو حیرت ہوئی۔ اس کو یہ بھی پتہ ہے۔ مگر وہ
خاموش ہی رہا۔ ”زیادہ چھپانے کی کوشش مت کر، وہ کہاں

ہے جس نے یہاں آئے کا راستہ بتایا ہے۔ جواب دے۔“
اب رستم کو بولنا ہی پڑا۔ ”وہ تیرے ڈر سے نہیں

آیا۔“
”میرا ڈر وہ پاگل ہے میرے ہاتھ میں ڈر کا سرا ہی

نہیں رہا۔ ڈر نا کس بات سے ہے۔“
اس نے پوچھا۔ ”پتہ نہیں کہتا وہ یہی تھا۔“ رستم نے

جواب دیا۔
”تو کیوں آیا ہے اپنا مطلب تو بتا۔“ اس نے پوچھا۔

”میں ادھر رہا ہوں ایک جاپ کے لئے گرو نے بتایا
تھا پھر گرو چلے گئے۔ اب میں اپنی اور بھنڈاری کی حفاظت

کیسے کروں۔ کچھ تو لپے ہو، بھنڈاری تو مایا لاسکتا ہے۔ لیکن نہ
اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے نہ میری کوئی بھی جاپ کر کے اپنے

پاس بلا لے گا۔ پھر میں کیا کروں گا۔ اس لئے میں تمہارے
چرنوں میں آیا ہوں، چاہو تو میری غلطی پر سزا دے دو، میں

نے اپنا گرو تم کو مان لیا ہے۔“ رستم نے کہا۔
”ارے نادان غلطی پر غلطی کر رہا ہے اور اب بھنڈار

ی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ ارے گدھے میں خود سزا کاٹ
رہا ہوں۔ میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔ اس میدان

کے باہر نہیں جاسکتا اور تو کہتا ہے مجھے گرو بنا تا ہے۔ ارے
گرو تو وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی کا مالک ہو، خود مختار ہو، میری

ودیا میرے کام نہ آئی تو تیرے کس کام آئے گی۔ واپس
چلا جا اور تیرے پاس بھنڈاری ہے۔ اس کو بہت سمجھ، زیادہ

گا۔“ بھنڈاری بولا۔

☆.....☆.....☆

موہن لال کروڑوں کا مالک ہے۔ اس کا کاروبار پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس میں کامیاب ہو گیا۔ ہر جگہ دولت کے ڈھیر اس نے لگا دیئے۔ اس کے مقابلے پر جو آیا، اس کا دھڑن تختہ ہو گیا۔

اس کو نقصان تو ہوتا ہی نہیں اور جو نقصان کرنے کی سوچتا ہے وہ خود ہی بھٹس جاتا ہے۔ موہن ہر آدمی کی خبر رکھتا ہے۔ موہن لال ہر اس آدمی کا دشمن تھا جو ایمانداری اور دیانت سے کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے جیسوں کی مدد کی۔ کاروبار اور معاشرے میں جتنی برائیاں وہ پیدا کر سکتا تھا، کر رہا تھا۔ اس کا روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا جو اس کے سامنے آیا۔ اس نے اپنی ماما کے زور پر اس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ کچھ ایماندار تباہ ہو کر گھر بیٹھ رہے مگر زیادہ تر اس کی برائی میں شامل ہو گئے۔ وعدہ خلافی اور جھوٹ اس کے کاروبار کا بنیادی اصول تھا۔ کسی مزدوری کی مزدوری وہ پوری نہیں دیتا تھا کسی کا مال پورا نہیں دیتا تھا۔ کسی سے بچ بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی شکل پر پھنکار برستی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے مگر وہ اس کا انتقام بھی لے لیتا تھا۔ وہ کسی پارٹی میں دعوت میں نہیں جاتا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتا تھا۔ اس نے جو لوگ رکھے تھے ان کو سخت تاکید تھی کہ وہ کسی خیراتی ادارے والوں سے نہیں ملیں گے۔ انسانوں کو پریشان کرنے کی فضاء اس نے اپنے گروہ بندی تھی۔

دلی میں بھی اس کا دفتر تھا مگر لوگ اس کے ساتھ کاروبار کرنے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ جس نے اس کے ساتھ لین دین کیا، وہ ہمیشہ نقصان میں ہی رہا۔ موہن کے نام سے لوگ ڈرتے تھے۔ موہن لال کا ڈسا ایک آدمی میرے پاس آ گیا۔

اس نے بتایا۔ ”میرا نام کشوری لال ہے۔ میری چاندنی چوک میں کپڑے کی دوکان ہے۔ موہن بیٹھ سے میرا لین دین تھا۔ ہزاروں کمال میں خریدتا تھا اور اس کی

ادائیگی بھی کرتا تھا۔ سال کے بعد موہن کے بمبئی کے دفتر کا مجھے ایک خط ملا۔ اس میں مجھے اس نے لکھا کہ میری طرف اس کے پانچ لاکھ روپے نکلنے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا۔

کاروبار میں تو ادھار نقد سب چلتا ہی ہے اور ایک دوسرے کے بھروسے پر یہ سب ہوتا ہے۔ میں نے بمبئی جا کر پتہ کیا میرا دیوار پیوہاں کچھ نہ تھا اور میری طرف تمام مال ادھار دکھایا گیا تھا۔ میں بھنڈاری بیٹھ سے ملا۔ اس نے نگاہیں بدل کر بات کی اور ہم کی دی اگر ایک ماہ میں تمام روپیہ ادا نہ کیا گیا تو دوکان مکان سب بیچ کر وصول کر لوں گا۔ میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ رقم معمولی نہیں تھی۔ دوسرے میں ہر ماہ جو رقم دیتا رہا وہ کہاں گئی۔“

”تم رقم کس طرح ادا کرتے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”موہن کا ایک آدمی رقیں وصول کرتا ہے۔ رسیدیں بھی دیتا ہے۔ میں نے وہ سب رسیدیں موہن کو دکھائیں تو وہ بولا۔“

”ارے تم ہم کو چونا لگاتا ہے۔ یہ تو سب جعلی ہیں۔ وہ آدمی کون تھا جو تم سے وصولی کرتا تھا۔ وہ ہمارا آدمی نہیں ہے۔ تم کسی کو رقم دے دو۔ اس کے ہم تو ذمہ دار نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ آدمی انہوں نے خود لگایا تھا۔ وہ صاف مکر گیا۔“

کشوری لال نے بتایا۔

”یہ سن کر میری حالت خراب ہو گئی۔ بڑی مشکل سے دلی آیا ہوں۔ یہاں آ کر میری حالت اور خراب ہو گئی۔ سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ اب دوکان اور مکان بھی جاتا نظر آ رہا ہے۔“ وہ بولا۔

موہن کے بارے میں اس قسم کی باتیں مشہور تھیں مگر کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا تھا۔ وہ لوگوں کو دل کھول کر قرض دے دیا کرتا تھا۔ لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں اور وہ لوگ اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے تھے اور پھڑ پھڑاتے رہتے تھے۔

میں نے کشوری لال کا پیہ لیا اور کہا۔ ”میں تمہارے گھر آؤں گا فکر نہ کرو تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔“ دوسرے دن میں

رولوکا کے ساتھ اس کے مکان اچھی قبر چلا گیا۔

اور پھر ایک خط موہن کے نام لکھا گیا۔ اس میں لکھا کہ ”تیری کوئی رقم میری طرف نہیں ہے اگر تو وصول کر سکتا ہے تو دلی آکر وصول کر لے۔“

کشوری لال بہت ڈرا ہوا تھا مگر رولوکا نے کہا۔

”آئے تو دوا گروہ خود آئے گا تو اور بھی اچھا ہوگا۔“

مگر وہ نہیں آیا۔ اس کا ایک آدمی آیا اور بڑے غصے سے دوکان میں آ گیا۔ رولوکا وہیں پر موجود تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔ ”کشوری لال کدھر ہے۔ اس کو بلاؤ۔“

رولوکا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”تم کون ہو اور کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ہم چندو مل رہے۔ موہن سینھ کا آدمی وصولی کے لئے آیا ہے۔“

”نہیں بھی چندو مل تو بھی جعلی ہوا تو ہماری رقم تو گئی۔“ رولوکا نے کہا۔

”ارے ہم رسید دے گا۔“ وہ بولا۔

”اور وہ بھی سچی ہوئی تو پھر۔“ رولوکا نے کہا۔

”تم ہوش کا بات کرو، موہن سینھ کا نام چلتا ہے۔“ وہ بولا۔

”اگر دلی میں نہیں چلے گا اس کا دفتر بھی ہے ہم اس پر بھی بھروسہ نہیں کریں گے۔ موہن کو جا کر بولو کہ وہ خود آئے اور رقم وصول کرے۔ اس کا پورا رقم اس کے ہاتھ میں دیں گے اور اس کے ہاتھ کا رسید لیں گے۔ ایک دفعہ تم لوگ بے ایمانی کر چکا ہے۔ دوبارہ نہیں چلے گی اب بے ایمانی۔“ رولوکا نے رعب سے کہا۔

چندو گنڈ کر بولا۔ ”تم ہم کو بے ایمان بولا۔ تم موہن کو نہیں جانتا، وہ تم سب کو برباد کر دے گا۔“

”اب زیادہ ہمارا وقت نہ خراب کرو اور چلا جا۔“ رولوکا نے کہا۔

وہ غصے میں چلا گیا مگر دوسرے روز دلی دفتر کے دو تین آدمیوں کے ساتھ پھر آ گیا۔ مگر رولوکا نے ان کو بھی بھگا دیا۔

ایک ہفتہ تک کوئی نہیں آیا اور پھر موہن خود آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بہن بھی شہر کے نامی گرامی بد معاش تھے۔ وہ ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا دوکان میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ وہ چاروں بد معاش بھی اندر آ گئے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک سایہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رولوکا نے سمجھ لیا کہ موہن لال خالی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مادیاتی شہرتی بھی ہے۔ رولوکا اپنی جگہ ہوشیار ہو گیا۔ موہن اندر آ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بولا۔ ”کون ہے رے وہ سورما جو ہمارے منہ آ رہا ہے۔“

دوسرے میں اور رولوکا ہی دوکان میں تھے۔ رولوکا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”تم کون ہو جو اونٹ کی طرح گردن اٹھائے اندر آ گئے ہو۔“

”بنادیں گے رقم ڈکار کے بیٹھا ہے کشوری لال، اس کو تو بلا اور تو کون ہے بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے۔ ایک منٹ میں سارا بیخارا تار دیں گے۔“ وہ غور سے بولا۔

”تم موہن ہو۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”ہاں اور کون ہیں۔“ وہ بولا۔

”شکل سے بھی یہی پتہ چل رہا تھا۔ پوچھ تو ایسے ہی لیا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”ارے یہ تو کوئی پورا ہی سورما جتا ہے۔ ذرا سنبھال تو اسے۔“ اس نے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی کھڑا رہا۔ اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا لیکن یہ کیا وہ بھی نہ ہلا اور پھر اس نے باقی دو کو بھی رولوکا پر حملہ کرنے کا کہا مگر کوئی اپنی جگہ نہ چھوڑا۔ کا تو وہ گلی دے کر بولا۔

”مٹی کے مادھو بنے کھڑے ہو، یہ سر اٹھاری بے عزتی کرے جا رہا ہے، پھنکار سے تم پر۔“

رولوکا آگے آ کر بولا۔ ”غبارہ بہت بڑا لگتا ہے مگر بہت ہلکا ہوتا ہے۔ تیرے اندر بھی صرف ہوا بھری ہے۔ ذرا سی موٹی لگاؤں کا تو ساری ہوا نکل جائے گی۔“

”یہ تو سب منک حرام ہیں، میں تجھے اور کشوری کو دیکھ لوں گا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”یہاں سے جانے گا تو دیکھے گا اور سن وہ جو تیرے

ساتھ آیا ہے اور چھپا کھڑا ہے۔ اس کا پرستے تو کرا دے۔ اور اگر نہ کرایا تو اس کو پکڑ کر باندھ دوں گا۔ پھر تو اکیلا رہ جائے گا۔“

رولوکا نے کہا تو وہ بولا۔

”میں تو اکیلا ہوں۔ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔“

”میں اندھا نہیں ہوں۔ سب دیکھ رہا ہوں۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ کشوری کو بلا۔ رقم کی بات کر۔“ وہ بولا۔

”نالے کی کوشش مت کر۔ موہن لال یہ بتا تیرے ساتھ کون ہے؟“ رولوکا بولا۔

”ارے نہ جانے کیا بکواس کئے جا رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود ہی پتہ کر لوں۔“ اور رولوکا نے اپنے کارندے کو اشارہ کر دیا۔

ایک لمحے میں بھرت بھنڈاری اس کی گرفت میں تھا۔ ”اب تو خود اپنا پرستے کرا دے۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں بھرت بھنڈاری ہوں۔ میرا کام تو یہ ہے کہ میں جس کے بس میں ہوں، اس کو مایا دیتا رہوں بس۔“

بھرت نے جواب دیا۔

”اچھا موہن تو اسی لئے اس کو چھپا رہا تھا۔ یہ تیری مایا لانے کا ذمہ دار ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ تو ایک بکری

سے نہیں لڑ سکتا۔ موہن لال یہ تیری بد نصیبی ہے کہ تو دلی آگیا۔ تیرا وقت ختم ہوا۔ اب تو اپنی پرانی جگہ جائے گا۔“

موہن حیران کھڑا تھا۔ اسی دن سے بچنے کو وہ گروتلاش کر رہا تھا۔ کچھ جتر منتریکھنا چاہتا تھا۔ مگر مایا کے جال میں پڑ کر وہ کچھ نہ کر سکا۔

”تیرے بدن سے یہ بدبو کیوں آ رہی ہے۔“ رولوکا نے بھرت سے پوچھا۔

”میرا کھا جانے والی ماس ہے اور یہ موہن لال بھی یہی کھا جا کھاتا ہے تو مجھے جانے دے۔ میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ میں تیری غلامی کرنے کو تیار ہوں۔“

رولوکا نے غصے سے کہا۔ ”لعنت ہے تجھ پر اور اس مردود پر تم لوگ آدم خور ہو۔“

”میں کیا کروں۔ میں تو زمین کے اندر کا ہوں، بلاتے ہیں تو آتا ہوں۔“ بھرت نے کہا۔

”مگر اب تو زمین کے اندر نہیں جائے گا۔“ اور رولوکا کے اشارے پر کارندہ اس کو اٹھا کر لے گیا۔

”موہن تو اس لائق بھی نہیں کہ تیرا یہ گندہ گوشت کوئی جانور کھائے۔ اس لئے اسی مرگھٹ میں تجھے جلایا جا

ئے گا جہاں تو نے چالیس راتیں گزاری ہیں۔“ اور اس طرح موہن لال کا قصہ تمام ہوا۔

☆.....☆.....☆

کہلاتے تو وہ سردار سلامت علی تھے مگر وہ کسی جگہ کسی قبیلے کے سردار نہ تھے۔ سرداری تو ان کے دادا تک رہی اور پھر ختم ہو گئی اور وہ اپنا آبائی علاقہ جو کراٹر پردیش میں تھا۔ چھوڑ کر

لکھنؤ میں آ گئے۔ یہاں پر آ کر بی ان کی شادی ہوئی اور چار لڑکوں اور دو لڑکیوں کے وہ باپ بنے۔ لڑکیوں کی شادی کردی

اور ان کو روانہ کر دیا۔ لڑکے سب پڑھے لکھے تھے۔ وہ سرکاری ملازمتوں میں چلے گئے۔ سب سے چھوٹا نڈا شاعرانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس لئے اس کو ملازمت کرنا پسند نہ تھا۔

کچھ سرداری کے زمانے کی نشانیاں ابھی باقی تھیں۔ دادا کا اثر پوتے پر آ گیا تھا۔ وہ آزاد رہنا چاہتا تھا۔ سلامت

علی نے بہت کوشش کی کہ وہ شادی کر لے اور جس طرح تین بھائی رہتے ہیں۔ وہ بھی رہے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ لکھنؤ کا

ماحول بڑا شاعرانہ تھا۔ روز مشاعرے اور ادبی محفلیں برپا ہوا کرتی تھیں اور انور میاں روز ہی ان محفلوں میں شر

کت کیا کرتے تھے۔ یوں تو وہ جس مکان میں رہتے تھے، وہ بہت بڑا

تھا۔ سب بڑے آرام سے اس میں گزارہ کرتے تھے مگر باپ کی یہ خواہش تھی کہ ایک ایسا مکان بنایا جائے جو چاروں

لڑکوں کے لئے ہو سب ایک چھت کے نیچے ہیں اور سب الگ الگ بھی ہوں۔ سب کے آنے جانے کے راستے الگ

ہوں مگر ہوں سب ایک ہی چھت تلے۔ کیونکہ میرے مرنے

نہیں ملتا کیونکہ یہاں پر بہت گہرا ایک تالاب بنا ہوا تھا۔
برساتی پانی سال بھر اس میں بھرا رہتا تھا۔

اس پلاٹ کے چاروں طرف بڑی اونچی اونچی
جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ اس کو خریدنا نہیں چاہتے تھے مگر
دلال بہت ہوشیار تھا، بولا۔ ”میاں جی خرید لو یہ سونا ہے سونا،
چاروں طرف سڑک ہے۔ اس پانی کا کیا ہے بھرت بھروادینا
۔ بہت ہی بڑھیا مکان ہے گا اور اب اتنے بڑے پلاٹ ختم
ہو گئے ہیں۔ میرے پاس کئی گاہک موجود ہیں اور شاید زیادہ
ہی میں سودا ہو جائے۔“

سلامت علی نے اس کی بات پر غور کیا۔ واقعی ہر
طرف دروازہ بن سکتا ہے۔ ہر گھر کا الگ الگ سمت میں
دروازہ بن جائے گا اور پانی کا کیا ہے۔ مٹی بھروادی جائے
گی۔ اور پھر یہ پلاٹ سلامت علی کے نام ہو گیا۔

اس کے بعد انہوں نے گدھے والوں سے بات کی
اور گدھے والے مٹی لا کر اس میں ڈالنے لگے اور پانی خشک
ہوتا گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ پورا گڑھا مٹی سے بھر گیا اور
زمین خشک ہو گئی۔ جھاڑیاں صاف کر دی گئیں تو وہ ایک اچھا
پلاٹ نظر آنے لگا۔ یہ سب کام انہوں نے نہایت خفیہ طریقہ
پر کئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے مکان کا
نقشہ اس طرح بنوایا کہ چار کشادہ ایک ہی طرز کے مکان
بنائے جائیں اور سب کے دروازے الگ الگ ہوں۔ مگر
درمیان میں بھی ایک دروازہ ایسا ہو کہ اندر سے اندر کسی کے
مکان میں بھی جایا جاسکے۔ نقشہ نویس نے بہت اچھا نقشہ
بنا کر دے دیا اور پھر وہ اس کو بنوانے کے لئے دوڑھوپ میں
لگ گئے اور زمینوں کا سودا کر دیا اور مکان کی تعمیر شروع ہو گئی۔
زمین کے اندر بہت بڑا لیک حوض بنوایا گیا۔ یہ پانی
جمع کرنے کے لئے تھا۔ یہ ان کے ذہن کی پیداوار تھی۔ پہلے
اس زمانے میں اس کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کنواں
بنایا جاتا تھا۔ مگر انہوں نے کنواں کے ساتھ زمین کے اندر
حوض بھی بنوایا۔ دیواروں کی چٹائی دو فٹ اور ضرورت کے
تحت ڈھائی فٹ رکھی گئی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر ڈاٹ
لگا کر حراب دار چٹائی کی گئی۔ بھٹے پر خاص طور سے اینٹیں

کے بعد اگر بھائیوں میں اختلافات ہو گئے تو سب الگ
الگ ہو جائیں گے۔ ساتھ رہنے میں اختلافات ہونے میں
دیر نہیں لگے گی۔ بھائی نہیں لڑیں گے مگر عورتیں اور ان کے
بچے ضرور یہ صورت حال پیدا کر سکتے ہیں۔ الگ الگ اپنے
اپنے حصے میں رہیں گے تو ان میں بھائی چارہ قائم رہے گا۔
محبت رہے گی۔ ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ سلامت
علی بڑے دور اندیش تھے۔ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ وہ
جانتے تھے کہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی ایک
چھوٹی سی سلطنت ہو۔ اس پر اس کی حکمرانی ہو۔ اس پر صرف
اس کا حکم چلے ہو۔ عورت کیسی ہی نیک سیدھی ہو۔ وہ اس
خواہش کو دبائیں سکتی۔ یہ اس کا قدرتی حق ہے اور وہ اس حق
کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ایک مکان میں سب کی سلطنت تو قائم نہیں ہو سکتی۔
سب کے الگ الگ حصے ہوں گے تو سب اپنی اپنی جگہ خوش
رہیں گے۔ کسی کی مداخلت نہیں ہوگی۔

سلامت علی نے فیصلہ کر لیا کہ ایک ایسا آشیانہ وہ
بنائیں گے جو سب کا ہوگا اور سب الگ الگ بھی رہیں
گے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک کم از کم دو ڈھائی ہزار
گزر کا پلاٹ حاصل کیا جائے اور پھر ایسا نقشہ بنایا جائے جو
ان کے خواب کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی
سے مشورہ نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکوں سے مشورہ کرنے
میں یہ خرابی ہوگی کہ سب اپنا اپنا مفاد اور فائدہ رکھ کر بات
کریں گے جبکہ ان کے لئے سب برابر تھے۔ وہ سب کو برابر
رکھنا چاہتے تھے۔ نئی نئی باتیں سامنے آئیں گی اور ان کے
کام میں رکاوٹ کھڑی ہوگی۔ وہ وقت برباد کرنا نہیں چاہتے
تھے۔ ان کے پاس اتنا روپیہ تھا کہ وہ پلاٹ خرید سکیں، بنوا
نے کے لئے ان کے پاس باپ دادا کی زمینیں موجود تھیں۔
خود مختار تھے جو چاہیں کریں۔

شہر کے باہر امین آباد کی ایک بستی بن رہی تھی۔
پلاٹ فروخت ہو رہے تھے اور یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ جب
وہ پلاٹ خریدنے پہنچتے تو سارے پلاٹ یک جگہ تھے۔
صرف ایک پلاٹ ڈھائی ہزار گزر کا بانی تھا۔ وہ بھی شاید ان کو

بنوائی گئیں اور اچھے کاریگر لگائے گئے۔ بہت قاعدے اور قریب سے مکان بنایا گیا۔ گو کہ ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ مگر انہوں نے کسی لڑکے کو پیہ نہیں چلنے دیا۔ ویسے تو کسی لڑکے کو غرض نہیں تھی۔ وہ کہاں جاتے ہیں اور دن بھر کیا کرتے ہیں۔

گھر آتے تو کھانا وقت پر ان کو مل جاتا۔ بہویں ان کو کھانا دیتیں۔ اگر کوئی لڑکا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ اللہ اللہ خیر صلہ۔ زمینوں کی آمدنی بند ہوئی تو انہوں نے گھر میں خرچ دینا بھی بند کر دیا۔ خرچ بند ہوا تو بوڑوں کو احساس ہوا۔ بڑی بہو نے ایک دن کہا۔

”ابا مہنگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اخراجات بھی بڑھ رہے ہیں۔ آپ کے بیٹے جو دیتے ہیں، وہ اب کم پڑ رہا ہے۔ آپ نے بھی ہاتھ روک لیا ہے۔ گزرا ہوا مشکل ہے۔ آخر سب کے بچے ہیں۔ ان کے اخراجات بھی ہیں۔ کچھ ہمارا بھی خیال کریں۔“

سلامت علی نے بڑے سکون سے بڑی بہویں بات سنی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بات صرف بڑی بہو نہیں کہہ رہی۔ سب کی طرف سے کہہ رہی ہے۔ اس بات کو مجھ تک پہنچاتے سے پہلے ان سب کی ایک میٹنگ ہوئی ہوگی اور پھر فیصلہ ہوا ہوگا اور پیغام بڑی بہو کو بنایا گیا ہوگا۔

وہ اس سوال کا جواب بہت پہلے تیار کر چکے تھے۔ ان کو پیہ تھا۔ یہ سوال کسی نہ کسی روز ان کے سامنے آئے گا۔۔۔۔۔ پھر بھی انہوں نے پوچھا۔

”بیٹا تم یہ بتاؤ تم خود سے یہ سوال کر رہی ہو تو میرا جواب یہ ہے کہ میری وجہ سے اگر اخراجات بڑھ رہے ہیں تو میں اپنا انتظام کر لوں گا۔۔۔۔۔ اور اگر یہ سوال سب کی طرف سے ہے تو جواب یہ ہے کہ میں نے اپنا ذریعہ آمدنی خود بند کر دیا ہے، نہ میں فروخت کر دی ہے۔

تم سب کو اس لائق میں نے بنانے کی کوشش کی ہے کہ تم سب اپنے بچوں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ میری بیساکھی کی ضرورت کسی کو نہیں ہے۔ زمین اور زوہد بیساکھی چیز ہے کہ آپس میں لڑائی اور نفرت پیدا کرتی ہے۔ میں نے دونوں کو

ختم کر دیا ہے۔ تاکہ میرے بعد تم آپس میں اس کی خاطر نہ لڑو۔ مگر میں نے نا انصافی نہیں کی، تم سب کا حق نہیں مارا۔ وہ سب کو مل جائے گا۔ یہ میرا پیغام تم سب کو بتا دینا۔ کچھ عرصہ صبر کرو۔“

یہ پیغام سب لڑکوں کو مل گیا۔ کسی نے کچھ نہ کہا۔ اخراجات والی بات بھی ان کے سامنے نہیں آئی۔ مکان بننا چلا گیا اور پھر بہت خوبصورت مکان تیار ہو گیا۔ مکان کے چاروں طرف روڑ تھا۔ اس کو بھی سلامت علی نے بنوایا اور درخت بھی لگوا دیے۔

”سلامت منزل۔“ ایک بہت بڑے سنگ مرمر کی سل پر کھود کر نمایاں جگہ آویزاں کر دیا گیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنا کارنامہ لڑکوں کے سامنے پیش کریں۔ عید کا دن تھا۔ سب نماز ادا کرنے ساتھ جاتے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے کہا۔

”آج میرے لئے بہت خوشی کا دن ہے۔ ایک تو عید کا دن ہے۔ دوسرے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آج مجھے اس کی تعبیر مل گئی ہے۔ دو گنا نماز کے بعد میں تم سب کو ایک تحفہ دوں گا۔ وہ تحفہ میرا خواب بھی ہے اور تم سب کی ضرورت بھی۔“ اور سب لوگ نماز کو روانہ ہو گئے۔ سب کے دل میں کھلبلی سی ہوری تھی۔ ”آخرا کیا کرنے والے ہیں۔ کیا تحفہ دینے والے ہیں۔“

سب واپس آ گئے اور بڑے کمرے میں سب بیٹھ گئے۔ نہویں بھی آ گئیں۔ انور میاں کو بھی آنا پڑا۔ حالانکہ ان کا انتظار ان کے دوست کر رہے تھے۔

سب کے آنے کے بعد سلامت علی نے اپنی دلی تمنا اور خواب کے بارے میں بتایا۔ ”سب ایک چھت تلے رہیں اور الگ الگ بھی رہیں تاکہ آئندہ بھی تم سب میں محبت اور بھائی چارہ رہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی مکان ایسا بنایا جائے جو اس مقصد کو پورا کر سکے اور پھر میں نے ایک ایسا مکان بنالیا تم سب اپنی اپنی فیملی کے ساتھ الگ الگ رہ سکتے ہو۔ سب کے دروازے بھی الگ الگ ہوں گے اور آنا جانا بھی الگ الگ ہوگا۔

تم سب سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے زمین فروخت کر کے نہ معلوم روپیہ کہاں برباد کر دیا۔ مگر میں نے اپنا خواب پورا کیا ہے۔ تم سب قریب قریب رہو، ایک دوسرے کے دکھ دکھ میں ساتھ رہو۔ اپنی رشتہ داریاں آپس میں کرو، محبت بڑھے گی، دوریاں محبت کم کر دیتی ہیں۔ بتاؤ میں نے یہ غلط کیا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو تم جہاں دل کرے رہنا۔“ سلامت علی خاموش ہوئے تو بڑے بیٹے منور علی نے اٹھ کر باپ کو گلے لگایا اور بولا۔ ”ابا مجھے معاف کر دینا، بہت پہلے مجھے ایک لمحے کو آپ کے متعلق ایک خیال آیا تھا۔ وہ خیال میں نہیں بتاؤں گا، مجھے معاف کر دینا بس۔“

سلامت علی نے بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”میں نے تمہیں معاف کیا۔“ اور پھر سب نے باپ سے معافی مانگی۔ پھر سب نئے مکان کی طرف چلے گئے۔ چونکدار نے ایک طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اندر آنے کے بعد سلامت علی بولے۔ ”اس مکان کو دیکھ لو، چاروں اسی طرح کے ہیں۔ کسی میں ذرا فرق نہیں ہے۔ چاروں طرف روڈ ہے۔ ہر مکان ایک ہی طرز پر بنایا گیا ہے۔ تم سب پسند کر لو اور یہاں آنے کی تیاری کرو۔“

”ابا آپ کس مکان میں رہنا پسند کریں گے؟“ انور نے پوچھا۔

”میں اپنے پرانے مکان کو ہی آباد رکھوں گا۔“ وہ بولے۔

”نہیں ابا آپ میرے ساتھ رہیں گے۔“ انور نے کہا۔

”تمہارے ساتھ رہ کر میں سب کو ناراض نہیں کر سکتا۔ تمہارا جتنا حق ہے، اتنا ہی سب کا ہے۔“

یہ آبادی جہاں یہ مکان اور بہت سے مکان بنائے گئے تھے، کسی زمانے میں ایک بہت بڑا میدان ہوا کرتا تھا۔ اس میدان میں بہت سی لڑائیاں بھی لڑی گئی تھیں۔ ہزاروں لوگ اس میدان میں قتل بھی ہوئے تھے اور ان کی لاشیں اسی میدان میں بے گورنمنٹ مٹی میں دبا دی گئی تھیں۔ ان میں کس کس مذہب کے لوگ مارے گئے تھے، کیا کہا جاسکتا ہے۔

کس کس نواب کے عتاب سے یہ زمین لاشوں سے بڑھتی۔ کتنے بے قصور اس مٹی میں تھے۔ زمین کھودنے پر ایسے آثار نظر آتے تھے مگر ان پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ آبادی اتنی تیزی سے بڑھتی تھی کہ ہر طرف مکانات نظر آتے تھے۔ زمین آباد ایک اچھی بستی بن گئی تھی۔

سلامت علی کے چاروں مکان آباد ہو گئے تھے۔ اس مکان میں آکر ان کو احساس ہوا کہ ہم پہلے کہاں پڑے تھے۔ ابانے ہمیں کتنا بڑا تحفہ دیا ہے۔

انور میاں نے شادی نہیں کی تھی مگر وہ کسی بھائی کے ساتھ نہیں رہے۔ انہوں نے اپنا مکان ہی آباد کیا۔ سلامت علی تو کہہ ہی چکے تھے کہ وہ اپنے پرانے مکان میں رہیں گے۔

انور میاں کا کہنا یہ تھا کہ وہ جس بھائی کو کہہ دیتے، ان کو مل جاتا تھا۔ ان کے مکان میں ان کے یار دوستوں کا میلا لگا رہتا۔ کوئی نہ کوئی محفل بھی رہتی۔ شہر کے لوگ محفلوں میں شرکت کرتے۔ سلامت منزل پورے شہر میں ادبی محفلوں اور مشاعروں کے لئے مشہور ہو گئی۔

مشاعرہ ایک رات دو بجے ختم ہوا اور سب شاعر اور سامعین چلے گئے۔ انور میاں بھی اپنے کمرے میں آ گئے۔ آنکھ لگتے ہی انہوں نے محسوس کیا جیسے کوئی ان کو جگا رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مگر کمرے میں بلب روشن تھا اور کمرہ خالی تھا۔ وہ پھر لیٹ گئے۔ مگر آنکھ لگتے ہی پھر دوبارہ ان کو اٹھادیا گیا۔ وہ بڑے حیران ہوئے، کمرہ خالی ہے اور بار بار ان کو اٹھا جا رہا ہے۔ وہ ڈر پوک نہیں تھے۔ مگر ان حالات میں کوئی بھی حیران تو ہوتا ہی ہے۔ وہ پھر لیٹ گئے مگر آنکھیں کھلی رکھیں۔ کچھ نہ ہوا مگر تک تک پھر نیند کا جھونکا آ گیا۔

اور پھر کسی نازک ہاتھ نے ان کو جھجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ پوری طرح نیند میں نہیں تھے۔ اس لئے محسوس کر لیا کہ اٹھانے والی کوئی عورت تھی۔ اب وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دروازہ کھول کر صحن میں آ گئے۔ دور دور کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ انور میاں کی زندگی میں کبھی ایسا پر اسرار اور عجیب واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ ان کے چہرے پر حیرت برس رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ہیں پر جتنے کھڑے رہے اور پھر مڑ کر کمرے کی طرف

احساس کرو۔“ وہ بولی۔

”میں تم کو کس نام سے یاد کروں گا، یہ تو بتاؤ۔“ انور نے کہا۔

”میرا نام شبنم ہے۔ یہ تو یاد رہے گا۔“

”شبنم کی زندگی تو بہت کم ہوتی ہے۔ بچوں پر بڑی شبنم دھوپ نکلے ہی پھل جاتی ہے۔ کچھ دیر پا نام بتاؤ۔“ انور نے کہا۔

”تم شاعر ہو، ہر بات میں بات پیدا کر لیتے ہو۔ شبنم پاک بھی ہوتی ہے۔ یہ تو سوچا ہوتا۔“

”تم نے یہ نام خود اپنا رکھا ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”یہ نام زمانے نے رکھا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”زمانے نے ٹھیک نام رکھا ہے۔ تم زندہ ہو، تم کس

طرح اس بند مکان میں آئیں۔ یہ تو بتاؤ۔“ انور نے پوچھا۔

”ابھی بہت کچھ بتانا باقی ہے۔ میں صرف یہ دیکھنے

آئی تھی کہ تہااری آنکھوں میں میرے لئے کیا ہے۔ اور میں

نے دیکھ لیا کہ نکدہ عورت مرد کی آنکھوں میں سب کچھ دیکھ لیتی

ہے۔ میں پھر آؤں گی، کب یہ نہیں بتا سکتی۔ مگر تم سے ملے بنا

میں رہ نہیں سکتی۔ تم میرے جنم جنم کے ساتھی ہو۔“ اور پھر وہ

ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

انور ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ”یہ خواب تھا مگر میں تو

کھڑا ہوں، جاگ رہا ہوں، پھر خواب کیا معنی۔ اگر یہ

حقیقت تھی تو یہ کیسی حقیقت تھی۔ وہ حینہ کون تھی۔ جس کا نام

شبنم تھا۔ کون بتلائے گا، کس سے پتہ کروں، کیا کوئی میری

بات سمجھ پائے گا۔ کیا میں مذاق نہ بن جاؤں گا۔ بہتر یہی

ہے کہ خاموش رہوں۔“ اور انور نے اس بات کا ذکر کسی سے

نہ کیا۔ دماغ میں البتہ اس کے وہ حینہ موجود رہی۔ دوبارہ

اس کو دیکھنے کی خواہش بڑھتی رہی۔ وہ ہر رات بے چینی سے

اس کا انتظار کرتا رہا اور ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہفتہ کی رات وہ کسی

محفل سے رات بارہ بجے واپس آیا۔ اپنے کمرے میں آکر

لیٹ گیا۔ آج بھی اس کے تصور میں شبنم تھی۔ اس نے سوچا،

کاش وہ آجائے۔ اچانک اس کے کانوں میں جل ترنگ کی

طرح کھٹکی آواز آئی۔ ”تم نے یاد کیا اور میں آگئی۔“ وہ بستر

چلے کہ ان کے کانوں میں کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ جل

ترنگ کی طرح کھٹکی آواز جیسے کسی نے تنے تار پر لگی سے

چھیر خانی کی ہو۔ وہ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ آواز بند ہو گئی۔

اب تو وہ حیرتوں کے نیچے گویا دب گئے۔ ہر طرف خاموشی

تھی۔ آخر کب تک کھڑے رہتے۔ پھر کمرے کی طرف کا

رخ کیا۔ مگر وہی ہنسی پھر سنائی دی۔ اب تو انور میاں کا دل

گھبراہٹ سے بیٹھنے لگا۔ ان کو ایسا لگا جیسے وقت کی نبض ختم گئی

ہو۔ اس اکیلے مکان میں وہ بالکل تنہا تھے۔ کس کو آواز دیں

کس کو پکاریں۔ آدھی رات ہر کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔

کوئی نظر نہیں آتا کیا کروں، کس سے مدد لوں۔ وہ پھر کمرے

کی طرف چلے مگر پھر آواز آئی ایک کھٹکی سی آواز ”درتے

ہو، میں اتنی ڈراؤنی تو نہیں۔“ انور میاں نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک اندھیرے کمرے کے دروازے پر ایک ہیولا سا کھڑا

تھا۔ اس کا باریک لبہاد ہوا سے اڑ رہا تھا۔ وہ بادو بہار کے

حصہ کوں کی طرح قریب رک گئی۔ اس کی آنکھیں انور میاں

کے حواس پر چھائی جا رہی تھیں۔ اس کے گداز بدن کی پیش

جھلسائے دے رہی تھی۔ انور میاں ایک سنگی بت کی مانند

خاموش کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے۔ اتنا حسین پیکر انہوں

نے پہلے کب دیکھا تھا۔ ان کی شاعری کی محبوبہ بھی اتنی حسین

نہ تھی۔ ان کے تصور سے بڑھ کر یہ حسن تھا۔ ان کا بہوت

ہو جانا تو قدرتی بات تھی۔

وہ نازنین بھی بڑے غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

دونوں کی زبان بند تھی۔ مگر آنکھیں بات کر رہی تھیں۔ بہت

سے سوال انور کی آنکھوں نے کر دیئے اور بہت سے جواب

معلوم کر لئے۔ مگر ایک سوال کا جواب انور کو اب تک نہیں

ملا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کے لب پہلے اور وہ بولے۔

”تم کون ہو؟“

نازنین کے لب پہلے اور جواب ملا۔ ”ابھی یہ سوال

مت کرو، میری پیاس بجھ جائے گی تو میں جواب دوں گی۔“

”مگر میری بے چینی اور بڑھ جائے گی۔“ وہ

بولے۔

”مدتوں سے جو بھٹکتی رہی ہوں۔ اس کا تو تم

سے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سکتا تھا۔ مگر نہیں لیا کسی نے۔ تمہارے باپ نے یہ جگہ خریدی اور میں اس مکان بننے اور آبادی ہوتے دیکھتی رہی۔ کیونکہ تم کو یہاں آنا تھا اور تم آئے۔ کیا تم امن حقیقت کو جھٹلاؤ گے۔“

دروازے پر سفید لبادے میں ملیں شبنم کھڑی تھی۔ سفید لبادے میں اس کا بدن دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ وہ بے چین ہو گیا اور اس کی طرف بڑھا۔ شبنم نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔ اور بولی۔ ”ابھی صبر کرو، میں تمہاری ہوں۔ میں نے تمہارا انتظار کیا ہے۔ تم بھی ذرا صبر کرو۔ تمہاری جلد بازی پھر ہماری جدائی کا باعث بن جائے گی۔“

”تم نے مجھے پاگل بنادیا ہے، جاو کر دیا ہے، میں کیا کروں۔“ وہ بولا۔

”عشق تو جاو ہی ہوتا ہے۔ یہ سرچڑھ کر تو بولتا ہی ہے۔ مگر جنم جنم تک بولتا ہے۔ یہ تم کو نہیں پتا ہوگا۔ میں تمہارے ہر جنم میں تمہارے پاس آتی ہوں مگر ہر جنم میں ناکام ہوئی، اس دفعہ ناکام ہونا نہیں چاہتی۔“

”تم کب سے ہو اور میرا یہ کون سا جنم ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”تم نے یہ ساتواں جنم لیا ہے اور ہر جنم میں تم نے پوری زندگی گزاری ہے تو اندازہ کر لو، میں کب سے ہوں۔“

”تم مجھے چکر میں ڈال رہی ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ بار بار جنم لینا ہمارے مذہب میں نہیں ہے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ میں حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہوں۔ مرنے کے بعد ایک بار پھر ہمیں زندگی ملے گی اور وہ دن ہوگا ستر کا اور اس روز ہم اپنی زندگی کا اپنے اعمالوں کا حساب دیں گے۔“

انور نے جواب دیا۔

”میں تم کو مجبور نہیں کرتی۔ تم نہ مانو مگر میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔ مجھے اس قسم سے سروکار نہیں، بس تم صرف میرے سن کے مندر کے دیوتا ہو۔ ایک طویل مدت کے بعد تم مجھ سے مل جاتے ہو۔ بہت سی باتیں انسان نہیں مانتا مگر ان کا وجود ہوتا ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ اسی مقام پر جہاں یہ گھر بنایا گیا ہے، میں موجود ہوں کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ میری منزل یہی مقام ہے۔ تم جس مقام پر جنم لینے والے ہوتے تھے، میں اس مقام پر آ جاتی تھی۔ تم نے ہی یہ مکان کیوں لیا۔ کوئی اور بھی تو لے

ایک تو حسن کا جادو اور پھر بیان کا جادو، انور کے سر پر چڑھ رہا تھا۔ بار ایک لبادے میں شبنم کا چھانکتا بدن اتنا سڈول کہ سنگ مرمر کے مجسمے اس کی چکنائٹ اور تراش کے آگے سر جھکا دیں۔ اس کی حسن اور جوانی ایسی تھی کہ انسان اپنی سدھ بدھ بھول جائے۔ انور تو ایک شاعرانہ مزاج کا نوجوان تھا۔ اس کا بہکنا کون سا مشکل تھا۔

”تم مجھے ہر جنم میں ملے مگر میں تم کو اپنا نہ سکی۔ کبھی تم مجبور تھے۔ کبھی میں مجبور تھی۔ میری تمام حسرتیں کبھی پوری نہیں ہوئیں۔ تم ہر جنم میں مجھے بھول گئے۔ میں نے ہر دفعہ تم کو یاد دلایا۔ مگر سب بیکار گیا اور اس طرح چھ جنم بیت گئے۔ دیکھ لو میں ویسی کی ویسی ہوں۔ اس لئے کہ مجھ پر گزرتے وقت نے اپنا اثر نہیں ڈالا۔ وقت شریر پر اثر ڈالتا ہے۔ روح پر اس کا زور نہیں چلتا۔ میں ایک ترسی ہوئی آتما ہوں۔ میرا صرف ایک جنم ہوا ہے اور میں اسی جنم سے اس دنیا میں موجود ہوں۔“

انور علی حیران اس کی باتیں سن رہا تھا۔ خاموش تھا۔

”کیا تم مجھے حاصل کرنا نہیں چاہتے؟“ شبنم نے پوچھا۔

”ہاں میں تم کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے تخیل سے زیادہ حسین ہو۔“ انور نے کہا۔

”اور میں بھی تم کو پانے کے لئے بے چین ہوں۔“

شبنم نے جواب دیا۔

”مگر ہمارا ملاپ کس طرح ہوگا۔“ انور نے پوچھا۔

”میں تم کو بتاؤں گی، تم راضی ہو، میرے لئے یہی بڑی بات ہے۔ میں اس جنم میں تم کو ضرور پاؤں گی۔ تم کو ذرا صبر کرنا ہوگا۔ وقت آنے پر میں تم کو ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گی۔ میری آتما تمہاری روح میں ضم ہو چکی ہے۔ میری بے چینی کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں جنم جنم کی پیاسی ہوں۔“

جب بھی یہ کوشش ہوتی، ان کو جلاب یا تے ہونے لگتی اور سب کچھ نکل جاتا۔ ہر طبیب اپنی سی کر رہا تھا مگر حالت گرتی ہی جاتی تھی۔

میرے پاس ایک ارجنٹ پیغام آیا۔ مریض کی حالت بتائی گئی اور آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ میں نے رولوکا کو بتایا اور ہم دونوں فوراً لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ ہم دونوں پیغام ملنے کے تین روز کے بعد وہاں پہنچے۔ سلامت علی کا یہ مکان ایک حویلی کی شکل کا تھا۔ بہت بڑے کشادہ کمرے اور اونچی اونچی چھتیں اور بہت بڑا صحن، برآمدہ یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ سلامت کا پورا خاندان رہ سکتا تھا۔

مگر سب کو ایک ساتھ ہی رہنا پڑتا۔ سلامت علی دور اندیش آدمی تھے۔ آنے والے وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھ رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب کے لئے الگ الگ بندوبست کر دیا تھا۔ مریض کو ایک بہت صاف سترے کمرے میں رکھا گیا تھا۔

ہم نے جاتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ رولوکا نے کہا کہ آپ اپنی حکمت کا کام کریں۔ میں ذرا کچھ اور دیکھ لوں اور رولوکا چلا گیا۔ میں نے مریض کی طرف توجہ کی۔ ایک نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ جسم کا پانی ختم ہونے کو ہے۔ میں نے ایک آزمودہ مشروب مریض کو پلایا۔ مگر چند منٹ میں ہی وہ منہ سے باہر آ گیا۔ اتنی دیر میں رولوکا بھی آ گیا اور بولا۔

”معاملہ کچھ اور ہے۔ ابھی کچھ نہ کریں۔ میں ذرا راستے بند کر دوں۔“ اور رولوکا پھر چلا گیا۔

چند منٹ کے ہی بعد وہ آ گیا اور بولا۔ ”اب علاج شروع کر دیں۔ اس کا جسم پانی سے خالی ہو رہا ہے۔ پہلے پانی اندر پہنچائیں اور پھر ہم دونوں نے اس کے حلق میں پانی اور ایک مجرب تسخہ پہنچانا شروع کر دیا اور ایک گھنٹہ تک ہم یہی کرتے رہے اور اب پانی باہر نہیں نکلا اور نبض بھی کچھ بہتر ہو گئی۔“

ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور مریض کی حالت پہلے سے اچھی نظر آنے لگی۔ مگر وہ اب تک آنکھیں بند کئے بے ہوش تھا۔ سانس ٹھیک آ رہی تھی اور دوران خون بھی ہونے

انور علی کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس کے خیالات میں ہر وقت وہ پری پیکر رہنے لگی نہ اس کو کھانے کا ہوش رہا نہ کسی اور کام کا۔ صحت دن بدن گرتی گئی۔ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

بار دوستوں نے محفلوں میں لے جانے کی کوششیں کر لیں۔ سارے بھائی پریشان، باپ کی حالت خراب مگر وہ اپنے کمرے سے باہر جانے پر راضی نہ ہوتا، سب نے پوچھا مگر وہ کچھ نہ بتاتا۔

آخر تمام کوششوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ضرور کچھ اور پکڑے۔ کسی سیانے کو بلایا جائے۔

ایک پنڈت آئے۔ انہوں نے کچھ کرنا چاہا مگر وہ پہلی رات ہی ایسے بھاگے کہ پلٹ کر خبر نہ لی۔

کئی آئے اور ان کو بھی الٹا لٹکا دیا گیا۔ اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ انور میاں پر کوئی سایہ ہے۔ یوں نے مشورہ کیا کہ ان کی جگہ بدل دی جائے مگر وہ کہیں جانے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ خاموشی سے ان کو پرانے مکان میں پہنچا دیا جائے۔ بڑی وقتوں کے بعد ان کو گاڑی میں ڈال کر پرانے مکان پر پہنچایا گیا۔ مگر ان کی حالت میں تبدیلی نہیں آئی۔ وہ رات بھر نہ معلوم کس سے باتیں کرتے۔ کمزوری اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ لکھنؤ میں کالے بابا بہت مشہور آدمی تھے۔ وہ ہر قسم کا اتار ا کرتے تھے۔ بھوت پریت کے ماہر تھے۔ ان کو بلایا گیا۔

کالے بابا نے تین دن رات، پڑھت کی مگر پھر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ کالے بابا کی ناکامی نے سب کو اداس کر دیا۔ سب پریشان ہو گئے۔

انور میاں کا جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ چہرہ پر صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ہر قسم کے علاج ہو رہے تھے مگر انور میاں کی حالت گرتی جا رہی تھی۔ حکیم اور ڈاکٹر نے بتا دیا تھا کہ جسم میں پانی کم ہو رہا ہے۔ ان کے جسم میں زیادہ سے زیادہ پانی پہنچانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

نہیں کر سکتے تھے۔ مریض کی جان بچانے میں ہم لگ گئے تھے اور اب کچھ بہتری نظر آرہی تھی۔
تین روز کے بعد شام کو رولو کا ایک گھڑی اٹھایا اور بولا۔ ”لو حکیم صاحب دوا آگئی۔“

یہ دوا تین کوٹے کے پان کے برابر پتے تھے۔ یہ موٹے موٹے تھے اور ہر پتہ وزن رکھتا تھا۔ اس کو اگر موڑ کر دبایا جائے تو ٹوٹ جاتا تھا اور ٹوٹنے پر سفید لعاب بہتا تھا اور اس میں بہت چکنائٹ محسوس ہوتی تھی۔

رولو کا بتایا۔ ”اور اس کا استعمال یہ ہے کہ یہ پتے جسم کے ہر جوڑ پر باندھ دیئے جائیں گے۔ اس کی یہ خاصیت ہے کہ پتے کی چکنائٹ خود بخود اندر چلی جائے گی اور پتہ سوکھ جائے گا۔ جب سوکھ جائے تو دوسرا باندھنا ہے۔“

”یہ تو حیرت انگیز پتہ ہے۔“ میں نے کہا۔
”ہاں یہ حیرت انگیز پتہ ہے۔ آپ کو کمر حیرت ہوگی کہ یہ درخت زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ مگر ہوتا بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ کیونکہ یہ آدم خورد درخت یا گوشت کھانے والے درختوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اس کے پتے انسانوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور اس کے پڑوسی درخت انسانوں اور جانوروں کو ہڑپ کرتے ہیں۔ آپ اس دوا کا اثر بہت جلد دیکھیں گے۔ یہ مریض جو بے حس پڑا ہے۔ اس کے ہاتھ پیروں میں کتنی جلدی تو ہٹائی آتی ہے۔ یہ کوئی جادو ٹونہ نہیں ہے۔ یہ دوائی ہے جو قدرت نے پیدا کی ہے۔“

رولو کا بتایا۔
”میری زندگی کا یہ انوکھا تجربہ ہوگا۔ میں نے آج تک ایسی دوا استعمال نہیں کی اور نہ اس کی بابت جانتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”یہ پتے سایہ میں ایک ماہ تک ہرے رہیں گے اور ان کو استعمال کیا جاسکے گا۔ اس کے بعد ان کا رنگ بدل کر نیلہ ہو جائے گا مگر پھر بھی بیکار نہیں ہوں گے۔ ان کا سفوف بنایا جاسکتا ہے اور جوڑوں کے درد کے لئے اکسیر ہوتا ہے مگر اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا

لگا تھا۔
ہم متوازن کام کر رہے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ رولو کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد رات کو کہا۔

”میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ اس کے جوڑ سوکھ گئے ہیں۔ یہ تندرست ہونے کے بعد بھی جوڑوں کی تکلیف میں مبتلا رہے گا۔ ہڈیوں کا لعاب جو جوڑوں کو چکنائٹ دیتا ہے، ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جوڑوں کو چکنائٹ پہنچائی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ چلنے پھرنے سے معذور ہو سکتا ہے۔“ رولو کا بتایا۔
”تمہارے پاس اس کا کیا علاج ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں اس کی دوائی جانتا ہوں مگر اس کا یہاں ملنا دشوار ہے۔ اگر جنگلات میں ہوگی تو تلاش کرنا ہوگا۔ اور تلاش کرنے میں وقت زیادہ لگے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ افریقہ کے جنگلات سے اس کو سگواتا ہوں۔ وقت تو اس میں بھی لگے گا مگر پھر بھی تلاش کرنے سے کم ہی ہوگا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم جو کرو گے ٹھیک ہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔

رولو کا نے ایک طرف اشارہ کیا اور پھر نہ معلوم کون سی زبان میں باتیں کرنے لگا اور ہاتھ کے اشارے بھی کرتا گیا اور پھر میری طرف مخاطب ہوا۔ ”میں نے ہر کارے کو روانہ کر دیا ہے۔ وہ بہت تیز رفتار ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین دن میں دوائی آجائے گی۔“ رولو کا باہر چلا گیا اور میں اپنے کام میں لگ گیا۔

ہمارے اشارے کے منتظر کئی لوگ تھے۔ سلامت علی بھی ہمارے قریب رہے۔ مگر ہم نے کسی سے ابھی تک کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ لوگ حیران تھے کہ ہم آتے ہی علاج میں لگ گئے۔ ہم نے ان سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ میں ضرور ان سے پوچھتا مگر مریض کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ چند گھنٹوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ ہم پوچھ گچھ میں اپنا وقت برباد

پڑتی ہے۔“ رولوکانے بتایا۔

”آپ بہتر جانتے ہیں۔“ سلامت علی نے جواب دیا۔

”آج رات میں یہ کام کروں گا۔ آپ ایک کورامٹکا چھت پر اوندھا کر کے رکھوادیں۔ یاد رہے کہ یہ کورا ہو اور کہیں سے ٹونا پھوٹا نہ ہو۔ اس کے چاروں طرف گیندے کے تازہ پھول ڈلوادیں۔ اگر بتوں کے دو چار پا کٹ اور رتن جو کے پھول اور پتے بھی منگوائیں اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں لے آؤں گا۔ آپ یہاں رہیں تو بہتر ہے۔ مریض کے پاس ایک آدمی رہے گا۔ آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہوگا۔ اوپر چھت پر ہم صرف تین آدمی جائیں گے۔ میں آپ اور حکیم صاحب۔ یہ کام رات بارہ کے بعد ہوگا۔“

رولوکانے اپنا پورا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا اور پھر ہم سب ٹھیک بارہ بجے چھت پر چلے گئے۔ بہت بڑی چھت تھی۔ درمیان میں ایک گھڑا اوندھا رکھا تھا۔ اس کے اطراف میں پھول پڑے تھے اور اگر بتی کے پاکٹ اور ماچس بھی پڑا تھا۔ رولوکانے سب چیزوں کا معائنہ کیا اور بولا۔

”نیچے ایک آدمی آنے والا ہے، آپ لوگ جائیں اور اس کو اوپر لے آئیں۔“ میں اور سلامت علی نیچے آئے تو دیکھا کہ ایک پنڈت نما آدمی کھڑا تھا۔ میں پوچھا کہ آپ کون ہیں تو وہ بولا۔

”میں پنڈت ہوں، قریبی مندر میں رہتا ہوں۔ مجھے بلایا گیا ہے کہ کسی کا اتم سنسکار کرنا ہے۔ ارنی کہاں ہے۔“ میں نے کہا کہ آؤ ہمارے ساتھ اور ہم اوپر آ گئے۔ اوپر رولوکانے پنڈت سے کہا۔

”جو کچھ یہاں تم دیکھو اور سنو۔ وہ یہیں پر بھول جانا۔ ہرگز یاد نہ رکھنا اور تم کو جو کہا جائے وہ کرنا۔“

چھت کی مغربی دیوار کے ساتھ ہم سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رولوکانے بھی ہمارے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اوندھے رکھے مٹکے کی طرف چلا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر رولوکانے کی آواز آئی۔

”اس چھت کی چار دیواری تیری حد ہے۔ اس سے

تین دن کے بعد مریض نے آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ پیر بھی ہلائے۔ رولوکانے سلامت علی سے پہلی دفعہ بات کی۔ ”مبارک ہو، آپ کا بیٹا اب ٹھیک ہے۔“

سلامت علی جو ناامید ہو چکے تھے۔ ممنونیت بھری آواز میں بولے۔ ”آپ دونوں نے جتنی محنت اور لگن سے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں اس کا احسان تو کیا اتار سکوں گا، ہاں جب تک زندہ رہوں گا، آپ کے حق میں دعائیں ہی کروں گا۔۔۔۔۔“

”اور ہم صرف محتاج ہی دعاؤں کے ہیں۔ ہمارا معاوضہ ہی یہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے کسی نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ میں نے آپ دونوں کو اس کے بتانے سے بھی زیادہ پایا ہے۔ آپ نے اپنا کھانا پینا اور آرام سب کچھ چھوڑ دیا۔“ سلامت علی سر جھکا کر بولے۔ ”آپ خود پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میری سمجھ میں اب تک مرض نہیں آیا۔“ وہ بولے۔ ”مرض کچھ نہیں تھا اور ابھی وہ مرض گیا بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ مریض کے قریب وہ نہیں آ سکتا۔“ رولوکانے جواب دیا۔

”آخر وہ کیا ہے۔“ وہ پھر بولے۔ ”ابھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ پہلے مریض اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اس کے بعد مرض کا بندوبست ہوگا۔ مگر آپ بے فکر ہو جائیں آپ کا بیٹا عنقریب اٹھ کر چلے گا۔“ رولوکانے تسلی دی۔ اور پھر جلد ہی انور میاں پہلے جیسے ہو گئے۔ ان کی بیماری ایک بھیانک خواب سب کے لئے بن گئی۔ ان کا جشن صحت بھی منایا گیا۔ اس کے بعد رولوکانے کہا۔

”سلامت صاحب اب ہم بیماری کو بکڑتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وہ گئی نہیں۔ انور میاں کے ارد گرد رہتی ہے۔ اگر اس کا پکا انتظام نہ کیا تو پھر حملہ آور ہو سکتی ہے۔“

کہ یہ راجہ اور عایادونوں کے لئے سخت منحوس ہے۔

نوجوگتا کے بارے میں پنڈت نے کہا تھا کہ یہ بدنامی کرے گی۔ لڑائیاں کرائے گی۔ پرتو اس کا نام بہت دور تک مشہور ہوگا۔ میں تو منحوس ٹھہرائی جا چکی تھی۔ مجھ سے تو جان چھڑانی تھی۔ اس لئے میری لگن ایک سپاہی سے کردی اور وہ بھی صرف ایک رات میرے پاس رہا اور پھر پرتھوی راج سے لڑائیوں میں زخمی ہو کر بھاگا اور بھاگتے بھاگتے اس میدان تک آ گیا۔ یہاں پر پہلے ایک دریا ہوا کرتا تھا۔ قنوج میں ایسی بھگدڑ مچ گئی کہ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ پرتھوی راج نے راجہ جے چند کو دوا دیا۔

میں بھی کچھ لوگوں کے ساتھ بھاگی مگر پھر اکیلے رہ گئی اور اس جگہ تک آ گئی۔ یہ ایک جنگل سا تھا۔ اس مقام پر جہاں یہ مکان بنایا گیا ہے۔ مجھے ایک گھوڑے اور ایک آدمی کی سوچی لاش ملی۔ میں نے گھوڑے کی زین اور سبز دوسمان اور اپنے پتی کی انگوٹھی سے پہچان لیا کہ میں دودا ہو چکی ہوں۔

میں صرف ایک رات کی دہن دودا ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے پتی کی انگوٹھی چاٹ کر آتما تھیا کر لی۔ اور اپنے پتی کی آتما کی تلاش شروع کر دی۔ مگر وہ مجھے نہ ملی۔ میں پورے بھارت میں تلاش کرتی رہی اور لوٹ کر اسی مقام پر آتی رہی۔ چھ دفعہ میں نے دھوکا کھایا، میرا پتی نہ ملا۔

پھر میں یہیں پر بیٹھ گئی۔ مجھے دشواس تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مجھے ملے گا اور اسی مقام پر ملے گا اور پھر ایک مکان اس جگہ بنا شروع ہوا۔ میں دیکھتی رہی، میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اور پھر یہ آباد ہوا اور مجھے میرا پتی نظر آ گیا۔ میں نے چھ بار دھوکا کھایا تھا۔ اس بار میں ہوشیار تھی۔ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ چھپایا اور پتی کو رجھانا شروع کر دیا۔ وہ بھی میری طرف مائل ہو گیا۔ میرے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ ہمارا ملاپ مشکل تھا۔ میں ایک آتما اور وہ ایک جینا جاگتا انسان۔ میری سمجھ میں ملاپ کی صرف یہ صورت تھی کہ وہ بھی شریک قید سے آزادی پالے اور پھر دونوں آتماؤں کا ملاپ ہو سکتا تھا۔ مگر شاید میں واقعی منحوس تھی۔ میں کسی کی نہ ہو سکی، کوئی میرا نہ ہو سکا۔ اب میں تیری

باہر جانے کی کوشش مت کرنا۔ تو میری نظروں کے سامنے ہے اور تیرے چاروں طرف سخت پہرہ ہے۔ مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے، اس میں تیرا فائدہ ہی ہے۔ اس لئے تو اس مسئلے میں آ جا اور بات کر۔“

مگر رولوکا کی بات کا جواب نہیں آیا تو وہ پھر بولا۔

”میں بار بار ایک بات کو نہیں کہتا۔ اگر تو مسئلے میں نہ آئی تو میں پکڑ کر تجھے اس میں بند کر دوں گا اور پھر تیرا ٹھکانا سمندر کی تہہ میں ہوگا، وہاں تو قید رہے گی۔“

پھر ہم نے دیکھا کہ مڈکا جو اوندھا رکھا تھا، سیدھا ہو گیا اور پھر اس کے اندر سے ہارک مگر صاف آواز آئی۔ ”اب بول میں نے تیرا کہا مان لیا ہے۔“

”اب تو بتا کون ہے اور تو نے انور کی جان لینے کی کوشش کیوں کی تھی۔“

چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر آواز آئی۔ ”یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ کہاں سے بتاؤں۔“

”ساری رات پڑی ہے میں سن رہا ہوں تو بول۔“

رولوکا نے جواب دیا۔

”میں قنوج کے راجہ جے چند انصور کی بڑی بیٹی

کماری رکشی ہوں۔ میری ماں ایک داسی تھی۔ اس لئے میرا

نام تم نے نہیں سنا ہوگا۔ میری بہن کا نام نوجوگتا تھا۔ یہ راجہ کی

راہی کی اولاد تھی۔ یہ وہی نوجوگتا ہے جو پرتھوی راج پر مرمی

تھی۔ پرتھوی راج کی حکومت۔ اندر پت (دہلی) میں تھی۔

اور اس کو شہاب الدین غوری نے شکست فاش دی تھی۔

میں باندی زادی تھی۔ اس لئے میرے لئے کوئی

سوئمر نہیں ہوا۔ حالانکہ میں نوجوگتا سے زیادہ حسین تھی۔

مگر شہرہ نوجوگتا کا زیادہ تھا۔ اس کا سوئمر ہوا اور اس

نے برا ملا پرتھوی کے پتلے کے گلے میں ڈال دی جو کہ

پرتھوی کی بے عزتی کرنے کو بنایا گیا تھا اور پھر وہ اس کے

ساتھ ہی بھاگ گئی۔ اور پھر راجہ جے چند راٹھور اور پرتھوی

راج کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں۔

میں جب پیدا ہوئی تھی تو پنڈت نے میری جنم پتری

بنائی تھی۔ اس میں مجھے سخت منحوس قرار دیا تھا۔ اس نے کہا تھا

قید میں ہوں۔ میں کتنی دکھی تھی، مرنے کے بعد دکھی رہی۔ تم خود اندازہ کرو۔“ آواز بند ہو گئی تو رولو کا نے کہا۔

”میرے پاس دو صورتیں ہیں۔ ایک تو تجھے ہمیشہ کے لئے قید کر دوں اور یہ میں نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تیری آتما جس کا کہ اتم سنکار نہیں ہوا، کر کے تیری آتما کو وہیں روانہ کر دوں، جہاں سے آئی تھی تو منحوس نہیں ہے بلکہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ سینکڑوں سال تو اس دنیا میں بھٹکتی رہی ہے مگر کسی نے تجھ پر قابو نہیں پایا۔ کسی کی نظر تجھ پر نہیں پڑی۔ اگر کوئی دیکھ پاتا تو تو اس کی غلامی میں ہوتی اور اس کے کام کرتی۔ اب بتا تو واپس جانا چاہتی ہے؟“ رولو کا نے پوچھا۔

آواز آئی۔ ”جہلی صورت تو بہت بھیا نک ہے۔ دوسری مجھے منظور ہے۔“

اور پھر رولو کا نے پنڈت کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آ گیا تو رولو کا نے کہا۔ ”یہ آتما تیرے دھرم کی ہے۔ دنیا میں بھٹک رہی ہے۔ اپنے عقیدے اور دھرم سے اس کا اتم سنکار کر دے اور اس کو عزت سے روانہ کر دے۔ اب تیرا کام شروع ہوتا ہے۔“

اور پنڈت نے اشوک پڑھنا شروع کر دیئے۔ اگر بتیاں چلا لیں اور منکے پر پھول ڈالنے لگا۔ پندرہ منٹ تک وہ یہ کرتا رہا اور پھر منکا اوندھا کر کے بولا۔

”کام ختم ہوا، آتما پر لوک سدھا رہ گئی۔“

اس کے ساتھ ہی ہمارا کام بھی ختم ہوا۔ ہم نے واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر انور کی شادی میں روک لئے گئے۔ بڑے دھوم دھام سے انور میاں کی شادی ہو گئی اور ہم پورے چھ ماہ بعد ہی روانہ ہوئے۔

☆.....☆.....☆

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انسانی قربات انسان کو کس قدر عزیز ہوتی ہے۔ اسی لئے آدمی کو مجلسی جانور بھی کہا جاتا ہے۔ تنہائی پسند کوئی کتنا ہی ہو، وہ بھی قربات چاہتا ہے۔ بعض لوگ آدمیزار لگتے ہیں مگر ہوتے نہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست ہوتے ہیں۔ وہ ان سے ہلسی مذاق بھی

کرتے ہیں اور ان سے مل کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اکثر تو دیکھا گیا ہے کہ کوئی پتھر سے پتھر دل بھی ایک منٹ میں کسی کی قربات سے متاثر ہو جاتا ہے۔

زندگی کی بساط پر ہر قسم کے مہرے موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ مہرے اپنی مرضی سے حرکت کرتے ہیں۔ شطرنج کی بساط کے مہرے پابند ہیں۔ کھلاڑی کے ہاتھ کے اسی لئے وہ ذمہ داری سے بچ جاتے ہیں۔ اچھائی برائی کھلاڑی پر ہی آتی ہے مگر زندگی کی بساط پر ایسا نہیں ہے۔ ہر مہرہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کا ہر فعل اس کی مرضی سے ہوتا ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قدرت نے انسان کو عقل سے نوازا ہے۔ اس سے یہ اپنے لئے راستہ چنتا ہے۔ جبکہ حیوانات میں یہ بات نہیں۔ انسان صرف اپنی عقل کی وجہ سے تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ کیونکہ فطری میلان کو پورا کرنے میں عقل اس کی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت میں برائی نہیں ہے مگر اپنے عمل سے خیر یا شر کا تا ہے۔ عمل یہ اپنی عقل سے کرتا ہے اور یہ عقل ہی اس کا نفس بھی ہے۔ یہ اگر قابو میں رہے تو ولی اور بے قابو ہو جائے تو ابلیس کا چیلان جاتا ہے۔

بے شک عقل میزان عدل ہے۔ جب پلڑا ایرانی کی طرف جھٹکا جاتا ہے تو انسان گناہوں کے دلدل میں ڈوبتا جاتا ہے اور جب اچھائیوں کی طرف جھٹکا ہے تو انسان عرفان آگہی کی منزل پالیتا ہے۔

نام تو ان کا فضل خان تھا مگر محلے کے سب لوگ ان کو فوجو میاں کہتے تھے۔ ان کے ابا ہارمونیم بجانے کے استاد تھے۔ یہی بیٹی ان کا روزی روزگار تھا۔ بڑے مندروں میں خاص موقعوں پر بلائے جاتے تھے۔ بڑی محفلوں میں گانے والوں کی سنگت کے لئے ان کو بلایا جاتا تھا۔ بہت اچھے فن کار تھے۔ مگر جتنے اچھے فن کار تھے۔ اتنی ہی خراب لت ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ کوئی محفل بوتل کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ استاد فخر الدین پہلے بوتل طلب کرتے ہیں۔ لوگ ان کے فن کے قدر دان تھے۔ ان کی

فرمائش پہلے پوری کرتے تھے۔ فوجیوں کی پیدائش کے بعد بھی ان کا طریقہ کار نہ بدلا۔ بہت کمایا اور بوتل پی گئے۔ فوجیوں چار سال کے ہوئے تو ان کی تعلیم شروع ہوگئی اور دس سال کی عمر میں وہ محفلوں میں جانے لگے۔ استاد فخر الدین کا بہت نام تھا۔ ان کا بیٹا ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھا۔

اس دور میں چٹنی ماسٹر کی قدر طوائف کے کوٹھے پر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ مگر استاد فخر الدین نے کبھی کسی کوٹھے پر چٹنی نہیں بچائی۔ ان میں لاکھ برائیاں تھیں مگر اپنے فن کو وہ طوائف کے کوٹھے پر لے کر نہیں گئے۔ بڑے بڑے گانے والوں کی سنگت میں زندگی گزار دی۔ اب ان کا بیٹا اسی آلہ پر چل رہا تھا۔

بڑی بڑی نامی گرامی گانے والیوں نے استاد فضل خان کو اپنے پاس بلا یا مگر باپ کا کہا اور ان کے اصولوں کو اس نے پہلے باندھ رکھا تھا۔ اچھا برا وقت گزارا مگر کسی بانی کی قدم بوی نہیں کی۔

استاد فضل خان وضع دار باپ کے بیٹے تھے۔ اس پر وہ ایک فن کار، ناک پر کبھی نہیں بیٹھتے۔ باپ کے انتقال کے بعد بھی ان کا چلن وہی رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کوئی شوق نہیں کرتے تھے۔ بہت سادا زندگی گزارتے تھے۔ اسی لئے کم کم کما کر بھی محلے میں عزت سے زندگی گزار رہے تھے۔

فوجیوں کی سب سے ہی عزت کرتے تھے۔ موسیقی کے شوقین لڑکے لڑکیاں ان کے پاس شام کو آجاتے اور وہ بڑی لگن اور ایمانداری سے ان کو پیشی بجانے اور راگ راگنی اور الاپ کے رموز بتایا کرتے۔ حالانکہ وہ گانیک نہیں تھے مگر رموز موسیقی اور گانے دونوں میں عبور رکھتے تھے۔ بہت بڑے گانے والوں سے ان کا واسطہ اور تعلق رہتا تھا۔ اچھے اور برے سب سے واسطہ تھا۔ وہ ہلکے گانے والوں سے دور رہا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی عادت ٹوک دینے کی تھی اور کم ظرف لوگ برا مان جاتے تھے۔ مگر ان کی عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ وہ باز نہیں آتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سچا فنکار

وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطی مان کر درست کر لے اور نہیں مانے گا تو وہ غلطیاں کرتا رہے گا جو متواتر غلطیاں کرتا ہے وہ بھلا فنکار کہاں ہوا۔ ان کے قد مردان بہت تھے۔ جوان کو اور ان کے فن کو سمجھتے تھے وہ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ان کی سادگی میں بھی ایک بانٹا پن تھا۔ محفل چاہے جتنی بڑی ہو گانے والا چاہے کوئی ہو، وہ سفید کرتا اور علی گڑھ پا جاسے میں اپنی چٹنی کے ساتھ شرکت کرتے۔

شیریں بانی اقبالے والی اپنے زمانے کی بڑی گانے والی تھی۔ ہر کسی محفل میں نہیں جاتی تھی۔ راجے مہاراجے اس کو بلاتے تھے۔ وہ ہر جگہ گاتی نہیں تھی اور منہ مانگی قیمت رات بھر کے گانے کی وصول کرتی تھی۔ بہت تک چڑی عورت تھی۔ مگر گانے میں اپنا غنائی نہیں رکھتی تھی۔

دولت رام کڑا اچھے والے سہارن پور کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ جس زمانے میں روپے کا تیس یہ گندم بکا کرتا تھا۔ اس وقت وہ لکھ بکی کہلاتے تھے۔ ان کے ناز اور خزانے بھی کم نہ تھے۔ جس پر انکی رکھ دیتے وہ چیز ہر قیمت پر خرید لیا کرتے۔

یہ تین کردار تھے جو اس کہانی کے لکھنے کا موجب بنے ہیں۔ ایک طرف بچے فن کار ہونے کا غرور تھا۔ ایک طرف اپنی آواز اور گانیکنی ناز و داد کا غرور تھا۔ تو ایک طرف دولت کا غرور تھا۔

دولت رام کڑا اچھے کی لڑکی کی بارات آنے والی تھی۔ اس زمانے میں باراتیں تین دن اور اس سے بھی زیادہ رکا کرتی تھیں۔ دولہا کی فرمائش تھی کہ شیریں بانی اقبالے والی کا گانا پہلی رات ہوگا۔ دولت رام کے آدمی شیریں بانی کے پاس دوڑے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔

مگر دولت رام ایک ضدی آدمی خود اقبالہ چلے گئے۔ شیریں سے بولے۔ ”بانی جی آنا تو آپ کو پڑے گا۔ میری عزت کا معاملہ ہے۔ میرا نام دولت رام ہے۔ تم یہ بتاؤ کیا لوگی۔“

شیریں بانی خوب زمانے کی ہوا دیکھ چکی تھی۔ بڑوں سے اس کا واسطہ رہا تھا اور بڑوں کی اتنا اور ضرورت سب کو

جانتی تھی۔ اس نے مسکرا کر دولت رام کو دیکھا اور بولی۔

”اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس بیٹھ جی۔ بات تم کی نہیں ہے۔“

”میرے خیال میں تو ساری بات رقم کی ہی ہوتی ہے۔“ دولت رام بولے۔

”آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم فنکار لوگ ہیں۔

ہمارے بھی کچھ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ آپ ٹھہرے بڑے آدمی۔ ان اصولوں اور قاعدوں پر آپ کو چلنا نہیں آتا۔“ شیریں بائی نے کہا۔

دولت رام کو ذرا یہ بات ناگوار گزری بولے۔
”تو پھر تم گانے کیوں جاتی ہو ہر جگہ۔“

”میں راجے مہاراجوں کے دربار میں گاتی ہوں، ہر شخص سے آگاہی نہیں کرتی۔ میرے گال پر او سر پر نوٹ نہیں رکھے جاتے، شادی بیاہ محفلوں میں یہ سب خرافات ہوتی ہیں۔ آپ کس کس کو روک دے اور میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔ پھر بتاؤ میں نہ جاؤں یہی بہتر نہیں ہے۔“ شیریں بائی نے کہا۔

”میں یہ پابندی لگا دوں گا کہ کوئی گانے کے دوران تم کو کچھ نہیں دے گا۔“ دولت رام نے کہا۔

”یہ بہت مشکل کام ہے..... یہ نہیں ہو سکے گا۔“ شیریں بائی نے جواب دیا۔

اب دولت رام کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کب برداشت کر سکتے تھے کہ وہ خود آئیں اور یہ دونوں کی گانے والی ان کی بات نہ مانے۔ ان کے سر پر تو دولت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک تو ہر چیز کی ایک قیمت تھی، کم یا زیادہ، وہ خریدنے پر آتے تو یہ کب دیکھتے تھے۔

غصے میں بولے۔ ”دیکھو بائی جی۔ آنا تو تم کو پڑے گا۔ راضی سے آ جاؤ تو اچھا ہے۔ میں قدر کروں گا۔ رہا روپے پیسے کا معاملہ تو اتنا دوں گا کہ راجے مہاراجے شرم جائیں گے۔“

”آپ پھر درمیان میں رقم کو لے آئے۔ بات ہے قدر دانی کی۔ میں طوائف ضرور ہوں۔ مگر ایک فنکارہ بھی

ہوں۔ فنکار رقم کی طرف نہیں دیکھتا ہے۔ استاد فضل خان فنکار ہے۔ میں اس کو لاکھ روپے بھی دوں اور کہوں کہ میری سنگت کریں تو وہ لاکھ روپے ٹھکرا دے گا۔ یہ ہے فنکار۔ آپ ہیں کہ بار بار اپنی دولت کا رعب مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ بیٹھ صاحب دولت ہر چیز نہیں خرید سکتی۔ آپ بھی اپنے دماغ سے یہ بات نکال دیں۔“

دولت رام کے لئے یہ بات نئی تھی۔ اس نے تو اب تک اپنی دولت سے جو چاہا خرید لیا تھا۔ مگر یہ کیا ایک ناچ گانا کرنے والی طوائف قایم میں نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ زاد پر خاموش رہے۔ پھر بولے۔ ”میں تمہارا ہر مطالبہ پورا کروں گا۔ جس طرح کہو گی، انتظام کروں گا۔ کوئی باتاری یا کوئی آدمی تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ جس طرح درباروں میں گاتی ہو، اسی طرح گانا۔ اب بولو۔“

شیریں بائی بھی ایک کائیاں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری باتیں لے جانے کی ہیں۔ بارات کا ماحول وہ جانتی تھی۔ اب اس کے پاس منع کرنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ اس طرح اس کی دیرینہ خواہش کی بھی تکمیل ہوتی تھی۔ وہ بولی۔

”آپ میرا صرف ایک مطالبہ پورا کر دیں، میں بارات میں گاؤں گی۔“

”بولو کتنی رقم تم کو درکار ہے؟“ دولت رام جلدی سے بولے۔

”آپ پھر درمیان میں روپے کو لے آئے۔“ شیریں بولی۔

”اچھا چھوڑ دو روپے کو تم مطالبہ بتاؤ۔“
”استاد فضل خان میرٹھ والے کو آپ جانتے ہیں۔“
دولت رام دو کے چار کرنے والے ان کا ان فنکاروں سے کیا واسطہ بولے۔ ”میں نے تو نام ہی تم سے سنا ہے۔ میں کیا جانوں۔“

”یہ میرٹھ کے مشہور آدمی ہیں۔ فنکار برادری ان کو سب جانتی ہے۔ خاندانی فنکار ہیں۔ یہ ہر کسی کے ساتھ

چھوڑ دیا۔

یہ ایک بہت بڑا سا کمرہ تھا۔ چھت کھریل کی تھی اور وہ بھی کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ زمین پر ایک دری پڑی تھی اور ایک چھلکا چار پائی ایک طرف پڑی تھی۔ ایک جوڑی طبلے کی اور ایک پرانا ہارمونیم دری پر رکھا تھا۔ وہ ادھیڑ آدمی دری پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”ہاں جی اب بتاؤ کس سے ملنا ہے۔“

”استاد فضل خان سے ملنا ہے۔“ مٹی نے کہا۔

”تو پھر..... ہم ہی ہیں۔“ وہ بولا۔

”آپ یہاں اس طرح رہتے ہیں۔ اتنے نامور آدمی اور اس طرح حیرت ہو رہی ہے۔“ دولت رام نے کہا۔

”حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ ہیرا تو کوئلے کی کان میں ہی ملتا ہے۔“ استاد نے جواب دیا۔

دولت رام کیا جواب دیتے ہوئے۔ ”میرا مطلب تھا آپ اتنے بڑے فنکار جس کا نام دور دور لوگ جانتے ہیں۔ کچھ تو بہتر جگہ اور بہتر طریقہ پر آپ ہوتے۔“

”آپ کے خیال میں یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ مگر میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا، اسی گھر میں پلا ہوں، اسی گھر سے مجھے عزت ملی ہے، یہ گھر میری جنت ہے، آپ کو اگر پسند نہیں تو آنے کی زحمت کیوں آپ نے اٹھائی۔“ استاد نے کہا۔

”آپ ناراض ہو گئے شاید۔“ دولت رام نے نرمی سے کہا۔

”میں تو آپ کا نام سن کر آیا تھا۔ بڑی قدر میرے دل میں آپ کے لئے ہے۔ میں کچھ آپ کے لئے کرنا چاہتا تھا۔ آپ مجھے نہیں جانتے میرا نام دولت رام ہے۔ میرا سہا بن پور میں بہت بڑا کاروبار ہے۔“ دولت رام نے کہا۔

”دولت کے بیوہ کی پارٹی ہو گئی، میں پارٹی ہوں۔“ فنکار کی اور دولت کی تو کبھی جی نہیں تھی۔

دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں ہٹ دھرم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی نہیں مانتے اور میں کیا کہوں۔“ استاد نے کہا۔

”آپ تجربہ کار ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، میں

سنگت نہیں کرتے۔ تم ان کو میری سنگت پر راضی کر لو۔ میں آ جاؤں گی۔“ شیریں بائی نے کہا۔

”لگتا ہے کہ ان کا معاوضہ کچھ بہت زیادہ ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، میں لے آؤں گا۔“ دولت رام ہوئے۔

”بات پھر تم کی آپ لے آئے، آپ ان کو لے آئیں، میں گانے کا کچھ نہیں لوں گی۔ آنے جانے کا خرچ بھی خود کروں گی۔ آپ کی بارات سچ جائے گی۔“ شیریں نے کہا۔

”بس ٹھیک ہے تم تیاری کرو۔“ دولت رام نے کہا۔

”تیاری تو میں جب کروں جب آپ مجھے بتائیں گے کہ استاد آنے پر تیار ہیں۔ اگر وہ نہ آئے تو میں نہیں آؤں گی۔ آپ نے میرا مطالبہ ماننے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ پہلے پورا کر دیں۔ میں سر کے بل چل کر آؤں گی۔“ شیریں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے میرٹھ جاتا ہوں اور واپسی میں تم کو بتا جاؤں گا۔“ اور دولت رام میرٹھ روانہ ہو گئے۔ شیریں نے دل میں کہا۔

”استاد بہت ٹیڑھی کچھ نہیں۔ وہ میرا نام سن کر ہی منع کر دیں گے۔“

میرٹھ کی پرانی آبادی میں استاد کا مکان تھا۔ دولت رام کے ساتھ ان کا ایک مٹی ٹائپ آدمی بھی تھا۔ مکان ایسی جگہ تھا۔ جہاں ٹانگا بھی نہیں جاسکتا۔ پتلی پتلی گلیاں اور ان کے درمیان پانی کی نالی وہ ناک پر رومال رکھے جا رہے تھے اور پھر کسی نے بتایا کہ وہ سامنے جو کھریل پڑی ہے۔ وہی استاد کا مکان ہے۔ مٹی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھول کر پوچھا، کس سے ملنا ہے۔

دولت رام تو شکل اور کپڑوں سے ہی دولت مند معلوم ہوتے تھے، آگے بڑھ کر بولے۔ ”استاد فضل خان سے ملنا تھا۔“

اس ادھیڑ عمر آدمی نے ذرا غور سے دولت رام کو دیکھا اور بولا۔ ”اچھا اندر آ جاؤ۔“ اور ان دونوں کے لئے راستہ

تو خدمت کرنے حاضر ہوا تھا۔“ دولت رام نے کہا۔
 ”ہاں آپ نے بتایا نہیں کہ آتا کیوں ہوا؟“ استاد
 نے پوچھا۔
 ”آپ کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“ دولت رام

بولے۔

”کیا ضرورت پڑ گئی، اس فقیر کی۔“ استاد نے پوچھا۔
 ”ایک گانے والی ہے، کہتی ہے کہ میں استاد کی
 سنگت کے بنا نہیں گاؤں گی۔“ دولت رام نے بتایا۔
 ”میاں فنکار کی تو ایک کل زیادہ ہوتی ہے۔ اگر نہ
 کر دے تو وہاں مشکل ہوتی ہے۔ اگر وہ نہیں گاتی تو نہ گائے
 آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ گانا سننا ہے تو کسی اور کا سن لو۔“
 استاد بولے۔

”استاد آپ بات کو نہیں سمجھے۔ بات آن کی اور عزت
 کی پوری بات آ۔ کو بتانا ہی پڑے گی۔ میری لڑکی کی بارات
 آنے والی ہے۔ داماد کی فرمائش ہے کہ پہلی رات شیریں بائی
 انبالے والی کا گانا ہوگا۔ بڑی مشکلوں سے وہ اس شرط پر مانی
 ہے کہ اگر میری سنگت استاد فضل خان میرٹھ والے کو یں تو
 گاؤں گی۔ بات یہ ہے۔“ دولت رام بولے۔

”اور تم منہ اٹھا کر چلے آئے۔ ہم کیا سڑک پر پڑے
 ڈھیلے ہیں کہ اٹھایا اور دے مارا کسی کے منہ پر۔“ میاں آپ
 دولت رام ہیں تو جائیں اپنی دولت کے ڈھیر پر بیٹھ کر چین
 کی بانسری بجائیں۔ اس طوائف سے کہہ دیں کہ ہم خاندانی
 لوگ ہیں۔ کسی طوائف کی سنگت نہیں کرتے اور آپ بھی سن
 لیں، ہم کو کوئی بکاؤ چیز نہ سمجھیں۔ یہ بیٹی لکڑی کی ہے۔ مگر اس
 پر ایک فنکار اپنا سبق یاد کرتا ہے۔ اس لئے یہ منول ہے۔

آپ شاید مجھے خریدنے آئے ہیں۔ آپ اس لکڑی
 کی بیٹی کو بھی نہیں خرید سکتے۔ اس لئے کہ میں اس کو فروخت
 کروں گا ہی نہیں۔ آپ میرے گھر آئے ہیں، اس لئے میں
 آپ کو معاف کرتا ہوں۔ آپ شاید میری باتوں کو دیوانہ پن
 خیال کریں۔ مگر یہ صرف اور صرف احساس کی بات ہے۔
 آپ میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ جاسکتے ہیں۔“
 اور استاد اٹھ کھڑے ہوئے۔

دولت رام کو امید نہیں تھی کہ بات اتنی جلدی مگر جا
 ئے گی۔ ابھی تو اس نے لیکن دین کی بات کی ہی نہیں تھی۔ یہ
 کیسے بے وقوف لوگ ہیں جو اتنی مایا کو ٹھکراتے ہیں۔ ٹوٹے
 گھر میں رہتے ہیں۔

اس نے اب تک اپنی زندگی میں ایسا آدمی نہیں
 دیکھا تھا۔ دولت رام کو غصہ تو بہت آیا مگر پھر خود کو قابو کر کے
 بولا۔ ”استاد جی آپ کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ
 میں آپ کو نہال کر دوں گا۔“

”دولت رام جی نہال تو میں پہلے سے ہی ہوں۔
 آپ مجھے کیا نہال کریں گے۔ میں دولت کا پجاری فنکار
 نہیں ہوں۔ آپ کو بہت مل جائیں گے، کوئی اور دروازہ
 کھٹ کھٹاؤ۔“

دولت رام جو بہت دیر سے خود کو قابو کئے ہوئے تھے
 پھٹ پڑے۔ ”میاں اپنی حالت تو دیکھو۔ بھر بات کرو۔“
 ”میری حالت کو کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ کی تمنا کرتا تو اپنی
 حالت بردہ کرتا۔ میں تو اسی حالت میں خوش ہوں۔ پھر
 مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟“
 ”میں تمہیں زمین سے اٹھا کر آسان پر پہنچانا چا
 ہتا تھا مگر تم گندگی کے پیداوار ہو۔“ دولت رام نے غصے
 سے کہا۔

”میں جہاں ہوں، خوش ہوں۔ میاں تم اپنا کام کرو،
 تم کیا جانو، فن کو اور فنکار کو۔“ استاد نے کہا۔

اور دولت رام بھی بھنا کے چل دیئے۔
 یہ ان کی زندگی کا اٹھواں تجربہ تھا۔ پہلے ان کو شیریں بائی
 نے حیران کیا اور اس سے زیادہ اس کی آدنی نے حیران کر دیا۔
 کیا دولت اتنی بے کار چیز ہے کہ اس سے یہ دو کوڑی کا استاد قابو
 نہیں ہو سکتا اور ایک بازار میں بیٹھنے والی طوائف اس کو ٹھکرا دیتی
 ہے۔ ”مگر میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ اب یہ میری ضد ہے
 میری آن ہے۔ میں ان دونوں کو جھکا کر رہوں گا۔“

وہ واپس سہارنپور چلا گیا اور بارات ایک سال آگے
 بڑھادی۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ یہ اس نے کیوں
 کیا۔ شیریں بائی پر اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا چاہا۔

درخواست سن لیں۔“

”اچھا تم بھی اپنی سناؤ۔“ استاد نے یہ کہا اور کہا۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔“

اندر آ کر شرمائے اندر کا جائزہ لیا اور بولے۔ ”استاد

یہ جگہ آپ کے شان کی نہیں ہے۔ کچھ تو اپنا خیال کریں۔

پورے میرٹھ کیا پورے بھارت میں آپ کا ایک مقام ہے۔

مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔“

استاد نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی اور بولے۔

”میاں اگر آپ ہم کو کوئی سبب یا غ دکھانے آئے ہیں تو پھر یہ

کوشش نہ کریں۔ ہم تو ملگ طبیعت کے آدمی ہیں۔ جس

حال میں اللہ نے رکھا ہے، خوش ہیں۔ اب کوئی دوسری بات

کرو، ہمارے سامنے کسی قسم کے لالچ کی بات نہ کرنا۔ یہ

سب چیزیں اصولوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں اور ہم ہیں

اصولوں کے غلام۔“ استاد نے جواب دیا۔

”ہماری تمنا تھی مگر آپ نے آگے بات کرنے کی

گنجائش ہی ختم کر دی تو دوسری بات کرتے ہیں۔ دوسری

بات یہ ہے کہ آپ اگر طوائف کی سنگت نہیں کرتے تو نہ

کریں مگر یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کسی کی بھی سنگت کرنے

کے قابل نہیں رہیں گے۔ اسی گندی جگہ سڑک مر جائیں

گئے۔ کوئی بچانے نہیں آئے گا۔ ہم یہ طے کر کے آئے ہیں

اور اس طوائف کا حشر بھی کم برائہ ہوگا۔“

”ہم جانتے ہیں کہ آپ سرمایہ دار لوگ ہیں۔

کھاتے نہیں تو کڑھ کا دیتے ہیں۔ مگر تم کو اب تک ایسا کوئی

پاگل نہیں ٹکرایا ہوگا جو سب کچھ جانتے ہو جیسے بھی آپ کی

بات ٹھکرارہا ہے۔ ہم خدا پرشاکر رہنے والے آدمی ہیں۔ تم

جو کر سکتے ہو وہ کر لیتا۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔“

شرما جی غصے سے بولے۔ ”ہاں چلے جاتے ہیں مگر تو

یاد رکھنا۔ میرا نام کھ رام شرما ہے۔ میں دولت رام نہیں

ہوں جو تم پر دیا کروں گا۔ میں پھر آؤں گا، آؤ دولت رام۔“

اور دونوں غصے میں منہ سے جھاگ اڑاتے دروازے کے

باہر آ گئے۔

باہر آ کر دولت رام نے کہا۔ ”میں نا کہتا تھا بہت

مگر وہ اپنی جگہ چٹان کی مانند مضبوط رہی۔ وہ کچھ چکی تھی کہ
دولت رام استاد کے پاس نا کا م ہوا ہے۔ اس نے صاف
جواب دے دیا کہ تم نے وعدہ کیا تھا، میرا مطالبہ پورا کرو گے
نہ کر سکتے تو میں کیا کروں۔“

دولت رام دولت کے نشے میں دھت تھے۔ اگر ذرا

بھی ان کا نشہ کمزور ہوتا تو وہ استاد کی بات سمجھ جاتے مگر ان کو

پورا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ سمجھتے تو کس طرح بہت سوچ بچار کے

بعد وہ اپنے دوست کھرام شرما سے ملے اور بولے۔

”یار بڑی سکی ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ شرمائے پوچھا۔

”یار ایک دو کوڑی کی گانے والی قابو نہیں آ رہی

ہے۔“ وہ بولے۔

”شرم کرو یا اس عمر میں طوائف بازی کرتے ہو۔“

شرمائے کہا۔

”پوری بات سن لو، پھر بتاؤ۔“ اور پھر دولت رام نے

پوری کھانسی اور بولے۔ ”اب بتاؤ۔“

”طوائف تو خیر ضدی ہوتی ہی ہے۔ ان کو صرف

اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے مگر یہ دو ٹکے کا استاد کس پر پھول

رہا ہے۔ ارے باجی تو بچنا ہے۔ بجادے تم اس کو رانی نہ

کر سکتے۔“ شرمائے کہا۔

”یار وہ بڑا میٹھا آدمی لگتا ہے۔“ دولت رام نے

جواب دیا۔

”تھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کرنا پڑتی

ہے۔“ شرمائے کہا۔

”تو پھر تم ٹیڑھی انگلی سے ہی نکال دو۔“ دولت رام

بولے۔

”ٹھیک میں چلتا ہوں، تمہارے ساتھ۔“ شرمائے

کہا۔ اور دونوں پھر استاد فضل خان کے گھر پہنچ گئے۔

دروازہ پھر استاد نے ہی کھولا۔ دولت رام کو دوبارہ

دیکھ کر استاد نے ناگواری سے کہا۔ ”میاں تم پھر آ گئے۔ ایک

دفعہ کا کہا کیا نہ کافی تھا۔“ شرما جی آگے بڑھے اور بولے۔

”استاد آپ خفا نہ ہوں۔ یہ ذرا ناٹائی ہیں، میری

”یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ دونوں کو دیکھ لیں گے۔ تم گھر جاؤ۔ چٹا کی ضرورت نہیں ہے۔“

اور شرمائی خوش خوشی واپسی دولت رام کے پاس آگئے اور خوش خبری سنا دی۔ ایک ہفتہ کے بعد خبر آگئی۔ شیریں بانی کی آواز بند ہوگئی ہے۔ اور استاد فضل خان پر فغان کا انکس ہو گیا ہے۔

شرما جی نے یہ خوش خبری دولت رام کو سنائی تو وہ بولے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ گوگل ناتھ تیاڑی نے کام دکھا دیا۔“

”ارے وہ بہت کرو ہے۔ چھوڑے گا نہیں۔“

شرما نے کہا۔

”مال بھی بھر پور لیا ہے اس نے۔ کام تو کرے گا ہی۔ دولت رام بولے۔

”اب تماشا دیکھو ناک رگڑتے آئیں گے دونوں۔“

شرما نے کہا۔

”تم نے تیاڑی کو بتا تو دیا تھا کہ مارنا کسی کو نہیں ہے، ہماری ضد تو یہ ہے کہ یہ گانا آکر گائیں گے۔“ دولت رام نے کہا۔

”ہاں ہاں خوب اچھی طرح بتا دیا تھا۔“ شرما نے جواب دیا۔

شیریں بانی نے اپنا علاج کرانا شروع کر دیا تھا۔ مگر کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی ڈاکٹر، حکیم یہ پتہ ہی نہیں کر سکے تھے کہ آواز بند ہونے کی وجہ کیا ہے مگر شیریں بانی کے پاس پیسہ تھا تو وہ اپنی بیماری پر خوب خرچ کر رہی تھی۔ ادھر میرٹھ میں استاد اکڑے ہوئے بدن کے ساتھ اکیلے ٹھہرے پڑے تھے۔ ان کے شاگرد ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور علاج بھی کر رہے تھے۔ مگر حالات جوں کے توں تھے۔

اور پھر ایک آدمی انبالے سے میرے پاس آیا۔ اس کے پاس شیریں بانی کا خط تھا۔ اس خط میں شیریں بانی نے اپنی حیرت انگیز بیماری کے ساتھ ساتھ شرم اور دولت رام کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا تھا اور ساتھ ساتھ میرٹھ میں استاد کی

ٹیزھا آدمی ہے۔“

”تو پھر ہم بھی کم ٹیزھے نہیں ہیں۔ اس کا تو میں ایسا حشر کروں گا کہ مرنے کی دعا میں مانگے گا اور مرے گا نہیں۔ اس کو اب تک کوئی دھتک کا آدمی نکرایا نہیں ہے۔“ اور دونوں سیدھے شیریں بانی کے پاس پہنچے اور تو جاتے ہی دولت رام نے کہا۔

”وہ تیرا استاد تو پاگل ہو گیا ہے۔ پوری بات سنتا ہی نہیں اور جواب دے دیتا ہے۔ اب تو بتا تیرا کیا ارادہ ہے تو اس کے بنا گائے گی کہ نہیں۔“

شیریں بانی اس کے انداز گفتگو سن کر بھٹائی اور بولی۔ ”آپ نے تو ادب و آداب بھی کنارے کر دیا۔ میں ایسے لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی جن کو گفتگو کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو۔“

”تو دو کوڑی کی گانے والی عورت ہم کو سلیقہ سکھائے گی۔“ شرما نے غصے سے کہا۔

”اپنی جگہ پتھر بھی بھاری ہوتا ہے۔ میں تو پھر ایک انسان ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ آپ مجھے زبردستی کسی کام کو نہیں کہہ سکتے۔ میں ہرگز نہیں کاؤں گی۔ آپ جاسکتے ہیں۔ اگر آگے کچھ بات کی تو یہ نہ سمجھنا کہ میں عورت ہوں۔ ہمارے بھی ہاتھ پیر ہیں۔“ شیریں بانی نے جواب دیا۔

”اور وہی ہاتھ پیر ہم باندھ دیں گے۔ آؤ دولت رام یہ دوسری ہی زبان سمجھتے ہیں۔“

باہر آکر شرمائی بولے۔ ”دولت رام تم گھر جاؤ میں ان دونوں کا بندوبست کرنے کا شی جاؤں گا۔ وہاں پر میرے ایک متر ہیں۔ ان کے بہت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہی ان کا علاج کریں گے۔“

اور شرمائی کا شی روانہ ہو گئے۔

نریش کمار ان کے دوست تھے۔ وہ ان سے ملے اور پوری کہانی ان کو سنا دی اور پھر نریش کمار ان کو لے کر ایک بہت بڑے آشرم میں گئے اور یہاں پر وہ دونوں جس آدمی سے ملے۔ اس کا نام پنڈت گوگل ناتھ تیاڑی تھا۔ تیاڑی نے پوری بات سن کر کہا۔

خیریت بھی پتہ کرنے کو کہا تھا۔ عورت بہت دور اندیش تھی۔ اس نے جو اندازہ کیا تھا، لکھ دیا تھا۔

میں نے رولو کا سے مشورہ کیا تو وہ بولا۔ ”تو پھر آپ ایسا کریں، میرٹھ چلے جائیں اور استاد کو دیکھیں۔ میں شیریں بانی کی طرف جاتا ہوں۔ اگر حالات آپ کے قابو سے باہر ہوں تو آپ استاد کو لے کر انبالہ آجائیں شیریں بانی کے پاس۔“ اور میں میرٹھ روانہ ہو گیا۔

رولو کا انبالہ شیریں بانی کی طرف روانہ ہوا۔ شیریں بانی کا مکان تلاش کرنے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ سات آٹھ دنوں میں ہی شیریں بانی مرجھا گئی تھی۔ کونسلہ کی طرح کوئی شیریں بانی خاص تھی۔ رولو کا اس کے قریب گیا تو اس نے اشارے سے بتایا کہ میں بول نہیں سکتی۔

رولو کا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن میں ایک جھٹکا لگا۔ رولو کا نے کہا۔ ”خود سے باہر آئے گا یا پکڑ کر باہر کروں۔“

شیریں بانی نے حیرت سے رولو کا کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ رولو کا پھر بولا۔ ”میں باہر کروں گا تو مارا جائے گا۔ جواب دے۔“

مگر خاموشی رہی تو رولو کا نے کہا۔ ”کوئی ایک آئے کی روٹی لے آئے، آٹا بس ایک روٹی کا ہو۔“

کچھ ہی دیر میں ایک عورت نے ایک گول گیند کی شکل کی روٹی آٹا رولو کا پکڑادی۔ اور رولو کا نے وہ روٹی لے کر گولا کی میں پھیلائی، جس طرح روٹی پکانے کو پھیلاتے ہیں اور اس کو شیریں بانی کے منہ اور ناک پر رکھ دیا۔ جس وقت اس کو رکھا گیا تھا۔ آٹا سفید تھا۔ رولو کا نے سختی کے ساتھ آٹے کو دبائے رکھا اور پھر سب نے دیکھا کہ آٹے کا رنگ بدلتا شروع ہو گیا۔ آٹا پہلے پیلا ہوا۔ پھر نیلا نظر آنے لگا اور پھر کالا ہونے لگا۔

اور پھر سب نے حیرت سے دیکھا کہ آٹا کونسلے کی طرح کالا ہو گیا اور اس کا لے آٹے کو رولو کا نے منہ اور ناک پر سے ہٹا کر اپنی ایڑی کے نیچے دبایا اور پھر شیریں بانی کو مخاطب کر کے کہا۔

”بیمار میرے پیروں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ تم ٹھیک ہو، بولو۔“ شیریں بانی نے منہ کھولا اور اپنی آواز سن کر خوشی کے مارے وہ اچھل پڑی۔

”تم اب ٹھیک ہو اور اس نے جھک کر وہ کالا آٹا ہاتھ میں اٹھالیا۔ اس کو گول گیند نما بنادیا اور کہا۔ ”تمہارا چوہا جل رہا ہے۔“

ایک نوکرانی نما عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”جل رہا ہے، حضور کیا حکم ہے۔“

”مجھے وہاں لے چلو۔“ اور رولو کا اس کے ساتھ باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی۔ ”بچاؤ، ارے جل گیا۔ ارے گورو بچاؤ۔“ کی آوازیں آنے لگیں اور ایک کالے دھوئیں کا پادل آسمان کی طرف اڑ گیا اور رولو کا واپس آ گیا اور بولا۔

”بانی جی آپ اب ٹھیک ہیں۔ کسی نے جادو سے آپ کی آواز پکڑ لی تھی۔ میں نے اس پکڑنے والے کو جلا دیا ہے۔ اب آپ یہ بتائیں استاد کا آپ نے ذکر کیا تھا، وہ کیا تھا۔“ شیریں بانی بولی۔

”میر اور استاد کا دشمن ایک ہی ہے۔ میری آواز بند ہوئی تو مجھے یہ خیال آیا کہ شاید استاد پر بھی کوئی آفت نہ ڈوٹی ہو، اس لئے میں نے خط میں لکھ دیا تھا۔“

”حکیم صاحب میرٹھ گئے ہیں۔ اگر حالات ایسے ہی ہوئے جیسے یہاں پر تھے تو وہ استاد کو لے کر یہاں آئیں گے۔“ اور واقعی یہ ہوا کہ شام کو ہی میں استاد کو لے کر شیریں بانی کے گھر پہنچ گیا۔ استاد کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میں ہر قسم کا علاج کر چکا تھا مگر فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔

رولو کا نے استاد کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”اب تو بھی باہر آجاتے یا رکا لے بند کو بیڑہ غرق ہو گیا، باہر نہیں آئے گی تو تو بھی جلا دی جائے گی۔“ مگر کچھ نہ ہوا تو پھر رولو کا نے کہا۔ ”آخری بار پوچھتا ہوں۔“

اور پھر سب نے دیکھا کہ استاد کے بدن سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔ وہ دھواں پیلے رنگ کا تھا۔ وہ سارا دھواں ایک کونے میں جمع ہو گیا۔ استاد نے آنکھیں کھول دیں۔

”اور ہمارا دشمن ایک ہی تھا یا ہے۔ اس نے ہی یہ کام دکھایا ہوگا۔“ استاد نے کہا۔

رولوکانے کہا۔ ”ابھی دشمن موجود ہے اور گھاؤ کھایا ہوا ہے۔ وہ کسی وقت بھی انبالہ آ سکتا ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں سے کہوں گا کہ آپ سب کچھ عرصہ کے لئے کسی اور جگہ چلے جائیں کیونکہ یہ جگہ گھنی آبادی میں ہے۔ وہ تو دشمن ہے اور گھائل ہے۔ وہ کسی بات کا خیال نہیں کرے گا۔ کوئی بھی لیٹ میں آ سکتا ہے۔ میں اکیلا ہوں گا تو مجھے کسی طرف کی فکر نہیں ہوگی۔“

اور سب لوگ شام سے پہلے ہی دوسرے مکان میں چلے گئے۔ شیریں بانی کے مکان پر صرف اکیلا رولوکارہ گیا۔ رولوکا کسی کو بھی خطرے میں نہیں ڈالتا تھا۔

رولوکا مکان میں اکیلا تھا۔ دروازے پر تالہ پڑا ہوا تھا اور رولوکا کے ہر کارے مکان کے چاروں طرف گردش میں تھے۔ باہر کی پوری خبر رولوکا کو تھی۔ تیسری رات تیزاڑی آ گیا۔ دروازے پر تالہ پڑا تھا۔ اس کے اشارے پر اس کے کسی بیر نے تالے پر زور آزمائی کرنا چاہی، تالا ایک دھماکہ سے پھٹ گیا۔ یہ واقعہ اتنا اچانک اور اتنا زوردار ہوا کہ تیزاڑی بھی حیران رہ گیا اور وہ بیر جس نے زور آزمائی کی تھی۔ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ رولوکا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر نہیں تھا۔ وہ باہر ہی موجود تھا۔

تیزاڑی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا استقبال اس طرح ہوگا۔ وہ تو اپنی طاقت کے نشے میں دوڑا چلا آیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا پڑا تھا اور اندر ناچ گانا ہو رہا تھا۔

شیریں بانی کا رہی گھی اور تماشا بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ حیرت سے دیکھتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی سامنے کا منظر بھی بدل گیا اور کمرہ خالی نظر آنے لگا۔ تیزاڑی نے آنکھ مل کر پھر دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ تو وہ زور سے بولا۔ ”چوٹ کر گیا، دھوکا دے گیا۔ ارے یہ کون کمال دکھایا۔ یہ تو سڑک کے کنارے

تماشے دکھانے والے بھی کر لیتے ہیں۔“

”اچھا تو نے اچھی بات بتائی۔“ رولوکانے کہا تو وہ

”اب تو بتاؤ اس کے کہنے پر آئی تھی اور تو کون ہے۔“
کونے سے آواز آئی۔ ”میں پہلی بندی ہوں میرا گھر والا کالے بندو شیریں بانی کے اوپر تھا۔ اور ہم کو گرو تیزاڑی نے لگایا تھا۔“

”تو تم ان کو مارنا چاہتے تھے۔“ رولوکانے پوچھا۔
”نہیں یہ حکم نہیں تھا۔“ آواز آئی۔

”تیزاڑی کہاں ہے۔ کیا اس کو پتہ ہے کہ تم دونوں پکڑے گئے ہو۔“ رولوکانے پوچھا۔

”میں بتاؤں گی جا کر تو پتہ چلے گا میں نے وہی کیا ہے جتنا حکم تھا۔ مجھے جانے دے۔“

”تیسرا گھر والا مر گیا تو جی کر کیا کرے گی۔“ رولوکا نے کہا۔

”میرا قصور کیا ہے یہ تو بتا۔“ وہ بولی۔
”تو نے اس آدمی کو اتنے دن مغلوب کر کے رکھا۔ اندرونی طور پر یہ کسی قدر کمزور ہو گیا۔ ذہنی طور پر برباد ہو گیا اور تو کہتی ہے کہ میں نردوش ہوں۔ میں تیرے ناک کان کاٹ کر تیرے گرو کے پاس پہنچاؤں گا اور گرو کو بتا دینا میں یہاں پر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر کچھ ملے ہے تو آجائے۔“

اور پھر کسی عورت کے بین کرنے کی آوازیں آئی۔
رولوکا کے کسی ہر کارے نے رولوکا کا کہا پورا کر دیا تھا اور عورت کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔

استاد فضل آنکھیں کھولے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شیریں بانی نے کہا۔ ”استاد نئی زندگی مبارک ہو۔ یہ سب ان دونوں مہربانوں کا کیا ہوا ہے۔“
”مگر میں یہاں کس طرح آ گیا۔“ وہ بولے۔

”قبلہ آپ گاڑی سے آئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ ہوش میں نہیں تھے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ میں طویل عرصہ سے بیدار ہوا ہوں۔“ استاد نے کہا۔

”نور میں بھی پورے پندرہ دن کے بعد بات کر رہی ہوں، میری تو آواز ہی بندھی۔“ شیریں بانی نے کہا۔

حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

رولوکا پھر بولا۔ ”سڑک چھاپ تماشے والے یہ بھی کرتے ہیں کیا۔“

”سائے آج تو پھر پوچھوں۔“ تیواڑی غصے سے بولا۔

”تیری دویا کہاں گئی۔ کیا آدمیوں کو کشت دینے کی ہے۔ اب تجھے کشت بھوگنا ہے اس کا تجھے پتہ ہے۔“

”مرگئے مجھے کشت دینے والے۔ تو نے اب تک تیواڑی کو نہیں پہچانا۔ جادوگری میں گیارہویں درجے کا ہوں

میں۔ میرے پاس بڑی ہلکتی ہے۔ ایک اوپر ستر بجلی دے چکا ہوں۔ تو میرا کیا بگاڑے گا تو میری گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔“

تیواری غرور سے بولا۔

”تو نے اپنی ہلکتی کے زور میں ایک غلطی کر ڈالی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”ہلکتی کے آگے کیا ہے وہ سب دھان بائیں سیر ہیں۔ تو میرا کیا بگاڑے گا۔“ وہ بولا۔

”بتلائے دیتا ہوں تیری غلطی، تو نے بہت کم دیکھے ہوں گے میرے جیسے کہ تو دشمن بن کر آیا ہے اور میں تجھے

تیری کمزوری بتا رہا ہوں۔ اس دروازے کے اندر آتے ہی تیرے سارے سیر باہر رہ گئے کیونکہ وہ اندر آئی نہیں سکتے

تھے۔ صرف تجھے اندر آنے کی اجازت تھی۔ اب تو ان کو بلائے گا تو بھی وہ نہیں آئیں گے۔ کیونکہ میں قلعہ بند ہوں

اور تو کھلی جگہ پر کھڑا ہے۔ یہ تو تو جانتا ہی ہوگا کہ کھلے میدان میں جنگ کرنے والا زیادہ نقصان اٹھاتا ہے۔ بات تیری

سمجھ میں آگئی ہے تو بول اگر کچھ کرتب دکھانا چاہتا ہے تو وہ بھی دکھا دے۔“

”میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میرے سیر ہر جگہ آجاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”تو پھر دیر مت کر۔ تیرا وقت ختم ہونے کو ہے۔“ رولوکا نے نفیاتی داد مارا۔

اور تیواڑی نے متر بہ متر شروع کر دیا۔ پھر اس نے بہت ہاتھ پیروں کو جھکا منہ سے بھینک آوازیں بھی نکالیں

مگر کچھ نہ ہوا۔ تو وہ بولا۔ ”تو پھر تو یوں بول کہ مجھے تو نے قید کر لیا ہے اور سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ یہ تو کوئی بہادری نہیں ہے۔“

”تیرے دھرم میں بہادری دھوکے اور فریب کا نام ہے۔ میں نے تو تجھے سب پہلے ہی بتا دیا ہے۔“

”پھر بھی میں تو دھوکے میں پھنس گیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”یہ دھوکا میں نے نہیں تیرے اعتماد نے دیا ہے۔ تیری ہلکتی نے دیا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”تو پھر اب بتا تو نے مجھے کیوں باندھا ہے۔“ تیواڑی نے پوچھا۔

”پہلے تو بتا تو نے استاد پر حملہ کیوں کیا تھا اور شیریں بانی کو کیوں پریشان کیا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”مجھے یہ کام کرنے کا کہا گیا تھا اور میں نے اس کام کے بدلے رقم لی تھی۔“ تیواڑی نے جواب دیا۔

”تو نے چند روپوں کے بدلے دو بے گناہ انسانوں کو عذاب میں ڈال دیا۔ تجھے ذرا ان کی تکلیف کا خیال نہیں

آیا۔ کمزوروں پر تجھے ایسا ظلم کرتے ذرا شرم نہیں آئی۔ اب تو خالی دھول میرے سامنے کھڑا ہے۔ تو کمزور ہے تیرے

سارے کبوتر باہر کھڑے پڑ پڑا رہے ہیں۔ بول تو میں تجھ پر وہی ڈال کر کتوں کو چھوڑ دوں۔ بول تو تجھ پر آدم خور

جو خوشیاں دوڑا دوں۔ تیری گیارہویں درجے کی رام لیلیا سب دھری کی دھری رہ جائے گی۔ تو نے آخر یہ کیوں

کیا۔“ رولوکا نے پھر پوچھا۔

”دولت رام کڑا اچھے والے جو سہارنپور کے ہیں اور ان کے ایک متر نے یہ کام کرنے کو کہا تھا اور رقم دی تھی۔“

”دولت رام اور اس کے متر ٹھیک ہے تو اسی کمرے میں قید ہے۔ میں ان کو بلاتا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا، میں

نے تجھے کچھ وقت بکھ کرنے کو دیا تھا۔ وہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب تو کسی قسم کی کوئی کوشش مت کرنا۔ اگر کرے گا تو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں تجھے ابھی کوئی نقصان

پہنچانا نہیں چاہتا۔ زیادہ ہوشیاری کبھی کبھی گلے میں پھانسی بن جاتی ہے۔ تیرے چاروں طرف پہرے ہیں۔ تیری ایک ایک حرکت ریکارڈ پر آرہی ہے۔“ اور رولوکا سہارنپور روانہ ہو گیا۔

وہ سیدھا دولت رام کے بنگلے میں پہنچا اور دولت رام سے بولا۔ ”تمہارا ایک دوست کھرم رام شرما ہے وہ کہاں ہے۔“

”تم کون ہو اور منہ اٹھا کر اندر آگئے۔ ارے میں کوئی شرما کا سکریشری ہوں کہ بتاؤں وہ کہاں ہے۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔“ دولت رام بھڑک کر بولا۔

”زیادہ گرمی اچھی نہیں ہوتی دولت رام، مانا کہ دولت میں بہت گرمی ہے مگر ایسا نہ ہو کہ وہی گرمی تم کو جلاڈالے۔ شرما کو بلاؤں تو میں بلاؤں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”ارے کیا ہوائی باتیں کرتے ہو، کیا بھنگ پی کے آئے ہو۔“ وہ بولا۔

رولوکا نے اس سے کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔“ رولوکا کا انداز ہی اور تھا۔ وہ یہ حکم سننے ہی خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر رولوکا نے کہا۔ ”شرما کے پاس چلو۔ وہ چل پڑا۔“

اب وہ رولوکا کے اشارے پر چل رہا تھا۔ شرما گھر پر تھا۔ اس نے دولت رام اور اس کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھا تو بولا۔

”ارے سیٹھ کیا بات ہے، خبر تو ہے۔“

دولت رام بولا۔ ”مجھے کیا پتہ میں تو اس کے حکم پر آیا ہوں۔“

”اور یہ کون لاکھ صاحب ہیں جو تم پر حکم چلا رہے ہیں۔“ شرما نے کہا۔

”اپنی بے ہودہ زبان کو قابو کر اور میرے ساتھ چل۔“ رولوکا نے کہا۔

”واہ بھئی واہ۔ یہ خوب رہی کیوں تمہارے ساتھ چلوں۔“ وہ نکبہ کر بولا۔

”عزت کی زبان تم کو پسند نہیں ہے شاید تو پھر سن خاموشی سے میرے ساتھ چل۔“ تجھے انبالہ جانا ہے۔ وہاں پر

تیرا ایک رشتہ دار تیرا انتظار کر رہا ہے ساری تیزی ختم۔“ رولوکا نے کہا۔ اور دونوں پانٹو کتے کی طرح ساتھ ہوئے۔ انبالہ آتے آتے شام ہو گئی۔

شیریں بائی کا بالا خانہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رولوکا نے دیکھا۔ اس کے ہرکارے اپنی اپنی جگہ موجود تھے اور دروازہ بند تھا۔ وہ جیسے ہی دروازے پر پہنچا تو دروازہ کھل گیا اور وہ ان دونوں کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں نے دیکھا تو تیزواڑی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اندر آتے ہی رولوکا روپوش ہو گیا تھا۔ اب صرف وہ تین ہی نظر آتے تھے۔ دونوں کے حواس بھی واپس آچکے تھے۔

شرما نے حیرت سے تیزواڑی کو دیکھا۔ اس کمرے کو دیکھا اور بولا۔ ”دولت رام ہم کہاں ہیں اور یہ سانسے تیزواڑی جی بیٹھے ہیں کیا۔ ان کو کیا ہوا ہے؟“

دولت رام بھی ہوش میں آ گیا تھا بولا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ تیزواڑی جی ہی لگتے ہیں۔“ وہ ان کے قریب چلا گیا اور بولا۔

”مرد جی کچھ ہماری طرف بھی نظر کرو۔“

تیزواڑی نے دولت رام کو دیکھا اور غصے سے بولا۔

”ارے تم دونوں نے مروادیا میرے ساتھ دھوکا کر دیا، تم دونوں نے مجھے پتھر سے ٹکرا دیا۔ میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”ہم نے کیا دھوکا کیا ہے۔“ شرما نے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ دونوں کو باندھو۔ میں نے کر دیا۔ ارے ان کی پیٹھ کتنی مضبوط تھی۔ تم نے نہیں بتایا میں بھی دھوکے میں مارا گیا۔ میری ساری محنت ساری شہرتی دروازے کے باہر رہ گئی اور میں اکیلا یہاں قید ہوں۔ ارے بتا دیجئے تو اس بکٹ سے کیوں ٹکراتا اور اگر ٹکراتا تو بندوبست کرتا میں تو فریب میں آ گیا اور تم نے وہ فریب کیا ہے میرے ساتھ۔ تم دونوں بھی اسی کے آدمی ہو۔“ تیزواڑی نے کہا۔

”وہ کون ہے تم اس سے ملے ہو۔“ شرما نے پوچھا۔

”آواز سنی ہے بس۔“ تیواڑی نے کہا۔
 ”جو ہم کو لایا ہے۔ کہیں وہی نا ہو۔ مگر آتے ہی وہ غائب ہو گیا ہے۔“

میں ساری باتیں سن رہا تھا۔ اب بولنا ضروری تھا۔
 ”لانے والے کا کام ختم ہو گیا، وہ چلا گیا۔ تم تینوں نے بے گناہ لوگوں کو عذاب میں ڈالا تھا۔ صرف اپنی خوشی کی خاطر، صرف اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر تمہارے دماغ پر دولت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ تم انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ تم کو احساس نہیں ہے۔ اب تم تینوں احساس کرو گے تم تینوں زندہ رہو گے مگر جانوروں کی طرح تم نے استاد کو پانچ کر دیا تھا۔ تم بھی فالج کے مریض ہو، تم نے شیریں بالی کو گونگا کر دیا تھا۔ تم بھی گونگے ہو۔“ اور پھر رولو کا کے کارندے ان کو اٹھا کر ان کے گھر چھوڑ آئے۔

☆.....☆.....☆

انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ اس میں ہر طرح کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی کبھی اس کے اندر خود غرضی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو صرف اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لئے سب کا نقصان کرنے پر تیار نظر آتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک اور جذبہ غالب آ جاتا ہے اور اس کو اپنی ذات سے کچھ غرض ہی نہیں رہتی اور یہی جذبہ اپنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ کوئی اس کو غرض مند نہ سمجھ لے۔ یہاں سے خدمت کا آغاز ہوتا ہے اور انسان کا گراف اوپر ہوتا جاتا ہے۔ اگر کسی کی رہبری مل جائے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوتی ہے۔ ہر برائی کو ہلاک کرنے کے لئے سچ کا زہر پینا لازمی ہوتا ہے۔ سچائی دکھ تو دیتی ہے۔ آگ کے دیواؤں سے گزارتی ہے۔ مگر ایک دائمی مسرت بھی اس سے ہی ملتی ہے اور پھر معراج انسانیت اسی راہ میں ملتی ہے۔ ”رولو کا نے کہا۔“

”تمہارا تجربہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ ہر برائی اتنی آسان کیوں ہوتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”برائی آسان بھی ہوتی ہے اور بھلتی پھرتی بھی نظر آتی ہے۔ انسان اس کی طرف بڑی آسانی سے راغب

ہو جاتا ہے اور اس کو وہ حاصل بھی کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے آسانیاں پیدا کرنے والی ایک بڑی طاقتور ہستی دنیا میں موجود ہے اور وہ ہے شیطان۔ انسان اگر اچھا نیوں کی طرف سفر کرتا ہے تو یہ روٹے اگاتا ہے۔ اس کو راہ سے بھٹکا کر اپنی طرف لانا چاہتا ہے۔ مجرورہ مراعات دیتا ہے اور اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔ مگر پھر بھی ناکام رہتا ہے۔ ”رولو کا نے جواب دیا۔“
 ”یہ تو درست ہے کہ شیطان کا مہیاب کبھی نہیں ہوتا تو ہر دفعہ ناکامی اس کو ملتی ہے مگر پھر بھی لاکھوں سال سے وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ اس کی سزا ہی ہے۔ وہ انسانوں کو بھٹکانے کی کوشش کرتا رہے اور منہ کی کھاتا رہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

اچانک ایک مریض کے آنے سے ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مریض کے ساتھ دو آدمی تھے اور مریض ایک عورت تھی جو جوان عورت۔

ساتھ آنے والوں نے بتایا۔ ”یہ ایک ہفتہ سے بے ہوش ہے۔“ ان دو میں ایک اس کا بھائی تھا اور اس کا نام گوہر لال تھا۔ دوسرا وکرم ملہوڑا تھا۔ یہ اس کا شوہر تھا۔ یہ لوگ ریواڑی سے آئے تھے۔ ملہوڑا نے بتایا۔ ”ایک ہفتہ پہلے ہم لوگ ایک تقریب میں گئے تھے۔ وہاں پر رات ہو گئی۔ ہم دونوں سیان پھو کی عطاہ ہمارے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ ہمارا ذاتی تانگہ ہے۔

رات ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ یہ جگہ ریواڑی سے پانچ کوس پر ہے۔ اس کا نام ہنومان تلپ ہے۔ سڑک خراب ہے۔ زیادہ تیز یہاں گھوڑا دوڑ نہیں سکتا۔ ہم دونوں باتیں کرتے سفر کر رہے تھے۔ گھوڑا بھی اسی سڑک پر جتنی تیز چل سکتا تھا، چل رہا تھا۔ اندھیری رات نہیں تھی، ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک دور تک نظر آ رہی تھی۔

اچانک گھوڑے کی چال میں فرق آیا اور گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ یہ گھوڑا میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ میری آواز پر چلتا تھا۔ اس طرح

ہو، انسان اپنے احساسات اور اپنی سرگرمیوں میں خود مختار ہوتا ہے تم بھی خود مختار ہو۔ تم کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ تم ایک ناول جس اور دماغ کی مالک ہو۔ تمہارے جسم کے ہر اعضاء اپنا کام پوری طرح انجام دے رہے ہیں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ بات کرو۔ کیونکہ تم بات کر سکتی ہو۔“

اور پھر سب نے حیرت سے سنا کہ اس نے اپنے بچی کو پکارا۔ ”وکر م میں بول سکتی ہوں۔“
وکر م آگے بڑھا اور خوشی سے بولا۔ ”تم اب ٹھیک ہو۔“

”ہاں اب میں ٹھیک ہوں۔ میرے اندر ایک شکتی سی آگئی ہے۔“ ساوتری نے جواب دیا۔
”ان کو صرف اتنے ہی علاج کی ضرورت تھی۔ یہ اب ٹھیک ہیں۔“

”میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ آپ نے تو نہ دوا دی، نہ کچھ اور کیا اور یہ بول پڑیں۔ چپکار کا تو کوئی مول نہیں ہوتا۔“ لمہوترا امنونیت بھری آواز میں بولا۔

”میں اس کو اپنے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ خدمت صرف خدمت ہوتی ہے۔ معاوضہ نہیں ہوتا۔ مگر ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے۔ میں آپ کے پاس آؤں گا، پھر کام پورا ہوگا۔“

”میری سمجھ میں کچھ آیا نہیں۔“ وکر م نے کہا۔
”ریواڑی آنے پر بتاؤں گا۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔“ رولوکا نے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے رولوکا سے پوچھا۔
”معاملہ کیا ہے؟“ رولوکا نے مسکرا کر کہا۔

”دینی پرانا چکر ہے۔ کبھی کبھی پراسرار روحمیں اور خاص طور پر گندی اور بھٹی ہوئی روحمیں اپنا سحر سینے نضاؤں میں گردش کرتی ہیں اور بعض تو اپنا ایک مقام بتا لیتی ہیں اور وہاں پر ہی گردش کرتی ہیں۔ اس مقام کے بنانے کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں کہ جن بھوت پریت کا وجود ہے۔ لیکن ان کا وجود ایک دائرے کے اندر رہتا ہے۔ مگر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی روح بھولوں کو

کیوں کھڑا ہو گیا۔ میں نے تو رکسے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ سامنے سڑک پر نظر ڈالی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے پھر گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کیا مگر اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ گھوڑا خطرہوں کو پہچان لیتا ہے۔

دور دور کی آبادی کا پتہ نہ تھا۔ رات کا وقت سڑک سنسان پڑی تھی۔ جھینگروں کے بولنے کی آواز ڈرائے دے رہی تھی۔ گھوڑا ایک قدم بھی آگے بڑھانے پر تیار نہ تھا۔ سڑک کے کنارے لگے درخت اور ان کے سامنے ڈراؤنی شکلیں بنا رہے تھے۔ میری پیوی ساوتری کی خوف کے مارے آواز بند ہو گئی تھی اور وہ ہر قطر کان پر رہی تھی۔ میری بھی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میرے پاس بچاؤ کے لئے کچھ نہیں تھا۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ سڑک پر ایک سایہ نظر آیا۔ گھوڑا گھبرا کر دو پہروں پر کھڑا ہو گیا اور پھر پلٹ کر دوبارہ اس کا رخ منہ ہنومان تلیہ گاؤں کی طرف ہو گیا اور ایسا سر پٹ دوڑا کہ تانگہ اچھلنے لگا۔ ہم لوگ بڑی مشکل سے اس پر بیٹھ پائے۔ گھوڑا، ہنومان تلیہ کی آبادی میں آ کر ہی رکا۔..... ہم نے رات وہاں گزاری اور سویرے گھر آئے۔ اسی راستے سے مگرون میں سواریاں چل رہی تھیں۔ اس لئے کچھ نہ ہوا۔ ساوتری اسی رات سے ایسی ڈری ہے کہ آواز بند ہو گئی ہے۔ خاموش گم مہم ڈری ڈری رہتی ہے۔ ریواڑی میں علاج کروایا، کسی نے آپ کا پتہ دیا تو آپ کے پاس آئے ہیں۔“
”حد سے زیادہ بڑھا ہوا خوف انسان کے جسم کو متاثر کرتا ہے اور بعض اوقات یہی حد سے زیادہ بڑھا ہوا خوف انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو ان کا خوف تو ختم ہو جائے گا۔“

پھر رولوکا ساوتری سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ”تم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک ہوائی خود ذاتی کمزور اور بے آسرا تھی کہ گرم گرم لوگ وہیں پر کھڑے رہتے تو وہ خود بخود بھاگ جاتی۔ انسان سے زیادہ طاقتور اور عقل مند کوئی مخلوق نہیں ہے۔ میں اس کو تمہارے سامنے پیش کر دوں گا تو تم اس کو دیکھ کر ہنسو گی۔ یہ صرف دھوکا ہے۔ حیات انسانی کا دھوکا۔ تم ایک انسان

”آپ چلیں گے تو اور اچھا ہوگا۔ آپ کے تجربے میں اضافہ ہوگا۔“ رولوکا بولا۔ اور تین دن کے بعد ہم ریواڑی روانہ ہو گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وکرم نے فوراً ہمارے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ صبح اس نے ہمارے ناشتہ کا بندوبست ایک مسلمان گھرانے سے کرا دیا۔ آدھی بجھ رہا تھا۔ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

ناشتہ کے بعد رولوکا نے کہا۔ ”اگر آپ کو فرصت ہو تو ہمیں وہ جگہ دکھائیں جہاں پر یہ واقعہ ہوا تھا۔“ اور وکرم نے فوراً تانگہ تیار کر دیا اور ہم تینوں ہنومان تلپہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

دن کا وقت تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی اس سڑک پر زیادہ تر بیل گاڑیاں چلتی تھیں۔ ایک دو تانگے بھی نظر آ گئے۔ کوئی کوئی سائیکل سوار بھی جاتا نظر آ جاتا تھا۔ سڑک کے کنارے در در جانور اور غنیم کے درخت کھڑے تھے۔ گھوڑا بڑے سکون سے ست چال چلا آگے بڑھ رہا تھا۔ کوئی تین کوس کے بعد وکرم نے کہا۔ ”ہاں یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تانگہ کھڑا ہو گیا۔“

سڑک سے ذرا فاصلے پر ایک بہت پرانا اہلی کا درخت کھڑا تھا۔ یہاں پر بھی سڑک نہایت خستہ حالت میں تھی۔ رولوکا تانگے سے اتر گیا اور اہلی کے درخت کی طرف چلا گیا اور پھر اہلی کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اس درخت کے تین چکر لگائے اور واپس ہماری طرف آ گیا۔ اور بولا۔ ”واپس چلو۔“ واپس آنے کے بعد رولوکا نے کہا۔

”گیارہ بجے میں اکیلا جاؤں گا اور پیدل جاؤں گا۔ مجھے سواری کی ضرورت نہیں ہے۔“

وکرم نے تعجب سے کہا۔ ”بہت دور ہے آپ تانگہ لے جائیں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

میں تو سمجھ چکا تھا کہ رولوکا حواری کا محتاج نہیں

راہ دکھاتی ہے۔ انسانوں کی مدد کرتی، میرے خیال میں ایسی روح اپنی زندگی کے گناہوں کا اچھا بیوں کے ذریعہ بدلہ پورا کرتی ہے اور کچھ ناپاک رومنیں زندہ انسانوں کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کو ڈراتی ہیں، ان کو راہ سے بھٹکانی ہیں۔ اس سے ان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مسکن کو ویران رکھنے کو ایسا کرتی ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”یہ چھلا وہ بھی اسی قسم کی روح ہوتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہ بھی بھٹکتی روح ہے۔ یہ رات میں لوگوں تک آتی ہے اور ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ یہ صرف یہی کر سکتی ہے۔ زندہ انسانوں سے زیادہ یہ طاقتور نہیں ہیں۔ مگر چونکہ یہ اپنا چولہ بدلنے پر قادر ہیں۔ اس لئے انسان ان سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان سے ڈرنے کی تو بات کچھ ہے ہی نہیں۔ ڈر اور خوف انسان کے اندر ہوتا ہے اور وہی اس کو متاثر کرتا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مگر اکثر حالات میں لوگ ڈر جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ڈر اس لئے جاتے ہیں کہ عالم ارواح کا ایک الگ مزاج ہے۔ یہاں جاگتے والے سو جاتے ہیں اور سونے والے جاگ جاتے ہیں۔ اس کا تجربہ کرنا اور بیان کرنا بہت مشکل ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اس کے بارے میں تم نے کچھ تو اندازے لگائے ہوں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہماری بہادری اور قوت ارادی یہی ہے کہ اپنے رازوں کو سینے میں چھپا کر رکھیں۔ ہر بات کا جواب دیا جاسکتا ہے مگر ہم اس لکیر کے آگے نہیں جاتے۔ یہ لکیر ہی ہماری بندش ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

اب اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش نہیں تھی۔ ”تو اب تم ریواڑی جاؤ گے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جانا ضروری ہو گیا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میں بھی ساتھ چلوں۔“ میں نے پوچھا۔

ہے۔

بھی ایک زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ میرے جاتے ہی ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ یہ ٹریفک کا حادثہ تھا۔ بلند شہر اور خوبہ کے درمیان ایک پل ہے۔ دریا نے جننا پر درمیان میں ریل چلتی ہے اور پٹری کے دونوں طرف سڑک ہے۔ ایک آنے کو ایک جانے کو بلند شہر کو آنے والی سڑک پر یہ حادثہ ہوا تھا۔ ایک ٹرک جس پر بوریوں لوڈ تھیں۔ عین دریا کے درمیان گر پڑا تھا۔ ڈرائیور اور اس کا ہیلپر زخمی حالت میں اسپتال میں تھے۔ میں فوراً اسپتال پہنچا تو پتہ چلا کہ ہیلپر مر چکا ہے اور ڈرائیور بے ہوش ہے۔

میں نے اپنا بہروپ دلی کے ایک اخباری رپورٹر کا بنایا ہوا تھا۔ میں ڈاکٹروں سے بھی ملا مگر انہوں نے مرلیض کی خستہ حالت کی وجہ سے ملانے سے انکار کر دیا۔ تین دن کے بعد ڈرائیور کچھ ہوش میں آیا تو میں پھر اسپتال گیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈاکٹروں نے مجھے چند منٹ بات کرنے کی اجازت دی۔

ڈرائیور ایک پختہ عمر کا سکھ تھا۔ خیریت پتہ کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”سردار جی یہ حادثہ کیسے ہوا؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے میں نے لہراتے دیکھے تو پھر کہا۔ ”سردار جی ڈرنے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا اور پھر تم نے کیا کیا۔ ہمت کرو، ڈرو نہیں، نہیں بتاؤ گے تو دوسرے بھی مارے جائیں گے۔“

خبر نہیں جی وہ کی شے سی۔ ہونٹ پر ہنسی سی۔ اس دی شکل انی گندی سی کہ بندہ دیکھ سکتا ہی نہیں۔ پورا شیشہ دھندلا گیا سی۔ میری رفتار زیادہ نہیں سی۔ میں بریک مار یا اور گڈی آپ ہی آپ ایک پاسے مڑ گئی اور دریا کے اندر گر گئی۔ مینوں تو اب پتہ چلا ہے کہ میرا کلیئر مارا گیا ہے۔ گڈی دریا میں پٹی ہے۔ بس جی بس انی سی بات ہے وہ کون سی مینوں کوئی پتہ نہیں۔“ مجھے تو صرف یہی پتہ کرنا تھا۔ میں اسپتال سے واپس آ گیا۔ دوسری رات میں نے پل پر گزاری مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے رولو کا ہومان تلپہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ صبح ہی اس کی واپسی ہوگی۔ اس لئے میں سو گیا۔ سویرے رولو کا آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کام ہوا۔“ ”نہیں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔ ”ہوا کیا یہ بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اعلیٰ کا درخت اس کا مسکن ہے۔ میں نے اس کو باندھ دیا تھا۔ وہ اس پر نہیں آیا۔ دور سے بندش کو تار کے فرار ہو گیا۔ وہ اب اس طرف تو آئے گا نہیں مگر کسی بھی جگہ پریشانی کا باعث ہوگا۔ اب اس کو تلاش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔“ رولو کا نے کہا۔ ”وہ ہے کون؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ ایک چملا وہ ہے۔ یہ صرف پھل کپٹ یعنی دھوکا فریب کرتا ہے، ڈراتا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”بھاگ گیا تو جانے دو تلاش کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”چور، چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ وہ باز نہیں آئے گا جہاں جائے گا، لوگوں کو ڈرائے گا۔ ان کے ساتھ فریب کرے گا اور لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔ ”تو پھر تم اس کو تلاش ضرور کرو گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یہ تو میری ڈیوٹی ہے، پوری تو کرتا ہے۔“ رولو کا بولا۔ میں دلی روانہ ہو گیا اور رولو کا آگے چل پڑا۔

”میں کئی شہروں اور دیہاتوں میں چلتا گیا۔ مگر ایسا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔

علی گڑھ میں، میں تین دن رکا۔ خوبہ میں قیام کیا اور پھر بلند شہر پہنچا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ بلند شہر کے بعد اس کو لوٹنا تھا کیونکہ یہی اس کی حد سی۔ اس کے آگے اگر وہ جاسکتا تھا تو پھر ضرور وہ کسی کا آلہ کار تھا۔ بلند شہر

”تو کیا جانے درد تکلیف کیا ہوتی ہے۔ تو تو بے شریر ہے، تیری پکڑ صرف یہی ہے۔“
 ”مجھے جانے دے تیری بستی کرتی ہوں۔ اب کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ بولی۔
 ”یہاں نہیں آئے گی کسی اور جگہ چھل کپٹ کرے گی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ بولی۔
 ”ریواڑی روڈ پر تانگہ کس نے روکا تھا۔ کس نے ڈرایا تھا۔“ میں نے پوچھا۔
 ”وہ خود ہی ڈر گئے۔ میرا گھر بھی چھین لیا۔ میں یہاں آگئی۔“ وہ بولی۔
 ”اور تو نے وہی کام یہاں کیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ گاڑی دریا میں گر گئی۔ یہ الگ نقصان ہوا، تو کہتی ہے۔ میں نے کیا کیا۔“ میں نے کہا۔
 ”اچھا اب کسی کو پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے چھوڑ دے۔“

”تیرا شریر تو ختم ہو چکا اور اتنا کیوں بھٹک رہی ہے تو آخر کیوں اوپر نہیں گئی۔ کچھ نہ کچھ گناہ ہے ضرور تو میری بات اچھی طرح سمجھ لے۔ تجھے اب اس دنیا سے جانا ہے۔ اگر نہ گئی تو تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔ تو کیوں نہیں گئی، کیوں رک گئی، مجھے یہ بتا، شاید میں تیرے کچھ کام آ جاؤں۔“
 ”میں گوبندہ کے کارن نہیں گئی۔ گوبندہ میرا گھر والا تھا۔ ہم ریواڑی میں پر تاب نگر میں رہتے تھے۔ گوبندہ بڑا بڑھیا کارگیر تھا۔ بہت اچھی مورتیاں بناتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ میں مٹی تیار کرتی اور گوبندہ اس مٹی کو مورٹی بنا کر رکھ دیتا۔ پھر وہ ان میں رنگ کرتا اور قدردان ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے۔ مورٹی کا ایک خریدار آیا۔ وہ کوئی ٹھا کر تھا۔ ہم کہہ اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے۔ آتے ہی گوبندہ سے بولا۔

”میں مٹی کی مورٹی کا خریدار نہیں ہوں۔ میں تو اس مورت کا خریدار ہوں۔“ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ بول کیا لے گا۔“ یہ سن کر گوبندہ سنائے میں آگیا اور

ٹریفک بحال کر دیا گیا تھا۔ رات میں ویسے بھی بہت آہستہ اور ہوشیاری سے چلے لوگ گاڑیاں گزارتے ہیں۔ اب تو اور زیادہ احتیاط کر رہے تھے۔ میں پوری طرح چوکھا تھا۔ تین راتیں گزر گئیں، شکار گھاٹ پر نہیں آیا۔ میں بھی ڈور ڈالے موجود رہی۔

چوتھی رات میں نوبے ہی چل کے کنارے موجود تھا۔ دریا پوری رفتار سے بہہ رہا تھا۔ بارشوں کا موسم تھا۔ دریا کا پانی پل پر چھلانگیں مار رہا تھا۔ میں نے دیکھا، کوئی پل کی ریلنگ پر بیٹھا ہے۔ اول تو وہاں پر بیٹھنا ہی آسان نہ تھا۔ دوسرے کون بے وقوف ہوگا جو چڑھے دریا پر اس طرح کی بے وقوفی کرے گا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرا شکار ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا گیا اور اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ وہ اگر بھاگنا بھی چاہے تو نہ بھاگ سکے۔

پھر میں بھی اس کے برابر ریلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کے کان کے پاس منہ کر کے کہا۔ ”بس اب تیرا ٹھیل ختم ہوا۔“ وہ حیرت سے اچھل پڑا مگر میں نے اس کو گرنے نہیں دیا۔ اس کے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ میں نے وہ پکڑ لئے اور ریلنگ سے اتر آیا۔ اس نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اس کو لے کر پل سے بہت دور خوبصورت کی طرف آگیا اور پوچھا۔ ”ہاں بتا تو کون ہے؟“
 وہ خاموش تھا۔ میں نے پھر کہا۔ ”جلدی بتا تو کون ہے۔ نہیں بتائے گا تو اسی جہنم میں دفن کر دوں گا۔“

”میرا نام پدنی ہے۔“
 میں نے پھر اس کو غور سے دیکھا۔ ”اچھا تو ہی ہے جس نے گاڑی دریا میں گرانی تھی۔“
 ”وہ تو خود ہی گر پڑا تھا۔“ وہ بولی۔
 ”تو نے اس کو ڈرایا تھا۔“ میں نے کہا۔
 ”وہ اتنا کسرو، ڈر پوک تھا، میں کیا کروں، میرے بال تو چھوڑ۔“ وہ بولی۔

”چھوڑ دوں گا، مریوں رہی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”کچھ اور پکڑ لے، بال چھوڑ دے، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

غصے سے چیخ کر بولا۔

میں خود چلی جاؤں گی۔“

”میں اگر پتہ کرلوں کہ گوبندہ کے ساتھ کیا ہوا تو تو چلی جائے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پھر میرا یہاں کیا کام رہ جائے گا۔“ وہ بولی۔

”میں تجھے اسی وعدے پر چھوڑ رہا ہوں۔ تو میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ دونوں چٹوٹی گاؤں جائیں گے اور تیرے سامنے ہی سب کچھ ہوگا، اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ میں نے کہا۔

”یہ ایک آتما کا وعدہ ہے۔“ وہ بولی۔

چٹوٹی گاؤں بہت بڑا گاؤں تھا۔ گلیاں بڑی بڑی اور مکانات بھی بکے زیادہ تھے۔ خوش حالی ہر طرف نظر آتی تھی۔ جگہ جگہ کنویں موجود تھے اور ہر گھر کے اندر جانور نظر آتے تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف کھیت تھے۔ گاؤں کے اندر میں اکیلا گیا۔ پدمنی کی آتما کو میں نے ایک درخت پر چڑھا دیا۔ گاؤں کے اندر جاتے ہی میں ایک دیہاتی کے روپ میں آگیا اور ایک آدمی سے پوچھا۔

”بھئیٹھا کر پردیپ سنگھ کا گھر کون سا ہے؟“

اس آدمی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔
”ارے کا باؤلا ہوا ہے جو سب سے بڑھیا گھر دکھے وہی ہے۔
ٹھا کر کا گھر، ارے مورکھ وہ ہی اس گاؤں کے سرخیج ہیں۔“
میں نے مصحویت سے گردن ہلا کر اقرار کیا۔
”معاف کرنا بھئیٹھا آدمی ہوں، پتہ نہیں تھا۔“

وہ آدمی چلا گیا اور میں سب سے اونچا اور اچھا مکان تلاش کرنے لگا۔..... یہ کوئی زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔
میں ایک عالیشان حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔

میرے کھڑے ہوتے ہی ایک آدمی جس کے سر پر بڑی سی پیلی پگڑی تھی، آگیا اور بولا۔ ”یہاں کیوں کھڑا ہے؟“

میں نے ہندوؤں کے رسم کے مطابق ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”ٹھا کر سے بھینٹ کرنا تھی۔“

”کون ٹھا کر نام تو بتا۔“ وہ بولا۔

”ٹھا کر پردیپ سنگھ سے جی۔“ میں نے کہا۔

”ہوش میں بات کر، ٹھا کر یہ میری عزت ہے، تو ٹھا کر ہے تو ہوا کرے۔“

”اور تو بھی ذرا دیکھ بھال کر بول، میں ٹھا کر پردیپ سنگھ ہوں۔ جس چیز پر انگلی رکھ دیتا ہوں، وہ میری ہوتی ہے۔“ ٹھا کر پردیپ نے گرج کر کہا۔

مگر گوبندہ بھی غصے میں تھا بولا۔ ”یہ کوئی مورتی نہیں، زندہ عورت ہے اور میری گھر والی ہے۔ میرے جیتے جی تو اس کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔“ ٹھا کر یہ سن کر آگے بڑھا، مگر گوبندہ ہوشیار تھا۔ اس نے زمین پر بڑی چٹائی ایک جھٹکے سے کھینچ لی، ٹھا کر اس پر بیٹھا۔ ٹھا کر ایک زوردار دھماکے سے زمین پر گرا، وہاں پر پیلے مٹی کا ڈھیر تھا، وہ اس میں لپٹ گیا۔ اوپر سے گوبندہ نے اس پر لکڑی سے حملہ کر دیا۔ ٹھا کر بری طرح پٹ گیا۔ کپڑے خراب ہو گئے۔ سر سے خون بہنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھا، اس کی حالت خراب تھی مگر اکڑ وہی تھی، بولا۔ ”تو نے اپنی سی کر لی، اب میں اپنی سی کروں گا۔ تیری جو رو کو میں لے جاؤں گا اور تیرا حشر میں ایسا کروں گا کہ کسی کہار میں پھر ہمت نہیں ہوگی، کسی ٹھا کر پر ہاتھ اٹھانے کی۔“

اور ٹھیک ایک مہینے کے بعد وہ اپنے چھ سات ساتھیوں کے ساتھ آگیا اور دن دھاڑے ہم دونوں کو باندھ کر اپنے گاؤں چٹوٹی لے گیا۔ چٹوٹی ریواڑی سے دس کوس پر ہے۔ یہ ٹھا کر کا گاؤں ہے۔ دوسرے ذات کے ہندو تو وہاں جاتے ہی نہیں۔

گوبندہ اس گاؤں میں کہاں تھا۔ مجھے نہیں پتہ، میرا یہ حال ہوا کہ شاید کسی دیسیا کا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے پھر اپنے بچے کو نہیں دیکھا۔ میرا شریک تک ساتھ دیتا، آخر ظلم کا انت یہ ہوا کہ میری آتما نے شریک کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں گوبندہ کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ مجھے نہیں ملا۔ گوبندہ مر گیا، زندہ ہے کچھ تو پتہ چلے، میں کب یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ بھٹکتی پھرتی ہوں، مجھ سے ضرور کچھ ہوا ہے۔ میں نادم بھی ہوں، پر میں کیا کروں، گوبندہ کا پتہ چل جائے،

”تم نے ایک بے گناہ عورت پر اتنا ظلم کیا کہ وہ مر گئی۔ اس کے آدمی کو قید کر رکھا ہے۔ تم انسان ہو، تم کو کون انسان کہے گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھا کر تھلا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اشارہ کیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے پھر کہا۔ ”اب تو اپنی زبان بند رکھنا، یہ تیرے بد معاش جو تیرے غلام ہیں، تیرا دیا کھاتے ہیں۔ تیرے خلاف پولیس گے اور حقیقت بتائیں گے تو خاموش رہے گا اور اسی طرح بیٹھا رہے گا۔ تیرے ظلم کا وقت ختم ہو گیا ہے۔“ کرسیوں پر سب خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تم میں سے کس کو پتہ ہے، گو بندہ کہاں ہے۔ جس کو پتہ ہے وہ بتائے۔“ ایک لمبا ترنگا جوان اٹھا اور بولا۔

”وہ حویلی کے تہ خانے میں قید ہے۔“

میں نے پھر پوچھا۔ ”وہ زندہ ہے؟“

جواب ملا۔ ”ہاں زندہ ہے، بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔“

”کمزور ہے۔“

”اس کی عورت کے ساتھ کس کس نے منہ کالا کیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم سب نے ٹھا کر کے حکم پر کیا تھا۔“ وہ بولا۔

”اور ٹھا کرنے کیا کیا تھا؟“

”سب سے پہلے ٹھا کرنے ساری رات اپنے پاس رکھا تھا اور پھر سب کو حکم دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”سن لیا تھا کہ یہ کتنی صفائی سے جی بات بتا رہا ہے۔ تو بھی اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ کچھ کیا ہے تو ان سب نے اپنی مرضی سے کیا ہوگا۔“ ٹھا کر بولا۔

”ٹھا کر مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا بوجھ لوگ ہانکا کرتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے اور تو ہے کہ اور بوجھ بڑھا رہا ہے۔ یہ تیرا گاؤں ہے۔ ہر طرف تیرے آدمی ہیں۔ اس لئے ایسا کر رہا ہے۔ یہ تیری بھول ہے۔ اس کمرے کے اندر بھی تیرے ہی آدمی ہیں۔ یہ کیوں سچ بول رہے ہیں تو

”اچھا ٹھہر جاتا ہوں۔“ اور وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر میں آکر بولا۔ ”آج میرے ساتھ۔“ اور میں اس کے ساتھ بڑے سے دروازے سے اندر چلا گیا۔

اندر بہت رفتی تھی۔ ہر طرف پھول پھولاری لگی تھی اور بہت صاف ستھری اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں پر چش ہوتا رہتا ہے۔ دروازے پر نیا چونا اور رنگ کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں بہت ساری کرسیاں بڑی تھیں اور ایک تخت بھی پڑا تھا۔ تخت پر سفید چاندنی پنچھی ہوئی تھی اور کئی موٹے موٹے گاؤں تکے رکھے تھے۔ ان ہی کے سہارے ایک شخص بیٹھا اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کرسیوں پر بھی چھ سات بہت ٹکڑے اور مونچھوں والے آدمی بیٹھے تھے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہی ہوا تھا کہ وہ بولا۔ ”کون ہے کیوں آیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ٹھا کر صاحب کچھ اکیلے کی بات ہے۔“

وہ بولا۔ ”سب اپنے ہیں بول۔“

”میں دلی سے آیا ہوں۔ سب کے سامنے بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔

”ارے جب میں کہہ رہا ہوں تو اچھا ہی ہوگا۔“ وہ بولا۔

”میں گو بندہ کا پتہ کرنے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”گو بندہ، کون گو بندہ میں کسی گو بندہ کو نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔

”ریوڑی کے پر تباہ مگر محلے کا کبار جس کی عورت کو آپ اور آپ کے آدمی اٹھا کر لے آئے تھے اور پھر آپ نے اس کی عورت کو خراب کر کے مار ڈالا تھا۔ اس عورت کی آتما اپنے پتی کو تلاش کر رہی ہے اور وہ نہیں ملتا۔ وہی گو بندہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور تو کون ہے اس کی کھوج کرنے والا۔ منہ اٹھا کے چلا آیا۔ ارے یہ ہمارا گاؤں ہے۔ ہماری حکومت ہے یہاں، اپنی خیر مناد اور چپکے سے چلا جا اور پھر کبھی گو بندہ یا اس کی جو روکا نامت لیتا۔“ ٹھا کرنے کہا۔

نے ذرا سوچا نہیں میں جانتا ہوں۔ ان سب کو اپنی موت نظر آرہی ہے۔ یہ اپنے گناہوں کا مداوا کر رہے ہیں تجھے ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا۔ اس لئے تو ابھی تک غرور اور طاقت کے نشے میں ہے۔ اب دیکھ تیرے سامنے کون کھڑا ہے۔“ اس نے سامنے دیکھا اور اچھل پڑا۔

”یہ تو مرگئی تھی، یہ کہاں سے آگئی؟“ وہ بولا۔

”ہاں یہ مرگئی تھی۔ یہ گوئندہ کی گھر والی نہیں، یہ اس کی بیوی تھی۔ تم نے اس کے شریر پرستم توڑا تھا۔ مگر آتما کا تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تم سب سے انتقام لینے کو بے چین ہے۔“

”مجھے معاف کر دو، میں گناہ گار ہوں۔ معاف کر دو۔“ ٹھا کر بولا۔

”کس کس سے معافی طلب کرو گے تمہارے کارناموں کی بہت لمبی فہرست ہے۔“ اور پھر میرے کارندوں نے کام شروع کر دیا۔ کسی کو جان سے نہیں مارا گیا۔ مگر سب کو ناکارہ کر دیا گیا۔ ٹھا کر دونوں آنکھوں اور ہاتھوں سے بے کار ہوا۔

تہہ خانے میں گوئندہ موجود تھا۔ مگر وہ بھی بہت کمزور اور بیمار تھا۔ اس کا علاج کیا گیا۔ مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ دونوں کی آتمائیں آسمانوں کی طرف پرواز کر گئیں۔ ظلم کی ایک اور داستان اس طرح ختم ہوئی۔

عقیدت اچھی چیز ہے۔ مگر انسان کو اس کی غلط سوچ بھٹکا دیتی ہے۔ سوچ کو بھٹکانے میں کچھ مطلب پرست انسانوں نے بھی کردار ادا کیا اور اپنی وحشیانہ فطرت کی تکمیل کے لئے فرضی دیوی، دیوتاؤں کا سہارا لیا اور عام انسانوں کو پھانسنے کی خاطر سخت رسومات رائج کر دیں اور اپنی ہیبت کو برقرار رکھا۔ میں کسی مذہب کے خلاف نہیں ہوں مگر جن باتوں کو عقل تسلیم ہی نہ کرتی ہو، ان کو کس طرح مان لوں۔

کچھ دیو مالائی کردار اور ان کے نام میں آپ کو بتاؤں تو آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔ مگر میرا مقصد کسی مذہبی بحث میں پڑنا نہیں ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان

خود اتنی کچھ بوجھ کا مالک ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے کہ اس کو کہاں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ مگر حیرت صرف اس بات پر ہے سمجھتے ہوئے بھی اسی پر قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف جو میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اس کی جڑیں ہزاروں سال سے اس معاشرے میں ہیں۔ وہ کس کس کو جواب دے، رشتہ دار یاں دوستیاں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے بزرگ کرتے آئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان اپنے دور جہالت کی اساسی باتوں کو فراموش نہ کر سکے۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ کراچی سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں شہر اور گاؤں ہیں اور کروڑوں کی آبادی ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے بعد یہاں پر مسلمانوں کی حکومت رہی اور مغلیہ دور تک اس ملک پر مسلمان حکومت کرتے رہے۔ پھر انگریز آ گئے۔ کئی سو سال وہ حکومت کرتے رہے۔ یوپی ایک زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں پر شہروں سے زیادہ گاؤں میں آبادی ہے اور ان کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔

شہر آگرہ اور دلی کے درمیان بہت گاؤں ہیں۔ دلی سے آگرہ کی طرف سڑک پر سفر کریں تو آگرہ سے چالیس یا کچھ زیادہ پر سڑک سے صرف چند فرلانگ پر ایک گاؤں آتا ہے۔ اچھا بڑا گاؤں ہے۔ مین روڈ سے اندر گاؤں کی طرف کچی سڑک ہے۔ اس پر آدمیوں کے باغات ہیں۔

ساری آبادی اہیر قوم اور جاتوں کی ہے۔ پورے گاؤں میں صرف دو گھرانے مسلمانوں کے ہیں۔ ایک گھرانہ اچھا کھانا پیتا گھرانہ ہے۔ زمینداری کرتا ہے، بہت زمینیں ان کے پاس ہیں۔

دوسرا گھرانہ ان کی خدمت کرنے کو ہے۔ اس گھرانے کا پورا خرچ پہلا گھرانہ ادا کرتا ہے۔ اس گاؤں کا نام شام نگر ہے۔ اسی شام نگر میں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے۔

اس کا باپ زمیندار اکبر خاں کا ہادی ہے۔ وہ اچھا کسان ہے۔ اکبر خاں بھی اس سے خوش ہے۔ اکبر خاں نے کبھی اس کو اپنا نوکر یا رہا نہیں سمجھا۔ اس کی ہر ضرورت وہ

گئے۔ مقررہ کے اجودا گاؤں گئے اور دھرم داس کے بارے میں پتہ کیا۔ تو پتہ چلا کہ دھرم داس کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی چاروں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔ بڑے لڑکے کا بھی دیہات ہو گیا ہے۔ ایک لڑکا زندہ ہے۔ یہ خاندان وہیں پر آباد ہے۔ اس کی ماں کا نام شکلا دیوی تھا جو کہ مر چکی ہے۔

اب تو شکلا کی ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس کی شہرت گاؤں گاؤں پھیلی گئی اور شکلا دیوی بن گئی۔ دور دور سے عورتیں اور مرد اس کے درشن کو آنے لگے۔

پنڈت اس کا نمائندہ بن گیا اور سب کو بتانے لگا۔ اس نے بہت سی باتیں اپنی طرف سے بیان کرنا شروع کر دیں۔ پنڈت دیا ناتھ کے اور پاس دیو کے دارے نیارے ہو گئے۔ جو آزاد دیوی کی نظر کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ اب یہ شہرت شہروں تک پھیل گئی تھی۔ پنڈت لوگوں نے اس واقعہ کو خوب اچھا لیا۔

انگریز سرکار اور اکبر خان کیا کرتے، وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے مگر جھگڑاتے کیسے لڑکی کی ہر بات درست نکلی تھی۔ شام گھر گاؤں بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ اگرچہ اور اس کے قرب و جوار کے شہروں سے لوگ جوق در جوق دیوی کے درشن کو آنے لگے۔ پنڈت آسن جمار باس دیو کے گھر بیٹھ گیا اور خوب کمائی کرنے لگا۔ جب بھیڑ زیادہ ہونے لگی تو پنڈت نے وقت مقرر کر دیا کہ دیوی کو زیادہ تکلف نہ کیا جائے، اب لوگ آتے اور گاؤں میں ڈیرہ لگا دیتے۔ کسی کو دو روز میں کسی کو تین روز میں دیوی کے درشن ہو جاتے۔ اب شکلا دیوی بھی اتنی ہوشیار ہو گئی تھی کہ لوگوں کے سوالوں کا جواب فر فر دیا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر بزرگوں کی سی سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پنڈت اس کے پاس ہر وقت تھا۔ اس دیوی کے لئے پنڈت کا بہت بڑا اسہارا تھا۔ ساری اونچ نیچ وہی سنبھالتا تھا۔ اگر اس کے بدلے وہ کچھ لے رہا تھا تو باس دیو کا کیا جاتا تھا۔ اتھ تو اس کے بھی رکنے جا رہے تھے۔ اس نے زندگی میں اتنا روپیہ پیسہ کب دیکھا تھا۔ گاؤں میں ایک میلان لگا ہوا تھا۔ دھرم کا معاملہ تھا۔ سارا گاؤں اس پر

پوری کرتا ہے۔ اکبر خان اور اس کے بزرگ بھی یہی کرتے آئے تھے۔ اس سے بھی زیادہ زمینیں دوسروں کے پاس تھیں اور وہ ہندو بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ پنچایت کا سر بن چکا تھا۔ اس کی بات انگریز سرکار بھی غور سے سنتی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کرتا تھا۔

اور اپنا فیصلہ بہت غور و فکر اور مشورے سے کیا کرتا تھا۔ اپنی پسندنا پسند کو درمیان میں نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ سب جانتے تھے اور اس کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔

اس لڑکی کے باپ کا نام باس دیو ہے اور ماں کا نام بسنتی ہے۔ یہ لڑکی ان کی دوسری اولاد ہے۔ اس سے پہلے ایک لڑکا ہے۔ اس لڑکی کا نام وہ شکلا رکھتے ہیں۔ وہ لڑکی سات سال کی ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی کودتی ہے پھر اس کو گاؤں کے پنڈت کے پاس جہاں پر گاؤں کے اور بچے بھی پڑھتے ہیں، بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ پنڈت گاؤں کے مندر کا چناری بھی ہے۔ اس کا نام پنڈت دیا ناتھ ہے۔ پنڈت دیا ناتھ دینی طور پر کٹر ہندو ہے۔ بظاہر وہ بڑا سیدھا سادہ نظر آتا ہے۔ مگر اندر سے وہ خود کے علاوہ سب کو حقیر اور کمتر خیال کرتا ہے۔ شکلا اس کے پاس روز پڑھنے جاتی ہے۔ ایک سال گزر جاتا ہے۔ دوسرا سال شروع ہو جاتا ہے اور پھر عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔

لڑکی اپنی ماں سے کہتی ہے۔ ”تم میری ماں نہیں ہو، یہ گھر میرا نہیں ہے، میرا گھر تو بہت بڑا ہے اور میں مقررہ کی رہنے والی ہوں۔ میرے پتی کا نام دھرم داس ہے اور مقررہ کے قریب گاؤں اجودا میں میرا گھر ہے۔“ سب یہ سن کر حیران ہوتے ہیں۔ سارے ہندو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اپنے بچے کے جنم کی بات بتا رہی ہے۔ اس نے تو مقررہ کو دیکھا ہی نہیں اور دھرم داس کے بارے میں یہ کیا جانے، اس سے آگے اس نے بتایا کہ میرے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ میں بیمار ہو گئی تھی، پھر مجھے نہیں پتہ کیا ہوا۔

اب اس کی کئی باتوں کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنادی گئی۔ اکبر خان اور پنڈت کو اس میں رکھا گیا۔ دو تین اور ہندوؤں کو اس میں شامل کیا گیا۔ یہ لوگ مقررہ اچلے

خبر کرتا تھا کہ یہ چسکار ہمارے گاؤں میں ہوا۔

اکبر خان لاکھ اثر رسوخ والے تھے مگر دھرم کے سامنے وہ کیا کہتے اور اگر ایسی غلطی کرتے تو کون ان کی سنتا۔ بنی بنائی عزت پر آجاتی۔ ان کی کوئی دلیل، کوئی نہیں سنتا۔ سب اس کو ہندو دھرم اور اس کی پریم پر کا دشمن سمجھتے، اس لئے وہ خاموشی اختیار کر گئے۔

پورے ڈیڑھ سال یہ ڈرامہ ہوا۔ اس کے بعد شکلا دیوی پھر سے شکلا بن گئی۔ مگر اس دوران یہ ضرور ہوا کہ باس دیو، بشری باس دیو بن گئے۔ ان کا مکان اچھا بن گیا اور انہوں نے کاشت کاری چھوڑ کر آدھت شروع کر دی۔ پنڈت نے بھی لب سڑک ایک بہت بڑا پلاٹ خرید کر گنور کھشا آشرم بنالیا اور ایک بہت بڑا مندر بنالیا۔ اس سے ان کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔

اس واقعہ کی اتنی شہرت ہوئی تھی کہ دلی میں، میں نے بھی سنی تھی۔ مگر اس کو نہ میں نے اہمیت دی اور نہ رولوکا نے۔ پھر یہ معاملہ ختم ہو گیا تو میں نے رولوکا سے کہا۔ ”تم نے شام مگر گاؤں کا واقعہ سنا تو ہوگا، اس پر روشنی ڈالو۔“

”میں کیا روشنی ڈالوں۔ مجھے تو یہ سب بہت بڑا ڈرامہ لگتا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”مگر لڑکی کی بنائی سب باتیں ہو بہو درست ثابت ہوئی ہیں۔ یہ کس طرح ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اسی لئے تو میں اس کو ڈرامہ کہہ رہا ہوں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”وضاحت کرو ذرا۔“ میں نے کہا۔

”لڑکی کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی، اس کو پوری تیاری کرائی گئی اور پھر منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ابھی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ آپ نے سوال کر دیا ہے۔ اس کا جواب مجھے تلاش کرنا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”چھوڑو۔ میں نے تو ایسے ہی اپنی تسلی کے لئے پوچھ لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مگر ایک گرہ تو آپ کے دماغ میں رہے گی۔ آخر

اس لڑکی نے اپنے گزشتہ جنم کے حالات کس طرح بتائے۔ کیا واقعی یہ اس کا دوسرا جنم تھا۔“ رولوکا نے کہا۔

”تم نے اسے ڈرامہ کیوں کہا؟“ میں نے پوچھا۔

”دیو مالائی باتوں میں بے بنیاد اور بہکانے والی باتیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس لئے میں نے اسے ڈرامہ کہا ہے اور جواب نہیں دیا۔ میں خود اس کی تحقیقات کروں گا۔“

پھر جواب دوں گا۔ اگر ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر رگڑ لیا جائے تو جھٹکنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ انسان افضل ترین مخلوق صرف اپنی عقل کی وجہ سے ہے۔ کسی بھی پاگل سے کوئی رابطہ نہیں کرتا۔ اس کو کسی قابل نہیں سمجھا جاتا۔ صرف اس لئے کہ اس کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہوئی ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”تم نے درست کہا مگر کچھ باتیں ایسی سامنے آتی ضرور ہیں کہ انسانی عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اب تازہ واقعہ ہی دیکھ لو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں کچھ چیزیں دیکھ کر انسان کا حیرت زدہ ہو گا فطری عمل ہے۔ انسان ایک جانب تو عقل کے بل پر مادہ کی ہیئت پر غور و فکر کرتا ہے مگر دوسری طرف یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا موجد کون ہے۔ اس کا خالق اس کا موجد وہی ہے جس نے اتنی بڑی کائنات کو ایک بل میں بٹا ڈالا اور جو اصول و قاعدے کروڑوں سال پہلے بنائے تھے۔ وہ آج تک نہیں بدلے۔ کروڑوں سال سے سورج چاند موسم ہر چیز اپنی جگہ قائم ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے حکیم صاحب۔ آپ ترازو بانٹ کے چکر میں کہاں پھنس گئے۔“ رولوکا فانس کر بولا۔

”اب کیا ارادہ ہے، یہ بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔

”اب میں شام مگر گاؤں جاؤں گا اور حقیقت جاننے کی کوشش کروں گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں تو تمہاری یہ کاوش بے کاری ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بظاہر تو ایسا ہی ہے مگر ایک گانڈھ تو آپ کے

اندر پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے میں خود آواگون کی حقیقت جانے کا شوقین ہوں۔ ہمیشہ دوسروں کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا ہوں۔ اب کے اپنے جذبہ تحسین کی تسکین کی خاطر کچھ کر لوں۔“ ردو لو کا جواب دیا۔

اور ردو لو کا شام نگر روانہ ہو گیا۔

کہنے کو صرف دو گھرانے مسلمانوں کے اس گاؤں میں تھے۔ مگر کسی قسم کا تعصب ان کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ ایک توجہ یہ تھی کہ اکبر خان کا گھر اندر زمینداری کرتا تھا اور گاؤں کا کھانا پیتا گھرانہ تھا۔

دوسرا گھرانہ اس کے خدمت گار کا تھا۔ اکبر خان گوشت خور آدمی تھے۔ ان کی حویلی میں ہر دوسرے دن کبیرا، بکری ذبح ہوتے تھے۔ یہ بات سب ہی جانتے تھے مگر اس پر اعتراض کوئی نہیں کرتا تھا۔

گاؤں کے بڑے اکبر خان کی حویلی میں روز ہی آتے تھے اور اکثر رات کا کھانا بھی کھاتے تھے۔ اکبر خان کے پاس گوشت کی اپیشل دوش ضرور ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہرن کے کباب، نیل گائے کی بریانی یا بلاؤ بھی ہوتا تھا۔ گاؤں کے بڑے آتے تو تھے ملاقات کو مگر اصل مقصد ان کا کچھ اور ہوتا تھا۔

میں ایک جانوروں کے ڈاکٹر کے روپ میں گاؤں گیا اور اپنا نام ڈاکٹر سموی خان بتایا۔ میں نے اکبر خان سے اور دوسروں سے درخواست کی کہ میں کچھ عرصہ رکنا چاہتا ہوں اور جانوروں کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر سب خوش ہوئے اور اکبر خان نے میرے رہنے اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔

میں روزانہ گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا اور کسانوں کے جانوروں کو دیکھتا، ان کا علاج بناتا، دوا دیتا۔ چند ہی روز میں مجھے سب جاننے لگے اور خود بھی میرے پاس آنے لگے۔ گاؤں میں زیادہ عرصہ آدمی اجنبی نہیں رہتا۔ یہاں پر چوپال پر سب ایک دوسرے کا پوچھتے ہیں۔ مزاج برسی کرتے ہیں۔ دکھ سکھ بانٹتے ہیں۔ شہروں کی طرح نفسا نفسی کا عالم نہیں ہوتا۔ دن بھر محنت کرنے والے کسانوں کی واحد

تفریح چوپال پر گپ شپ اور قصہ کہانیاں سننا ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی یہ لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ رات نو بجے پورا گاؤں اندھیرے کی چادر میں چھپ جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک آل چلانے والا کسان صبح صادق بیدار ہو کر بل کا ندھے پر رکھ کر کھیت پر جاتا ہے اور اپنا کام ختم کرتا ہے اور آتے وقت سر پر چارے کا گٹھا کا ندھے پر ہل لے کر گھر واپس آتا ہے۔ پھر اس چارے کو کٹی کرتا ہے اور بیلوں کو ڈالتا ہے رات کو جلدی سونا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ شہری لوگ، دیہاتی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شہروں کو کھانا دیتے ہیں۔ شہروں کو روشن رکھتے ہیں۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ کسی ہندوستانی گاؤں میں تھا۔ میں فوراً باس دیو کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔

اور نہ اس لڑکی شکلا سے ملنا چاہتا تھا اور جو میری نظر میں سب سے اہم کردار پنڈت کا تھا، میں اب تک اس سے بھی نہیں ملاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ باس دیو کسی کام سے خود مجھے ملے اور یہ موقع آخر آ ہی گیا۔ اس کی بھینس بیمار ہو گئی۔ وہ مجھے بلا کر گھر لے گیا۔

اس نے نیا گھر بنوایا تھا۔ ایک طرف بازوہ تھا۔ جہاں تین گائیں اور دو بھینس بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے بھینس کا علاج بتا دیا۔ اس نے مجھے کچھ دینا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور پوچھا۔ ”نیا گھر بنوایا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”بس بھگوان کی کرپا ہے۔ میں مزدور آدمی ہوں۔“

”مگر اب تو تم مزدور نہیں لگتے۔“ میں نے کہا۔

”بس کا بتائیں ایسا ہے کہ بھگوان کی نظر ہو گئی۔ ایک چنتا کر میرے گھر ہو گیا اور وارے نیارے ہو گئے۔“ وہ بولا۔

”کیا چنتا کر ہوا، ذرا بتاؤ تو بھیا۔“ میں نے پوچھا۔

”میری ایک چھوڑی ہے، بڑی کرومو والی ہے۔ یہ سب اس کے کارن ہوا۔“ وہ بولا۔

”اچھا مگر کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کو اپنا پچھلا جنم یاد آ گیا۔“ لوجی اس نے فر فر اپنے پتی اور پچھلے جنم کے خاندان کے حالات بتانے شروع

ہیں۔ اس کے چہرے پر بھی عمر سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ وہ خاموشی سے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہاس دیو بھی اس کے قریب ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”بھیا زادو گھونٹ پانی تو پلائے دو، پیاس لگی ہے۔“

وہ چلا گیا تو میں نے لڑکی سے کہا۔ ”میں تمہارا بچھلے جنم کا رشتہ دار ہوں۔“

”کون مجھے کیا خبر۔“ وہ بولی۔

”تمہاری لڑکی کا بیٹا ہوں۔ تم میری نانی ہو۔“

میں نے کہا۔

”تم کا کہہ رہے ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ وہ

بولی۔

”سمجھ میں اس لئے نہیں آرہا کہ اب پنڈت تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس نے تم کو جتنا پڑھایا تھا، تم نے اتنا کام خوب اچھی طرح کر دیا۔ اب اس کی ضرورت نہ تم کو ہے، نہ تمہارے بھانجے پنڈت کو۔“

میں نے کہا۔ لڑکی کم عمر تھی اور گاؤں کی سیدھی سادھی

گھبرا گئی۔ اتنے میں ہاس دیو آ گیا۔ لڑکی کو دیکھا تو بولا۔

”کاہو اپنا؟“ مگر اس نے جواب نہیں دیا اور اندر چلی گئی۔

میں نے ہاس دیو سے کہا۔ ”خوب رنگ جمایا تم

نے۔ سارے گاؤں کو بے وقوف بنا ڈالا۔ تم تو بڑے گرو ہو

بھائی۔“

”کاہوا ڈاکٹر کیسی، بھکی بھکی باتیں کر رہے ہو؟“ وہ

بولی۔

”ہاس دیو تمہاری لڑکی کو کوئی جنم یاد نہیں آیا تھا۔ اس

کو یہ سب سبق پڑھایا گیا تھا اور اس نے وہ سبق سب کے

سامنے پڑھ دیا ہے۔ سمجھ دار ہے، گھبرائی نہیں اور دیوی بن

گئی۔ بڑا ہن اس پر برساتم نہال ہوئے سو ہوئے وہ پنڈت

بھی نہال ہو گیا۔ خوب ڈرامہ رچایا تم نے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے ارے چھوڑی نے خود سب

کچھ بتایا تھا اور سچ بتایا تھا۔ سب نے جا کر پتہ کیا، سب سچ

تھا، پھر اس میں کیا کھوٹ رہ گیا۔“ ہاس دیو بولا۔

”تم بہت سی باتوں سے ناواقف ہو۔ سارا کیا دھرا

کردینے۔ میں کیا، پورا گاؤں یہ سن کر حیران رہ گیا اور پھر اس کی بتائی باتوں کی تصدیق کرنے لگاؤں کے کچھ بڑے

مقرر آ گئے۔ پتہ نشان اس نے سب بتایا تھا اور بھیا وہ سب

باتیں ہو بوٹھیک ٹھٹھیں۔ پس پھر کیا تھا، لوگ جوتی در جوتی

درشن کو آنے لگے۔ میری بیٹی دیوی سان ہو گئی اور بن برسنے

لگا۔ بھگوان بھلا کرے پنڈت کا۔ اس نے اس سے میری

بڑی مدد کری۔ سارا کام وہی کرتا تھا۔ میں بھلا یہ سب کیسے

کرتا ہو بھیا یہ کہانی ہے۔“ ہاس دیو خاموش ہو گیا۔

”تو اب کا وہ بھول گئی سب۔“ میں نے پوچھا۔

ہاں پنڈت کہتا تھا کہ یہ صرف کچھ عرصہ یاد رہتا

ہے۔ پھر آدمی بھول جاتا ہے اور اپنا واقعہ ہزاروں سال میں

ہوتا ہے۔ اگر بھول نہ جائے تو پھر اس جنم میں زندگی کیسے

گزارے گا۔“ وہ بولا۔

”وہ پنڈت بھی بڑا انکار آدمی لگتا ہے۔“ میں

نے کہا۔

”ہاں بھیا بہت جانکار ہے۔“ وہ بولا۔

”اب کیا یہاں نہیں رہتا۔“ میں نے پوچھا۔

”گاؤں کے اندر نہیں ہے۔ گاؤں کے باہر سڑک۔“

کے کنارے جو گنو شاہ بنی ہے وہ اس نے ہی بتائی ہے۔

جہت بھلا آدمی ہے۔ ایک مندر بھی اس نے بنالیا ہے۔ بس

وہیں رہتا ہے۔“ وہ بولا۔

”میری ایک بھتی ہے۔ پوری کرو گے؟“ میں نے

کہا۔

”ہاں..... ہاں..... بولو۔“ اس نے پوچھا۔

”ایسی دیوی سان چھوڑی ہے تمہاری۔ ذرا درشن تو

کرادو چاریات کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ارے تو یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ابھی بلائے

دیتے ہیں۔“

اور وہ گھر کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس

کے ساتھ ایک بارہ تیرا سال کی گوری سی لڑکی تھی۔ اس نے

ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ حالانکہ اس عمر میں لڑکیاں یہاں

ساڑھی نہیں باندھتی ہیں۔ وہ گھبرا کر اور چولی استعمال کرتی

پنڈت کا لگتا ہے۔ مگر تم بے فکر رہو۔ یہ بات میں کسی کو بتاؤں گا نہیں۔ کیونکہ اب بتا کر اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد پنڈت کا تھا وہ اس نے پورا کر لیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”پنڈت نے اگر کچھ کیا ہے تو کیوں؟“ وہ بولا۔
”بہت بھولے ہو، سمجھ نہیں رہے ارے بھولے
تھا۔ اس کو روپے کی ضرورت تھی۔ وہ کسی طرح روپے کمانا
چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ آسان ترین آگئی اور اس
نے تمہاری لڑکی کے ذہن کو پلٹنا شروع کر دیا۔

اور اس کے ذہن میں لڑکی کے پچھلے جنم کی باتیں
اتارنے لگا۔ مقررہ میں جس خاندان کا اس نے لڑکی کے ذہن
میں ڈالا، وہ ضرور اس خاندان کے بارے میں خوب جانتا
تھا۔ وہی باتیں اس نے لڑکی کو خوب یاد کرادیں اور ڈرامہ
شروع کر دیا۔ تم کو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس لئے کہ اس کی
ضرورت ہی نہیں تھی۔“

”پھر بھلا بتاؤ، میرا کیا تصور ہے؟“ وہ فوراً بولا۔
”میں بھی تم کو کب تصور وار کہتا ہوں۔“ میں نے
کہا۔

”اب کیا ہوگا؟“ وہ فکر مندی سے بولا۔
”کچھ نہیں ہوگا، بھگوان نے تم پر کرا کر دی ہے
موج کرو۔“ اور میں واپس چل دیا۔

مجھے جو شہر تھا وہ میں نے بیان کر دیا تھا۔ اب اصل
اور ہدایت کا جس کا یہ ڈرامہ تھا، اس سے ملاقات کرنا تھی۔
دوسرے ہی دن میں صبح ہی گونشالہ کی طرف چلا گیا۔ یہ گون
شالہ اور مندر چار پانچ ایکڑ زمین پر بنا ہوا تھا۔ بڑے
دروازے کے بعد ایک کھلا میدان اور درمیان میں ایک مندر
بنا ہوا تھا۔ اور اس میں گنیش جی پاکی میں بیٹھے تھے۔ میں
مندر کے قریب چلا گیا۔ مندر کے دونوں طرف کمرے بنے
ہوئے تھے۔ ایک آدمی میرے قریب آ گیا اور بولا۔

”کس سے ملنا ہے؟“
میں نے جواب دیا۔ ”پنڈت جی سے ملاقات کرنی
ہے۔“

”اچھا دیا تھا جی سے ملنا ہے۔ آؤ وہ اندر ہیں۔“
میں اس کے ساتھ چلا، وہ ایک کمرے کے اندر چلا اور بولا۔
”میرے ساتھ آؤ۔“ میں بھی اندر چلا گیا۔ اندر ایک ساٹھ
سال سے اوپر کا آدمی ایک دھوئی اور بندوق میں ملبوس تخت پر
بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ ”کیا بات ہے (چندن) کیا بات ہے؟“
میرے ساتھ جو آیا تھا وہ چندن تھا، بولا۔ ”یہ آدمی
آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ میں لے آیا ہوں۔ یہی ہیں پنڈت
جی۔“ وہ بولا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”اچھا بھائی تم جاؤ۔“ اور میں
پنڈت سے مخاطب ہوا۔ ”شام نگر کے تم وہی پنڈت ہو جو
پچھلا جنم بتانے والی لڑکی کے ساتھ تھے۔“
”ہاں جی بھگوان کا یہ چمکار میں نے اپنی آنکھوں
سے دیکھا ہے۔“ وہ بولا۔

”تم کچھ غلط کہہ گئے ہو پنڈت۔“ میں نے کہا۔
”کیا غلط کہا میں نے سارے ہندوستان نے یہ
چمکار دیکھا ہے۔“ وہ بولا۔

”غلط یہ کہا کہ تم نے خود یہ چمکار دکھایا ہے۔ بھگوان
کو درمیان میں کیوں لاتے ہو۔ بھگوان کا نام لے کر تم جو
کرتے ہو۔ وہ سب کون سا بھگوان تم سے کرنے کو کہتا
ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے تو کون ہے اناپ شتاب کہے جا رہا ہے۔
میں کہتا ہوں چلا جیسا ہیں سے۔“ وہ غصے میں بولا۔

”چلا جاؤں گا، فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے ساتھ
مقررہ کے کچھ لوگ بھی آئے ہیں۔ وہ تم کو جانے ہیں۔ ان کا
کہنا ہے کہ تم مقررہ کے رہنے والے ہو اور گاؤں اجودا کے
دھرم داس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، اس کی
اولادوں کے بارے میں گھریا اور اس کی دھرم جتنی شکا کے
بارے میں تم کو سب کچھ پتہ ہے۔ دھرم کے مرنے کے بعد
سے شکا کے مرنے تک تم وہیں پر تھے اور پھر تم شام نگر
آ گئے۔ یہاں آ کر تم نے ایک بہت کامیاب اور اچھا ڈرامہ
کھیلایا اور وہ سب کچھ پایا، جس کی تم نے تمنا کی تھی۔ جو لوگ
میرے ساتھ ہیں۔ وہ تم کو پھر مقررہ لے جائیں گے اور

تمہارے پورے ڈرامے کی قلعی کھل جائے گی..... جو کچھ کہنا ہے تاک کے رستے نکل جائے گا۔ صرف میری تصدیق کی ضرورت ہے۔ میں شام نگر میں آیا۔ تیری وجہ سے تھا، اب بول کیا کہتا ہے۔ جو ج ہے قبول دے ورنہ تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔“ میں نے کہا۔

پنڈت کا سارا کلف اتر گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں کیا کرتا، زندگی دان دکھشنا میں گزر گئی۔ بھجن کی ترن کی آمدنی پیٹ نہیں بھرتی۔ میں بھی آخر انسان ہوں، کچھ تو کرنا تھا۔ تم نے جو کہادہ سب ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔

”تجھے یہ خیال نہیں آیا کہ کبھی لڑکی کوئی بات کم زیادہ کرے۔ یہی تو بات بگڑ جائے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نے دیکھ سال تک اس کو ایک ہی بات بتائی تھی اور وہ یہی تھی کہ تو شکلا ہے اور تو تمہرا کی ہے۔ تیرے پتی کا نام یہ ہے۔ اتنی بیٹیاں ہیں، اتنے بیٹے ہیں۔ بار بار میں نے الٹ پلٹ کر یہ سبق یاد کروا دیا تھا۔ پانی سب کام تو مجھے کرتا تھا اور میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ اب میری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”دل تو نہیں کرتا مگر میں کچھ نہیں کروں گا۔“ اور میں واپس چل دیا۔

اب میرا گدوں میں کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔ ”تو اس طرح آؤ گون تسلیم کروا دیا گیا ہے۔“

”اس کا فیصلہ تو آپ کریں۔ میں نے جو دیکھا بیان کر دیا ہے۔“

انسان بڑا سنگدل اور سفاک بھی ہے۔ طاقت کی فراوانی رحم کے جذبے کو ختم کرتی ہے۔ چاہے یہ بھائی عمل ہو مگر کبھی کبھی یہ دور انسان پر آتا ہے۔ اس دور کے گزرنے کے بعد کچھ تھوڑے کا دور شروع ہوتا ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو محسوس تو کرتا ہے۔ مگر اکثریت اپنی غلطیوں کو محسوس ہی نہیں کرتی اور اگر کرتی ہے تو ان کی کچھ نہ کچھ توجیہات پیش کر کے خود کو برحق سمجھتی ہے۔ جو لوگ اپنی غلط روش کو دیا بت

داری سے محسوس کر لیتے ہیں، وہ دوبارہ غلطی نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں اور آنکھیں کھول کر چلتے ہیں۔

مکرم علی اچھا کھاتے بیٹے گھرانے کا فرد ہے۔ اس کا باپ ایک دفتر میں کلرک ہے۔ پرانے زمانے کا ٹڈل پاس ہے۔ باپ دادا کے زمانے کا مکان ہے۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ مکرم علی کے باپ مقدم علی کا ہانا بنایا گھر ملا تھا۔ باپ نے بڑی کوشش کے بعد مکرم علی کو سرکاری دفتر میں نوکر کرادیا تھا۔ مقدم بھی بہت نیک اور شریف آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد صرف نماز پڑھنے کو مسجد کے لئے نکلتا تھا۔ محلے میں کسی سے زیادہ راہ رسم نہیں رکھتا تھا۔ کسی کو اس کی ذات سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ صرف اس کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ وجہ صرف پیسہ ہوا کرتا تھا۔ وہ پورا خرچ بیوی کو نہیں دیتا تھا۔ اسی بات پر روزانہ ان کے درمیان جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ مقدم بھی بلا کا کنجوس آدمی تھا۔ وہ اپنا پیسہ خرچ کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہر چیز مفت کی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دعوت شام کی کہیں سے آجائے تو وہ دوپہر کو بھی نہ کھاتا تھا اور نہ کسی کو کھانے دیتا تھا۔ خود بھی مختصر سا آدمی تھا۔ تین لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی نہایت چھوٹے قد کاٹھ کی تھیں۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی باپ کی طرح چار فٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔ اماں پر کوئی بچہ نہیں گیا تھا۔ مقدم علی ہر دس تاریخ کو بڑے بھائی کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہ بڑے بھائی ان کے تایا زاد تھے۔ مقدم علی کے حالات جانتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مقدم علی کا گزرا وہ اس کی آمدنی میں آسانی سے ہو سکتا ہے مگر وہ پھر بھی ہر ماہ اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ عید پر سب کو کپڑے بنا دیا کرتے۔ رمضان میں پورا خرچ ادا کرتے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ رشتے دار بڑی خاموشی سے مقدم علی کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اس سے مقدم علی گھر کا خرچ چلا سکتے۔ بیوی کے ہاتھ پر انہوں نے کبھی اپنی آمدنی نہیں رکھی تھی جو خرچ ہوتا خود کرتے۔ بیوی آدھا سیر گوشت منگوائی تو یہ پاؤلاتے۔ ایک پاؤدودھ منج وہ لیتے تھے۔ اس میں سے ایک کپ خود پی جاتے۔ باقی کی

چائے بنی تھی۔

چراہی ہو گئے۔ باپ کی طرح یہ چھوٹے سے تھے مگر دنیا کے الگ ڈھنگ دیکھ کر اور باپ کی شہرت سے ڈر کر باپ کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ وہ اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور وہ اپنی مرضی سے خرچ کرتی۔ تین فرد گھر میں تھے۔ خرچ ہی کتنا تھا۔ بڑے آرام سے گزارہ ہوتا تھا۔ مکرم کے ساتھ کے لڑکوں کی شادیاں ہو گئیں۔ مکرم کی اماں کو بھی بھولانے کا شوق ہوا اور انہوں نے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں۔

مکرم علی کی ماں کی خواہش تھی۔ بہو چاند کا کھڑا ہو۔ یہ خواہش تو ہر ماں کی ہوتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی، وہ یہ بھول جاتی ہے کہ بیٹا کیسا ہے، مگر کیسا ہے اور پھر مقدم علی کی شہرت مگر مکرم علی کو بھی سب جانتے تھے۔ باپ کی اس میں کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ نوکری کے علاوہ بھی کام کرتا تھا۔ محنت سے نہیں گھبراتا تھا۔ چال چلن بھی اچھا مٹلے میں نظریں نیچی کر کے چلتا تھا۔ لڑکے میں کوئی خرابی نہیں تھی اور رہے اس کے قد کاٹھ تو وہ پیداؤں ایسا تھا۔ اس میں تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مکرم علی پیسے سے بھی کمزور نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ مقدم علی نے زندگی بھر پیسہ جمع کیا ہے۔ پھر اس کی رہنمائی کا پیسہ بھی ملا ہے۔ سب ہی مکرم علی کے پاس محفوظ ہے۔ وہ اپنا گزارہ اپنی کمائی سے کرتا ہے۔ ایک بہن رہ گئی ہے۔ اس کا بھی اس نے انتظام کر رکھا ہے۔ تلاش کرنے سے تو ہر چیز مل ہی جاتی ہے اور مکرم کی اماں کو لڑکی پسند آئی۔ نین نقش درست گوری چنی عمر کا بھی نیل اور گھرانہ بھی ٹھیک۔ ذات برادری کے نہ لڑکی والے قائل تھے نہ یہ لوگ۔ ذات برادری کا کیا ہے، آدمی شریف ہو، مسلمان ہو اور کیا دیکھا۔ لونجی بات پکی ہو گئی۔ اور شادی ہو گئی۔ مگر یہ کیا ہوا۔ دہن کے آتے ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔

مکرم کی ماں کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی وہ نہیں جو دکھائی گئی تھی۔ سب عورتوں نے پوچھا۔ یہ لڑکی نہیں دکھائی تو بھی اس میں کیا خرابی ہے۔ اچھی گوری چنی لڑکی ہے۔ اب جو ہوا اس پر صبر کرو۔ مگر اس کی عمر تو دیکھو۔ میرے مکرم سے دس سال بڑی لگتی ہے۔ اماں نے جواب دیا۔

بہن فریادوں سے خوب سودا کرتے اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو سہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اسی طرح فروٹ والوں کے ساتھ کرتے۔ پورے محلے میں ان کی شہرت ہو گئی تھی۔ کوئی دوکاندار ان کو بھانپ نہیں بتاتا تھا۔ جانتے تھے یہ خریدیں گے۔ کچھ نہیں اور بچت کریں گے۔ دعوت میں جانے کے بہت شوقین تھے اور حیرت انگیز طور پر اپنے قد کاٹھ سے زیادہ کھا جاتے تھے۔ کسی نے مذاق میں پوچھ لیا۔ مقدم بھائی یہ بھری بھری ڈشیں کہاں جاری ہیں تو جل کر جواب دیتے۔ میاں دعوت میں آئے ہیں۔ اگر دو وقت کا کوٹنا کھائیں تو پھر کیا فائدہ ہو ادعوت کا۔ اسی لئے تو دوپہر کو بھی نہیں کھاتا تھا کہ شام کو دعوت میں کھانا ہے۔ ویسے آدمی شریف تھے۔ کمزور یاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ اس کمزوری کو معاف کر دیا جائے تو ان کے گھر کے روز روز کے بھڑکے ختم ہو جائیں۔

لڑکیاں بڑی تھیں۔ قد کاٹھ کم سہی مگر جوانی تو آخر آتی نکلا ہے۔

انہوں نے کچھ نہ کچھ جوڑ تو ذکر کے ان کی شادیاں شروع کر دیں اور تین کو فارغ کر دیا۔ اس سے ان کی جیب سے کچھ نہیں گیا اور کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ کسی سے جین لیا، کسی نے زیور دیا، کوئی کپڑے لے آیا اور کسی نے دو تین دیگ کھانا فراہم کر دیا۔ لونجی لڑکی کی شادی ہو گئی۔ ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ خود کو نہایت مسکین اور غریب ظاہر کر کے وہ اپنا کام چلا لیتے تھے۔ ان کی ان باتوں سے بیوی کتراتے تھی۔ مگر کیا کرتی، رہنا تو ان کے پاس ہی تھا۔ اب رہ گئی ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور مقدم میاں بیمار پڑ گئے۔ اپنی خود ساختہ دواؤں سے علاج کرتے رہے۔ پھر کسی نے اسپتال میں داخل کر دیا۔ اپنے علاج پر بھی کبھی پیسہ خرچ نہ کیا اور پھر اپنی سبجی کی نظر ہو گئے۔ مگر مرنے سے پہلے ایک کام وہ کر گئے۔

لڑکان کی سبجی کی وجہ سے پڑھ نہ سکا تھا۔ اس کو اپنے دفتر میں چراہی کی ملازمت دلا گئے اور میاں مکرم

”میں نہیں لڑ سکتا تو کیا ہوا، کوئی تو لڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں مل کر مقابلہ کریں گے۔“ اجمل نے کہا۔

”یہ تو تم کو کہتے ہیں کہ میرے ساتھ سسرال والوں نے دھوکا کیا تھا جو لڑکی دکھائی گئی تھی، اس سے شادی نہیں ہوئی۔ اس سے دس سال بڑی سے میرا نکاح کر دیا۔ چلو یہاں تک ہی بات ہوتی تو میں برداشت کر لیتا۔“ مکرم نے کہا۔

”اس لڑکی کی شادی کیوں نہیں ہوئی تھی؟“ اجمل نے پوچھا۔

”اس لڑکی نے اپنی شادی کسی ہوائی مخلوق سے کر لی تھی اور وہ روز رات کو اس کے پاس آتی تھی۔ اس کی ماں نے کسی سے ایک گنڈا بھالیا اور اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس سے وہ ہوائی مخلوق اس کے پاس آنے سے رک گئی۔

ماں نے کہہ دیا تھا کہ تو نے اگر یہ گنڈا اتارا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی اور اس نے اسی دوران اس کا نکاح دھوکے سے میرے ساتھ کر دیا۔ مگر دلہن نے مجھے ساری بات بتادی اور دور رہنے کا کہا۔ مگر اب وہ گنڈا اس نے اتار دیا ہے۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ مخلوق روز آتی ہے۔ میں بے غیرتی سے اس کے کام کرتا ہوں۔ مگر اب میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ میں کیا کروں، کس سے لڑوں، کون ہے سامنے، میری بساط کیا ہے، میں ڈنکی اور جسمانی دونوں طرح کمزور آدمی ہوں۔“ مکرم نے کہا۔

”تو ایسا کرتے ہیں، کسی سیانے سے ملتے ہیں۔“ اجمل نے کہا۔

”میراں تو کسی سیانے کو جانتا نہیں، تم ہی کچھ کرو۔“

”یہاں فرخ آباد میں تو ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔

اس کے لئے بلیا چلنا ہوگا۔“

”تو پھر دیر نہ کر دو چلو۔“ مکرم نے کہا۔

دونوں نے ہلایا کی بس پکڑی اور روانہ ہوئے۔ بس کا چار گھنٹے کا سفر پورا ہوا۔ مکرم نے پوچھا۔ ”تم اس آدمی سے ملے ہو کبھی۔“

”ایک دو دفعہ کسی دوست کے ساتھ ملا ہوں۔ وہ شنگ میں ایک مندر ہے۔ اس میں رہتا ہے۔ جادوؤں نے

کا ماہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آدمی کام کر دے گا۔۔۔۔۔“

باتیں کرتے کرتے شنگ آ گیا۔ یہاں پر کارتی کا مندر کے دروازے پر اجمل نے پوچھا۔ ”گوگل کار تک مہاراج اندر ہیں۔“ جواب ملا، اپنی کنیاسیں موجود ہیں۔

وہ دونوں وہاں چلے گئے۔ اندر دو تین عورتیں کنیاسی کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ایک ایک کر کے اندر جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کا نمبر آ گیا۔ وہ اس بوڑھے کے سامنے بیٹھ گئے تو وہ بولا۔ ”کیسے آئے، کیا کام ہے؟“

اجمل نے کہا۔ ”مہاراج میں پہلے بھی آپ کے پاس آ چکا ہوں۔ اب کے اپنے دوست کے کام سے آیا ہوں، یہ خود اپنی کہانی سنائے گا۔“

اور مکرم نے کم سے کم الفاظ میں اپنی کہانی بیان کر دی۔ پوری کہانی سننے کے بعد ایک لمبی ہوں کی اور بولے۔ ”صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک جن ہے جو اس عورت پر قابض ہے مگر چننا کی کوئی بات نہیں بھگا دیں گے۔ پرنتو عورت کو یہاں لانا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”اور اگر وہ آنے پر راضی نہ ہوئی تو پھر کیا کریں؟“ مکرم نے پوچھا۔

”آئے گی تو نہیں لگتا ایسا ہی ہے۔“ گوگل کار تک نے کہا۔ ”تو پھر گاڑی کا بندوبست کرو، ہم خود چلتے ہیں۔“

”آپ کب چلیں گے۔“ اجمل نے پوچھا۔

”کل صبح جائیں گے، شام کو آئیں گے۔“

مکرم حیرت سے بولا۔ ”اتنی دیر میں کام ہو جائے گا، مہاراج۔“

”تو تمس جانتا نہیں بچہ۔ جانتا تو یہ بات نہ کرتا۔ ہم کارتی کا دیوتا کے پجاری ہیں۔ وہ کارتی کا جویش جی کا بھائی ہے اور جنگ کا دیوتا کہلاتا ہے۔ ہم کسی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا بچہ۔۔۔۔۔“

کار تک مہاراج نے کہا۔

”حکم کر مہاراج۔“ اجمل نے پوچھا۔

”ہم کار تک لوگ عورتوں سے دور رہتے ہیں۔ گھر میں زیادہ عورتیں ہوں تو ان کو الگ کرنا ہوگا۔ ہم صرف

مریض سے بات کریں گے۔“

”مگر آپ کے پاس تو عورتیں آتی ہیں۔“ مکرم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بہ ضرورت مند ہوتی ہیں۔ ان کو واپس کرنا گھور پاپ ہے۔ تو نہیں جانتا کارہیکاد دیتا بہت غصہ وردیوتا ہے، وہ کمار بن میں رہتا ہے۔ اگر کوئی بھولی بھگی ہوئی اپسرا بھی اس طرف جانکتی ہے تو وہ طیش میں آجاتا ہے اور اسے کسی نہات میں منقلب کر دیتا ہے، کوئی آم کا درخت بن جاتی ہے، کوئی نیم کا، اسی لئے پورے بھارت میں کارہیکا کی پوجا کے لئے جو خاص مقامات ہیں، وہاں پر صرف پرش جاتے ہیں، عورتوں کا داخلہ منسوخ ہے۔“

”ٹھیک ہے مہاراج ہم سویرے گاڑی لے کر آجائیں گے۔“

پورے پچاس روپے میں گاڑی ہوئی اور تینوں فرخ آباد روانہ ہو گئے۔ دس بجے گھر پہنچ گئے۔ پہلے مکرم گھر میں گیا اور اماں کو پڑوس میں بھیج دیا۔ اور پھر اجمل اور مہاراج کار تک گھر میں آئے۔ مہاراج نے آتے ہی چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے ساجدہ کے کمرے کے علاوہ پورا گھر گھوم پھر کر دیکھ لیا اور بولا۔ ”خالی ہے، کچھ نہیں ہے۔“ مریض دکھا تو پتہ چلے۔

اجمل کمرے سے باہر رک گیا اور پنڈت مکرم کے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی مہاراج کے منہ پر ایک زوردار پھٹ پڑا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ وہ ذرا سا گھبرائے مگر پھر قدم ہما کر کھڑے ہو گئے بولے۔ ”دیکھ بھال کے ہم ملاقات کو آئے ہیں اور تو مارتا ہے۔ کچھ تو خیال کر۔“

ساجدہ کے منہ سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ”سب جانتا ہوں تجھے اب تیری ملاقات کو۔ تو نے خوب ڈھنگ بنایا ہوا ہے، روٹی کمانے کا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو چلا جا اور پھر کبھی نہ آنا اس طرف، ورنہ اٹال کا دوں گا کسی درخت پر۔“

”میری بات تو سن، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

کار تک بولا۔

”زیادہ مت بن، تیری بات میں سمجھ گیا ہوں۔ چلا جا اسی میں تیری سلامتی ہے، فریب کرے گا تو نقصان ہوگا۔“ کار تک فوراً پلٹ کر دروازے سے نکل گیا۔ اب اکیلا مکرم کمرے میں تھا۔ وہ واپس پلٹا تو آواز آئی۔ ”اور تو بھی ہوش کر۔ تجھے اس لئے چھوڑا ہوا ہے کہ تو بے ضرر ہے۔ اگر پر نکالنے کی کوشش کرے گا تو سارے پرنوچ کر بوت کر کاچپے بنا دوں گا، بھاگ جا.....“

مکرم جلدی سے کمرے سے باہر آ گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ اجمل نے دونوں کو حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ”ارے کیا ہوا مہاراج، اتنی جلدی کام ہو گیا کیا؟“

”ارے تجھے کام کی پڑی ہے، اپنی تو جان پر بن گئی۔ گاڑی کا بندوبست کرو، ہم واپس جائیں گے۔“

مکرم نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مہاراج کچھ تو کرو، وہ تمہارا کارہیکا دیتا کس کام آئے گا، کچھ اس سے کام لو۔“

”ارے تو کیا کارہیکا میری جیب میں رکھا ہے کہ نکال کے لگا دوں کام میں۔ اس کو سنانا پڑتا ہے، بتانا پڑتا ہے، پھر بھی اس کی مرضی ہے کہ آئے نہ آئے۔“

مہاراج نے کہا۔

”واہ مہاراج واہ! تم نے پورے پچاس روپے خرچ کر دوائے اور کام کچھ ہوا نہیں۔ اب پھر پچاس کیوں خرچ کریں۔“ اجمل نے جواب دیا۔

”ارے بچے میں جا کر کچھ جاپ کارہیکا کے لئے کروں گا۔ تمہارا کام ذرا کٹھن ہے، ہوگا تو مگر دیتا کو مرضی کرنا ہوگا۔ اس میں ذرا وقت لگے گا۔“ مہاراج بولے۔

”تو پھر کیوں آگئے تھے ہمارے ساتھ۔“ مکرم نے کہا۔

”دیکھنا بھی تو ضروری تھا۔ اب آکے اندازہ ہوا کہ پانی کتنا گہرا ہے۔“ کار تک بولا۔

”پانی اتنا گہرا ہے کہ تم ڈوب جاؤ گے۔ اب تم واپس خود چلے جاؤ۔ ہمارے پاس کرایہ نہیں ہے۔“ مکرم نے جواب دیا۔

”چلے جاتے ہیں بچہ پر تو تم نے ہمارے ساتھ اچھا

سلوک نہیں کیا ہے۔“ اور کار تک مہاراج منہ پر ایک تھپڑ کھا کر چلے گئے۔ اور مکرم بھی اجمل کے ساتھ گھر سے باہر آگیا اور بولا۔

”یاد حیرت ہے ساجدہ کے منہ سے مردانہ اور بڑی رعب دار آواز آرہی تھی اور کار کلک کو تو اندر جاتے ہی بہت زوردار تھپڑ بھی پڑا تھا۔ اس تھپڑ نے اس کی ساری ہیکڑی نکال دی اور وہ بلی کے بچے کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگا تھا۔ یہ تو کچھ بہت ہی خطرناک جن معلوم ہوتا ہے۔“

”اور تجھے اس نے کچھ نہیں کہا۔“ اجمل نے پوچھا۔

”ہاں کہا۔ بولا تو بے ضرر ہے، اس لئے چھوڑ دیا ہے۔ زیادہ پر نکالے گا تو پکڑا دوں گا۔“ مکرم نے جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ہماری کارروائیوں کو جانتا ہے۔ پھر تو میری بھی خبر نہیں۔“ اجمل نے ڈر کر کہا۔

”اے تو کیوں ڈرتا ہے، معاملہ تو میرا ہے۔“ مکرم نے کہا۔

”تیری مدد کرنے میں، میں بھی مارا جاؤں گا۔ تجھے تو پتہ ہے کہ میرے سر پر تو کوئی اتھار رکھنے والا بڑا بھی نہیں ہے۔ اس لئے بھیا تم اس معاملے میں میرے پاس نہ آنا۔ معاف کرنا یا میں مجبور ہوں۔“ اور اجمل فوراً اپنے گھر چلا گیا۔

مکرم کو بہت رنج ہوا۔ بڑا دقتی کا دم بھرتا تھا۔ ذرا برا وقت آیا کہ ساتھ چھوڑ گیا۔

دنیا اسی کا نام ہے۔ بنی کے سب ساتھی ہوتے ہیں، بنی بگڑتی ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

اماں عورت ذات اگر کوئی راز کی بات عورت کو پتہ چل جائے تو وہ اس کے پیٹ میں کہاں رکھتی ہے۔ جب تک وہ کسی کے کان میں اس کو قے نہ کر دے وہ بے چین رہتی ہے۔

”شہزادی کی اماں میں تم سے ایک بات پوچھوں، کسی کو بتاؤ گی تو نہیں۔“ مکرم کی ماں نے اپنی پڑوسن شہزادی کی اماں سے کہا۔

”اے لو! میں نے کبھی کسی کو کچھ بتایا ہے کہ اب بتاؤں گی۔“ شہزادی کی اماں ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔

”دیکھ بات ذرا پردے کی ہے۔ میں تجھ پر بھروسہ

کر کے مشورہ کر رہی ہوں۔“ مکرم کی ماں نے کہا۔

”ارے تو بے فکر ہو کر بول، یہ دل سمندر ہے جو بات گئی، ڈوب گئی۔“ شہزادی کی اماں سینے پر انگلی رکھ کر بولیں۔

”بات یہ ہے کہ مکرم رات کو دلہن کے پاس نہیں سوتا، چھت پر چلا جاتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ساجدہ کی باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میں نے پوری پوری رات چوکیداری کی ہے۔ اس کے کمرے سے کوئی آتے جاتے میں نے نہیں دیکھا۔ ساجدہ روز شام کو خوب بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ مگر کھاتی کچھ نہیں اور بہت خوش نظر آتی ہے۔ میں تو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر بے حال ہو گئی ہوں۔“ مکرم کی اماں نے ایک ہی سانس میں اپنا پیٹ ہلکا کر لیا اور سکون کی سانس لی۔

”ہائے ہائے یہ تو تو نے نئی بات بتادی۔ میں تو جانوں یہ کچھ اوپر کا چکر لگتا ہے۔“

”اری صاف بات کر، اوپر نیچے کا کیا چکر ہے۔“

مکرم کی ماں الجھ کر بولیں۔

”ارے بے وقوف یہ کوئی سایہ ہے جو اس کے پاس آتا ہے، وہ باتیں کرتی ہے، تم کو نظر نہیں آتا۔ اس سے باتیں کرتا ہے اور اسی کے ڈر سے مکرم چھت پر بھاگ جاتا ہے۔ میری مانو تو کسی سیانے کو دکھاؤ، یہ بڑی خطرے والی بات نظر آوے ہے۔“ شہزادی کی اماں نے مشورہ دیا۔

”تیری نظر میں کوئی ایسا سیانا ہے، میں کسی کو جانے نہیں ہوں۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

”سنا ہے کہ امام باڑے والی گلی میں کوئی رہتا ہے۔“

شہزادی کی اماں بولیں۔

”تو پھر چل میرے ساتھ۔“ مکرم کی اماں نے کہا۔

”آج تو مشکل ہے، کل سویرے میں چلوں گی۔“

شہزادی کی اماں نے جواب دیا۔

دوسرے دن دونوں خاموشی سے نکل گئیں۔

پوچھتے پوچھتے پتہ چل گیا کہ بابا سرے والے یہ کام کرتے ہیں۔ وہ ایک سرے کی سلاخی مریض کی آنکھوں میں

لگاتے ہیں اور مریض بولنا شروع ہو جاتا ہے۔ جن بھوت پریت کا اتارا کرتے ہیں۔ مکرم کی اماں نے پورا احوال ان کے گوش گزار کر دیا۔

انہوں نے اپنی سرمہ بھری آنکھیں کھول کر کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، اس لڑکی کو ہمارے پاس لے آؤ، بس اتنا کام تمہارا ہے۔“

”اور اگر وہ نہ آئی تو پھر باباجی، ہم کیا کریں؟“

”تو پھر ہم خود تمہارے گھر آ جائیں گے۔“ وہ بولے۔

”مجھے تو جی اس سے ڈر لگتا ہے، میں اس کو نہیں لاسکتی، آپ ہی آ جاؤ تو اچھا ہے۔“ مکرم کی ماں نے کہا۔

”اس کی ذیل نہیں ہوتی ہے۔“ وہ بولے۔

”ذیل تلتی ہوگی؟“ مکرم کی ماں نے پوچھا۔

”صرف ساڑھے دس روپے۔“ بابا نے جواب دیا۔

”یہ تو بہت زیادہ ہیں بابا کچھ کم کر دو۔“ وہ بولیں۔

”اچھا تم ضرورت مند ہو تو پھر تم مجھے سنکھل فیس سوا

پانچ روپے دے دینا۔“ بابا نے کہا۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اس زمانے میں یہ بھی

بہت تھے مگر مجبوری تھی، وہ راضی ہو گئیں۔ بابا نے کہا۔

”ٹھیک ہے کل کسی وقت تانگہ لے کر آ جانا، ہم چلیں گے۔“

دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے سرمے والے بابا

آ گئے۔ گھر میں مکرم نہیں تھا۔ صرف ساجدہ اپنے کمرے میں

تھی اور اماں بابا کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ اماں نے دروازے

پر آہستہ سے دستک دی تو ساجدہ کی آواز آئی۔ ”اندرا آ جاؤ۔“

اماں اندر چلی گئیں اور بولیں۔ ”بیٹا ایک سرمے والا

آیا ہے۔ بہت بڑھیا سرمہ اس کا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا

تمہاری آنکھ میں بھی ایک سلائی ڈلوادوں، فائدہ کرے گا۔“

”مجھے سرمے لگانے کا شوق نہیں ہے منع کر دو۔“

ساجدہ نے کہا۔

”خرچ ہی کیا ہے بیٹا۔ اچھی چیز ہے اس لئے کہتی

ہوں۔“ وہ بولیں۔

”اچھا ٹھیک ہے، بلا لو۔“ ساجدہ نے کہا۔

اور بابا سرمے والے کمرے کے اندر آ گئے۔ اندر تو

آگئے مگر اب واپس جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ کیونکہ

دروازے پر ایک بہت بڑا سانپ پھنک کر اس مار رہا تھا۔

بابا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے مگر ہاتھ پیر

کانپ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مکرم کی

اماں کی حالت ان سے بھی زیادہ خراب تھی۔ گھر میں کبھی

چوہے کا بچہ نظر نہیں آیا اور آج اتنا بڑا سانپ کہاں سے آ گیا۔

ساجدہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔ دروازہ تیز آواز کے ساتھ بند

ہو گیا اور ساجدہ کے منہ سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

”سرمہ لگائے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ، دنیا کو بے

وقوف بنا کر روٹی کھاتا ہے۔ تیرے اندر کیا ہے، صرف

جھوٹ اور فریب۔ تجھے دیکھ کر جم آتا ہے اور تم بوڑھی عورت

ہو، تم کو بہت خیال ہے اپنے بیٹے کا، میں نے اس کو چھوڑ رکھا

ہے۔ اس لئے کہ وہ بے ضرر سا آدمی ہے۔ تمہارے

بڑھاپے کا میں نے خیال کیا ہے۔ اس کے بدلے میں تم

لوگ میرے ہی خلاف کام کر رہے ہو۔ کان کھول کے سن

لے بڑھیا کہ یہ میری بیوی ہے۔ میں نے اس سے شادی کی

ہے۔ تم نے اس کے خلاف یا میرے بھگائے کو کچھ کیا تو اب

کے معاف نہیں کروں گا۔ آخری موقع میں دے رہا ہوں۔ تو

بڑھے اپنی سرمہ دانی اٹھا اور بھاگ جا اور دیکھ بھال کر سرمہ

لگایا کر۔ اب میرے سامنے آیا ہے، دوبارہ نہ آؤ۔ ورنہ

آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ پھر سرمہ میں ڈالے گا تو اندھوں

کی آنکھ میں سرمہ ڈالتا ہے۔ میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گا۔“

شیرانی کی اماں کو تو پچھلے لگے ہوئے تھے۔ آگے کا

احوال جاننے کو بے چین تھیں۔ دوسرے دن سویرے ہی

آ گئیں۔ اتنے ہی بولیں۔ ”ارے بہن کیا ہوا تم نے کچھ بتایا

نہیں۔“

مکرم کی اماں کا خوف کے مارے اب تک بدن

کانپ رہا تھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا

اور آہستہ سے بولیں۔ ”تم گھر جاؤ، میں وہیں آئی ہوں۔“

شہزادی کی اماں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ گھڑوچی سے ایک گلاس پانی بھر اور غصا غٹ پی گئیں۔ پھر ایک گلاس لاکر کمرم کی اماں کو دیا۔ وہ بھی ایک ہی سانس میں پی گئیں۔ ذرا اوسان بحال ہوئے تو کمرم کی اماں نے کہا۔ ”میں اسی لئے ڈرتی تھی۔ ارے اس کو سب پتہ چل جاتا ہے۔ وہ کمرے میں بند رہتی ہے مگر سب طرف دھمتی ہے۔ ہم بھلا اس کا کیا مقابلہ کریں گے، میری تو توبہ ہے۔“ کمرم کی اماں نے کہا۔

”ہاں بہن تم نے ٹھیک کہا۔ بتاؤ! میں تو تمہاری ہمدردی میں ماری گئی۔ پتہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔“ شہزادی کی اماں نے کہا۔

”ارے کچھ نہیں ہوگا تم آکے اس سے معافی مانگ لیتا۔ اتنا ظالم مجھے وہ لگتا نہیں ہے۔“ کمرم کی اماں نے حوصلہ دیا۔

”میری تو حالت خراب ہے، اب اس کے سامنے کیسے جاؤں گی؟“ وہ بولیں۔

”نہ جاؤ پھر سزا کتیا رہو۔“ کمرم کی اماں نے کہا۔

”ہائے میں تو بری پھنس گئی، اب کیا کروں۔“ وہ روہانسی ہو کر بولیں۔

”میں نے جو کہا ہے وہ کرنا ہی پڑے گا۔“ کمرم کی اماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں شہزادی کے ابا سے مشورہ کروں گی۔“ وہ بولیں۔

”یہ تو تم اور ایک غلطی کرو گی۔ مردوں میں بات پھیل جائے گی، پھر تو وہ نہ معلوم کتنا ناراض ہو جائے۔“ کمرم کی اماں نے فکر مندی سے کہا۔

”اچھا تو پھر ان سے مشورہ نہیں کروں گی۔ میں ذرا ہمت جمع کروں۔ پھر تمہارے گھر آؤں گی۔“

وہ رات بھر ہمت جمع کرتی رہیں اور کوئی ان کی دونوں بکریاں کاٹ کے چلا گیا۔ صبح دیکھا تو ہائے میری بکریاں کہہ کر شہزادی کی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ سب نے تسلی دی۔

شہزادی نے اور اس کے ابا نے یہ کارروائی کسی دشمن

شہزادی کی اماں کو کمرم کی ماں کا چہرہ دکھ کر کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کچھ نہ بولیں اور خاموشی سے پلٹ کر گھر آ گئیں اور بے چینی سے کمرم کی اماں کا انتظار کرنے لگیں۔

وہ پھر میں کمرم کی اماں آئیں تو وہ بولیں۔ ”اے تم نے کچھ بتایا نہیں، سرے والے پاپا نے کیا کیا؟“

”بہت مشکل ہے، ارے یہ کوئی بہت بات تو رجن لگتا ہے، سر مردہ تو بھیگی بلی بن گیا، اس کے سامنے لو بتاؤ میرے گھر میں سانپ کہاں سے آ گیا۔ یہ بڑا خوفناک اور پھر خود بخود غائب اور پھر ساجدہ کے منہ سے مردانہ آواز ایسی رعب دار کر کیا بتاؤں۔ اب میں تو اس کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، آخری موقع دیا ہے اس نے۔ کہہ دیا ہے کہ اب کچھ کیا تو سزاؤں گی۔“ کمرم کی اماں نے تفصیل بتادی۔

”یہ تو بہت خطرناک بات ہو گئی۔ تم ایسا کرو، کسی مولوی سیانے سے رابطہ کرو۔ وہ کچھ جھاڑ پھونک دے گا۔ سنا ہے کہ کیل دینے سے بھی مکان میں کوئی بلا داخل نہیں ہوتی۔“ شہزادی کی اماں نے مشورہ دیا۔

”نہیں اب میں کچھ نہیں کروں گی اس نے کہہ دیا ہے کہ سزاؤں گا۔“ کمرم کی اماں ڈرتے ڈرتے بات کر رہی تھیں۔

”ڈرو گی تو کام نہیں چلے گا۔ میں کسی حضرات کرنے والے کو تلاش کرتی ہوں۔“

”کر لے بڑھیا تو بھی حضرات کرالے اور کسی سیانے کو تلاش کر لے۔ تیرا بھی حشر خراب کروں گا۔“

دونوں نے یہ سن کر دروازے پر دیکھا تو ساجدہ غصے میں کھڑی تھی اور مردانہ آواز میں بات کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر دونوں تھر تھر کا پنے لگیں۔ شہزادی کی اماں کے ہاتھ کا سر دٹا کب زمین پر گر گیا، ان کو خبر نہ ہوئی۔

دن کا وقت تھا مگر دونوں کا دہشت زدگی کے مارے برا حال تھا۔ زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔

”تو ہی ہے جو روز نئے نئے طریقے بتاتی ہے، اب تجھے بھی دیکھنا ہوگا۔“ اور ساجدہ پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی دونوں کی حالت خراب رہی۔ کافی دیر کے بعد

کی قرارداد سی دی اور پورے محلے نے ان کا ساتھ دیا۔ دوسری رات سب ہوشیار تھے مگر شہرانی کی ساری مرغیاں کٹ گئیں۔ لوجی اب تو سب ہی فکر میں پڑ گئے۔ ایسا کون تھا جو ڈربے میں گھس گیا اور ایک ایک کو کاٹ ڈالا۔

شہرانی کی اماں کے اوسان بگڑے ہوئے تھے۔ نقصان پر نقصان ہو رہا تھا۔ کوئی نہیں سمجھا تھا مگر وہ سمجھ چکی تھیں کہ یہ اسی جن کی کارستانی ہے۔ اب تو انہیں معافی مانگنے کی اور جلدی ہو گئی اور شام کو ہی مکرم کی اماں کے پاس پہنچ گئیں۔

مکرم کی اماں نے دیکھتے ہی کہا۔ ”اب آئی ہو نقصان کروا کر۔“

”ارے بہن کیا کرتی میری حالت خراب تھی، اس ڈربے نہیں آئی کہ پریشانی میں آدمی کا دماغ تو اپنے ٹھکانے ہوتا نہیں، منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

”جاؤ معافی مانگ لو ابھی نہا کر اندر گئی ہے تیاری کر رہی ہے رات کے لئے۔“

”تم بھی بواؤرا اپنی زبان کو کاٹو کرو، مکی بات زبان پر مت لاؤ۔“ شہرانی کی اماں نے کہا۔

”بس کیا کروں، دل جلتا ہے تو منہ سے دھواں نکل ہی جاتا ہے۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

”اچھا میں اندر جاتی ہوں۔“ شہرانی کی اماں نے کہا۔

”دروازے سے پہلے اجازت ضرور لے لیتا۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

شہرانی کی اماں نے دروازے پر دستک دی تو ساجدہ کی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

شہرانی کی اماں بولیں۔ ”ارے میں ہوں شہرانی کی اماں۔“

”ابھی میں مصروف ہوں، رات کے نو بجے آتا پھر ملوں گی۔“ ساجدہ کی آواز آئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، بیٹا پھر آ جاؤں گی۔“ اور وہ واپس

گھر آ گئیں۔

مگر ٹھیک نو بجے پھر انہوں نے دروازے پر دستک دی تو ساجدہ نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

شہرانی کی اماں نے جواب دیا۔ ”میں ہوں تم نے نو بجے بلایا تھا تو آئی ہوں۔“

دروازہ کھل گیا۔ ساجدہ کے بڑے بڑے ہال کاندھے پر پڑے تھے۔ دوپٹہ غائب تھا۔ اس کے منہ سے مردانہ آواز برآمد ہوئی۔ ”کیا بات ہے بڑھپا کیوں آئی ہے۔“

”مجھے معاف کر دو، بڑی بھول ہو گئی مجھ سے، اب میں اپنی زبان بند کر لوں گی۔“ وہ بولیں۔

”بکریاں اور مرغیاں مر گئیں۔ اس لئے معافی مانگ رہی ہو۔“ پوچھا گیا۔

”ہاں یہ بات بھی ہے۔ دوسرے مجھے پتہ نہیں تھا۔ عورتیں ایسے دھوکہ رچاتی رہتی ہیں۔ میں بھی جوانی میں کبھی کبھی کوئی ڈرامہ کرتی تھی، سب ڈر جاتے تھے اور میں خوش ہوتی تھی۔ مگر اب مجھے پتہ چل گیا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔“ شہرانی کی اماں نے منت کی۔

”جلدی عقل آگئی تھی اب تیرے مردوں کا نمبر تھا۔ اچھا جا اور خاموشی سے رہ کسی سے ساجدہ اور میرے بارے میں ذکر مت کرنا۔ دوسرا کوئی کرے گا تو وہ بھی نقصان اٹھائے گا۔“

شہرانی کی اماں نے شکریہ ادا کیا اور جلدی سے کمرے سے نکل آئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھے تو مکرم کی اماں نے اشارے سے پوچھا۔ سب ٹھیک ہے اشارے سے ہی جواب ملا۔ ہاں سب ٹھیک ہے۔ اب میں گھر جا رہی ہوں۔

عورت ذات بھی عجیب چیز ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ عورت کو جھنانا ممکن ہے۔ یہ پل میں تو لہ تو دوسرے پل سیر ہو جاتی ہے۔ یہ اپنی دوسری عورت سے بھی خلوص نہیں رکھتی۔ ایک عورت، دوسری عورت کے سامنے اگر ذرا بھی پر اسرار بن جائے تو دوسری عورت کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ وہ عورت کے اسرار جاننے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔

بات کی ہے اور حمکی دی ہے کہ کسی کو بتایا تو سزا دوں گا۔“
 ”اور تم نے مجھے بتا بھی دیا۔“ شاکرہ نے کہا۔

”ہاں تو تو دور کی ہے، اس لئے بتا رہی ہوں۔ تجھ سے پہلے شہزادی کی اماں پڑوس میں رہتی ہے۔ اس کو بتایا تھا وہ مجھے ایک سیانے کے پاس بھی لے کر گئی تھی۔ وہ سیانا بھی بھاگ کھڑا ہوا اور اس کی مرغیاں اور بکریاں بھی مر گئیں۔ اس نے معافی مانگ کر اپنی جان چھرائی، بہت خطرناک ہے۔“ وہ بولیں۔

”اب تم نے مجھے بتادیا ہے۔ میرا بھی کیا وہ وہی حشر کرے گا۔“ شاکرہ نے ڈر کر پوچھا۔

”پتہ نہیں مگر تو تو بہت دور ہے اس کو کیا پتہ چلے گا۔۔۔۔۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

”اگر وہ واقعی جن ہے تو پتہ چلانا اس کے لئے کون سا مشکل کام ہے۔“ شاکرہ بولی۔

”پتہ ہی تو چلا ہے تو نے کون سا اس کے خلاف کچھ کیا ہے۔“ مکرم کی اماں نے تسلی دی۔

”ارے یہ بات راز کی تھی تم نے اس کا راز مجھے بتادیا۔ یہ بات بھی تو ہے۔“ شاکرہ بولی۔

”ہاں یہ غلطی تو ہو ہی گئی مجھ سے۔“ مکرم کی اماں نے قبول کیا۔

”اچھا اب تم جلدی گھر واپس چلی جاؤ۔ دیر کرو گی تو شاید وہ تم پر شہک کرے۔“ شاکرہ نے کہا۔

”اری سن تو ذرا دھیان رکھنا۔ کوئی ایسا آدمی جو یہ کام کر سکتا ہو بتانا۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

”میں کچھ نہیں کروں گی۔ میرے پاس تو میری دولت جانور ہی ہیں۔ مر گئے تو میں کیا کروں گی۔ اب تم جاؤ۔“

دوسرے دن ساجدہ نے مکرم کی اماں سے کہا۔

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی ہو۔ تم میرے شوہر کے خلاف جا کر باتیں کرتی ہو۔ ارے یہ اس کی مہربانی ہے کہ تم اور تمہارا بیٹا اس گھر میں موجود ہو۔ یہ بھی میری سفارش پر ہے۔ وہ اگر چاہے تو تم کو ریل کی پٹری پر باندھ

اس کا کھانا پینا، سونا سب حرام ہو جاتا ہے۔ ہر وقت بے چینی اس پر سوار رہتی ہے اور جب تک وہ سب کچھ جان نہیں لیتی۔ بے چین ہی رہتی ہے۔ یہاں پر ہی بات ختم نہیں ہوتی۔ جاننے کے بعد اس کے پیٹ میں مروڑ ہو جاتی ہے اور پھر وہ جب تک سارے اسرار کی تے کسی کے سامنے نہ کرے، مروڑ ہوتی رہتی ہے۔

مکرم کی اماں کو زندگی نے ایک سخت سبق پڑھا دیا تھا۔ مگر وہ کیا کرتیں، اپنی عورت پن سے مجبور تھیں۔ شہزادی کی اماں نے تو ڈر کے مارے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پیٹ میں بھی بڑی سخت مروڑ اٹھتی تھی مگر مرغیوں کے خالی ڈبے اور خالی کھونٹوں کو دیکھ کر ڈر جاتی تھیں۔ کئی دفعہ بات زبان پر آتے آتے رہ جاتی تھی۔ شہر سے باہر گاؤں میں مکرم کی اماں کی ایک بچپن کی سہیلی رہتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے پاس چلی گئیں۔ شاکرہ نے پوچھا۔ ”آج تم کیسے بھول پڑیں۔ بغیر بتائے خیریت تو ہے نا۔“

”ارے کیا خیریت، بڑے جنجال میں پڑی ہوں۔“ وہ بولیں۔

”کچھ بتاؤ تو کیا بات ہے؟“ شاکرہ نے پوچھا۔

”تم کو پتہ ہے کہ مکرم کی شادی کی تھی۔ ایک تو یہ دھوکا ہوا کہ لڑکی چھوٹی دکھائی اور بھیر دی بڑی۔ چلو ہم نے اس پر بھی صبر کر لیا۔ مگر وہ جس دن سے آئی ہے نئی مصیبت آگئی ہے۔“ مکرم کی اماں نے کہا۔

”اچھا آگے بتاؤ۔“ شاکرہ بولی۔

مکرم کی اماں نے چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے ڈرتے ڈرتے کہنے لگیں۔۔۔۔۔ ”اس پر ایک جن کا سایہ ہے۔ ارے سایہ کیا ہے وہ اس کی بیوی ہے۔ وہ رات کو آتا ہے۔ اس کے پاس سوتا ہے۔ میں نے خود دونوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔“

”ارے یہ لڑکیاں فراڈ کرتی ہیں۔ مکرم سے اس کا دل نہیں ملا ہوگا، اس لئے جان چھڑانے کو وہ کرتی ہوگی۔“

شاکرہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”نہیں شاکرہ وہ واقعی جن ہے۔ اس نے مجھ سے بھی

اندر پکنے والا آتش گیر مادہ اس سے نادانی کروا تا ہے اور وہ پھر جو کرتا ہے۔ پھر اچھے برے نتائج کی اس کو فکر نہیں ہوتی۔ بس حالت جنوں میں وہ گزر رہا ہے۔ مکرم علی اسی حالت جنوں میں صبح ہی صبح سولاف خریدنے کے بہانے نکل گیا اور کالے حافظ جی کے پاس چلا گیا اور ان سے اپنی پوری کہانی بیان کر دی۔

کالے حافظ جی نے کہا۔ ”میاں تم واقعی ایک مصیبت میں گرفتار ہو مگر میں کچھ نہیں کر سکتا گا۔ جب یہ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی یہ کام نہیں کیا۔ تم ایسا کرو، گورے گاؤں چلے جاؤ۔ وہاں پر میاں شرف الدین ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام کرتے ہیں۔ شاید تمہارا کام ہو جائے۔“ اور مکرم علی وہاں کے لئے روانہ ہو گیا۔ میاں شرف الدین کو بھی اس نے پوری کہانی بیان کر دی۔

شرف الدین سن کر بولے۔ ”بھائی میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کرتا، کیونکہ مجھے یہ معاملہ ڈرامیٹر حافظ آ رہا ہے۔“

”آپ کوشش تو کریں۔“ مکرم نے کہا۔ اور وہ میاں شرف الدین کو لے کر فرخ آباد آ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اس نے میاں جی کو اپنے کمرے میں ٹھہرا لیا تھا۔ میاں جی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مکرم علی بھی کمرے میں موجود تھا۔ رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ دروازہ بند تھا۔ مکرم اور میاں جی دونوں اندر تھے۔ دروازہ دھڑام کر کے کھلا اور ساجدہ دندانہ اندر آ گئی اور بولی۔ ”کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑا ہے بڑھے۔ یہ تو زرا گدھا ہے، اس کی باتوں میں آ گیا ہے۔ چل اٹھ اور بھاگ جا۔ میں بلا وجہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔“ مگر میاں شرف الدین اپنی جگہ جیسے بیٹھے رہے تو وہ پھر بولی۔ ”تو جو پڑھ رہا ہے وہ میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔“ اور اس نے میاں جی کو ایک ہاتھ میں اٹھالیا اور سر سے اوپر کر کے زمین پر دے مارا۔ زمین پر گرتے ہی ان کے سر سے خون جاری ہو گیا۔

ساجدہ نے پھر ان کو اٹھالیا اور دیوار پر دے مارا۔ اب میاں جی کے سارے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے اور وہ آخری پگلی لے

کر ڈال آئے اور تم دونوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ۔ اب تم اکیلی اس گھر میں رہو۔ میں نے اپنا انتظام کر لیا ہے۔ مکرم میرے ساتھ جائے گا۔ آخر مجھے کسی ملازم کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرے مجھے اس کی آڑ بھی چاہئے۔ میرا شوہر تو وہ نہیں مگر نوکر تو ہے۔ مگر کاسودا سلف لانے والا۔

تم اسی گھر میں رہو اور اپنی زبان بند رکھو۔ اگر زبان کھولی تو سب سے پہلے مکرم کی جان جائے گی۔ اس کے بعد تمہارا کچھ ہوگا۔ اور پھر مکرم اپنی بیوی کو لے کر نہر والے جنگل میں چلا گیا۔ یہ جنگل شہر کی نکال پر نہر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کو کسی انگریز کرنل نے بنوایا تھا مگر زیادہ نہ رہ سکا۔ اس کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا تھا۔ میرے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کرنل کی بیوی کا منہ چڑھا تھا۔ کرنل کے قتل کے بعد کرنل کی روح رات بارہ بجے کے بعد چائے ڈبل روٹی مانگتی پھرتی تھی اور یہ جنگل ویران ہو گیا تھا۔ مکرم نے ساجدہ کے حکم پر اس جنگل کی صفائی کروائی اور رہنے کے قابل بنالیا اور دونوں یہاں آ گئے۔ مکرم نے بھی چائے ڈبل روٹی کی آواز سنیں تھیں۔ ڈر بھی لگا تھا۔ مگر اس کے کمرے میں کرنل کی روح نہیں آئی، باہر سے آوازیں دیتی گزرتی۔

دنیا کی نظر میں مکرم ساجدہ کا شوہر تھا اور جب سے اس جنگل میں آتا تھا۔ لوگ اس کو بہت بہادر سمجھنے لگے تھے مگر وہ نہ بہادر تھا نہ ساجدہ کا شوہر۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا، پلان بناتا رہتا۔ اس کے اندر آگ سی جلتی رہتی۔ لاوا ابلتا رہتا مگر جب خود پر نظر پڑتی تو وہ رو پڑتا۔ ”میں کتنا مجبور ہوں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں بے غیرتی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس لئے کہ میں کمزور ہوں۔“

آخر وہ انسان تھا۔ روزانہ بیوی کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں روز دیکھتی تھیں اور دل حسرتوں کا شکار بن جاتا تھا۔ اس کی ذات کے لئے جلنا اور کڑھنا رہ گیا تھا۔ وہ روز اپنے جذبات کی قبر کھودتا اور ان کو اس میں دفن کر دیتا۔ مگر کب تک وہ یہ کرتا۔ انسان نادانی کرتا ہے بھی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی حالات اس سے نادانی کراتے ہیں۔ وقت اور حالات ٹھن محرومیاں اور اندر ہی

کر سکتا ہو گئے۔ پھر ساجدہ مکرم کی طرف بڑی اور بولی۔
 ”میں انہوں کے ساتھ برا نہیں ہوں، اس
 بوڑھے کی جان تیری وجہ سے گئی ہے۔ تجھے زندہ رکھنا
 میری مجبوری ہے۔ ورنہ تو اس لائق نہیں ہے۔ اب کے
 اگر تو نے کوئی حرکت کی تو ہاتھ بڑ توڑ کر چور ہے پر
 بٹھا دوں گا۔ بھیک مانگتے رہتا۔“ اور ساجدہ چلی گئی۔
 کمرے میں میاں جی کی لاش پڑی تھی۔ مگر مکرم کو سخت نیند
 آرہی تھی اور پھر وہ فرش پر ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔
 صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ فرش صاف تھا۔
 لاش تو کیا کسی قسم کے آثار نہیں تھے۔ مکرم بڑا حیران ہوا۔
 یا اللہ یہ کیا میرا خواب تھا۔ میرے سامنے یہ واقعہ ہوا میں
 سو گیا اور لاش اور سب نشانات ختم ہو گئے۔

چاہتا۔ مکرم پھر ساجدہ کی غلامی کرنے لگا۔ روز اپنے جذبات
 کی قبر بنا رہا۔ قبریں بڑھتی گئیں اور مکرم ایک ویران قبرستان
 بن گیا اور پھر اس کو قبرستان اچھا لگنے لگا۔ شہر کے آخری
 سرے پر پرانا قبرستان تھا۔ وہ اس میں جانے لگا۔ آج بھی وہ
 بے وجہ قبرستان کا چکر لگا کر سرک پر آیا ہی تھا کہ اس کو ایک
 شخص نظر آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوٹی تھی۔ سینے پر
 بڑے بڑے سیاہ بالوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا۔
 کشادہ پیشانی پر صندل اور سندور کی آڑی ترچھی اور بل کھاتی
 لکیریں نظر آرہی تھیں۔ گلے میں موٹے دانوں کی مالائیں
 پڑی تھیں اور کچھ خشک پھولوں کے ہار گلے میں جمول رہے
 تھے۔ وہ اچھا ہماری بھر کم شخص تھا۔ وہ اچانک مکرم کے
 سامنے آ گیا اور بولا۔ ”یہاں کیا ملے گا، بار بار آتا ہے۔“
 ”مجھے پتہ ہے مردے کسی کو کیا دیں گے۔“ مکرم
 نے جواب دیا۔

”پھر کیوں وقت برباد کرتا ہے۔ مجھے بتا جو تیرے
 من میں ہے، کل کر بتا دے۔ مجھ سے پردہ مت کر، شاید
 تیری قسمت کا لکھا پورا نہ ہو۔“ میراگی نے کہا۔
 ”میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟“ مکرم نے پوچھا۔
 ”ایسے سوال مت کر، جس کے جواب دینے نہ
 جائیں۔ میں تیرے چہرے پر کھٹناؤں کے بادل دیکھ رہا
 ہوں، دین دھرم سب بعد کی باتیں ہیں تو ایک انسان ہے۔
 میری طرح شاید میں تیری کچھ مذکر سکوں۔ بتا دے۔“
 میراگی نے کہا۔

”کیا بتاؤں، بتاؤں گا تو مارا جاؤں گا، نہ بتاؤں تو
 بھی زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ میرے چاروں طرف اندیرا
 ہے۔ موت ہے، ذلت ہے، میں کیسے بتاؤں۔“ مکرم نے
 رو کر کہا۔

”جب ہر طرف موت کا اندیرا ہے تو پھر اس طرف
 چل، جدھر کچھ زندگی کے آثار نظر آئیں۔ میں تیرے ساتھ
 ہوں، میں تیرے ساتھ موت کی طرف جاؤں گا۔ میری
 زندگی بھی اسی مقام پر ہے کہ جہاں میرا مرنا جینا برابر ہے۔
 کوئی میرے لئے رونے والا نہیں، دنیا کے کوئی کام میرے

شام کو آیا تو کسی نے بازار میں بتایا کہ گورے
 گاؤں کے میاں شرف الدین کو کسی نے ان کے گھر میں قتل
 کر دیا ہے اور ان کا قتل کسی بھی تھہارے سے نہیں ہوا ہے۔
 ان کو زمین پر اور دیوار سے ٹکرا کر مارا گیا ہے۔ ایک روز
 پہلے ان کے پاس ایک آدمی آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گئے
 بھی تھے۔ مگر وہاں کب آئے، کسی کو پتہ نہیں ہے، پورا شبہ
 اسی آدمی پر ہے۔ وہ گھبرا کر فوراً بنگلے پر آ گیا۔ ساجدہ نے
 اپنی آواز میں کہا۔
 ”درا بھی گڑ بڑ کرو گے تو تمہارا نام پولیس کو بتا دیا
 جائے گا۔“

اب تو یہاں مکرم کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ ایک
 طرف جیل کی کوفری اور ایک طرف اذیت ناک زندگی
 جہاں روزمرنا اور روز بھینا پڑتا ہے۔ مگر زندگی بہت پیاری چیز
 ہے۔ حالات لگام کھینچ کر ٹیش دلاتے ہیں اور بات انسان
 کے پس سے باہر ہو جاتی ہے اور وہ حالت جنوں میں وہ کر
 گزرتا ہے جو اس کے بس سے باہر ہوتا ہے اور نقصان اپنا ہی
 کرتا ہے۔ اشتعال اور بارود میں زیادہ فرق نہیں ہے۔
 دونوں میں دھماکے ہوتے ہیں۔ دونوں جانی پھیلاتے
 ہیں۔ دونوں ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔
 مجبوری انسان سے وہ کرتا ہے جو انسان کرنا نہیں

نہ ہونے سے بند نہیں ہوں گے۔“ حیرا کی بولا۔

ہوتے۔ وہ طاقت جسے ماورائی طاقت کہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر قدرتی طور پر ہوتی ہے۔

بس طاقت کو چگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے نفس کشی لازمی ہے۔ اپنے نفس کو خود آزمائش میں ڈالنا پڑتا ہے اور پھر اس آزمائش پر پورا اترنا پڑتا ہے۔ اس طرح انسان کی پوشیدہ طاقتیں ابھر کر سامنے آتی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ عبادت کے ارتکاز سے ان طاقتوں کو جلا بخشی جاتی ہے۔ تب جا کے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ کسی ہوائی مخلوق کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو سکے۔

دوسری بات اور میری یاد رکھنا، کسی کی ظاہری حالت پر کبھی نہ جانا، پاگل نظر آنے والا پاگل نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے کو پاگل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کسی دیوانے سودائی کو پتھر نہ مارنا کہ وہ پتھر پلٹ کر حیرتی گیر پھوڑ سکتا ہے۔ اب تو جا بے فکر ہو جا میں خود آؤں گا۔“

اور کرم واپس چلا آیا۔ دو دن گزر چکے۔ رات کو ساجدہ نے کرم کو اپنے پاس بلایا اور کہا: ”میں جا رہا ہوں، تو اپنے گھر جا۔“ اور اسی رات ساجدہ وہاں سے چلی گئی۔

سویرے حیرا کی بابا آگئے۔ آتے ہی بولے۔ ”بھاگ گیا۔ جانے گا کہاں؟“ پھر کرم سے بولے۔

”تو گھر جا، تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔“ اور کرم گھر چلا گیا۔

حیرا کی پھر قبرستان میں اسی قبر پر آگئے۔ ”میتا تو وہ کہاں بھاگا ہے؟“ انہوں نے کسی سے پوچھا۔ ان کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔ کچھ دیر سنتے رہے، پھر بولے۔

”دھند کے پار نظر نہیں آیا۔ خیر کوئی بات نہیں، میں پتہ کرتا ہوں۔“ اور وہ اٹھ کر ایک بہت پرانے برگد کے درخت کے نیچے چلے گئے۔ یہاں پر بھی قدیم قبریں بنی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر وہ ایک قبر کے کنارے کھڑے رہے اور پھر قبرستان سے باہر نکل گئے۔

اب ان کا رخ جھانسی روڈ کی طرف تھا۔ ان کی چال عجیب تھی۔ زمین پر چلتے تو وہ نظر نہیں آتے تھے اور حیرت انگیز طرہ پر وہ کچھ ہی دیر میں جھانسی شہر میں داخل ہو رہے

اور کرم نے پوری کہانی حیرا کی کونسا دی۔ حیرا کی نے پوری بات سکون سے سنی اور پھر بولا۔ ”زندگی بہت پیاری چیز ہے۔ اس کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ صرف ایک بار پتی ہے۔ موت کا تصور ہی بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ مگر کچھ لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کسی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اب تو گھر جا، میں دیکھ رہا ہوں، کچھ لگا ہیں اٹھ رہی ہیں۔ میں آؤں گا تیرے پاس۔“ اور حیرا کی قبرستان کے اندر چلا گیا۔

تین دن گزر گئے حیرا کی بابا نہیں آیا تو وہ پھر قبرستان کی طرف چلا گیا۔ حیرا کی ایک پرانی قبر پر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا خاموش۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر حیرا کی نے اس کی طرف دیکھا، مسکرایا اور بولا۔

”بہت بے چینی ہے۔“ کرم خاموش رہا تو وہ پھر بولا۔

”نیاری کرنا ہوتی ہے۔ وزن کرنا پڑتا ہے۔ حساب کتاب کی ذرا سی غلطی پچھتاوے کو ختم دیتی ہے۔“

”میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا۔“ کرم نے کہا۔ ”دو سالے اس سے ڈر کر بھاگ گئے۔ ایک میرے سامنے مارا گیا۔ وہ سب جانتا ہے، وہ اس کا تو ذکر لیتا ہے۔ جس جنگل میں رہتا ہے، وہاں پر ایک انگریز کرنل کی روح رہتی ہے۔ اس کی آواز میں نے سنی تھی ہے مگر وہ روح اس کے قریب نہیں جاتی۔ میں وہاں رہتا ہوں۔ میرے قریب بھی اس کے ڈر سے نہیں آتی۔ اندھیرے میں آپ کا کچھ نقصان نہ ہو، میں یہ چاہتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، وہ لا دین نہیں ہے۔ طاقت بھی رکھتا ہے۔ مگر بھٹکا ہوا ہے۔ اگر دھرم پر ہوگا تو وہ یہ حرکت نہ کرتا۔ دنیا کا ہر مذہب طاقت ور ہوتا ہے۔ ہر مذہب عبادت کی تلقین کرتا ہے اور ارتکاز سے انسان کی خفیدہ پوشیدہ قوتوں کو جلا پاتی ہے۔ انسان بہت طاقتور ہے۔ انسانی طاقت کے مظاہرے جو غیر انسانی نظر آتے ہیں، وہ غیر انسانی نہیں

کیوں شادی کی۔ وہ عورت صرف میری بیوی ہے۔ مجھ سے خوش ہے۔ میری وفادار ہے۔“ آواز آئی۔

بیراگی بولا۔ ”تیری بات اگر میں مان لوں تو بھی تو غلطی پر ہے۔“

”میں نے کیا غلطی کی ہے؟“ آواز آئی۔

”وہ عورت ایک انسان ہے۔ اس پر کوئی انسان ہی اپنا حق جتا سکتا ہے تو قوم جنات ہے۔ کیا تیری قوم میں تیرا جوڑ نہیں ہے تو پھر کیوں کسی کے حق پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔“ بیراگی نے پوچھا۔

”وہ میری محبت ہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

آواز آئی۔

”تو کلمہ گو ہے۔ اس لئے میں وہ نہیں کرنا چاہتا جو

میں کر سکتا ہوں۔“ بیراگی نے جواب دیا۔

مگر پھر کچھ جواب نہیں آیا۔ بیراگی نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اب تو بھاگتا ہی رہے گا۔“

رات کو یہی بیراگی پھر روانہ ہو گئے۔ اب ان کا رخ گوالیار کی طرف تھا۔ یہاں پر بھی ایک پرانا قلعہ ہے۔ وہ

سیدھے ادھر ہی چلے گئے۔ اندر آتے ہی وہ بولے۔ ”کچھ بات کرنا ہے۔ اجازت دو تو بات کروں اندر آ کر۔“ اور پھر وہ

اندر چلے گئے۔ گری ہوئی برتی پر بیٹھ کر بولے۔ ”ایک میرا چور ہے، وہ کچھ چرا کر بھاگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے پاس

آئے، تم لوگوں کی قوم کا ہے کیا تم اس کو پناہ دو گے۔“

اچانک ان کے سامنے ایک سفید ریش بزرگ نمودار ہو گئے اور بولے۔ ”اگر وہ چور ہے تو ہم اس کو گرفتار کر کے آپ کے حوالے کر دیں گے۔“

”بس مجھے یہی پتہ کرنا تھا۔ آپ نے میری امید

کے مطابق جواب دے کر میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ اور وہ باہر آ گئے۔ وہ ہر شہر میں

اس کا راستہ روکتے گئے۔ مگر پھر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ دلی، آگرہ میں بڑی آبادی جنات کی ہے مگر وہ وہاں پر نہیں تھا۔

ساجدہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ بیراگی کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ بیراگی کی علمیت اور قابلیت کو وہ سمجھ گیا تھا اور اسی انداز

تھے۔ اتنا زیادہ فاصلہ اتنی جلدی اور بغیر کسی سواری کے انہوں نے طے کر لیا۔ یہاں پر بھی رکے نہیں۔

اب ان کا رخ جھاننی کے قلعہ کی طرف تھا۔ اب شام ہو رہی تھی۔ قلعہ کے دروازے بند تھے۔ مگر بند

دروازے ان کو روک نہ سکے اور وہ اندر آ گئے۔ قلعہ کے اندر آ کر انہوں نے کہا۔

”معاف کرنا دو ستوا ضرورت سے آیا ہوں۔ زیادہ نہیں روکوں گا۔“ اور وہ سرنگ کی طرف چلے۔ مگر سرنگ کے

اندر جانے سے پہلے ہی پلٹ گئے۔ بولے۔ ”بھاگ لے، کتنا بھاگے گا۔“

اور وہ قلعہ سے باہر آ گئے۔ اب ان کا رخ جھاننی کے قدیم قبرستان کی طرف تھا۔ رات میں قبرستان پر سناٹے

کا راج تھا۔ دور دور کسی انسان کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ ابھی زیادہ

دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک بھاری پتھر آسمان کی طرف سے ان کے سر کی طرف آیا۔ وہ ایک طرف تیزی سے سرک گئے اور

وہ پتھر زمین سے ٹکرا کر مٹی کی طرح کھڑ گیا۔ ”چھپ کر دوار کرتا ہے مردود۔“ وہ بولے۔

”تو نے بھی تو ایسا کیا تھا۔“ اندھیرے میں آواز آئی۔

”میں نے تیری جان لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔“ بیراگی نے جواب دیا۔

”تو کیا سمجھتا ہے میں تیرا علم نہیں جانتا۔ تو جو پڑھتا ہے وہ مجھے بھی آتا ہے۔ تیرے پاس جو کچھ ہے، وہ میں سینکڑوں سال سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ تو میرا کچھ نہیں کر

پائے گا۔“ آواز آئی۔

”تو بھٹک گیا ہے۔ ذرا سوچ، غور کر، تو نے کسی کی بیوی پر پناہ جائز قبضہ کیا ہوا ہے۔“ بیراگی نے کہا۔

”تو جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے اس عورت سے پہلے شادی کی تھی۔ پھر ایک ملک نے مجھے باندھ دیا اور اس

دوران اس آدمی نے اس عورت سے شادی کر لی۔ میری تو وہ بیوی پہلے بنی تھی۔ اس آدمی نے اس عورت سے بعد میں

میں تو ذکر رہا تھا۔ مقابلہ کرنے سے کتر رہا تھا مگر اپنا بچاؤ
خوب کر رہا تھا۔

دلی میں بیراگی سے میری ملاقات اچانک ہو گئی۔
میں بڑے مزار پر حاضری دینے کے بعد مقبرہ ہمایوں پر بھی
جاتا ہوں۔ مقبرے کے دروازے پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ جسم
سے ننگا تھا۔ صرف ایک دھوتی اس کا لباس تھا۔ میں اس کے
قریب گیا تو مجھے اندازہ ہوا وہ شخص بیمار ہے۔ اس کا چہرہ سرخ
ہو رہا تھا اور سخت بخار اس کو چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی
نبض دیکھی اور ایک تانگے میں ڈال کر دو خانے لے آیا اور
اس کا علاج شروع کر دیا۔ وہ اب تک خاموش تھا۔ میں نے
جو دوائیں اس کو دیں، اس سے شام تک اس کا بخار اتر گیا۔
کمزوری البتہ بہت تھی مگر بیماری اب زیادہ نہیں تھی۔ میں
نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

”بابا آپ آرام کرو۔ میں پرہیزی کھانا آپ کو
دیتا ہوں۔ ایک دو روز میں آپ ٹھیک ہو جاؤ گے۔“
”بہت مہربان ہے تو میری جسمانی بیماری تو ٹھیک
کر دے گا۔ مگر میرے اندر جو آگ ہے وہ کس طرح ختم
ہوگی؟“ وہ بولا۔

”آپ پہلے جسمانی بیماری سے نجات پالیں۔ پھر
دوسری کو دیکھیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس بیماری کا علاج تو مجھے خود کرنا ہوگا۔ بیردنی
بیماری اندر کی بیماری کا پرتو ہے۔“ وہ بولا۔

”ابھی آپ آرام کریں۔ آپ کے جسم کو اس کی
ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”ضرورت تو ہے مگر ضرورت پوری کب ہوتی ہے۔
ایک کے بعد دوسری سر ابھار دیتی ہے، کرتے رہو پوری۔“

”یہ بات تو آپ کی درست ہے، مجھے ذرا خدمت کا
موقعہ تو دیں۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں تو خدمت گار ہے۔ خدمت تو
کرے گا نفی۔“ وہ بولے۔

صبح میرے ساتھ رولو کا بھی تھا۔ رولو کا کو دیکھ کر وہ
بولے۔ ”میری حالت دیکھ رہے ہو۔ بہت دوڑا ہوا ہے اس

نے، پردہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔ میرے علم کی کاٹ کر لیتا ہے۔
اب میں اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ یہ انسانوں کی تو بین
ہے۔ میں اپنی آگ میں خود مل رہا ہوں۔ ایک دفعہ پکڑ لیتا
تو کچھ بات ہوتی مگر میں پکڑ ہی نہیں پایا۔“

”بابا تم یہ بتاؤ، کون ہوا اور کس کے پکڑنے کے چکر
میں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تو حلیم ہے، جسمانی بیماری کو سمجھتا ہے، میں
بیراگی ہوں، پھر نا میرا کام ہے۔ کسی کی بگڑی، کسی کی
مصیبت اپنے سنے کر لینا میرا پیشہ ہے۔ مگر اس دفعہ بری طرح
خود سے نا امید ہوا ہوں۔ وہ ایک نہایت ہوشیار جن ہے۔
اس نے ایک عورت پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس کو لے کر فرار
ہے۔ وہ کلمہ گو ہے، میرا تو ذکر لیتا ہے اور اپنا دفاع بھی خوب
کرتا ہے۔ اب میں اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ کیا پتہ وہ
میرے قریب ہی ہوا اور میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہو۔“

رولو کا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”آپ نا امید نہ ہوں،
برے کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ آپ دلی میں آرام کریں۔ میں
آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔ انسان سے بڑھ کر کوئی
طاقتور نہیں ہے۔“ پھر ذرا رک کر رولو کا نے کہا۔

”میری ایک درخواست ہے، اجازت ہو تو کہوں؟“
”ہاں ضرور کہو۔“ بیراگی نے کہا۔

”میرا کام کرنے کا انداز ذرا الگ ہے۔ جیہ داشن
ہو، ویسا ہی وار کرتا ہوں۔ میرے کام میں مداخلت نہ کرنا۔
ہو سکتا ہے کہ میرا طریقہ آپ کے طریقے سے الگ ہو مگر
آپ صرف دیکھنا۔“ رولو کا نے کہا۔

”میں حیرانی میں سمجھ رہا ہوں۔ تو کسی راستے سے
چل، سمت تو یک ہی ہے۔ منزل تو یک ہی ہے۔ پھر بھلا
مجھے کیا پڑی ہے کہ تجھے روکوں، ٹوکوں۔ میرے نصیب مجھے
دلا لائے ہیں۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آ گئی ہے۔“

رات کھانے کے دوران میں نے رولو کا سے
پوچھا۔ ”یہ بابا کس کو تلاش کر رہا ہے؟“

”یہ تو آپ نے سنا ہے کہ وہ ایک جن ہے اور کسی
عورت کو لے کر فرار ہوا ہے۔ اس قسم کی حرکتیں عموماً بے دین

جنت کرتے ہیں اور بڑی آسانی سے پکڑے جاتے ہیں۔
مگر میرا گی بابا بتاتے ہیں کہ وہ نہیں پکڑا گیا اور میرا گی بابا کو
تھکا دیا اس نے۔“ ردولوکا نے جواب دیا۔

”جنت کے وجود کے بارے میں کچھ بتاؤ؟“ میں
نے پوچھا۔

”جنت کا وجود کوئی قصہ کہانی نہیں ہے۔ مذہبی
کتب میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ انسانوں کی طرح صاحب
ایمان اور کافر بھی ہوتے ہیں اور بے دین بھی۔ آج بھی ان
کے بارے میں مشہور ہے اور کل بھی تھا۔

انسان اپنی کمزوریوں اور خود میں روحانی طاقتوں کی
کئی کئی وجہ سے ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ اگر انسان اپنے حواسوں کو
مضبوط کر لے اور دلوں کو گناہوں کی آلودگی سے پاک کر لے،
احساسات کو پاک اور خواہشات کو مارے نفس پر کنٹرول
کر لے تو دیکھتا کوئی مشکل نہیں ہے۔ نفس کو مارنے کے لئے
عبادت و ریاضت ضروری ہے۔“ ردولوکا نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہوا کہ تمہاری ڈیوٹی شروع ہوگئی۔“
میں نے کہا۔

”میں تو مزدور ہوں۔ مزدوری کروں گا تو مزدوری
ملے گی۔“ ردولوکا نے جواب دیا۔

”تمہاری ہر بات میں راز ہوتا ہے۔ اب میں کچھ
تمہاری زبان سمجھنے لگا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”دوستوں کی باتیں دوست ہی سمجھا کرتے ہیں۔“
ردولوکا بولا۔

”اچھا اب کیا ارادہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب میں فرخ آباد جاؤں گا۔ ابتدا جہاں سے
ہوئی ہے۔“ ردولوکا نے بتایا۔

”اور اب پھر کب ملاقات ہوگی۔“ میں نے پوچھا۔

”میں آپ سے رابطہ کروں گا۔“ ردولوکا نے جواب
دیا۔ اور ردولوکا فرخ آباد روانہ ہو گیا۔

فرخ آباد میں، میں مکرم کے گھر چلا گیا۔ میرا لباس
اور بول چال ایک عام دی والے کی تھی۔ ”میاں تم ہی ہو

مکرم۔“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”ہاں جی میں ہی ہوں۔“

”تو بھائی میاں میں دلی سے آیا ہوں۔ تم مجھے نہیں
جاننے مگر میں جانتا ہوں۔ میرا گی بابا نے بتایا تھا۔ میرا گی بابا

تو بیمار ہیں۔ میں پتہ کرنے آیا ہوں، تم یہ بتاؤ کہ تمہاری جورو
کا کچھ پتہ چلا۔“ ردولوکا بولا۔

”نہیں کچھ پتہ نہیں چلا۔ البتہ ایک رات وہ جن
آ گیا تھا میرے پاس۔“ مکرم نے کہا۔

”تم سے بات کی اس نے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بڑے رعب سے اس نے کہا۔ ساجدہ کے
بارے میں کسی کو کچھ نہ کہنا، کوئی پوچھے تو کہنا میسے گئی

ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہا تو ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو
کھلا دوں گا۔۔۔۔۔۔“ مکرم نے کہا۔

”تو پھر کسی نے تم سے پوچھا، ساجدہ کے بارے
میں؟“

”عورتوں کو تو کرید ہوتی ہی ہے، پوچھا تھا اور میری
سسرال جا کر ساجدہ سے وہ مل بھی آئی تھیں۔“ مکرم نے

جواب دیا۔

”کیا وہاں تمہیں؟“ ردولوکا نے کہا۔

”ہاں جی عورتیں بتاتی تھیں، وہ وہیں پر تھی اور خوش
نظر آتی تھی۔“ مکرم نے کہا۔

”تم تو کہتے تھے اس کو جن لے گیا تھا۔“ میں نے
کہا۔

”مجھے تو یہی پتہ تھا۔“ مکرم بولا۔

”تم نے جا کر خود اس کو نہیں دیکھا۔“ میں نے کہا۔

”ڈر کے مارے نہیں گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ جن بھی
وہیں ہوگا۔“

”تمہاری سسرال کتنی دور ہے۔ میرے ساتھ چلو،
پتہ کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

مکرم ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے
معاف کر دو۔ تم خود اگر پتہ کرنا چاہتے ہو تو کرو۔“ اور میں
اس کی سسرال چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مکرم خود ساجدہ کو

ہے۔ ”شاکی مابولہ۔“

”ہم تم کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“
سردار سے پوچھتا ہوگا۔

”پوچھو، میں انتظار کرتا ہوں۔“

”تم اسی جگہ انتظار کرو، سردار ایک میلے میں گیا ہوا ہے۔ رات کو آئے گا۔“

”میں تھکا ہوا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ شاکی
 مانے لگا۔

”اسی جگہ رکنا ہو گا تم کو۔ اگر اکیلے ہوتے تو اندر آ جاتے تمہارے ساتھ یہ آدم ذوالعورت ہے۔ ہم اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سردار یہ کام کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں یہیں پر بیٹھ جاتا ہوں۔“ اور شاکی اویں پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ساجد بھی بیٹھ گئی۔ اس کے گرد گرد اور جن بھی بیٹھ گئے۔ شاکی مانے ساجد سے کہا۔

”ہمارے یہاں سردار کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ سردار کا حکم سب مانتے ہیں۔ ان کو جو حکم ملا ہے، یہ وہ کر رہے ہیں مگر نہ کہ سردار کے آئے کے بعد میں سردار کو ماننا لوں گا۔“

آدمی رات کے بعد سردار آگیا اور شاکی ما کو دیکھ کر
 لا۔ ”تو کون ہے اور یہ عورت تیرے ساتھ کون ہے؟“

”سردار میں شاکي ماہوں۔ دين دارہوں۔ بے
 دين نہيں ہوں اور مدد کے لئے تمہارے پاس آيا ہوں۔“
 اکی مانے جواب ديا۔

”اچھا بول کیا بات ہے؟“ سردار نے پوچھا۔

”یہ عورت میری بیوی ہے۔ میرا قبیلہ شای قلعہ
ہو اور میں آباد ہے۔ میرے دشمن بہت ہیں۔ اتنی دور اس کو
لے کر جانا مشکل ہو رہا ہے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

سردار نے غور سے اس کی بات سنی اور کہا: ”یہ آدم
جو عورت، تو آگ یہ خاک، حیر اور اس کا ملن تو ہو ہی نہیں
سکتا تو اگر اس کو اپنے قبیلے تک لے کر چلا جائے گی تو بھی وہ
اس عورت کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو نے اپنی زندگی
خراب کی ہی ہے۔ اس عورت کی زندگی بھی خطرے میں

لے کر آیا تھا۔ دو روز وہ لوگ رہے اور پھر چلے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ جن مکرم کے بھیس میں گیا تھا۔

میں وہاں آگیا۔ تو پہچان گیا کہ وہ فرخ آباد سے جا چکا تھا۔ اب میرا رخ اب قہر کی طرف تھا۔ کیونکہ ایک مکرم کے جانے والے نے بتایا تھا کہ مکرم اپنی جورو کے ساتھ قہر کی گاڑی میں سوار ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مکرم کا بہرہ و اختیار کئے ہوئے ہے۔

گاڑی رات کو ہاترس میں پہنچی تھی۔ میں اپنے
 ذریعہ سے ہاترس روانہ ہوا اور گاڑی اسٹیشن پر پہنچنے سے کچھ
 پہلے پہنچ گیا اور روپوشی کی حالت میں ایک ایسے مقام پر ٹیک
 کیا، جہاں سے مسافر جا رہے ہیں۔

میں نے دیکھا، ایک برقعہ پوش عورت کے ساتھ
مکرم گیٹ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی
گیٹ سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں مجھے نہیں دیکھ پائے تھے۔
میں بھی اسی تانگے میں سوار ہو گیا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر
تھے اور خاموش تھے۔ تاہم ایک بہت بڑی حویلی کے سامنے
انہوں نے رکوا تو تانگے والے نے حیرت سے کہا، ”یہاں
اتر دے رتو دیران حویلی ہے۔“

مکرم نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو۔“

اور کرایہ دے کر وہ دفینوں اتر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اتر گیا۔ حویلی واقعی ویران تھی مگر جو آبادی اس میں تھی وہ ویرانہ ہی پسند کرتی ہے۔

حویلی کے اندر جاتے ہی اس کو پکڑ لیا گیا۔ اس کے
مجھے انسانوں جیسے ہی نظر آ رہے
تھے۔ شاید وہ ایک انسان کے سامنے اپنی اصلی صورت میں
نہیں آئے تھے۔

ساجدہ گھبرا گئی تو وہ بولا۔ ”تم گھبراؤ نہیں، یہ میری قوم کے لوگ ہیں۔“

”تیرا نام کیا ہے اور کیوں آیا ہے؟“ ایک نے آگے
 بڑھ کر کہا۔

”میں شاکی ماہوں..... یہ میرے ساتھ میری بیوی

ڈال دی ہے۔ اگر تو کافر ہوتا تو میں تجھے اسی وقت سخت سزا دیتا۔ تجھے تیرا قبیلہ ہی سزا دے گا۔ میں صرف یہ کروں گا کہ تجھے ان کے حوالے کر دوں گا اور اس عورت کو اس کے گھر پہنچا دوں گا۔ تم جیسے جنوں نے ہم سب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔“ اور شاکی ما کو باندھ لیا گیا۔

پھر ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تو اس کے ساتھ خوشی سے ہے یا اس نے زبردستی تجھ پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم دونوں کا ملاپ ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہمارے قانون سے نہ انسانوں کے قانون سے اس لیے تجھے میں تیرے گھر پہنچا دیتا ہوں۔“ سردار نے کسی کو اشارہ کیا اور دو جن ساجدہ کو لے کر گیٹ سے باہر چلے گئے۔ شاکی ما کو باندھ کر ایک کوفٹری میں ڈال دیا گیا اور سردار نے حکم دیا۔ ”کل صبح اس کو لاہور روانہ کر دیا جائے۔“

اور میری واپسی ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا، روٹو کا نے روٹو اسنادی۔

☆.....☆.....☆

کائنات کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا۔ تو پھر اس کے لاکھ رازوں کے بارے میں کوئی کیا جان سکتا ہے۔ انسان کا ذہن کائنات کی وسعت کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔

کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ وقت کی کیا کہانی ہے۔ وقت کیا کیا تماشے دکھا سکتا ہے۔ ہزاروں طلسمات اس کائنات میں بھرے پڑے ہیں۔ سب کچھ رب کائنات کی کارگیری ہے۔ ہماری جیسی نہ جانے کتنی پوشیدہ دنیا میں اس کائنات کے اندر ہیں۔ ان میں بسنے والے کس قسم کے ہیں۔ ان کے چہرے کیسے ہیں۔ ہم اپنے تصور سے ان کی خیالی تصویریں بناتے ہیں اور اس پوشیدہ دنیا کے اسرار و رموز ہمارے ذہن میں نہیں آتے۔

پیشے کے لحاظ سے وہ ایک سپاہی تھا۔ مگر وہ جنگلات کا سپاہی تھا۔ رہتا بھی جنگل کے کنارے تھا۔ اس نے جس لڑکی سے شادی کی وہ بھی جنگلی زندگی پسند کرتی تھی۔ اس کا

گاؤں بھی جنگل کے کنارے واقع تھا۔ جنگل کے قریب رہنے والے جنگلی جانور سے نہیں ڈرتے، وہاں کی عورتیں بھی بہادر ہوتی ہیں۔ وہ رہنے والا تو کرنال کے ایک گاؤں کا تھا مگر محکمہ جنگلات میں فاریسٹ گارڈ کی نوکری کے لئے یہاں آ گیا تھا۔ وہ مسلمان تھا اس کا نام اختر خان تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس کو تنگ پور کے قریب گاؤں بھیسا دل کی ایک لڑکی اچھی لگی۔ وہ مسلمان تھا، اس کو مسلمان لڑکی مل گئی اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

مریم اور اختر دونوں ایک مزاج کے مالک تھے اختر تو شکاری تھا ہی اور اسی شوق کی بدولت وہ گارڈ بنا تھا۔ بیوی ملی، وہ بھی شکاری دونوں کی خوب جوڑی تھی۔ نوکری تو صرف اختر کی تھی کہ جنگلات میں چکر لگائے غیر قانونی شکار اور غیر قانونی درختوں کی کٹائی پر نظر رکھے مگر مریم ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ مریم بہت اچھی نشانہ باز اور بہترین تیراک بھی تھی۔ وہ اختر کی بہت اچھی رفیق تھی۔ دونوں دن بھر جنگل میں پھرتے پرندوں کا شکار کرتے اور بھون کر کھاتے۔ اختر کے پاس سرکاری بندوق تھی مگر کار تو سن گنتی کے ہوتے تھے۔ اس لئے مریم نے ضرورت کے لئے تیر کمان رکھ لیا تھا۔ وہ کسی بھی درخت پر بیٹھے پرندے کو شکار کر لیتی تھی۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ جنگل میں گولی چلنے کا شور نہیں ہوتا تھا۔ وہ روز شام کو ہی گھر آتے تھے۔ رات کو کھانے کے لیے ان کے تھیلے میں کوئی نا کوئی پرندہ یا خرگوش ضرور ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس قدر گوشت خور تھے کہ ہفتوں اناج کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

یوں تو جنگل میں بہت سے برساتی نالے تھے مگر یہ نالے صرف برسات میں پانی سے بھرے نظر آتے تھے۔ صرف ایک بڑا نالہ ایسا تھا کہ اس میں ہمیشہ پانی رہتا تھا۔ وہ بہت دور تھا۔ اس لئے کبھی کبھی ہی یہ لوگ وہاں تک جاتے تھے۔

اس نالے پر جنگل کے جانور پانی پینے آتے تھے۔ مریم نے دیکھا کہ ایک ہرنی کے ساتھ اس کے دو بچے بھی پانی کے کنارے کھڑے تھے۔ اس نے اپنی کمان کا ندھے

انتھان اٹھاؤ گے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ مریم کمرے میں آئی اور پوچھا۔ ”کون تھا؟“
 ”پتہ نہیں کون تھا، کہتا تھا بڑے نالے پرمت آنا اور شکار بھی نہ کرنا۔“

”ارے چھوڑ دو ہوا کوئی، ہم تو جائیں گے اور ہرن کا گوشت بہت دن ہوئے نہیں کھایا وہیں پر شکار کریں گے۔“
 مریم نے کہا۔

ایک ہفتہ کے بعد دونوں پھر بڑے نالے پر کھڑے تھے۔ مریم اپنی کمان کا ندھ سے اتار رہی تھی کہ ان کے چاروں طرف سے لوگ آگئے اور ان کو گھیر لیا اور دونوں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان دونوں کو لے کر جنگل کے اندرونی حصے کی طرف چلے، اس علاقے میں مریم اور اختر بھی نہیں آئے تھے۔ یہاں پر درخت اور جھاڑیاں اتنے قریب قریب تھے کہ پیدل چلتا دشوار ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ دلہ لیں تھیں مگر یہ لوگ بڑی بے فکری سے چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ اختر نے کئی دفعہ ان سے پوچھا مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ معلوم کتنی دور جانا تھا۔ سارا دن وہ چلتے رہے۔ پھر درختوں کے درمیان ایک بہت بڑا ہرا میدان آگیا اور کچھ اور لوگ بھی نظر آنے لگے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جو اختر کے گھر آیا تھا۔

اس نے آتے ہی حکم دیا، ان کو بند کر دو اور پھر ان کو زمین کے اندر ایک کھوہ میں بند کر دیا گیا۔ کھوہ کے اندر گھپ اندھیرا تھا مگر ہوا آ رہی تھی۔ رات کا پتہ نہیں، کون سا پہر تھا کہ اس آدمی کی آواز اختر کے کانوں میں آئی۔

”بھوک لگی ہوگی لے کھانا کھالے۔ میں تیرے گھر گیا تھا تو مجھے چائے پلانا چاہی تھی۔ میں بھی تجھے بھوکا نہیں رکھوں گا۔“ اختر نے دیکھا وہ ایک مشعل جلائے اس کے سامنے بیٹھا ہے اور کھانا زمین پر رکھا ہے۔ اختر نے مریم کو اٹھایا اور کہا۔ ”کھانا کھاو۔“

دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا صرف گوشت تھا اور یہ گوشت ہرن کا تھا کھانے کے بعد وہ بولا۔

”تیری زندگی اس لئے باقی ہے کہ تو نے میرے

سے اتاری اور ہرن کے ایک بچے کا نشانہ لیا اور تیر چھوڑ دیا۔ مگر بچے نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی اور تیر پانی میں چلا گیا اور ہرنی اپنے بچوں کو لے کر فرار ہو گئی۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ مریم کا نشانہ خالی گیا ہو۔ واپس آتے وقت کچھ مرغیاں شکار کر کے وہ لے آئے۔

رات کو اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اختر نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ دھوٹی اور کرتا پہنے تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی موٹھ سے بے نیاز تھا۔ قد لمبا تھا اور پیروں سے نکلتا تھا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ بولا۔ اس کی آواز بڑی بھاری تھی۔

اختر نے کہا۔ ”اندرا آجاؤ۔“ وہ اندر آگیا تو اختر نے مریم کو آواز دی۔ ”دیکھو ایک مہمان آیا ہے۔ ذرا دو کپ چائے تو بنا دو۔“

وہ آنے والا جلدی سے بولا۔ ”میں چائے نہیں پیتا۔“

”کوئی بات نہیں آج ہی لو۔ شہر سے منگوائی ہے۔“
 اختر نے کہا۔

”تم پیو میں پیتا نہیں ہوں۔“ وہ بولا۔
 ”اچھا خیر یہ بتاؤ کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟“ اختر نے پوچھا۔

اس نے جنگل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”میں وہاں سے آیا ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ بڑے نالے پر تم یا تمہاری جوڑ بھی شکار نہ کرنا۔“ وہ بولا۔

”میں اس علاقے کا سرکاری گاڑ ہوں۔ مجھے میری ضرورت کی لکڑی اور گوشت حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ تم منع کرنے والے کون ہوتے ہو؟“ اختر نے کہا۔

”مجھے پتہ ہے..... جنگل میں صرف جانور ہی نہیں رہتے۔ تم کو کہہ دیا ہے۔“ وہ بولا۔

”میں جنگل کا گاڑ ہوں، تم مجھے دھمکا رہے ہو، میں سرکاری آدمی ہوں۔ تم کو پتہ ہے۔“ اختر نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

”سب پتہ ہے مگر تم میری بات یاد رکھنا۔ ورنہ

آخر میں بچے کے سامنے سردار آیا اور بولا۔

”تیری لمانت میرے پاس ہے۔ میں تجھے سوپ دوں گا۔“ اور گردن جھکا کر آگے بڑھ کر اختر کے پاس آیا اور بولا۔ ”تیری بیوی کے کپڑوں سے یہ چاند کا نور نظر پیدا ہوا تو کتنا خوش نصیب ہے۔ تجھے آج تک زندہ صرف اس لئے رکھا گیا کہ تو اس کا باپ ہے مگر یہ چاند کا نور نظر ہے۔ اگر یہ آج نہ پیدا ہوتا تو پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔ مگر یہ ہر امتحان میں پورا اترتا ہے۔ میں اسی گھڑی دنیا میں آیا ہے جو گھڑی ایک لمحے کو آتی ہے۔ اس کی پرورش مقدس بیٹیاں کریں گی۔ یہ مقدس بیٹیوں کا دودھ پئے گا۔ تیری عورت اس کو پیدا کرتے ہی مر چکی ہے۔ یہ بھی ایک علامت ہے۔ اس کے چاند ہونے کی۔“

اختر نے یہ سنا تو سنائے میں رہ گیا۔ ”اب آخری علامت بارہ سال کے بعد سامنے آئے گی۔ یہ بارہ سال کا ہوگا اور تو مر جائیگا.....“ سردار نے کہا۔

”میں تمہاری اس بکواس کو نہیں مانتا۔“ اختر چیخ کر بولا۔

”تو نہ مان! میں منوانے کو نہیں بتا رہا۔ بتانا میری ڈیوٹی ہے۔ چاند کے نور نظر کا حکم ہے۔ اس نے آتے ہی مجھے کچھ حکم دیئے ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ تجھ کو بتا دیا جائے کہ تیری زندگی صرف بارہ سال رہے گی ہے۔ ان بارہ سالوں میں تو جو کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے، جہاں رہنا چاہے جاسکتا ہے۔“ سردار نے کہا۔

”میں تمہاری بے سرو پا باتوں کو نہیں مانتا۔ تم نے میری بیوی کو مار دیا۔ اب اٹھی سیدھی بکواس کر رہے ہو۔“ اختر نے غصے سے کہا۔

سردار نے نہایت سکون سے اختر کی بات سنی اور بولا۔ ”تم حکم کرو، میں تم کو تمہاری جگہ پر پہنچا دیتا ہوں۔“

”اچھا تم مجھے پہلی بھیت میرے ہیڈ کوارٹر پہنچا دو۔“ اختر نے کہا۔

سردار نے یہ سن کر گردن جھکا دی اور چلا گیا۔ دوسری صبح اختر کی آنکھ کھلی تو وہ پہلی بھیت ریلوے اسٹیشن پر ایک بچہ پر لٹا تھا۔ اس کے کانوں میں گاڑیوں کی آواز آتی تو

ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ تیری بیوی کی زندگی اس لئے باقی ہے کہ یہ محل سے ہے۔ اب تم دونوں یہاں رہو گے جہاں چاہو گھومو۔ پھر تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور اگر تم لوگ بھاگنا بھی چاہو گے تو بھی بھاگ نہیں سکو گے، تمہارا فیصلہ تمہارا چپہ پید ہونے کے بعد ہوگا۔“ اور وہ چلا گیا۔

ادھر جنگل میں اختر اور اس کی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع ملنے کو ہوئی مگر ہزار کوشش کے بعد بھی اختر اور اس کی بیوی کا پتہ نہیں چلا۔

دونوں میاں بیوی پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ وہ دور دور تک جاتے تھے۔ وقت پر ان کا کھانا آ جاتا تھا۔ کھانا لانے والے ان سے کوئی بات نہیں کرتے تھے اور اس طرح آٹھ ماہ گزر گئے اور مریم کے ہاں ولادت کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے پہلی بار کسی عورت کی شکل دیکھی۔ وہ عورت بھی بے زبان تھی۔ درہم کے پاس کھوہ میں آگئی۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو وہ مریم کو کھلے میدان میں لے آئی۔ رات کا وقت تھا اور پورا چاند آسمان پر موجود تھا۔ چاند کی سنہری روشنی اس ہرنے بھرے میدان کو روشن کئے ہوئے تھی۔ میدان میں جہاں پر مریم تھی۔ اس سے قریب آسو گز دور ایک گول دائرے میں لوگ کھڑے تھے اور وہ جس کا حکم ان پر چلتا تھا۔ چاند کی طرف منہ کر کے کچھ بو بڑا رہا تھا۔ دائرہ بنائے جو کھڑے تھے ان کے چہرے بھی آسمان کی طرف تھے۔ اختر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر وہ کیا کرتا اور پھر اس نے بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کو ایک سکون سا ملا۔ اس عورت نے بچے کو دونوں ہاتھ پر اٹھا کر سر سے اونچا کر دیا اور سردار کی آواز آئی۔

”تیرے سائے میں تیرے سامنے تیری مہربانی سے یہ بچہ دنیا میں آیا ہے۔ اس پر اپنی نظر کرم کر، اس کو وہ سب عطا کر جو تیرے پاس ہے۔ آج مقدس رات ہے، اس رات میں بہت عرصہ کے بعد اس زمین پر تیرا ظہور ہوا ہے۔ یہ ان سب امتقون کا حق دار ہے جو تیرا وعدہ ہے۔“ اور سارے دائرے میں کھڑے لوگ آگے بڑھتے گئے اور ہر فرد اس بچے کے آگے گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ سب سے

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی بورڈ پر لکھا تھا، چلی بھیت جنکشن اور وہ ایک جھکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔

اس نے اپنی رو داؤب کو سناٹی مگر کوئی اس پر اعتبار کرنے پر راضی نہ ہوا اور اس کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ ناامید ہو کر دلی کی طرف جانے کی سوچنے لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں کرارے ٹوٹوں سے ٹکرائیں اور اس نے دلی کا ٹکٹ خرید لیا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ مگر اس کا دل یہاں نہ لگا وہ کھلے علاقے کا رہنے والا آدمی تھا۔ دلی تو انسانوں کا جنگل تھا۔ یہاں کے شور و غل نے اس کو بیزار کر دیا۔ وہ اور آگے بڑھ گیا۔ پھر اس میں رک گیا۔ یہاں پر دلی والا شور نہیں تھا۔ وہ ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہ سرائے ایک ہندو کی تھی اور یہاں پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ پھر اس میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے۔ یہ ہندوؤں کا شہر ہے۔ مندر بے حساب ہیں۔ گھنٹیوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ بہت جلد اس شہر سے اکتا گیا اور آگے بڑھ گیا۔ دھول پورا تر گیا۔ یہ بھی ہندو اسٹیٹ تھی۔ یہاں پر مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ راجہ ہندو تھا اور صرف ہندوؤں کی سنتا تھا۔ مسلمان بے چارے تیسرے درجے کے باشندے خیال کئے جاتے تھے۔ وہ اور آگے بڑھ گیا۔ آگرہ آگیا۔ یہاں پر مسلمان کثیر تعداد میں تھے اور برابری کی بنیاد پر ہر معاملہ تھا۔ کوئی ان کو دبائیں سکتا تھا۔ بکرے کا اور بھینس کا گوشت عام بلکتا تھا۔ گائے بھی کتنی تھی مگر وہ مسلمانوں کا پوشیدہ طریقہ تھا۔ یہاں آکر وہ پیٹ بھر کر کھانا کھانے لگا تھا۔ آگرہ شہر قدیم شہر ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی عظیم الشان عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ قدیم بادشاہوں کی بنائی ہزاروں عمارتیں ویران بھی پڑی ہیں اور جو مشہور ہیں، وہ سیاحوں سے دن بھر بھری رہتی ہیں۔ اختر کے پاس کچھ کام نہیں تھا۔ وہ دن بھر گھومتا رہتا۔ اس نے ایک تانگہ کرائے پر لے لیا تھا۔ سارے دن وہ اس کو شہر بھر میں لئے پھرتا تھا۔ وہ روز اس کو کرایہ ادا کر دیا کرتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کتنا بھی خرچ

کرے اس کی جیب میں روپے کم نہیں ہوتے تھے۔ تانگے والا بڑا ہوشیار تھا۔ اس کی لگی بندھی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ ہر روز اختر کو کسی نہ کسی نئی جگہ لے جاتا تھا۔ اختر نے بھی اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ آگرہ شہر کے باہر اتونی گاؤں ہے۔ اس گاؤں سے سات آٹھ کوس پر ایک گول برجی بنی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف کھیت ہیں۔ یہ سفید برجی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں جو پتھر استعمال ہوا ہے وہ سفید ہے، اندھیری رات میں بھی یہ صاف نظر آتی ہے۔ اس برجی کے چاروں طرف دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ کسان اس برجی سے دور رہتے ہیں۔ اس کے قریب جانے پر خوف محسوس ہوتا ہے۔ مگر کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے قریب جانے والا ڈر کر دوڑ ہو جاتا ہے۔

یہ دور سے صرف ایک برجی نظر آتی ہے مگر اندر سے بہت کشادہ ہے۔ اس کے چاروں طرف محلات کا ایک سلسلہ ہے۔ اس کے بنانے والے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، کب کس نے بنایا، کسی کو پتہ نہیں ہے۔ طرز تعمیر مسلمانی ہے۔ اس لئے خیال ہے کہ یہ کسی مسلمان بادشاہ نے بنائی ہے۔ جس زمانے میں اس کو بنایا گیا ہوگا۔ اس وقت تو یہ بیابان جنگل ہوگا۔ پھر اس کو کیوں بنایا گیا تھا۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سفید برجی کے بارے میں آثار قدیمہ والے ابھی کچھ نہیں جانتے۔

تانگے والا اتونی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کو سفید برجی کی بابت پتہ تھا۔ اس کے رشتہ دار بھی اتونی میں رہتے تھے۔ وہ بہت دن سے اتونی نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک ساتھ دو کام کئے۔ اتونی آنے کے بعد وہ بولا۔ ”صاب یہاں پر ایک برجی ہے۔ بہت اچھی عمارت ہے۔ میں آپ کو اس کے قریب چھوڑ دوں گا۔ آپ تفریح کریں، میں اتونی میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”تم میرے ساتھ نہیں چلو گے۔“ اختر نے پوچھا۔
”نہیں صاب میرے اتونی میں رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے ملاقات کروں گا۔“

اور وہ دونوں سفید برجی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کچی سڑک تھی اور تانگہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ دور سے سفید برجی نظر آرہی تھی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ پھر وہ کچی سڑک بھی آگے سے بند ہوگئی اور تانگے والے نے کہا۔ ”اب آگے راستہ نہیں ہے، آپ سیر کریں، میں اتوئی میں آپ کو مل جاؤں گا۔“

اختر تانگے سے اتر گیا اور سفید برجی کی طرف چلنے لگا۔ دور دور کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس کا رخ برجی کی طرف تھا۔ ایک کسان دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا اور اپنی سانسوں پر قاف پیا کر بولا۔

”کال جات رہے ہو۔“
اختر نے برجی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”برجی دیکھنے جا رہا ہوں۔“
کسان نے اس کے شہری لباس پر نظر ڈالی اور بولا۔
”بے خبر لاگے ہے ارے کانیا آؤ ہے تو کے کچھ خبر نا ہے۔“
اختر نے پوچھا۔ ”تم کیا بتانا چاہتے ہو؟“

”ارے باولے برجی کے دھورے کون ناہی جا سکت بہوت خطرہ ہے وہیں۔“ کسان بولا۔
”یہی تو پوچھ رہا ہوں خطرہ کیا ہے؟“ اختر نے پوچھا۔
”ای ہم کا کا خبر ہے جو جاوت ہے۔ نقصان اٹاوت ہے ہم تو ای جاوت ہیں بس۔“ وہ بولا۔

”تم لوگ ڈرتے ہو، میں جنگل کا باشندہ ہوں۔ ڈر و خوف میں نہیں جانتا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔“ اور وہ آگے بڑھ گیا۔ کسان حیرت سے اس کو دیکھتا رہ گیا۔
سفید برجی کے اطراف کی جگہ بالکل صاف تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ جگہ روز صاف کی جاتی ہو۔

برجی کے مین دروازے سے دو ڈھائی سو گز دور وہ کھڑا تھا۔ سامنے جو میدان تھا، وہ صاف سہرا تھا۔ عمارت بھی صاف نظر آتی تھی۔ وہ میدان سے گزرنے لگا اور میں دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک محراب دار دروازہ تھا۔ دور سے اس کی اونچائی اور چوڑائی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس دروازے سے بڑے سے بڑا ٹرک اندر آسکتا تھا۔

اس میں کوڑا نہیں تھے۔ داخل ہوتے ہی بہت بڑا ہال کمرہ تھا اور وہ کمرہ برقی کے نیچے تھا۔ اس کی چھت گول تھی۔ پتھر سفید ہونے کا کچر سے یہ کمرہ روشن تھا۔ جھروکوں سے روشنی اندر آرہی تھی۔

کمرہ صاف تھا مگر پورا کمرہ خالی تھا۔ پھر اس کے کانوں میں کی کے میڑھیاں اتر کر آنے کی آواز آئی..... دروازے کا ساتھ ہی زینہ تھا۔ وہاں سے کوئی آ رہا تھا اور پھر وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ایک خوبصورت مرد تھا۔ اس کے بال بھورے تھے۔ نیلی آنکھیں تھیں اور رنگ سرخ و سفید تھا۔ اس کے خدو خال مردانہ تھے اور قد سرحد کے پٹھانوں جیسا تھا۔ چہرہ اتنا رعب دار کہ نظر ملانا دشوار تھا۔

”ہمارے مقام پر آنے کا شکریہ۔ تم پہلے آدی ہو جو اس برجی کے اندر آئے ہو۔“ اس نے اپنی بھاری رعب دار آواز میں کہا۔
”میں اس لئے آگیا کہ میں جنگل کا آدی ہوں۔“
خوف مجھ سے دور رہتا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ بات نہیں ہے کہ تم اس لئے آگئے کہ تم کو کچھ مہلت ملی ہوئی ہے۔ میں بڑوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔
”تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ اختر نے پوچھا۔
”میرا نام جاننا تمہارے لئے بیکار ہے۔ پھر میں تم کو کیا بتاؤں۔“ وہ بولا۔

”اچھا ابھی بتا دو کہ تم کون ہو اور اس دیران برجی میں کیوں رہتے ہو؟“ اختر نے پوچھا۔
”اس سوال کا بھی میں جواب نہیں دوں گا، آدی کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ کرید بہت کرتا ہے۔ سوال پر سوال کرتا چلا جاتا ہے اور پھر بھی جب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اپنی مرضی سے سو تاویلات گھڑ لیتا ہے۔“ وہ بولا۔

”میں صرف سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہوتا کہ اس میں رہائش ہے تو نہ آتا۔“ اختر نے کہا۔
تم آئے ہو تو میرے مہمان ہو تم قابل احترام اس لئے بھی ہو کہ تم چاند کے نور نظر کے باپ ہو۔“ وہ بولا۔

اختر نے چونک کر پوچھا۔ ”اچھا تم کون ہو؟“
”میں اسی مقام سے آیا ہوں، جہاں پر تمہاری بیوی
نے چاند کے نور نظر کو جنم دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”وہ مقام تو بہت دور ہے۔ تم کو یہ سب کیسے پتہ
چلا۔“ اختر نے پوچھا۔

”دنیا کے دور دراز مقامات پر روز جاتے ہیں اور پھر
آ جاتے ہیں۔ تم ہمارے ذرائع کو نہیں سمجھ سکتے، تم چند روزہ
زندگی لے کر آئے ہو، انسان کی زندگی زیادہ سے زیادہ
سوسال ہوتی ہے۔ تم میری عمر کا کیا اندازہ لگاتے ہو۔“ اس
نے پوچھا۔

”زیادہ سے زیادہ چالیس سال.....“ اختر نے
جواب دیا۔

”مگر اگر بولا۔“ اس میں پانچ سوسال اور جمع کرلو۔“
اختر نے حیرت سے اس کو دیکھا اور بے یقینی سی
کیفیت میں بولا۔ ”اگر یہ حقیقت ہے تو پھر تم انسان نہیں
ہو۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ میں انسان ہوں۔
تمہارے لئے یہ انوکھی حقیقت ضرور ہے مگر تم نے ابھی کچھ
نہیں دیکھا ہے۔ تم اپنی مختصر عمر میں دیکھ بھی کیا سکتے ہو۔ دنیا
میں بڑی بڑی فکر انگیز حقیقتیں موجود ہیں۔ میں نے دنیا میں
جو کچھ دیکھا ہے، بیان کروں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ تم
میرے سامنے صرف اس لئے کھڑے ہو کہ تم کو مہلت دی گئی
ہے۔ مہلت کے ختم ہوتے ہی تم دنیا میں مزید نہیں رہو گے۔
تم کو اتنی مدت دنیا میں رہنا ہوگا۔ ہمارے مہمان کی طرح ہم
تمہارا خیال رکھیں گے۔ یہی حکم ہم کو ملا ہے۔“ وہ بولا۔

”تم اگر فوق البشر ہو تو سن لو کہ میں دنیا کے ایک
سب سے اعلیٰ مذہب سے تعلق رکھتا ہوں گو کہ بہت گناہ گار
ہوں مگر پھر بھی دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے خدا سے مدد
مانگنے سے روک نہیں سکتی۔ زندگی اور موت کا ایک فاصلہ
ہوتا ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اپنے وقت پر ہی
آتی ہے۔ تم یا کوئی اس کو نہیں بلا سکتا۔ تم مجھے بار بار موت
سے نڈراؤ، میں موت سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا ہوں۔ اگر

میری موت آنے میں بارہ سال ہیں تو بھی مجھے موت کا
خوف نہیں ہے اور اگر اس سے کم وقت ہے تو بھی فکر نہیں ہے
اور اگر زیادہ وقت موت کے آنے میں ہے تو تم اور تمہارا کوئی
بھی ساتھی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے بہت زمانہ دیکھا ہے
مگر تم نہیں جانتے کہ موت تو قرض ہے۔ یہ تو ادا کرنا ہی
پڑتا ہے۔ قرض بوجھ ہوتا ہے۔ بوجھ کون اپنے اوپر رکھنا
چاہتا ہے۔ تم ہزار سال بوجھ اٹھاؤ گے اور میں چند سال بوجھ
برداشت کروں گا۔ اب بتاؤ، بہتر کون رہا۔“ اختر نے کہا۔
”تم انسان ہو اور انسان تاویلات بہت کرتا ہے۔
اپنی ہر خرابی کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ تم جس کو مانتے ہو، اس
کی عبادت کتنی مدت کرو گے اور میں کتنے طویل عرصے تک
کروں گا تم کو اس کا اندازہ ہے۔“ وہ بولا۔

”تم صاحب علم ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ انسان کو
رب کائنات نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ ہماری مقدس کتاب
کے مطابق اس نے اپنے خلیفہ کو جس قدر ارض و سما کا حاکم بنا
دیا ہے۔ رب کائنات وسائل کے بغیر حاکم ہے تو اس کا خلیفہ
بھی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔“
”تم کچھ کہو مگر یاد رکھو، چاند کے نور نظر کا حکم آخری
ہوتا ہے۔“ وہ بولا۔

”چاند کو پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر تم چاند کی بات
کرتے ہو، ہم جس چاند کو طاقت کا سرچشمہ خیال کرتے ہو،
اس کو زمین اور آسمان کے درمیان کس نے روک رکھا ہے۔
چاند سے زیادہ توانائی اور روشنی سورج دیتا ہے۔ تم اس کو کیوں
اہمیت نہیں دیتے۔ اگر فطرت نے تم کو انسان سے زیادہ
اختیارات اور طاقت دی ہے تو تم اس دینے والے کو فراموش
کر رہے ہو۔ کیا تم دنیا کے مالک کو ناخوش نہیں کر رہے۔ یہ
اس کی رحمت ہے کہ وہ تمہاری رسی دراز کر رہا ہے۔ موقعہ
دے رہا ہے، تم کو پلٹ کر جانا تو ہے، دنیا میں تم کو زیادہ وقت
دے دیا ہے۔ انسان کو کم وقت دیا ہے تم کو سمجھنے کا زیادہ وقت
ملا ہے مگر تم بے فکر ہو کر بیٹھے ہو، چاند پر نگاہیں لگائے ہو، یہ
عقل مند ہی نہیں ہے۔“ اختر نے کہا۔
”تم کو وقت بتائے گا کہ میں نے درست کہا تھا۔“

وہ بولا۔

”میں بے چینی سے اس وقت کا انتظار کروں گا۔“

اختر نے کہا۔

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ میں حکم پورا

کروں گا۔“ وہ بولا۔

”تم میرا حکم نہیں پورا کرو گے بلکہ کسی اور کو خوش کرنا

چاہتے ہو۔“ اختر نے کہا۔

”ہاں یہ درست ہے مگر خواہش تو تمہاری پوری ہو

گی۔“ وہ بولا۔

اختر دروازے کی طرف چل دیا۔ تو وہ بولا۔ ”مجھ

سے ناراض ہو۔“

”تم آسمان کی طرف دیکھو، میری طرف مت

دیکھو، بارہ سال کے بعد مجھ سے ملاقات ضرور کرنا۔ میں

تمہارا انتظار کروں گا۔“ اختر نے کہا۔

”بارہ سال کے بعد میں تمہاری قبر پر آؤں گا۔“ وہ

بولا۔

”وقت جواب دے گا۔“ اور اختر تیزی سے باہر

آگیا اور پھر اتونی گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔

وہ میدان پار کر کے کھیت کی پگڈنڈی پر آگیا اور کبھی

سڑک کی طرف چلا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ وہی کسان

دوڑ کر اس کے قریب آگیا اور بولا۔

”آج تو گجب ہو گیا۔ بھگوان کی سوگند کوئی مانس

واپس نہیں آیا تو کیسے لوٹ آیا۔“

اختر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مارنے

والا کمزور ہوتا ہے، بچانے والا طاقت ور ہوتا ہے، میری

موت کا وقت نہیں تھا تو میں کیسے مرتا۔“

”پن ہم نے یہی دیکھا ہے اب تک جو گیا وہ گیا،

لونا تا ہی۔“ کسان بولا۔

”تمہارے پاس پانی ہوگا۔“ اختر نے پوچھا۔

”ارے بھیا! پانی کا روٹی کھاؤ، گھر والی نے بھجوائی

ہے، لسی بھی بھر کر رکھی ہے۔“ کسان بولا۔

”نہیں میں روٹی نہیں کھاؤں گا، پھر تم کو بھوکا رہنا

پڑے گا۔“ اختر نے جواب دیا۔

”تو پھر ایسا کرو، دونوں ساتھ کھاتے ہیں۔“

کسان بولا۔

”مجھے تم صرف پانی پلاؤ، سمجھ لو میں نے روٹی کھالی

۔“ اختر نے کہا۔

”ہاں بھیا ہم غریب آدمی ہیں۔ کوئی اور کی جا کری

کرت ہیں۔ تم کا بے ہماری روٹی کھاؤ گے۔“ کسان غصے

لہجے میں بولا۔

اختر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”آؤ

روٹی کھاتے ہیں۔“

کسان کے چہرے پر رونق آگئی، جلدی سے بولا۔

”آؤ بھیا پیڑ تلے بڑی ٹھنڈی ہوا آوت ہے۔“

کسان نے پیڑ کی جڑ کے پاس سے ایک پوٹلی

اٹھائی۔ وہیں پر ایک مٹکی رکھی تھی، اس میں لسی بھری تھی۔

باہرے کی دھوئی موٹی روٹیاں اس پوٹلی میں تھیں اور بہت

سا اچار اس کے اوپر رکھا تھا۔ کسان نے آدھا اچار دوسری

روٹی پر رکھا اور اختر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دونوں روٹی اچار

کھانے لگے۔ اختر نے پوچھا۔ ”یہ اچار تمہاری گھر والی نے

ڈالا ہوگا۔“

”ہاں بھیا ہماری گھر والی بڑی سکھڑ ہے۔ بہوت

بڑھیا اچار بناوت ہے۔“ کسان بولا۔

اختر کو باہرے کی روٹی اور اچار میں بڑا حرا آیا، روٹی

اتنی موٹی تھی کہ اس کا پیٹ بھر گیا۔ کسان نے لسی کی مٹکی پر

سے کپڑا اٹایا اور کہا۔ ”لو پیو۔“

اختر نے کہا۔ ”سبیل تم پی لو۔ میں بعد میں پی لوں گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، ارے ہم تو روز پیت ہیں۔ لگا

کی سوگند آج جو حرا روٹی میں آیا ہے، ایسا تو کبھی نہیں آیا، پہلے

تم جی بھر کر پی لو۔“ کسان جھوم کر بولا۔

اختر نے مٹکی منہ سے لگا لی اور غٹا غٹ لسی پی لی، اس

لسی کا بھی الگ ہی حرا تھا۔ باقی لسی بھی کسان نے پی لی اور

بولا۔ ”آج بڑا آند ملا ہے کھا کے۔“

”تم کو پتہ ہے تم کو آند کیوں ملا ہے۔“ اختر نے

پوچھا۔

”ارے ہم کا جائیں ہم تو نرے دیہاتی آدمی ہیں۔ کھوپڑیا چھوٹی سی ہے۔ صاف اور کھری بات سمجھ آوت ہے۔ ہائی سمجھنا ہی آتی ہے لوگ ہکا لچو چن کہت ہیں۔ پر ہمارا نام تو چن سنگھ ہے۔ سب جو کہت ہیں تو ہم روکا برانا ہی مانت ہیں۔ سب ہم کو لکھو کہہ کے خوش ہیں تو ہم بھی خوش ہیں۔ بھگوان نے روزی دے رکھی ہے۔ سوغزت سے کمات ہیں تم نے کچھ بتایا تمہیں۔“

”ہم تو مسافر ہیں بھائی۔“ اختر نے کہا۔

”تم نے ہماری جو خدمت کی، اس کا بدلہ تو ہم تم کو کیا دیں گے۔ تمہارے بھگوان نے تم کو جو آئندہ دیا ہے، وہ خدمت کے بدلے دیا ہے۔ انسان جب بے لوث کسی کی خدمت کرتا ہے تو اس کو خوشی ہوتی ہے۔ آئندہ ملتا ہے یہ خوشی اتنی انمول ہوتی ہے کہ اس کا کچھ بدل نہیں ہوتا۔ تم نے تو ایسی خوشی پالی ہے۔ میں بھی اگر ایسی خوشی لینا چاہوں تو تم میری بات مانو گے۔“ اختر نے پوچھا۔

”کاہے نا ہی مانیں گے ضرور مانیں گے۔“ کسان نے جواب دیا۔

اختر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”اور بولا۔“ ”یہ ہے میری خوشی کچھ بولنا نہیں، تم نے وعدہ کیا ہے۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا اور چکی سرک کی طرف چل دیا۔ کسان خاموش کھڑا اس کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

اختر آگرہ آکر سرائے کے اندر جانے سے پہلے تانگے والے کو روزانہ کرایہ ادا کر دیا کرتا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق جب میں ہاتھ ڈالا تو اسے یاد آیا کہ سب روپے تو وہ کسان کو دے آیا ہے مگر اس کی جیب بھر بھی بھری ہوئی تھی۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جا رہا تھا۔

دوسرے دن اس نے ٹرین پکڑی، رطام چلا گیا۔ یہاں پر شاہی عمارتیں تو نہیں ہیں۔ یہ ریلوے کا بڑا جنکشن ہے۔ زیادہ بڑا شہر بھی نہیں، اس کے چاروں طرف پتھریلی زمین ہے۔ آبادی ملی جلی ہے۔

پیلے پتھر کی پہاڑیوں میں دن بھر سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں۔ ہوا جب ان پہاڑی دروں سے گزرتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے۔ اختر کسی خاص ارادے سے نہیں آیا تھا۔ بس دل نے کہا اور وہ چل پڑا، وہاں سے کوئٹہ بوندی آگیا اور پھر امین کی ایک سرائے میں رک گیا۔

امین ایک تیرتھ ہے۔ ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے، وہ جینی کہلاتا ہے، اس کے بانی کا نام مہابیر ہے۔ امین میں مہابیر کا مکھ مندر ہے۔ ان کا ایک سالانہ بہت بڑا میلہ بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان بھر کے جینی فرقے کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس فرقے کے ساھو ننگے رہتے ہیں۔ یہ پورے ہندوستان سے قافلوں کی شکل میں امین آتے ہیں۔ ان کے پاس کاندھے پر صرف ایک بیگی رکھی ہوتی ہے۔ یہ ایک بانس ہوتا ہے۔ اس کے دونوں سروں پر تر ازو کی طرح پٹڑا ہوتا ہے۔ یہ تمام راستے مانگتے کھاتے امین آتے ہیں۔ مندر کے باہر جو سرک ہے، اس کے کنارے بڑے موٹے اور بہت بڑے پیٹ والے پنڈت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ بالکل برہمنہ ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اولاد دینی عداوت ہے اور دکھنا لیتے ہیں۔ یہ پنڈت بے تحاشا کھاتے ہیں۔ لوگ ان کو شرط لگا کر مٹھانی کھاتے ہیں اور یہ سب کو ہرا دیتے ہیں، نہ معلوم اتنی مٹھانی دے کہ کس طرح کھاتے ہیں۔

امین کا میلہ ختم ہو گیا تھا۔ قافلے واپس جا رہے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔ بڑی بڑی توند والے پنڈت نیل گاڑیوں میں چڑھائے جا رہے تھے۔ بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔ مہابیر کے بے جے کار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اختر ایک جگہ کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سے لوگ گزر رہے تھے۔ ایک بنگا ساھو بیگی کاندھے پر لئے اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”آجا میرے ساتھ۔“ اختر نے اس کو دیکھا اور جواب دیا۔

”تیرا میرا ساتھ کیسے ہوگا تو جانا کلام کر.....“

”میں اپنا کام ہی کر رہا ہوں۔ میں تیری تلاش میں تو آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو میلے میں آیا ہے، میلا ختم ہوا گھر جا۔“ اختر نے جواب دیا۔

”تو ابھی بالک ہے، سب میلے میں نہیں آتے، ہر کوئی اپنے اپنے مطلب سے آتا ہے۔ آجا میرے ساتھ۔“ وہ بولا۔

”تو کیوں مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے کچھ بتا تو.....؟“ اختر نے پوچھا۔

”میرا کام صرف یہ ہے کہ تجھے گرو کے پاس پہنچا دوں۔“ وہ بولا۔

”تیرا گورکون ہے اور کہاں ہے؟“ اختر نے پوچھا۔
 ”وہ کون ہے یہ تو وہی بتائے گا، کہاں ہے، اس کی تو فکر نہ کر، تجھے جانے میں کوئی کشت نہیں اٹھانا پڑے گا۔ ذرا اس بھینٹے تو نکل۔“ سادھو بولا۔

”اور اگر میں تیرے ساتھ نہ جانا چاہوں پھر.....“

اختر نے پوچھا۔
 ”پھر بھی جانا تو ہوگا، لکھی کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔“ وہ بولا۔

”تو میرے ساتھ زبردستی کرے گا۔“ اختر نے پوچھا۔

”ہر بات یہاں کھڑے کھڑے مت پوچھ، کچھ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔“ سادھو بولا۔

”میرے سوال کا یہ جواب نہیں ہے۔“ اختر نے کہا۔
 ”نہیں مانے گا تو سن میں چاند کے نور نظر کے باپ کے ساتھ کوئی بے ادبی کیسے کروں گا۔“ سادھو بولا۔

”تو بھی وہی ہے۔“ اختر نے تعجب سے کہا۔
 ”ہاں تیری خاطر کرنا خدمت کرنا ہم پر فرض ہے۔

اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو چاند کا نور نظر ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ پھر ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ ہم نے صدیوں اس کے آنے کا انتظار کیا ہے۔“ سادھو بولا۔

”ٹھیک ہے چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ اس کو ایسا لگا جیسے وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہو۔ وہ اڑتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی۔

پھر اس کے ہر زمین پر ٹپک گئے۔ اس کے سامنے سفید سفید پہاڑ تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں تھیں اور دور دور کسی انسان کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ سادھو اس کے سامنے بنگا کھڑا تھا۔ اس کو سردی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ سادھو بولا۔ ”وہ دیکھ سامنے جو غار نظر آتا ہے، یہی تیری منزل ہے۔ جاندر جا، گرو تیرا انتظار کر رہا ہے۔“

اختر غار کی طرف چلا، غار کا دروازہ بہت کشادہ تھا۔ وہ اس کے اندر چلا گیا۔ باہر سے غار نظر آنے والا اندر سے کسی محل سے کم نہیں تھا۔ بہت اونچی چھت تھی۔ ایک بہت بڑا گول کمرہ تھا۔ اس گول کمرے کے اطراف میں کئی دروازے نظر آتے تھے۔ ان دروازوں پر بڑے خوبصورت نقش و نگار والے لکواڑ لگے ہوئے تھے اور ہر دروازے پر بڑا شوخ رنگ کیا ہوا تھا۔ چھت میں بہت بڑا فائوس لنگ رہا تھا۔ درمیان میں سرخ رنگ کا قالین پڑا تھا، اس قالین پر گول بنکے رکھے تھے۔ ان بنکیوں پر بڑے خوبصورت پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ سرخ قالین پر پیلے بنکے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ابھی اس نے پوری طرح جائزہ بھی نہیں لیا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک حسین لڑکی باہر آگئی۔

اس لڑکی کے لباس کا رنگ نیلا تھا اور جس کمرے سے وہ آئی تھی اس کے کواڑوں کا رنگ بھی نیلا تھا۔ وہ لہراتی چال سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کا لباس صرف ایک چولی اور پاجامہ تھا۔ پاجامہ اس کے جسم پر چپک رہا تھا اور چولی ضرورت سے کم تھی۔ اس کے حسین ماتھے پر بڑی چمکدار بندیا چپکی ہوئی تھی۔ اختر نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا کہ یہ ضرور کوئی نئی چال ہے۔ اس نے لڑکی پر سے نگاہیں ہٹالیں اور لڑکی سے کہا۔ ”میں تجھ سے ملاقات کرنے نہیں آیا۔ پھر تو کیوں آئی ہے؟“

لڑکی نے اپنی کمر کو خم دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آئی اور کہا۔

”میرا کام سواگت کرنا ہے۔ آرام پہنچانا ہے، مجھے اپنا کام کرنے دو۔“ اس کی آواز بڑی مہذب تھی بالکل اپنی شکل کی طرح اور اس نے آگے بڑھ کر اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

پکڑ لیا۔ لڑکی کا ہاتھ بہت ملائم تھا۔ اختر کو ایسا لگا جیسے ریشمی فلائین کا کٹڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔

وہ اس کو لے کر اندر کی طرف چلی گئی۔ اس طرف کوئی بندہ نہیں تھا۔ بلکہ دروازہ جتنی چوڑائی کی گلی تھی۔ یہ گلی بیس بائیس گز تو ضرور تھی۔ گلی ختم ہوئی اور ایک چوکور کمرہ نظر آیا۔ اس کے بھی چاروں طرف دروازے نظر آتے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔ اس کی ہر شے سے لے کر تکی کی بڑائی تھی۔

دیواروں پر قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں میں بجا بیات کی نسکین کا تمام تر سامان موجود تھا۔ فرش پر دبیز قالین پڑا تھا۔ ایک بڑی گول میز قالین پر رکھی تھی۔ میز پر رنگ برنگے شیشے تھے اور بڑے بڑے گلدستے رکھے تھے۔ ان میں تازہ پھول موجود تھے مگر یہ پھول اختر نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میز کے اطراف میں بڑے بڑے نہایت قدیم طرز کے صوفے رکھے تھے۔ لڑکی نے اختر کو ایک صوفے پر بٹھا دیا تو اس کو پتہ چلا کہ یہ صوفے صرف قدیم نظر آتے ہیں، بہت آرام دہ ہیں۔ ان پر بیٹھتے ہی آدمی کی ہچکھن اتر جاتی ہے۔ لڑکی نے اپنی مہترم آواز میں کہا۔ ”گرو آتے ہیں۔“ اور وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اختر کی ذہنی کیفیت من و عن بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ بہت بہادر اور نڈر آدمی تھا۔ برف پوش پہاڑ کے اس غار میں اس کو ذرا سا بھی سردی کا احساس نہ تھا جس کو غار کہا گیا تھا۔ وہ تو ایک محل تھا۔ وہ اندر سے خوف اور حیرت کا شکار تو تھا۔ انسان کو کوئی بھی ہو، ان باتوں سے بچ تو نہیں سکتا۔ بے شک وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر جو واقعات اس کے سامنے آ رہے تھے، اس کی عقل کو تو جبر نہیں کر پار ہی تھی۔

نہ معلوم میں دنیا کے کس خطے میں ہوں۔ میں ایک غار میں ہوں، یقین نہیں آتا۔ ایسا تو نہیں کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، اس نے اپنی انگلی منہ میں ڈال کر زور سے دہائی تو اسے تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کا ذہن کام کر رہا تھا، ہر بات اس کے ذہن میں آ رہی تھی، ہر تصور، ہر احساس اس کے

ذہن میں تھا، اپنی ذہنی کیفیت کو بھی وہ سمجھ رہا تھا۔

مگر اس کے لئے یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا کہ اس کا وجود ان کے سامنے معمول بنا ہوا تھا۔ ان کے حکم پر چلنا پڑ رہا تھا۔ کئی اندازے قائم کر چکا تھا مگر ان کا رویہ اس کی سوچوں کو نکمیر دیتا تھا۔ کہیں پر کسی مقام پر اس کے ساتھ کوئی نازیبا بات اب تک نہیں ہوئی تھی۔ اس کو بالکل اس طرح رکھا جا رہا تھا جس طرح قربانی کے بکرے کو رکھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جہاں خوف کی انتہا ہوتی ہے، وہیں سے دلیری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس وقت انسان جو کرتا ہے، وہ دماغ کے زیر اثر نہیں کرتا بلکہ اعصاب کے زیر اثر کرتا ہے۔ میں بھی حیرتوں کی اس دنیا میں دماغ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، اس کا جواب دماغ نہیں دیتا۔

اب اعصاب کے عمل کا وقت آ گیا ہے۔ میرا دماغ سے رجوع کرنا حاصل ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ شاید اس کا ارادہ باہر جانے کا تھا کہ اچانک سامنے کا گلابی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک پری نما عورت یاہر آ گئی۔ اس کے ماتھے پر چاند کی ہندیا چمک رہی تھی۔ یہ ہندیا نہ معلوم کس دھات کی تھی کہ ہر زاویے سے اس کا رنگ بدل جاتا تھا۔ یہ ایک طویل قامت عورت تھی یا عورت نما لڑکی تھی۔ لہذا قد ہونے کے باوجود وہ بے ڈول نہیں لگتی تھی۔ اس کے اعضاء بڑے تناسب کے تھے۔ رنگ گلابی تھا اور بال بھورے تھے۔ وہ ایک سیلیطے سے اس کی کمر پر پڑے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کچھ ترجمہی تھیں اور اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

اس کا بھی لباس ایک چولی اور پانچمچہ تھا مگر ہتے کے فرق کے لئے اس کا لباس زیادہ قیمتی لگتا تھا۔ وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اختر بھی کھڑا تھا۔ وہ قد میں اختر کے برابر تھی۔

”بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو۔“ اس کے ہونٹ ہلے۔ بڑی سریلی آواز اختر کے کانوں میں آئی۔ اختر پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے وہ بھی بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز اتنا ہوش رہا تھا کہ آدمی بہک جائے۔ اختر نے اس پر سے نظریں ہٹا لیں۔ زندگی میں اتنی حسین عورت اس

نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ عورت کا حسن بڑے بڑے کو پاگل کر دیتا ہے۔ میں تو ایک کمزور سا انسان ہوں۔ مجھے خود پر کنٹرول کرنا ہے۔ اس عورت کا میرے پاس اس طرح آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ میرے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس میں ہی ان کا فائدہ ہے۔

”تم بہت زیادہ سوچتے ہو، میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔

”میں نے دیکھ لیا ہے۔ پھر بار بار کیا دیکھوں۔ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے، یہ بتاؤ۔“ اختر نے کہا۔

”خدمت کرنے کو، تم کو آرام پہنچانے کو، تمہاری خدمت ہمارا دھرم ہے۔“ وہ بولی۔

”اگر ایسا ہے تو میرا تم لوگ پیچھا نہ کرو، میں کسی محل میں آرام سے نہیں رہ سکتا۔ نہ تم جیسی حسین عورتیں مجھے آرام پہنچا سکتی ہیں۔ میری بیوی جو تم لوگوں کی نذر ہوگئی، میں اس کا آج بھی وفادار ہوں۔ میں تم کو صاف صاف لفظوں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں عورت کا بھوکا، عیاش مرد نہیں ہوں۔ مجھ پر کچھ پابندیاں میرے مذہب نے لگائی ہیں۔ میں ان کو توڑ نہیں سکتا۔ تم ہزار روپ اختیار کر کے مجھے لکھاؤ، ناز خڑے دکھاؤ، میرا جواب بہت کڑوا ہوگا۔ یہ میری ضد نہیں ہے بلکہ پابندی ہے۔“

”تم مجھے انسان نظر نہیں آتے۔ ہر انسان حسن و جوانی سے متاثر ہوتا ہے۔ تم اس سے کس طرح پہلو بچا رہے ہو، بتاؤ تم کون ہو؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”میں انسان ہی ہوں۔ تم یہ بتاؤ، تم چاند کے نور نظر کا حکم کیوں مانتی ہو، کیوں اس کو خوش کرنے کو ہر جتن کرتی ہو، اس کی خوشی کی خاطر تم نے مجھے خوش کرنا چاہا ہے۔“ اختر نے پوچھا۔

”صدیوں پہلے یہ کتابوں میں لکھا گیا تھا، وہ آئے گا جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ ہوا، اس طرح وہ دنیا میں آیا ہے، جب وہ نہیں آیا تھا، جب بھی ہم اس کا حکم مانتے تھے، اب

تو وہ آگیا ہے، تم اس کے لانے والے ہو۔ تمہارا ہم پر احسان ہے، ہم اس کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ وہ ہمارا معبود ہے۔“

اختر زور سے ہنس بڑا اور پھر بولا۔ ”تم لوگ صدیوں سے غلطی کر رہے ہو اور مسلسل کرتے جا رہے ہو۔ رب کائنات نے یہ دنیا بنائی ہے۔ یہ کتنی بڑی ہے، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا ہے۔ اس میں سیکڑوں سیارے گردش کر رہے ہیں، ہر سیارے کے چاند ہیں اور سورج ہیں۔ ایک کا دوسرے کے درمیان کروڑوں کا فاصلہ رکھا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے سیاروں پر زندگی ہے اور اگر زندگی ہے تو وہ کس شکل کی ہے۔ ان کو ہوائی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ تم نے اس عظیم ذات کو چھوڑ کر اس کی بنائی ایک ادنیٰ سی چیز کو اپنا معبود بنالیا۔ ذرا میری بات پر غور کرو جو معبود حقیقی ہے۔ اس کو تم نے چھوڑ دیا۔ ذرا اس کی کریمی اور رحم دلی پر غور کرو کہ وہ پھر بھی تم کو پال رہا ہے۔“ اختر نے کہا۔

”تمہاری بات بے وزن نہیں ہے۔ میں تم کو اس کا جواب دے سکتی ہوں مگر نہیں دوں گی اور جواب نہ دینے کی وجہ بھی نہیں بتاؤں گی۔“ وہ تنبیہ کی سے بولی۔

”میں تمہارے جواب کا طالب نہیں ہوں۔“ اختر نے کہا۔

”تم نے اب تک گرو سے ملنے کا اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔“ وہ بولی۔

”وہ میرا گرو نہیں ہے، پھر مجھے اس سے ملنے کا اشتیاق کیوں ہوگا؟“ اختر بولا۔

”اگر تم کو اشتیاق تیس تو پھر ملنا بے کار ہے۔ اگر ملے تو شاید کچھ رعایت تم کو مل جاتی۔“ وہ بولی۔

”مجھے اس کی کسی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اشارہ اگر میری موت کی طرف ہے تو غور سے سن لو کہ میں ہر وقت موت کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ رہی مدت ختم ہونے کی تو میں تم کو بتا دوں کہ میرے رب نے مجھے جتنی زندگی دی ہے، اس سے پہلے تم یا تمہارا گرو مجھے نہیں مار سکیں گے، میری جو عمر مقرر کر دی گئی ہے جہاں اور جس طرح مقرر

”تمہارا نام اختر ہے۔“

”ہاں میرا یہی نام ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ایک آدمی تم کو مسجد کی میزھیوں پر بلارہا ہے، کہتا

ہے کہ بہت ضروری کام ہے۔“ وہ بولا۔

”اختر میزھیوں پر آگیا۔ اختر نے پہچان لیا، وہ وہی

سادھو تھا۔ سادھو نے کہا۔ ”تم تو اندر ہی رہ گئے، باہر کی دنیا دیکھو، مزے کرو۔“

”میں اندر سکون سے ہوں، تم جاؤ، اب نہ آنا۔“ اختر

نے جواب دیا۔

”ارے اس پاگل عورت کی باتوں میں آگئے، وہ تو

سب سے ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔“ وہ بولا۔

”وہ تم سے زیادہ جانتی ہے، تم میرا پیچھا چھوڑ دو،

میں تمہاری امداد بھی نہیں لوں گا اور اگر میری جیب میں ڈال

جاؤ گے تو کنویں میں ڈال دوں گا۔ میں اب صرف اپنی کمائی

سے حلال کی روٹی کھاؤں گا۔“ اختر نے کہا۔

”نانا اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے تمہارا تو ہم پر حق ہے،

تمہاری خدمت ہم پر فرض ہے۔ پھر اس میں حلال و حرام

کہاں سے آگیا۔ میں تو حق دار کو اس کا حق پہنچاتا ہوں۔

سخت مزدوری تمہاری شان کے خلاف ہے، یہ کبھی نہ کرنا کہو تو

تمہارے لئے کوئی بڑھیا سا بنگہ تیار کروادوں۔“ سادھو بولا۔

”اچھا اب جاز یا وہ چالوئی کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے تیری یا تیری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ اور اختر

واپس مسجد کے دروازے کے اندر آگیا۔ اس نے پلٹ کر بھی

نہیں دیکھا۔

فقیر کی کا جملہ اس کے دماغ میں ہر وقت گونجتا رہتا

”ہاتھ پیر چلا اور رزق حلال پیٹ میں ڈال۔“

وہ مسجد سے نکل آیا اور کھاری پاڈی کی طرف چلا۔ اس

نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مکان بن رہا تھا۔ مزدور کام

کر رہے تھے۔ پہلی منزل تیار تھی۔ دوسری منزل پر چٹائی

ہو رہی تھی۔ اینٹیں اور مصالحہ اوپر پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک آدمی

کھڑا کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا اور بولا۔

”بھائی مجھے مزدوری مل سکتی ہے۔“ اس آدمی نے سر

ہے، میں عمر پوری کر کے مروں گا، یہ میرا ایمان ہے، تم لاکھ

شعبہ دے دکھاؤ، مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوگا۔“ اختر نے کہا۔

”میں مجبور ہوں، تم سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرے

ہاتھ پیر اور زبان سب باندھے ہوئے ہیں۔ تم کہو، کہاں جانا

چاہتے ہو، تمہاری مرضی کے مطابق تم آزاد ہو، ہم تمہاری راہ

میں نہیں آئیں گے۔ جب وقت ہوگا تو تم سے میں گے۔

بارہ سالوں تک تمہارا خرچ جتنا تم چاہو، تم کو ملتا رہے گا۔“ وہ

خاموش ہو گئی اور اختر دروازے کی طرف چلا۔ دروازے پر

سادھو بیٹھنے لگے کھڑا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اختر دلی کی شاہی مسجد کی میزھیوں

کے پاس کھڑا تھا۔ آخری میزھی پر ایک عورت میلی سی چادر

اڑھائے بیٹھی تھی۔ اس نے اختر کو دیکھ کر صدا لگائی۔ ”دے

اللہ کے نام پر۔“

اختر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو ہاتھ میں آیا،

عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

عورت کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”ٹھہر جا!

یہ کیا دے رہا ہے، اپنی حلال کی کمائی دے، یہ میں نہیں لیتی،

یہ تجھے ہی مبارک ہو۔“ اختر نے عورت کو غور سے دیکھا اور

عجب سے بولا۔

”مائی تجھے کیا پیڑ، یہ پیسے حلال ہیں کھ حرام تیرے

لئے تو صرف پیسے ہیں۔“

”مجھے بتاتا ہے، ذرا سی عزت پھیک میں کیا مل گئی،

اڑنے لگا، ارے وہ سب دھوکے کی رقم ہے۔ دھوکا ہے،

فریب ہے، کیوں امداد پر زندہ ہے تیرے ہاتھ پیر ہیں، چلا

اس کو اور حلال رزق پیٹ میں ڈال۔“

اختر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ شرم سے گردن جھکا کر

اس فقیر کی کے سامنے کھڑا کھڑا رہ گیا۔ فقیر نے بولی۔ ”اب

جا اور رزق حلال پیدا کر۔ راستہ خود بنے گا۔“

وہ گردن جھکا کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ دو دن وہ مسجد

کے گیٹ پر بھی نہیں آیا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو اس کو کھانا مل

جاتا، مسجد کے گھن میں جھاڑو لگا تار ہوتا، وہ بہت سکون محسوس

کر رہا تھا۔ دو دن کے بعد اس کے پاس ایک آدمی آیا اور بولا

”تو بڑا ضدی ہے۔ ارے کیوں پریشانیوں میں پڑا

ہے، تیرے لئے کچل تیار ہے، چل میرے ساتھ۔“ وہ بولا۔

”ضدی میں نہیں ہوں، تو ہے، بار بار میرے پاس

آ جاتا ہے، مجھے تیری مدد نہیں چاہئے۔ مجھے کیوں بھٹکانے

کی کوشش کرتا ہے۔“ اختر نے جواب دیا۔

”ارے عقل کے دشمن، دنیا جس چیز کو ترستی ہے،

میں وہ چیز تیرے قدموں میں ڈال رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اختر نے کہا۔

”لایا انسان کی بیٹائی بڑھانے کا سب سے موثر

ذریعہ ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر انسان کی رگوں میں

خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ دل و دماغ دونوں کو تقویت

حاصل ہوتی ہے۔

زندگی میں انسان بڑے حسین خواب دیکھتا ہے، ان

حسین خوابوں کی تعبیر کے لئے انسان کو دولت کی ضرورت

پیش آتی ہے۔ اسی دولت کے بل بوتے پر ایک کمزور آدمی

بڑے سے بڑے قوی سے قوی حریف پر قابو پالیتا ہے۔ ذرا

میری بات پر غور کر، دولت اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت

اور ضرورت ہے۔ تجھے اس کی قدر اس لئے نہیں ہو رہی کہ

تیرے پاس یہ خود آ رہی ہے۔“ سادھو نے کہا۔

”تو نے پوری تعریف دولت کی نہیں کی۔ کیا دولت

کی خاطر قتل نہیں ہوتے۔ کیا دولت کی خاطر عصمت فروشی

نہیں ہوتی۔ دنیا کے جرائم صرف اس کی خاطر نہیں ہوتے۔

کیا اس کی خاطر انسان بھیک کر شیطان نہیں بن جاتا اور وہ

شیطان بن کر کون سے اچھے کام کرتا ہے۔ یہی تمام خرابیوں

کی جڑ ہے۔

یہی انسانوں میں فرق بنتی ہے۔ غریبی اور امیری

پیدا کرتی ہے۔ فرق پیدا کرتی ہے۔ توازن بگاڑتی ہے۔ کسی

کو اونچا اور کسی کو نیچے لے جاتی ہے۔ اگر یہ بہت اچھی چیز

ہے تو اپنے پاس رکھ۔ مجھے کیوں دیتا ہے، میرے لئے تو

آٹھ آنے بہت ہیں۔ اب جا اور اب پھر مجھے بھٹکانے نہ

آنا۔“ اختر نے غصے سے کہا۔

”آنا تو پڑے گا تو نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ بڑی

سے میر تک اس کو دیکھا اور بولا۔

”کام ڈرا سخت ہے، کرلو گے؟“ اختر نے جواب

دیا۔ ”پیٹ کی خاطر تو کرتا ہی پڑتا ہے۔“

”چار اینٹیں ایک پھیرے میں اوپر پہنچانا ہیں۔ آٹھ

آنے روز ملیں گے، بول کرے گا۔“ وہ بولا۔

”کرلوں گا؟“ اختر نے جواب دیا۔

”تو پھر ہو جا شروع، تجھے آج کی پوری مزدوری

ملے گی۔“ وہ بولا۔

اور اختر بھی دوڑ دوڑ کر اوپر اینٹیں پہنچانے لگا۔ شام

کو اس کو آٹھ آنے مزدوری مل گئی۔ دو آنے روز پر ایک

سرائے میں اس نے چار پائی حاصل کر لی اور عشاء کے وقت

وہ مسجد چلا گیا۔ سب خرچ پورے کرنے کے بعد بھی اس کے

پاس تین آنے بچے ہوئے تھے۔ آخری سیزمی پر وہی فقیرنی

گردن گھٹنوں میں دینیے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا گیا

اور اس کے ہاتھ پر وہ تین آنے رکھ دیے۔ عورت نے گردن

اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

”آج تیری محنت کی خوشبو اس میں سے آ رہی

ہے۔ یہ بہت قیمتی رقم ہے۔“ وہ بولی۔

”تین آنے ہی تو ہیں تم نے اس کو رقم بنا ڈالا۔“ اختر

نے کہا۔

”یہ تیرے ان نوٹوں سے بھاری ہے، ابھی تیری

سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔“ وہ بولی۔

”میں نے ایک چار پائی بھی کرائے پر لے لی ہے۔

اب میں شاید ادھر نہ آ پاؤں۔“ وہ بولا۔

”پورے شہر میں اور بھی مسجدیں ہیں۔ ہر مسجد میں

خدا ملتا ہے شرط تو یاد کرنے کی ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں آپ کی بات درست ہے۔ آپ نے مجھے

ایک راستہ بتایا ہے، آپ کا احسان ہے۔“ وہ بولا۔

”مٹیں یہ احسان نہیں ہے، فرض تھا۔“

ایک سال تک اختر مزدوری کرنا رہا۔ وہ شاہی مسجد

بھی جاتا رہا۔ مگر وہ عورت اس کو پھر نہیں ملی، ایک سال کے

بعد سادھو پھر اس کے سامنے آ گیا۔

رعایت ملی ہے تجھے..... اب شاید گرد تیرے لئے کچھ اور سوچے گا۔ میں پھر کہتا ہوں، کر لے وچار ایک دفعہ اور پھر شاید تیرے پاس وچار کرنے کو وقت نہ ہو، ہم تو آخری وقت تک موقع دے رہے ہیں۔ اس کا کارن یہ ہے کہ تو چاند کے نور نظر کا باپ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تیرے پاس وقت کم ہے۔ اس کم وقت میں تیرے آرام کا خیال رکھنا ضروری ہے مگر لگتا ہے کہ یہ آرام بھی تیرے نصیب میں نہیں ہے۔“

”تو نصیبوں کا مالک نہیں ہے تو نے میرے متعلق جو اندازے لگائے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔“

تین دن نہیں گزرے تھے کہ وہ سیزھیوں پر گر گیا۔ اس پر ایک عجیب قسم کا دورہ پڑ گیا۔ آواز بند ہو گئی اور ہاتھ پیر اکڑ کر لکڑی ہو گئے۔ دوسرے مزدوروں نے اس کو سرائے پہنچا دیا۔

سرائے کا مالک شریف آدمی تھا اور اس کی ایمانداری اور صاف لین دین سے متاثر تھا۔ اس کو اس کی چار بائی پر لٹا دیا۔ شام تک وہ پڑا رہا۔ سورج غروب ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم کی تمام تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ اس نے سرائے کے مالک کو آواز دینا چاہی تو آواز نہ لگی، اس کے کانوں نے بھی کسی آواز کو سننے سے انکار کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرائے کے مالک کے پاس چلا گیا۔ سرائے کے مالک نے اس کو بھلا چنگا دیکھا تو حیرت سے بولا۔

”ارے واہ اختر میاں! دن میں تو تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ! تم ٹھیک لگ رہے ہو۔“

اختر نے اس کا ایک لفظ بھی نہیں سنا اور اشاروں سے بتایا کہ وہ بول نہیں سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے۔ سرائے کے مالک کی جب سمجھ میں اس کی بات آئی تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔

دوسرے دن سورج نکلنے ہی اختر پر وہی دورہ پڑا اور تکلیف سے ہاتھ پیر مارنے لگا اور سارے دن اس کی یہی کیفیت رہی۔ شام ہونے پر وہ پھر ٹھیک ہو گیا۔ مگر زبان اور کان بند رہے۔

سرائے کا مالک نیک آدمی تھا۔ اختر اپنی روزانہ کی مزدوری اس کے پاس جمع کرا دیتا تھا۔ اس نے اختر کی بیماری کا علاج کرانا چاہا مگر اختر کی بیماری عجیب نوعیت کی تھی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دن میں بیماری اپنے عروج پر ہوتی اور رات کو اس کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ زبان اور کان ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک مگر آواز بند۔ کسی معالج کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اور پھر وہ میرے مطب میں آ گیا۔ اس کو رستم خان نامی آدمی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں ایک سرائے کھاری باولی میں چلاتا ہوں۔ یہ آدمی سال سے میرے پاس رہتا ہے۔ نہایت چٹختی اور ایماندار آدمی ہے۔ لین دین کا بھی کھرا ہے۔ اس کی کچھ رقم میرے پاس پڑی ہے۔ اگر کچھ کمی بیشی ہوئی تو میں ادا کر دوں گا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا اور مریض رُخ رہا تھا۔ اس کی تکلیف میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میری زندگی کا یہ انوکھا کیس تھا۔ مریض کی تکلیف کی نوعیت پتہ نہیں چل رہی تھی۔

جسم کے کس حصے میں تکلیف تھی۔ اس کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیر لکڑی ہو رہے تھے۔ چہرہ لال، مہجود تھا۔ آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں مگر منہ سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور منہ کے اندر پانی تک نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت رولو کا کو یاد کرنا ضروری تھا۔ کچھ ہی دیر میں رولو کا آ گیا۔

میں مریض کے سرہانے کھڑا تھا۔ رولو کا بھی میرے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”معاملہ بہت بگڑا ہوا لگتا ہے۔“

”میری تو سمجھ میں اس کی تکلیف نہیں آئی، کچھ تم ہی بتاؤ۔“

”میں کچھ کرتا ہوں۔“ وہ خاموش کھڑا اس کو فور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”سورج غروب ہوگا تو ٹھیک ہوگا۔“

”سورج سے اس کی بیماری کا کچھ تعلق ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ابھی پوری بات بتا نہیں

سکتا۔ سورج غروب ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے کہا۔

رولو کا نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ وہ خاموش اس کے سر ہانے کھڑا ہو گیا اور کچھ اشارے اپنے اطراف میں کرتا رہا۔ سورج غوب ہوتے ہی مریض ساکن ہو گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رولو کا اس کے پیٹھے ہی زور سے بولا۔

”باہر مت جانا، مارا جائے گا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کون جارہا ہے؟“

”وہی جو اندکارروانی کر رہا تھا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سامنے کھڑا ہے؟“ رولو کا نے جواب دیا۔ ”مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔“

”تو جو بھی ہے سامنے آ جا، کیونکہ کسی بھی روپ میں تو باہر تو جانا نہیں سکتا۔“ رولو کا نے کہا۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک سادھو میرے سامنے کھڑا تھا۔ مریض نے اس کو دیکھا تو چونک پڑا مگر آواز نہ نکلی، اس کا مطلب تھا کہ مریض اس کو جانتا تھا۔

”تو کون ہے اور اس کو کیوں تکلیف پہنچا رہا ہے؟“ رولو کا نے پوچھا۔

”اس کو چھوڑ، تو کون سورما ہے کہ میرے کام میں دخل دے رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ میرا مریض ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک انسان ہے۔ میں اسی ناطے اس کی مدد کر رہا ہوں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے، اس کی جو سزا مقرر ہے، وہ بھوگنا ہوگی، کوئی اس سزا سے اس کو بچا نہیں سکتا۔“ سادھو بولا۔

”اور تجھے میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تجھے اندازہ نہیں ہے، میں کون ہوں۔“ سادھو بولا۔

”تجھے بڑی خوش فہمی ہے، تو نہیں جانتا، اس دنیا میں کیا کیا طلسمات بھرے پڑے ہیں۔ ہر کوئی خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا ہے۔ تو بھی سمجھ رہا ہے، تو نے اب تک اس کے جسم میں رہ کر خوب دکھ دیئے ہیں مگر اب تو ایسا نہیں کر سکے گا۔ دوسرے تو میری مرضی کے بغیر جا بھی نہیں سکے گا۔ اگر یقین نہیں ہے تو کوشش کر لے۔“ رولو کا نے کہا۔

”میری شہتی چاند دیوتا کی شہتی ہے۔“ وہ غرور سے بولا۔

”چاند کی شہتی چاندنی راتوں میں کام کرتی ہے۔ اندھیری راتوں میں تم مردہ مینڈک کی طرح ہو، میں سمجھ گیا، اب دیکھ یہ مریض تیرے سامنے بات کرے گا، تیرا گرد اور تو دیکھے گا، کچھ نہیں کر سکے گا، اس لئے کہ چاند رات ابھی دور ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”یہ میرا کبھی نہیں بول سکتا، اس کی زبان اور کانوں پر گرو نے مہر لگا دی ہے۔“ وہ بولا۔

رولو کا مریض کے سر ہانے گیا اور اس کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے جھک دیا۔ میں نے تعجب سے دیکھا کہ مریض کے کچھ بال اکھڑ کر رولو کا کے ہاتھ میں آ گئے اور وہ درد سے چیخ پڑا مگر پھر اپنی آواز سن کر حیرت سے بولا۔ ”میری آواز آ گئی، میں بول سکتا ہوں، سن بھی رہا ہوں۔“

رولو کا نے سادھو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”تم اس کو جانتے ہو؟“

آخر نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”ماجرہ کیا ہے، مجھے بتاؤ۔“ رولو کا نے پوچھا۔ اور آخر نے اپنی کہانی شروع سے بیان کرنا شروع کر دی۔ بات بڑی لمبی مگر میں نے اور رولو کا نے بڑے دھیان سے سنی، سننے کے بعد رولو کا نے سادھو سے پوچھا۔

”اب بول یہ کہانی درست ہے، جھوٹ بولے گا تو پکڑا جائے گا۔ سچ بتا اس نے جو کچھ کہا، وہ کچھ ہوا ہے۔“

سادھو نے جواب دیا۔ ”ہاں وہی ہوا ہے۔“

”تم نے اس کی اولاد کو چاند کا بیٹا کر بٹھایا۔ اس کی بیوی کو مار دیا۔ تمہاری ضعیف الاعتقادی نے اس کی

پاس قید ہو، اس کمرے میں اور اس کی بابت کسی کو پتہ نہیں ہے۔“ ردلوکا نے کہا۔

”یہ تمہارا خیال ہے۔ وہ سب جانتا ہے کہ وہ کروڑوں من برف کے اندر بھی ہماری پوری خبر رکھتا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔ سن رہا ہے۔ تمہاری بندش اور پہرے مجھے روک نہیں سکیں گے۔“ سادھو بولا۔

”تم اور تمہارا گرو سخت غلطی کا شکار ہو۔“ ردلوکا نے جواب دیا۔

”ہماری کتابوں میں جو لکھا ہے، وہ ضرور پورا ہوگا۔ تم دیکھ لو گے کہ یہ ٹھیک بارہ سال کے بعد خود بخود مرجائے گا، اس کو ہم نہیں ماریں گے۔ جب ساری نشانیاں پوری ہو رہی ہیں تو یہ بھی ضرور پوری ہوگی۔ تم کوئی آدم زاد اس کمرے سے نہیں بچا سکتا۔“ سادھو بولا۔

”تم نہیں جانتے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اس کی موت کا وقت اور جگہ مقرر کر دی جاتی ہے۔ اس کو کوئی بدل نہیں سکتا تم بے وقوف ہو کہ کسی کی موت کا وقت مقرر کر رہے ہو۔“ ردلوکا نے جواب دیا۔

”میں نے جو کہا ہے وہ پتھر کی لکیر سمجھ لے۔“ سادھو بولا۔

”تیری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی تجھے نقصان پہنچا سکتی ہے۔“ ردلوکا نے جواب دیا۔

”تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کب سے ہوں۔ تم اور تمہارا تجربہ میرے لئے بچکانا سا ہے۔ پھر میں کسی بچے کی بات کو کیا اہمیت دوں گا۔“ سادھو بولا۔

”کچھ باتیں عمر اور تجربہ نہیں سکھاتا، اس کے لئے محنت درکار ہوتی ہے۔ تو اپنی عمر کے تجربے کا رعب مجھ پر مت ڈال۔ اپنے پر غور کرو اپنی اوقات سے تجاوز نہیں کر رہا ہے۔“ ردلوکا شجیدگی سے بولا۔

”تو یہ بات اس لئے کر رہا ہے کہ تو نے مجھے روک لیا ہے مگر یہ کامیابی صرف وقتی ہے۔ تو مجھے زیادہ دیر تک نہیں روک سکتا۔“ سادھو نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر کہا۔

”دیکھ لے اچھی طرح دیکھ لے، کوئی سوراخ تلاش

زندگی کو جنم بنایا۔ تم موت کے وقت مقرر کرنے لگے۔ تم دنیا کے مالک بن گئے۔“ ردلوکا غصے سے بولا۔

”تو ہمارے درمیان نہ آ۔ ارے آدم زاد! تجھے پتہ نہیں کہ میں کس قوم سے ہوں۔ ہم برف پوش پہاڑوں اور جنگلات کے باسی ہیں۔ ہم آدم زاد سے دور رہتے ہیں۔ ہمارے معمولات بہت الگ ہیں۔ ہماری طاقت سب سے الگ ہے۔“ سادھو بولا۔

”پھر بھی تم کو آدم زاد کے بیٹے کی ضرورت ہے۔ وہی تمہارا حاکم بنے گا۔ تم اس کے آگے سر جھکاؤ گے، تم تو بڑے طاقتور ہو۔ پھر آدم کے بیٹے کے آگے سر کیوں جھکاؤ گے، تمہارے سب سے بڑے کرو نے بھی نے تو سر نہیں جھکایا تھا، تم کیوں جھکاتے ہو، بولو۔“

”ہمارے قبیلے کی یہ ہزاروں سال پرانی رسم ہے۔ ہماری قدیم کتابوں میں جو لکھا تھا وہ پچھین اسی ساعت میں پیدا ہوا۔ اس کے وہی سب آثار تھے جو لکھا تھا۔ ہر نشانی اس میں پائی گئی۔ اب آخری نشانی رہ گئی ہے کہ وہ بارہ سال کا ہوگا تو اس وقت اس کا باپ مرجائے گا۔

یہ آدمی اس کا باپ ہے۔ ہم نے بارہ سال اس کو دیکھنا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی وہ ہمارا دیوتا بنے گا۔ ہم نے اس کو عیس سے رکھنا چاہا مگر یہ اپنی چلانے لگا۔ اس نے ہماری نہ مانی تو سختی کرنا پڑی۔ ہمارا مقصد اس کو مارنا نہیں تھا، اس کو تو بارہ سال پورے ہونے پر قدرتی موت مرنا ہے۔ اگر یہ نہ مرا تو وہ بچ چاند دیوتا نہیں بنے گا اور ہمارا پھرنے دیوتا کے لئے انتظار شروع ہو جائے گا۔ پتہ نہیں، کتنے ہزار سال یہ انتظار کرنا پڑے۔“ سادھو نے کہا۔

”تم پھر بھی آدم زاد سے نفرت کرتے ہو۔“ ردلوکا نے کہا۔

”نفرت کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارا دیوتا آدم زاد کو بنایا گیا ہے۔ قدیم سے قدیم لکھے کو مٹایا بھی نہیں جاسکتا۔“ سادھو نے کہا۔

”تم نے آدم زاد کی طاقت دیکھی، تم نے یا تمہارے گرو نے مہر لگائی اور میں نے اس مہر کو توڑ دیا۔ تم میرے

کر لے بھاگئے کو۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو غلط سوچ رہا ہے، اسے آدم زاد، تجھے نہیں پتہ کہ طاغوتی طاقتیں کیا کر سکتی ہیں۔“ سادھو بولا۔

”مجھے تاپنے کی کوشش مت کر، میرا ارادہ تجھے باندھنے کا نہیں تھا مگر تو نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بتاؤں تجھے کہ انسان کیا چیز ہے۔“ پھر رولوکا نے ایک اشارہ کیا۔ اس کے سامنے پنجرہ آگیا۔ نہ معلوم کہ یہ کس دھات کا تھا کہ اس کی ہر تیلی چمک رہی تھی۔ اس کا ایک دروازہ بھی تھا۔ پنجرہ دیکھ کر سادھو پریشان ہو گیا۔

رولوکا نے کہا۔ ”تیرا تجربہ اور طاقت صرف اتنی ہے کہ اس پنجرے میں داخل ہو جائے اس کے بعد تو سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا۔ تیرا گرد گرد دیکھ رہا ہے تو تجھے بچائے تیری موت کا ذمہ دار میں نہیں، تیری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی تیری موت کا سبب بنی ہے۔“ اور رولوکا نے پنجرے کا دروازہ کھول کر سادھو کو اس کے اندر کر دیا۔ سب نے حیرت سے دیکھا کہ چھٹ کا آدمی بڑی آسانی سے اس پنجرے میں سا گیا اور پھر پنجرہ ہوا میں اڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”اس کو کہاں روانہ کر دیا۔“ میں نے پوچھا۔
 ”اس کو سمندر کے سب سے زیادہ گہرے حصے میں دفن کیا جائے گا۔ یہ دنیا کے لئے بہت بڑا فتنہ بننے والا تھا۔“ رولوکا بولا۔
 ”اور یہ آخر میاں کا کیا بنے گا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ان کو بیرونی خطروں سے بارہ سال بچانا ہوگا۔“ جب بارہ سال گزر جائیں گے تو پھر اس کے بچے کی تلاش کرنا ہوگی۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”یہ تو بھوسے کے ڈمیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہوئی۔“ میں نے کہا۔

”بات آپ کی درست ہے مگر یہ کرنا ہوگا۔ بارہ سال تک گرد اپنے چیلے کو تلاش کرے گا اور آخر پر نظر رکھے گا۔ وہ آخر کی موت کا انتظار ضرور کرے گا۔ اس کام سے زیادہ ضروری کوئی کام نہیں ہے۔ وہ میری طرف دھیان بارہ سال کے بعد کرے گا۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ بارہ سال

میں، میں اس کا ایک بازو اور بیکار کرنے کی کوشش کروں گا۔ دشمن پر اس وقت وار کاری پڑتا ہے جب وہ بے خبر ہو۔ مجھے پتہ ہے اب تک اس کو کچھ میں کھیل نہیں آیا ہے۔ کیونکہ سادھو کی طاقت پر اس کو بہت مہروسہ تھا اور سادھو بھی اسی گھمنڈ میں پھنس گیا تھا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ جنات کا وہ گروہ ہے جو چاند کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ پہاڑوں اور گھنے جنگلات میں رہتے ہیں۔ ان پر سردی اور گرمی دونوں اثر نہیں کرتیں۔ یہ لوگ انسانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں مگر مجھے یہ نئی بات پتہ چلی کہ یہ کسی انسان کو ہی چاند کا بیٹا بنا کر اس کو دیتا سمجھ کر پوجتے ہیں۔ یہ ایک عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ شیطان نے آدم کو سجدہ نہیں کیا۔ اس کو افضل نہیں مانا، پھر ان میں سے ہی ایک قبیلہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”بات تو غور طلب ہے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ دنیا ہے حکیم صاحب۔۔۔۔۔ یہاں پر بڑے نرالے کھیل تماشے ہوتے ہیں، ابھی اور نہ جانے کتنے کھیل ہیں جو ہم نے اب تک نہیں دیکھے۔“ رولوکا بولا۔

”آخر کو کہاں رکھا جائے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”آپ کا دواخانہ بہت بڑا ہے۔ کہیں پر رکھ لیں۔“ یہ یہاں پر محفوظ رہے گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”کیوں آخر یہاں رہیں گے۔“ میں نے آخر سے پوچھا۔

”میں تو آپ کا غلام ہوں۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے جو حکم ہوگا۔ بجالاؤں گا۔“ آخر نے جواب دیا۔

دوسرے روز رولوکا نے کہا۔ ”حکیم صاحب! میں نے یہاں پر آخر کی حفاظت کا پورا انتظام کر دیا ہے۔ میں کچھ عرصہ یہاں نہیں رہوں گا۔ ویسے ابھی آخر کی زندگی کو کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا۔ وہ لوگ صرف سادھو کو تلاش کریں گے۔“ رولوکا کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”تو کہاں رہو گے۔“

”میرا سفر بہت لمبا ہے مگر میں آپ سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ ابھی کچھ بتانے کو میرے پاس نہیں۔ جنگ

سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لیا جائے اور اپنی کمزوریوں کو دور کر لیا جائے۔ ”رولو کا نے کہا۔
”تم جو کچھ کرو گے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

اور رولو کا روانہ ہو گیا اور مسلسل ایک سال وہ دلی سے دور رہا مگر ہر دوسرے دن اس نے میرے دماغ میں اپنی خبریت بتائی۔ اختر دو خانے میں کام کرتا رہا۔ اس کو دلی سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ ایک سال کے بعد اچانک رولو کا آگیا۔ تو میں نے تفصیل پوچھی۔

”میرا ایک بہت پرانا دوست ہے، وہ ملا گسی ہے۔ یہ ایک نیم وحشی قبیلہ کا فرد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ یہ نیم وحشی اور نیم پولی نیشی ہیں۔ بہت صدیاں گزریں۔ ان لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ملایا اور لکا کے راستے سے سفر کیا تھا اور جنوبی سمندروں کے علاقے میں اپنا وطن مشرقی افریقہ کے ساحل پر جا بسے تھے۔ یہ بات یوں تو ناقابل یقین سی لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خود ساختہ کمزور کشتیوں پر پندرہ ہزار میل کا فاصلہ کھلے سمندر میں کیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مڈغا سکر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں پر انہوں نے قدیم باشندوں سے راہ و رسم بڑھائی اور ان سے شادیاں کر لیں۔ اس طرح ایک نئی نسل تیار ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگوں میں دونوں نسل کی بدترین خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ مڈغا سکر قدیم زمانے میں جادو کا گھر رہا ہے۔ میرا دوست اسی بدترین نسل کا ایک نمائندہ ہے۔ میں اس کو دوست صرف اس لئے کہتا ہوں کہ یہ میرے خلاف کبھی کچھ نہیں کرتا اور کہیں کہیں میری راہ نمائی کر دیتا ہے۔“

”تم اختر والے معاملے میں اس کے پاس گئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں سادو ایک بہت بڑا ساحر تھا۔ میں نے اندازہ یہ لگایا ہے کہ اس کا گرد و غبار یہی ہوگا۔ ایک تو جنت کی قدرتی طاقت اوپر سے جادوگر تو مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”اگر جنت کا یہ گروہ ان توہمات پر یقین کرتا ہے اور جادوگری بھی کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کافر جن ہیں۔“ میں نے کہا تو رولو کا نے جواب دیا۔

”آپ کا خیال درست ہے۔ جس طرح انسانوں میں بھانت بھانت کے عقیدے موجود ہیں۔ اسی طرح ان میں بھی ہیں۔ انسانوں میں جس طرح نیک اور ہمدرد انسان ہیں، اسی طرح ان میں بھی ہیں۔ ہم سب کو خراب نہیں کہہ سکتے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کا بھی ایک طرز زندگی اور مخصوص غذا ہے۔ بلاوجہ یہ ہم سے متصادم نہیں ہیں۔“

رولو کا بار بار جانتا رہا۔ واپس آتا رہا۔ اس طرح دس سال گزر گئے۔ ان دس سالوں میں اختر کے ساتھ کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اختر نے دلی میں شادی کر لی تھی۔ وہ کام مطب میں کرتا تھا اور رہتا الگ مکان میں تھا۔

میرے بچے اب جوان ہو گئے۔ وہ دونوں بھی مطب میں بیٹھا کرتے تھے۔ رولو کا کو وہ چچا کہتے تھے۔

رولو کا کون تھا، کیا تھا، وہ صرف میں جانتا تھا اور پھر دو سال اور گزر گئے۔ اختر کو رولو کا نے روک لیا تھا۔ وہ رولو کا کے پاس ہی رہتا تھا۔ اختر جانتا تھا کہ اس کو کیوں روکا جا رہا ہے۔

اور اختر ٹھیک رہا، پورے سال گزرنے کے بعد بھی ایک سال اوپر ہو گیا۔ اصل خطرہ اب شروع ہوا۔ یہ مطب تھا یہاں پر بننے والے لوگ آتے جاتے تھے۔ اختر وہیں موجود تھا اور پھر ایک دن ایک بہت بوڑھا آدمی آکر اختر کا پوچھنے لگا۔ اختر کی بجائے رولو کا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ بولا۔

”مجھے اختر سے ملنا ہے، تم کون ہو؟“ وہ بولا۔

”میں اختر ہوں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

بوڑھے نے غور سے رولو کا کو دیکھا اور غصے سے بولا۔ ”مجھے اندھا سمجھتے ہو، اختر کو بلاؤ۔“

”اگر آکھ والے ہو تو پچپان لو کہ میں کون ہوں؟“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تو ہی دیوار لگتا ہے، میری آنکھوں پر پردہ ڈال رہا ہے، اختر تو مر گیا ہے۔“ وہ بولا۔

”تم زندہ اختر کی تلاش میں آئے ہو یا مردہ کی تلاش ہے۔ اگر مردہ کی تلاش ہے تو پھر تم ناامید ہو جاؤ لیکن اختر زندہ ہے اور اسی چھت کے نیچے موجود ہے۔ دیکھنا چاہتے ہو تو حاضر کروں مگر ایک بات یاد رکھنا، یہ تمہاری برف پوش پہاڑی نہیں ہے۔ یہ دلی شہر ہے، اس شہر میں ہزاروں نیک لوگ زندہ ہیں اور مدفن بھی ہیں۔ کسی شعبہ کے کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا، تمہاری قدیم پوتھیوں میں جو لکھا ہے، اس پر اختر کا بچہ پورا نہیں اترتا ہے۔ اب وہ تمہارے لئے بے کار ہے۔ وہ چاند کا بیٹا نہیں ہے۔ اس لئے اختر کو اس کا بیٹا واپس کر دو، ہمارا تمہارا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔“

”تم اختر کو پیش کر دو تو میں فیصلہ کروں گا۔“ وہ بولا۔
روادگانے اختر کو آواز دی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی آ گیا۔ بوڑھے نے سرسری نظروں سے دیکھ کر اختر پر نظریں گاڑ دیں۔ دس پندرہ منٹ تک وہ ہنستا رہا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کو سخت صدمہ ہوا ہے۔ پھر بڑی دردناک آواز اس کے منہ سے نکلی۔ ”آہ! پھر انتظار، کتنے ہزار سال انتظار کروں؟ کیا میری زندگی صرف انتظار کی نظر ہو جائے گی؟“ وہ تھکے تھکے انداز میں کھڑا ہو گیا اور کمزور آواز میں بولا۔

”تم جیت گئے آدم زاد، میں پھر ہار گیا۔ بچہ تم کو مل جائے گا مگر اس بچے کو دھیان سے رکھنا، وہ ہمارا بھی لاڈلا رہا ہے، ہم نے بھی اس سے پیار کیا ہے۔“ اور پھر ناامیدی کی تصویر بنا، دروازے سے باہر چلا گیا۔ اختر خوشی سے رولو کا سے لپٹ گیا۔

روادگانے اس کا کندھا پکڑ کر اس کو الگ کیا اور کہا۔
”تم خوش نصیب ہو کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے ختم ہوا، میرا خیال تھا کہ اس دفعہ معرکہ بڑا سخت ہوگا۔ مگر خیر! اس بہانے میں نے اپنے کچھ پرانے سبق یاد کر لئے۔“

دوسرے دن ایک آدمی ایک بارہ سالہ بچے کو لے کر آ گیا۔ بچہ بڑا خوبصورت تھا۔ اختر کے چہرے کے نقوش اس سے ملتے تھے۔ اختر نے فوراً پہچان لیا کہ وہ اسی کا بچہ ہے۔

☆.....☆.....☆

ہر زمانے میں انسان موت سے ڈرتا آیا ہے۔ اس نے موت پر قابو پانے کا ہر حقن کر لیا مگر موت سے نہ بچ سکا۔ دنیا میں بڑے قابل لوگ پیدا ہوئے اور پھر بیست زمین ہو گئے۔ دنیا کے لئے وہ بے وقت مرے لیکن خالق کائنات نے جو وقت مقرر کر دیا تھا، وہی درست تھا۔ کیونکہ اس کے بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ ان کا مرنا ٹھیک تھا۔ موت پر قابو پانے کے لئے ماضی میں مصریوں نے بہت کام کیا ہے۔ کیونکہ مصر کے فرعون فنا ہونے سے بہت ڈرتے تھے ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس وقت تک زندہ رہتا ہے، جب تک اس کا جسم رہتا ہے اور روح دنیا میں اس کے ارد گرد رہتی ہے اور وہ روح پلٹ کر کسی بھی وقت جسم کی طرف آ سکتی ہے۔ اگر جسم باقی ہے تو، اگر جسم فنا ہو گیا تو روح نہیں آئے گی۔ کیونکہ روح کا لباس جسم ہے۔ اسی فارمولے کو سامنے رکھ کر فرعونوں نے مرنے کے بعد اپنے جسموں کی میاں بنوائی تھیں اور ہراموں کے اندر دفن ہونے سے پہلے ضرورت کی ہر چیز ساتھ رکھوائی تھی۔ ان کے خیال میں انہوں نے اس طرح موت پر قابو پایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح روح کو جسم کا تابعدار بنایا جاسکتا ہے۔ روح جسم چھوڑنے کے بعد بھی دوبارہ اسی جسم میں آئے۔ اس لئے جسم کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کا نظریہ غلط تھا۔ ہزاروں سال گزرنے پر بھی فرعون کی کسی مٹی میں جان نہ پڑ سکی۔ رب کائنات کے کچھ راز ہیں، جن تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ کچھ مقامات پر آگے جانے سے روکا بھی گیا ہے۔ مگر انسان ضدی ہے۔ اس کو جس کام سے روکا جائے، وہ اس کی طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے اور کبھی کبھی اسی ضد کی وجہ سے بہت زیادہ خسارے میں چلا جاتا ہے۔ واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

انسان پر ماحول کے اثرات بہت گہرے پڑتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک کورا کاغذ ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اس کے اثرات اس کے دماغ میں بیٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے، ماں صبح سویرے

کر سکتا۔“

یہ سن کر درویش کو جلال آگیا اور رتنا گری پر درویش نے ایک قہر کی نظر ڈالی تو رتنا گری وہیں کھڑے کھڑے راہک ہو گیا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر درویش بھی وہاں سے اس طرح غائب ہوا کہ پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ اس واقعہ کو گزرے چالیس سال گزر گئے مگر پرانے لوگوں کو یہ واقعہ یاد تھا۔ جب اندھیرا زیادہ ہو جاتا ہے تو روشنی کی کرن بھی ہوتی ہے۔ ایک روشنی کی کرن گھپ اندھیرے کو ختم کر دیتی ہے۔ آج پھر ایک رتنا گری بنگال میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ خود کو رتنا گری کا بیٹا کہتا ہے، وہ بھی انسانوں سے نفرت کرتا ہے، اس کے نزدیک انسان کھلوئے ہیں۔ وہ ان سے زندگی اور موت کے کھیل کھیلتا ہے۔ وہ سب سے بڑا ساحر ہے۔ بنگال کی سر زمین میں اس کا جادو خوب کام کرتا ہے۔ سیٹھ لالول اور جمیل خان پرانے دوست اور کاروباری شراکت دار تھے۔ لالول پٹنہ میں رہتے تھے اور جمیل خان مراد آباد میں رہتے تھے۔ جمیل خان مراد آباد میں برتنوں کا کارخانہ چلاتے تھے اور لالو مل ان کے بنائے مال کو پورے بھارت میں فروخت کرتے تھے۔ ان سے پہلے ان دونوں کے بزرگ یہی کرتے تھے۔ پرانے وضع دار لوگ تھے۔ کبھی آپس میں اختلاف نہیں ہوتا تھا اور اگر کبھی کچھ ہوا بھی تو ایک دوسرے کے جذبات کا خیال کرتے تھے اور دل صاف ہو جایا کرتے تھے۔ مگر نئی بیڑی کے آگے لالول اور جمیل خان ان روایات کو قائم نہ رکھ سکے اور یلین دین پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

لالول کا کہنا تھا کہ جمیل پر اس کی رقم نکلتی ہے اور جمیل کا کہنا تھا کہ حساب صاف ہے۔ یہ بات اتنی بڑی کہ دونوں کے آپس کے کاروبار بند ہو گئے۔ اس سے دونوں کو بھاری نقصان تو ہوا ہی، ساتھ ساتھ مارکیٹ میں دونوں کی ساکھ بھی خراب ہوئی۔ پہلے جمیل کے برتن پوری مارکیٹ پر چھائے رہتے تھے مگر اب پلائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ جمیل کو نئے سرے سے مارکیٹ میں جانا پڑا مگر لالول نے دوسرے کارخانوں کا مال تیزی سے بیچنا شروع کر دیا اور دام بھی گرا دیا۔ جمیل خان مراد آباد

اٹھتی ہے، باپ کو اٹھاتی ہے، دونوں اگر مسلمان ہیں تو نماز کی تیاری کرتے ہیں۔ کس طرح کرتے ہیں، بچہ دیکھتا ہے، یہ سب اس کے دماغ میں فیض ہوتا رہتا ہے۔ ہندو ہیں تو کس طرح تیاری کرتے ہیں، بھگوان کو یاد کرنے کا کیا طریقہ کرتے ہیں۔ بچہ نہ مسلمان ہے، نہ ہندو ہے، وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے، وہ بن رہا ہے۔ بڑا ہو کر وہ خود بخود مسلمان بن جاتا ہے اور ہندو بھی بن جاتا ہے۔ جو ماحول اس نے اپنے بچپن میں دیکھا ہوتا ہے، اس کو وہ پوری زندگی یاد رکھتا ہے، کبھی نہیں بھولتا۔ یہ بات دوسری ہے کہ عقل و شعور کی بیداری کے بعد وہ اپنے بارے میں فیصلہ کرے کہ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ غلط تھا یا سچی تھا۔

رتنا گری بنگال کا ایک بہت مشہور ساحر گزرا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پورے بنگال میں موجود رہتا تھا۔ جہاں کی یاد کیا اور وہ وہیں پہنچ گیا۔ وہ بہت بے حس اور غلام آدمی تھا۔ سحابی اور درگزر کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی سزائیں بھی بڑی بھیانک ہوتی تھیں۔

اس کا نام سننا بھی لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی غلامانہ کارروائیاں جب حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو ایک مرد خدا درویش بنگال میں وارد ہوا اور اس کا ٹکراؤ، رتنا گری سے ہو گیا۔

”تو نے اب تک جو کچھ کیا، تجھے اس کا تو حساب دینا ہی ہوگا۔“ درویش نے کہا۔

رتنا پتی جادو کی طاقت کے نشے میں مدھوش تھا، اس نے درویش کی بات کو اہمیت ہی نہیں دی اور بولا۔

”کیوں موت کو پکارتا ہے، میں اتنا گری ہوں یہاں پر میری حکومت ہے۔“ وہ بولا۔

درویش نے بڑی شہیدگی سے کہا۔ ”جب انسان زمین پر خدا بن جاتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے۔ اس دنیا کا مالک اس کو دیکھ رہا ہے اور جب وہ سزا کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس کو کوئی نہیں بچا سکتا۔“

رتنا نے جواب دیا۔ ”تو اور تیرا خدا میرا کچھ نہیں

میں رہ گئے مگر جدوجہد جاری رکھی۔

جھی۔ ”وہ بولا۔

جمیل نے اس کے اس چہیتے تیر کو برداشت کیا کیونکہ وہ کچھ اور تو کہ نہیں سکتے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ”اگر اب بھی عقل نہ آئی تو پاتال میں چلا جائے گا۔“ جمیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے اوسان بحال کئے اور بولے۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟“

”تیرے دماغ میں اگر بھوسا بھرا ہے، تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دیکھنے آئے تھے، جارہے ہیں، پھر آئیں گے۔“ اور وہ چلا گیا۔

جمیل خان کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ خوف حیرت اور پریشانی کا ملا جلا سا غبار ان کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون تھا، مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے ان کے اعصاب کو بری طرح کمزور کر دیا تھا۔ ان کو اپنی فکر کم اور بیوی بچوں کی زیادہ مٹی۔ وہ عالیشان مکان سے اٹھ کر ایک نہایت چھوٹے گھر میں اور بڑے کاروبار سے ایک چھوٹی سی دکان میں آ گئے تھے۔ ان کو جو ڈنٹی اور مالی جھٹکا لگا تھا، اس سے وہ ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ یہ نہ معلوم کون تھا۔ آ گیا اور پاتال میں پہنچانے کی بات کر گیا۔ ان کے دماغ میں خیالات کے میلے لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے دکان بند کر دی اور گھر آ گئے۔ ان کی پریشانی ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ بیوی نے بہت پوچھا مگر وہ کیا بتاتا۔ ان کی تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ وقت نے گزشتہ واقعہ کو ذرا ہی ڈھکا تھا کہ وہ پھر آ گیا۔

آتے ہی بولا۔ ”بڑے چین کی بنی بجا رہا ہے۔ ارے تجھے فکر نہیں کہ تجھ پر کسی کا ادھار باقی ہے۔“

”مجھ پر ادھار کس کا ادھار ہے۔“ جمیل نے پوچھا۔

”سیٹھ لالوئل کا اور کس کا یہ تو دینا ہی ہوگا تجھے۔“ وہ

حقیرانہ انداز میں بولا۔

”نہیں یہ غلط ہے۔ لالوئل میرا حصہ دار تھا مگر ہمارا

لالوئل جمیل کو پوری طرح برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے خلاف مراد آباد میں بھی مہم شروع کر دی۔ جمیل خان کا کاروبار مراد آباد اور دلی تک ہی رہ گیا تھا۔ وہاں پر بھی لالوئل آ گیا۔ چونکہ دولت میں وہ زیادہ تھا، اس لئے ضد میں اپنا نقصان بھی کر رہا تھا۔

وہ نقصان کرنے کی پوریشن میں تھا۔ وہ جمیل سے کم قیمت پر مال سپلائی کر رہا تھا۔ جمیل کا مال کوئی دوکاندار اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔ جب مال کی سپلائی بند ہوئی تو کارخانہ بند ہو گیا اور جمیل خان پرانے مال کو اوانے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی غنیمت تھا مگر ہوا یہ کہ مراد آباد میں جمیل خان کا باپ دادا کے زمانے کا جانا بھلا یا کارخانہ تھا۔ اس میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی اور پورا کارخانہ جل کر کوئلہ ہو گیا اور جمیل خان پوری طرح برباد ہو گئے۔ اب نہ ان کے پاس روپیہ تھا اور نہ کارخانہ۔ مراد آباد میں عزت دار کہلاتے تھے مگر اب ان کے پاس نہ عزت تھی نہ دولت، جو لوگ ان کو دیکھ کر سلام کیا کرتے تھے، وہ کئی کترانے لگے۔ ان کے ملازم تک ان کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بڑا جاناکہ تھا۔ انہوں نے مراد آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر دلی آ گئے اور لال کنویں کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور ایک دوکان کرپانہ کی حاصل کر کے خاموشی سے گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی ان کی دوکان پر آیا۔ وہ کوئی ہندو تھا، دھوتی کرتا اور واسٹک میں ملبوس سر سے منجھتا تھا، اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کا ہوگا۔ جمیل نے اس کو غور سے دیکھا اور غور کیا۔ اس کی منگراہٹ کچھ چھتی سی معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں حقارت کا انداز تھا۔ جمیل نے کچھ کہنے سے پہلے بلیکس جھپکائی ہی تھیں کہ جمیل کو ایسا لگا کہ وہ کہہ رہا ہو، چپ رہو، جمیل بولتے بولتے چپ ہو گیا اور جمیل کی تخیل نظر میں اس ادھیڑ عمر ہندو پر جم گئیں۔

”سیٹھ جمیل خان مراد آبادی اور ان حوالوں میں جھی

حساب ہر مہینہ ہوا کرتا تھا۔ میری طرف اس کا کچھ نہیں ہے۔“
جیل نے جواب دیا۔
”تیرے کہنے سے نہیں ہے، کھاتے تو بتاتے۔“ پوچھا۔

”وہ بولا۔“

”کھاتے ان کے اپنے ہیں۔ ان سے میرا کیا واسطہ۔“ جیل نے جواب دیا۔

”تیری ہر بات غلط ہے۔ پیسے کا بندوبست کر لے نہیں کرے گا تو بہت نقصان ہوگا۔“ وہ بولا۔

”اب میرے پاس کیا ہے جو کچھ تھا۔ وہ لالو نے اپنی چال باز یوں سے مارکیٹ میں ڈبا دیا۔ میرا لاکھوں روپیہ دوکانداروں پر نکلتا ہے مگر کوئی نہیں دیتا۔ میں تو تلاش ہو گیا ہوں۔“

”تم اپنی کمزوریوں کا الزام لالوئل پر نہ لگاؤ، تمہاری طرف ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم نکلتی ہے۔ یہ تم کو ادا کرنی ہے۔ وقت بتاؤ کب دو گے، اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو پورے بھارت میں بھاگ کر دیکھ لو۔ میں ہر جگہ آ جاؤں گا۔ میرا نام رتنا گری ہے۔ تم کو مہلت دے رہا ہوں، یہ میری عادت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”تم میری حالت تو دیکھو، میرے پاس تو روٹی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں دوں گا کہاں سے؟“ جیل نے گڑ گڑا کر کہا۔

”یہ میری درد سہی نہیں ہے، ٹھیک ایک مہینہ کے بعد آؤں گا۔ اگر وہ پیسہ نہ ملا تو تجھے نقصان اٹھانا ہوگا۔“

اب جیل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لالوئل کا آدمی تھا اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے بلا وجہ ہی مانگ رہا ہے۔ جیل کی پریشانیوں اپنے عروج پر تھیں۔ دماغ میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔ ان کا سر چکر رہا تھا۔ وہ نہ معلوم، کتنی مشکل سے گھر پہنچے اور جاتے ہی گر پڑے اور ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی۔

میں نے مریض کا معائنہ کیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے دماغ پر بہت زیادہ بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ضروری دواؤں اس کو دیں تو وہ شام کو ہوش میں آ گیا۔ مگر اس کی

”تم نے اپنے دل و دماغ کو ضرورت سے زیادہ کام کر دیا ہے۔ انسان کے ہر عضوی کام کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے زیادہ بوجھ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اگر کچھ پریشانی ہے تو بتاؤ، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“

اس نے ملتی جلتی سی آواز میں کہا۔ ”حکیم صاحب میں سخت پریشان ہوں۔“

”تم اپنی پریشانی بتاؤ تو شاید اس کا حل میرے پاس ہو۔“ میں نے کہا۔

”میرا نام جیل خان ہے۔“ وہ بولا اور اس نے اپنی مراد آباد سے دلی تک کی کہانی بیان کر دی۔ میں نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔

”کوئی فکر نہ کرو۔ جیل یہ زندگی کے کھیل ہیں۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کے کھیل ہیں۔ اچھا وقت نہیں رہتا تو کوئی برا بھی نہیں رہتا۔ تمہاری سچائی ضرور رنگ لائے گی۔ تم اپنا مکان یہاں میرے قریب لے لو۔ میں تم کو کرائے پر دلا دیتا ہوں۔ یہیں پر کاروبار کرو، وہ ایک ماہ کے بعد آئے گا، پھر بات کریں گے۔“

جیل نے میرے کہنے پر عمل کیا اور مطب کے قریب ہی میں نے ان کو کرائے پر مکان دلا دیا اور جیل ایک چھوٹی سی دوکان لے کر بیٹھ گیا۔

وہ روزانہ شام کو دوکان بند کر کے میرے پاس آ جاتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر بچپن سے کاروبار کرتا چلا آیا تھا اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ اس میں ہسکلو پن نہیں تھا اور بات کرنے کا ذہنک بھی جانتا تھا۔ میں نے رولو کا کو ان کے تمام حالات بتائے تو رولو کا نے کہا۔ ”رتنا گری کا میں نے بنگال میں نام سنا تھا مگر اس کو تو کسی درویش نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اب یہ کون سا رتنا گری آ گیا۔“

”سنا ہے کہ یہ خود کو اس کا بیٹا کہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

میں رہ گئے مگر جدوجہد جاری رکھی۔

جیسی۔ ”وہ بولا۔

جیل نے اس کے اس چہرے تیر کو برداشت کیا کیونکہ وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتے تھے۔ وہ بھر بولا۔ ”اگر آپ بھی عقل نہ آئی تو باتاں میں چلا جائے گا۔“

جیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے اوسان بحال کئے اور بولے۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟“

”تیرے دماغ میں اگر بھوسا بھرا ہے، تو اس میں ہمارا کیا تصور ہے۔ دیکھئے آئے تھے، جارہے ہیں، پھر آنکس گئے۔“ اور وہ چلا گیا۔

جیل خان کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ خوف حیرت اور پریشانی کا ملا جلا سا غبار ان کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون تھا، مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے ان کے اعصاب کو بری طرح کمزور کر دیا تھا۔ ان کو اپنی فکر کم اور بیوی بچوں کی زیادہ تھی۔ وہ عالی شان مکان سے اٹھ کر ایک نہایت چھوٹے گھر میں اور بڑے کاروبار سے ایک چھوٹی سی دکان میں آ گئے تھے۔ ان کو جو جیسی اور مالی جھوٹا لگا تھا، اس سے وہ ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ یہ نہ معلوم کون تھا۔ آگیا اور باتاں میں پہنچانے کی بات کر گیا۔ ان کے دماغ میں خیالات کے میلے لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے دکان بند کر دی اور گھر آ گئے۔ ان کی پریشانی ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ بیوی نے بہت پوچھا مگر وہ کیا بتاتا۔ ان کی تو خود بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ وقت نے گزشتہ واقعہ کو ذرا سی ڈھکھا تھا کہ وہ پھر آگیا۔

آتے ہی بولا۔ ”بڑے چین کی بنی بجا رہا ہے۔ ارے تجھے فکر نہیں ہے تجھ پر کسی کا ادھار پاتی ہے۔“

”مجھ پر ادھار کس کا ادھار ہے۔“ جیل نے پوچھا۔

”سیٹھ لالوئل کا اور کس کا یہ تو دینا ہی ہوگا تجھے۔“ وہ

حقیرانہ انداز میں بولا۔

”نہیں یہ غلط ہے۔ لالوئل میرا حصہ دار تھا مگر ہمارا

لالوئل جیل کو پوری طرح برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے خلاف مراد آباد میں بھی مہم شروع کر دی۔ جیل خان کا کاروبار مراد آباد اور لیٹک ہی رہ گیا تھا۔ وہاں پر بھی لالوئل آ گیا۔ چونکہ دولت میں وہ زیادہ تھا، اس لئے ضد میں اپنا نقصان بھی کر رہا تھا۔

وہ نقصان کرنے کی پوریشن میں تھا۔ وہ جیل سے کم قیمت پر مال سپلائی کر رہا تھا۔ جیل کا مال کوئی دوکاندار اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔ جب مال کی سپلائی بند ہوئی تو کارخانہ بند ہو گیا اور جیل خان پرانے مال کو اوئے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی غنیمت تھا مگر ہوا یہ کہ مراد آباد میں جیل خان کا باپ دادا کے زمانے کا جہا جہا کارخانہ تھا۔ اس میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی اور پورا کارخانہ جل کر کوئلہ ہو گیا اور جیل خان پوری طرح برباد ہو گئے۔ اب نہ ان کے پاس روپیہ تھا اور نہ کارخانہ۔ مراد آباد میں عزت دار کہلاتے تھے مگر اب ان کے پاس نہ عزت تھی نہ دولت، جو لوگ ان کو دیکھ کر سلام کیا کرتے تھے، وہ کئی کترانے لگے۔ ان کے ملازم تک ان کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بڑا جانکھ تھا۔

انہوں نے مراد آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر دی آ گئے اور لال کنویں کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور ایک دوکان کرایہ نہ کی حاصل کر کے خاموشی سے گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی ان کی دوکان پر آیا۔ وہ کوئی ہندو تھا، دھوتی کرتا اور واسٹک میں ملبوس سر سے گنجا تھا، اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کا ہوگا۔ جیل نے اس کو غور سے دیکھا اور غور کیا۔ اس کی منکر اہٹ کچھ چھتی سی معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں حقارت کا انداز تھا۔ جیل نے کچھ کہنے سے پہلے پلکیں جھپکائی ہی تھیں کہ جیل کو ایسا لگا کہ وہ کہہ رہا ہو، چپ رہو، جیل بولتے بولتے چپ ہو گیا اور جیل کی متیر نظر اس ادھیڑ عمر ہندو پر جم گئیں۔

”سیٹھ جیل خان مراد آبادی اور ان حوالوں میں جیسی

دماغی کیفیت ایسی تھی کہ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔
رات کو وہ سکون سے سویا اور سویرے وہ بہتر تھا۔ میں نے
پوچھا۔

”تم نے اپنے دل و دماغ کو ضرورت سے زیادہ کام
کروایا ہے۔ انسان کے ہر عضو کی کام کرنے کی ایک حد ہوتی
ہے۔ اس حد سے زیادہ بوجھ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ تم
نے ایسا کیوں کیا۔ اگر کچھ پریشانی ہے تو بتاؤ، شاید میں
تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“
اس نے ملتی جلتی سی آواز میں کہا۔ ”حکیم صاحب
میں سخت پریشان ہوں۔“
”تم اپنی پریشانی بتاؤ تو شاید اس کا حل میرے پاس
ہو۔“ میں نے کہا۔

”میرا نام جمیل خان ہے۔“ وہ بولا اور اس نے اپنی
مراہ آباد سے دلی تک کی کہانی بیان کر دی۔ میں نے ساری
روادوستی کے بعد کہا۔
”کوئی فکر نہ کرو۔ جمیل یہ زندگی کے کھیل ہیں۔ یہ
دھوپ اور چھاؤں کے کھیل ہیں۔ اچھا وقت نہیں رہتا تو کوئی
برا بھی نہیں رہتا۔ تمہاری سچائی ضرور رنگ لائے گی۔ تم اپنا
مکان یہاں میرے قریب لو۔ میں تم کو کرائے پر دلداہا
ہوں۔ بیٹیں پر کاروبار کرو، وہ ایک ماہ کے بعد آئے گا، پھر
بات کریں گے۔“

جمیل نے میرے کہنے پر عمل کیا اور مطب کے
قریب ہی میں نے ان کو کرائے پر مکان دلادیا اور جمیل ایک
چھوٹی سی دکان لے کر بیٹھ گیا۔

وہ روزانہ شام کو دوکان بند کر کے میرے پاس آ جاتا
تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر بچپن سے کاروبار کرتا چلا
آیا تھا اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ اس میں بھلو
پن نہیں تھا اور بات کرنے کا ذہنک بھی جانتا تھا۔ میں نے
رولو کا کو ان کے تمام حالات بتائے تو رولو کا نہ کہا۔ ”رتنا
گری کام میں نے بنگال میں نام تھا مگر اس کو تو کسی درویش
نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اب یہ کون سا رتا گری آ گیا۔“
”سنا ہے کہ یہ خود کو اس کا بیٹا کہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

حساب ہر مہینہ ہوا کرتا تھا۔ میری طرف اس کا کچھ نہیں ہے۔
جمیل نے جواب دیا۔
”تیرے کہنے سے نہیں ہے، کھاتے تو بتاتے۔“
”وہ بولا۔“

”کھاتے ان کے اپنے ہیں۔ ان سے میرا کیا
واسطہ۔“ جمیل نے جواب دیا۔
”تیری ہر بات غلط ہے۔ پیسے کا بندوبست کر لے
نہیں کرے گا تو بہت نقصان ہوگا۔“ وہ بولا۔
”اب میرے پاس کیا ہے جو کچھ تھا۔ وہ لالو نے
اپنی چال باز یوں سے مارکیٹ میں ڈبو دیا۔ میرا لاکھوں روپیہ
دوکانداروں پر ٹکلتا ہے مگر کوئی نہیں دیتا۔ میں تو تلاش ہو گیا
ہوں۔“

”تم اپنی کمزوریوں کا الزام لالوئل پر نہ لگاؤ، تمہاری
طرف ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم نکلتی ہے۔ یہ رقم تم کو ادا کرنی
ہے۔ وقت بتاؤ کب روگے، اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو
پورے بھارت میں بھاگ کر دیکھ لو۔ میں ہر جگہ جاؤں گا۔
میرا نام رتا گری ہے۔ تم کو مہلت دے رہا ہوں، یہ میری
عادت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔
”تم میری حالت تو دیکھو، میرے پاس تو روٹی
کے پیسے نہیں ہیں۔ میں دوں گا کہاں سے؟“ جمیل نے
گرد گرد کر کہا۔

”یہ میری درد سہی نہیں ہے، ٹھیک ایک مہینہ کے
بعد آؤں گا۔ اگر روپیہ نہ ملا تو تجھے نقصان اٹھانا ہوگا۔“
اب جمیل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لالوئل کا آدمی تھا
اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے بلا وجہ ہی مانگ رہا ہے۔ جمیل
کی پریشانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ دماغ میں ایک
بھونچال آیا ہوا تھا۔ ان کا سر چکر رہا تھا۔ وہ نہ معلوم، کتنی
مشکل سے گھر پہنچے اور جاتے ہی گر پڑے اور ان کی
حالت انتہائی خراب ہو گئی۔

میں نے مریض کا معائنہ کیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس
کے دماغ پر بہت زیادہ بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ضروری
دوائیں اس کو دیں تو وہ شام کو ہوش میں آ گیا۔ مگر اس کی

میں رہ گئے مگر جدوجہد جاری رکھی۔

جھی۔ ”وہ بولا۔

جیل نے اس کے اس چہرے تیر کو برداشت کیا کیونکہ وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ”اگر اب بھی عقل نہ آئی تو پاتال میں چلا جائے گا۔“

جیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے اوسان بحال کئے اور بولے۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟“

”تیرے دماغ میں اگر بھوسا بھرا ہے، تو اس میں ہمارا کیا تصور ہے۔ دیکھتے آئے تھے، جا رہے ہیں، پھر آئیں گے۔“ اور وہ چلا گیا۔

جیل خان کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ خوف حیرت اور پریشانی کا ملا جلا سا غبار ان کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون تھا، مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کیا گاڑا تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے ان کے اعصاب کو بری طرح کمزور کر دیا تھا۔ ان کو اپنی فکر کم اور بیوی بچوں کی زیادہ تھی۔ وہ عالیشان مکان سے اٹھ کر ایک نہایت چھوٹے گھر میں اور بڑے کاروبار سے ایک چھوٹی سی دوکان میں آ گئے تھے۔ ان کو جو جیسی اور مالی جھکا لگا تھا، اس سے وہ ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ یہ نہ معلوم کون تھا۔ آ گیا اور پاتال میں پہنچانے کی بات کر گیا۔ ان کے دماغ میں خیالات کے میلے لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے دوکان بند کر دی اور گھر آ گئے۔ ان کی پریشانی ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ بیوی نے بہت پوچھا مگر وہ کیا بتاتا۔ ان کی تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ وقت نے گزشتہ واقعہ کو ذرا ہی ڈھکا تھا کہ وہ پھر آ گیا۔

آتے ہی بولا۔ ”بڑے چین کی بنی بجا رہا ہے۔ ارے تجھے فکر نہیں کہ تجھ پر کسی کا ادھار باقی ہے۔“

”مجھ پر ادھار کس کا ادھار ہے۔“ جیل نے پوچھا۔

”سیٹھ لالوئل کا اور کس کا یہ تو دینا ہی ہو گا تجھے۔“ وہ

حقیرانہ انداز میں بولا۔

”نہیں یہ غلط ہے۔ لالوئل میرا حصہ دار تھا مگر ہمارا

لالوئل جیل کو پوری طرح برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے خلاف مراد آباد میں بھی مہم شروع کر دی۔ جیل خان کا کاروبار مراد آباد اور دلی تک ہی رہ گیا تھا۔ وہاں پر بھی لالوئل آ گیا۔ چونکہ دولت میں وہ زیادہ تھا، اس لئے ضد میں اپنا نقصان بھی کر رہا تھا۔

وہ نقصان کرنے کی پوری مشین میں تھا۔ وہ جیل سے کم قیمت پر مال سلانی کر رہا تھا۔ جیل کا مال کوئی دوکاندار اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔ جب مال کی سلانی بند ہوئی تو کارخانہ بند ہو گیا اور جیل خان پرانے مال کو اوانے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی غنیمت تھا مگر ہوا یہ کہ مراد آباد میں جیل خان کا باپ دادا کے زمانے کا بچا جمایا کارخانہ تھا۔ اس میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی اور پورا کارخانہ جل کر نکلے ہو گیا اور جیل خان پوری طرح برباد ہو گئے۔ اب نہ ان کے پاس روپیہ تھا اور نہ کارخانہ۔ مراد آباد میں عزت دار کہلاتے تھے مگر اب ان کے پاس نہ عزت تھی نہ دولت، جو لوگ ان کو دیکھ کر سلام کیا کرتے تھے، وہ کئی کترانے لگے۔ ان کے ملازم تک ان کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بڑا جانکاہ تھا۔ انہوں نے مراد آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر دلی آ گئے اور لال کنویں کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور ایک دوکان کرپانہ کی حاصل کر کے خاموشی سے گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک آدی ان کی دوکان پر آیا۔ وہ کوئی ہندو تھا، دھوتی کرتا اور واسکٹ میں ملبوس سر سے مٹنیا تھا، اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کا ہو گا۔ جیل نے اس کو غور سے دیکھا اور غور کیا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ چھپتی سی معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں تحارت کا انداز تھا۔ جیل نے کچھ کہنے سے پہلے پلکیں جھپکائی ہی تھیں کہ جیل کو ایسا لگا کہ وہ کہہ رہا ہو، چپ رہو، جیل بولتے بولتے چپ ہو گیا اور جیل کی متحیر نظریں اس ادھیڑ عمر ہندو پر جم گئیں۔

”سیٹھ جیل خان مراد آبادی اور ان حالوں میں جھی

حساب ہر مہینہ ہوا کرتا تھا۔ میری طرف اس کا کچھ نہیں ہے، ”
ججیل نے جواب دیا۔
”تیرے کہنے سے نہیں ہے، کھاتے تو بتاتے پوچھا۔

ہیں۔“ وہ بولا۔

”کھاتے ان کے اپنے ہیں۔ ان سے میرا کیا واسطہ۔“ ججیل نے جواب دیا۔

”تیری ہر بات غلط ہے۔ پیسے کا بندوبست کر لے نہیں کرے گا تو بہت نقصان ہوگا۔“ وہ بولا۔

”اب میرے پاس کیا ہے جو کچھ تھا۔ وہ لالو نے اپنی چال باز یوں سے مارکیٹ میں ڈیوایا۔ میرا لاکھوں روپیہ دوکانداروں پر نکلتا ہے مگر کوئی نہیں دیتا۔ میں تو فلاں ہو گیا ہوں۔“

”تم اپنی کمزوریوں کا الزام لالول پر نہ لگاؤ، تمہاری طرف ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم نکلتی ہے۔ یہ رقم تم کو ادا کرنی ہے۔ وقت بتاؤ کب دو گے، اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو پورے بھارت میں بھاگ کر دو کیلو۔ میں ہر جگہ آ جاؤں گا۔ میرا نام رتا گری ہے۔ تم کو ہلت دے رہا ہوں، یہ میری عادت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”تم میری حالت تو دیکھو، میرے پاس تو روٹی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں دوں گا کہاں سے؟“ ججیل نے گڑ گڑا کر کہا۔

”یہ میری درد سہی نہیں ہے، ٹھیک ایک مہینہ کے بعد آؤں گا۔ اگر روپیہ نہ ملا تو تجھے نقصان اٹھانا ہوگا۔“

اب ججیل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لالول کا آدمی تھا

اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے بلا وجہ ہی مانگ رہا ہے۔ ججیل کی پریشانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ دماغ میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔ ان کا سر چکر رہا تھا۔ وہ نہ معلوم، کتنی مشکل سے گھر پہنچے اور جاتے ہی گر پڑے اور ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی۔

میں نے مریض کا معائنہ کیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے دماغ پر بہت زیادہ بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ضروری دوائیں اس کو دیں تو وہ شام کو ہوش میں آ گیا۔ مگر اس کی

”تم نے اپنے دل و دماغ کو ضرورت سے زیادہ کام کروایا ہے۔ انسان کے ہر عضو کی کام کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے زیادہ بوجھ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اگر کچھ پریشانی ہے تو بتاؤ، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“

اس نے ملتی جلتی آواز میں کہا۔ ”حکیم صاحب میں سخت پریشان ہوں۔“

”تم اپنی پریشانی بتاؤ تو شاید اس کا حل میرے پاس ہو۔“ میں نے کہا۔

”میرا نام ججیل خان ہے۔“ وہ بولا اور اس نے اپنی مراد آد سے دلی تک کی کہانی بیان کر دی۔ میں نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔

”کوئی فکر نہ کرو۔ ججیل یہ زندگی کے کھیل ہیں۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کے کھیل ہیں۔ اچھا وقت نہیں رہتا تو کوئی برا بھی نہیں رہتا۔ تمہاری سچائی ضرور رنگ لائے گی۔ تم اپنا مکان یہاں میرے قریب لے لو۔ میں تم کو کرائے پر دلا دیتا ہوں۔ یہیں پر کاروبار کرو، وہ ایک ماہ کے بعد آئے گا، پھر بات کریں گے۔“

ججیل نے میرے کہنے پر عمل کیا اور مطب کے قریب ہی میں نے ان کو کرائے پر مکان دلا دیا اور ججیل ایک چھوٹی سی دکان لے کر بیٹھ گیا۔

وہ روزانہ شام کو دوکان بند کر کے میرے پاس آ جاتا تھا۔ وہ زیادہ بڑھا کھاتا نہیں تھا مگر بچپن سے کاروبار کرتا چلا آتا تھا اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ اس میں مٹھکو پن نہیں تھا اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ میں نے ردلو کا کو ان کے تمام حالات بتائے تو ردلو کا کہنا۔ ”رتنا گری کا میں نے بنگال میں نام نہا تھا مگر اس کو تو کسی درویش نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اب یہ کون سارتا گری آ گیا۔“

”سناسے کہ یہ خود کو اس کا بیٹا کہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

کر دو تو کیا تم سلائی کر دو گے۔“ لالو بولا۔
 ”ہو تو سکتی ہے مگر رقم نقد ادا کرنا ہوگی۔“ رولو کا نے
 کہا۔

”یہاں کچھ قاعدہ قانون بھی ہوتا ہے۔ کاروبار میں
 ایک مہینہ کا ادھار تو نقد کھلاتا ہے۔ بولو کیا خیال ہے؟“
 ”مگر ہمارے یہاں اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے کو
 نقد کھا جاتا ہے۔“

”تم کپڑے کے کاروبار میں نئے آئے ہو، ایسا لگتا
 ہے۔“ لالو نے کہا۔

”ہاں جی بات یہی ہے۔ مگر میں ادھار کاروبار نہیں
 کرتا۔“ رولو کا نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میری بات پر غور کرنا، نقد ادھار ہر کاروبار میں کرنا
 پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔

”مگر ہر آدمی سے ادھار نہیں ہوتا، آدمی آدمی دیکھ کر
 بات ہوتی ہے۔“ رولو کا نے کہا۔

”مجھ میں تم نے کیا خرابی پائی مارکیٹ میں میری
 ایک ساکھ ہے۔“ وہ بولا۔

”اور اسی ساکھ کے بل پر آپ بہت کچھ کر جاتے
 ہیں اور کم زور بچارہ مارا جاتا ہے۔“

”میاں زبان سنبھال کر بات کرو، تم میری ذات پر
 حملہ کر رہے ہو۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ابھی حملہ کہاں، سینٹھ لالو! ابھی تو میں تم سے
 صرف ملاقات کرنے آیا ہوں۔“ رولو کا بولا۔

”اچھا اس کے بعد حملہ بھی کرو گے۔ ہوش کے ناخن
 لو، بنارس سے بھاگتے پھرو گے اور پورے ہندوستان میں
 چھپنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ تم نے میرے متعلق غلط اندازے
 قائم کئے ہیں۔ درست کر لو تو اچھا ہے۔“ لالو نے غرور
 سے کہا۔

”اور تم بھی اپنی اوجھی حرکتوں سے باز آ جاؤ، کسی کو
 بلاوجہ پریشان نہ کرو۔ اگر تم رتنا گری پر بھروسہ کرتے ہو تو سن
 لو جس کو تم رتنا گری کہتے ہو، وہ رتنا گری نہیں ہے۔ رتنا گری
 کو تو ایک مرد خدا نے جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ یہ کوئی جعلی آدمی

”یہ بھی غلط ہے۔ رتنا گری نے شادی ہی نہیں کی تھی
 پھر بیٹا کہاں سے آ گیا؟“ رولو کا نے کہا۔

”ارے بیٹے کا کیا ہے، شادی کرنا ضروری ہے
 کیا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، ایسے لوگوں کے لئے تو واقعی
 ضروری نہیں ہے۔“ رولو کا نے تسلیم کیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ لالو! نے رتنا گری کو جیل کے
 پیچھے لگا یا ہے۔“ میں نے رائے دی۔

”رتنا گری کا جیل سے کیا واسطہ، رتنا گری کو لالو! نے ہی
 لگا یا ہے۔“ رولو کا بولا۔

”جیل ہر طرف سے مارے گئے، ان کا آبائی شہر چھوٹا
 کارخانہ گیا، کاروبار گیا، وہ جان بچا کر یہاں آ گئے تو یہاں پر
 بھی ان کو جیل سے نہیں رہنے دیا جا رہا۔“ میں نے کہا۔

”اب رتنا گری کب آئے گا؟“ رولو کا نے پوچھا۔
 ”پندرہ دن کے بعد آئے گا۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر ایسا کرتا ہوں کہ لالو! نے جو داؤ جیل پر
 مارا ہے، وہی پلٹا دیتا ہوں۔“ رولو کا بولا۔

”میں نہیں سمجھا تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”آپ کو آنے کے بعد بتاؤں گا۔“ اور رولو کا پشیم

روانہ ہو گیا۔ پشیمہ ایک لکڑی کا کاروبار شہر ہے۔ سینٹھ لالو! یہاں پر
 بڑا نام ہے۔ اس کے کئی کاروبار ہیں۔ ایک کاروبار اس کا یہ

بھی ہے کہ وہ ہر صوبے سے مال خریدتا ہے اور اپنے نام سے
 پورے ہندوستان میں سلائی کرتا ہے۔ رولو کا نے لالو! سے

ملاقات کی اور خود کو بنارس کا بیوپاری بتایا اور اپنا نام سلیمان
 احمد بتایا۔

لالو! نے کہا۔ ”تم کرتے کیا ہو، کس قسم کا کام ہے
 تمہارا۔“

”ہم بناری ساڑھی بناتے ہیں۔“ رولو کا نے جواب
 دیا۔

”کتنا مال مہینہ بھر میں سلائی کر سکو گے۔“ وہ بولا۔
 ”یہ تو آپ کے آرزو پر ہے۔“ رولو کا نے کہا۔
 ”اگر میں کہوں کہ ایک ہزار ساڑھی بڑھیا دالی سلائی

ہے۔“ روٹوکانے کہا۔

”تم کیا جانو، وہ کیا ہے مگر تم مجھے نقلی لگتے ہو۔ تم وہ میں جوتاتے ہو۔ رتناگری کا نام سن کر لوگ تمہارا جاتے ہیں تم جس طرح اس کا نام لے رہے ہو۔ اگر وہ سامنے آجائے اتو پانچاٹھ خراب ہو جائے گا، میاں جی کا۔“ لالوئل تھارت سے بولا۔

”یہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی کے لئے ایک سبق ہوڑے جا رہا ہوں۔“ اور روٹوکانا باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی میں روپوشی کی حالت میں ہو گیا۔ برے باہر آتے ہی کئی آدمی باہر دوڑے مگر مجھے نہ پا کر پھر در چلے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔

لالوئل نے پوچھا۔ ”پکڑ لیا اس کو؟“
”نہیں سرکار وہ تو دروازے سے نکلنے ہی عاجز رہ گیا۔ پکڑے کس کو؟“ ایک بولا۔

”تم لوگ سب ناکارہ ہو۔ ارے ایک آدمی کو کا بو نہیں کر سکتے۔“ اور اس نے ایک بازاری گالی دے دی۔
نا سنا تھا کہ ان میں جو سب سے ٹھکرا تھا اور ان کا سرخندہ لہٹا تھا، وہ آگے بڑھا، اس کا چہرہ قہر کے تاثرات سے الی تھا وہ لالوئل کے قریب گیا اور لالوئل کے گال پر اتنی ترور سے چائنا مارا کہ اس کی آواز دور دور تک گئی۔ لالوئل کے لہان میں یہ بات کبھی آئی نہیں سکتی تھی کہ اس کا ملازم اس ہاتھ اٹھائے گا۔ دوسرے یہ عمل اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی لکچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا۔ ابھی وہ پوری طرح سنہیل میں پایا تھا کیونکہ چائنا اتنا کرارہ تھا کہ اس کو دن میں ارے نظر آگئے تھے۔ دوسرا آدمی پہلے والے کی جگہ آ گیا۔
برایک بہت ہی بڑھیا قسم کا چائنا اس کے دوسرے گال پر رڈیا۔ یہ سب پانچ آدمی تھے۔ سب نے اپنا اپنا صرف ایک ایک چائنا لالوئل کو عنایت کر دیا۔

لالوئل کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ سب واپس چلے۔
ان بھی ایک لمحے کو باہر آیا اور پھر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
میں وہ اس صدمے سے سنہیل نہیں پایا تھا کہ اس نے مجھے رکھڑا دیکھا تو حیرت سے بولا۔

”ارے تو کون ہے، کیا چاہتا ہے؟“

”تو کمزوروں پر ظلم کرتا ہے۔ بد معاش پالتا ہے۔ جا دو گر پالتا ہے۔ تو کتنا بے خوف ہے۔ تو نے دیکھا کہ تیرے آدمی تجھے مار گئے تو ان کا کچھ نہیں کر سکا۔“ میں نے کہا۔
”میں ان کا بہت برا حشر کروں گا۔ وہ زندگی بھر اپنی غلطی پر پچھتاتے رہیں گے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ان کا حشر تو بعد میں خراب کرنا، پہلے اپنے اناج کے گودام کی فکر کر۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”میرے آدمی وہاں پر ہیں، میں کیا فکر کروں۔“ وہ بولا۔

”وہ تیرا آدمی ہر نام سنگھ اس نے گودام میں آگ لگا دی ہے۔ وہ تیرا بہت وفادار آدمی ہے تا اور جو تجھے مار کر گئے ہیں وہ بھی تو تیرے وفادار تھے۔“ میں نے کہا۔

”ارے کیا بکو اس کئے جا رہا ہے، کوئی ہے؟“ وہ دہاڑا۔

”کوئی نہیں آئے گا، یہ ہماری تمہاری پریم کہانی ہے جب ختم ہوگی تو کوئی آئے گا۔“ میں نے طنز کیا اور باہر نکل گیا۔ پٹنہ شہر میں لالوئل کے کئی گودام تھے، کئی ٹھکانے تھے۔ روٹوکانے شام تک ان سب کو نشانہ بنالیا۔ یہ کام اس کے اپنے آدمیوں نے کیا۔ اس کے پرانے وفاداروں نے لالوئل کے لاکھوں روپے کا نقصان کیا۔ میں نے یہ کام اتنی جلدی اس لئے کیا کہ رتناگری کے آنے کے بعد شاید میں اس کی طرف لگ جاؤں اور نقصان کا حوالا لالوئل نہ اٹھا سکے۔ جمیل کے ساتھ اس نے جو کیا تھا، اس کا جواب تو دینا ہی تھا۔

اب میں روپوشی کی حالت میں تھا اور لالوئل کے بہت قریب تھا۔ اس کے پاس پورے پٹنہ سے خبریں آ رہی تھیں اور وہ بے تاب اپنے کمرے میں دوڑ لگا رہا تھا۔
رات گیارہ بجے رتناگری آ گیا۔

وہ ایک پستہ قد اور نہایت کمزور سا آدمی لگتا تھا۔ چہرہ ستا ہوا آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئیں مگر ان آنکھوں میں چمک بہت زیادہ تھی۔ جسم چہرہ جس قدر کمزور نظر آتے تھے۔ آنکھیں اسی قدر طاقت ور لگتی تھیں۔ وہ بڑا گرگ

رتا گری نے بڑی توجہ سے بات سنی اور بولا۔

”وہ آدمی تمہارے پاس تھا اور اناج کے گودام میں

آگ ہر نام نے لگائی۔ یہ بہت بڑا کھیل ہے۔ یہ کام ایک

آدمی کا نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ میں کہاں کہاں

جاؤں گا۔ تم بہت بڑے چکر میں پھنس گئے ہو۔“ وہ خاموش

ہوا تو لالوئل اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔

”مجھے بچا لو کرو، میں تو تم پر غور کرتا ہوں، تم تو میرا

ساتھ نہ چھوڑو۔“

”میں ساتھ نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ حالات اتنے خرا

ب ایک دن میں تو نہیں ہوتے، تمہارا دشمن نہ جانے کب

سے تیاریوں میں تھا، تم بے فکر بیٹھے رہے۔ مجھے حالات کو

سمجھنے کی مہلت تو ملے۔ ہر کام قاعدے سے ہوتا ہے۔ دشمن

کا سراغ ملے تو دودھ ہاتھ کروں۔ ابھی تک تو میں اندھیرے

میں ہوں۔“ رتا گری بولا۔

”اب اور نقصان نہ ہو ماس کی روک تھام تو کرو

گرو۔“ وہ بولا۔

”ہاں یہ کروں گا، اپنے ہیر جگہ لگا دوں گا۔ اب تیرا

اور نقصان نہیں ہوگا۔“ رتا گری بولا۔

رتا گری ٹھیک رات ایک بجے باہر آ گیا۔ میں اس

کے ساتھ تھا۔ مگر اس کو اس کا ذرا احساس نہیں تھا۔ یہ نقلی رتا

گری اتنا بڑا ساحر نہیں تھا۔ کھانے کا نہ کے شعبہ کی

کرتا تھا اور نام رتا گری کا استعمال کرتا تھا۔ میں نے اس کا

پورا وزلی کر لیا تھا۔ روپ بہروپ خوب بدلتا تھا۔ وہ سفلی کا

ماہر تھا اور سارے ہیر گندے اس کے پاس تھے۔

وہ ایک اندھیری اور سنسان سڑک پر جا رہا تھا۔ اسی

اندھیری سڑک پر ایک اکیلا چھوٹا سامان بٹا ہوا تھا۔ وہ اس

کے دروازے پر پرک گیا اور دروازے پر دستک دی۔ دو تین

دستک کے بعد اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

”آگئے جب دل کرا مر گئے۔ ارے دن میں مر جایا

کرو، کرو ان کا کر یا کرم ہو گئی کالی رات۔ ارے کالی تاجھ

تیری تو زندگی ہی بے کار ہے۔ اترتی جلاتے جلاتے تو بھی

جل جانے گا ایک دن۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ

جہان دیدہ لگتا تھا۔ اس نے آتے ہی چاروں طرف نظریں

گھمائیں۔ وہ موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ دن بھر کے حالات

اس کے روبرو تھے۔ لالوئل اس کے قدموں میں گر پڑا اور

رو کر بولا۔

”میں برباد ہو گیا۔ گرو میرا سب کچھ برباد ہو گیا۔“

میں نے اس کے غرور کے شیشے کو یوں چٹکنا چور

ہوئے، دیکھا تو مجھے ذرا سکون ہوا۔ میں نے صرف احساس

دلانے کو یہ کیا تھا۔ اب شاید جیل کے نقصان کا اس کو احساس

ہو گیا ہوگا۔

”میں سمجھ رہا ہوں، یہ کوئی بہت بڑی چال ہے۔ یہ

سب کس نے کیا ہے؟“ رتا گری بولا۔

”ارے گرو جی! یہ سب میرے اپنے آدمیوں نے

کیا ہے۔ مجھے مارا تک ہے، میری تو زندگی پر لعنت ہے۔

اب صرف تمہارا ہی آسرا ہے، کچھ کرو نہ معلوم آگے کیا ہونے

والا ہے۔“ وہ بولا۔

”تو فکر نہ کر، میں آگیا ہوں۔ مجھے اس کو پکڑنا ہے

جو یہ کر رہا ہے۔ تیرے سارے آدمی ایک دم سے باغی تو

نہیں ہو سکتے۔ کوئی تو ہے جو ڈوری ہلار رہا ہے، میں دیکھتا ہے

وہ کون ہے؟“ رتا گری بولا۔

”جو کرتا ہے کرو جلدی کرو۔“ لالوئل نے جلدی

سے کہا۔

”تیرے پاس کوئی آیا تھا۔“ رتا گری نے پوچھا۔

”ہمارے سے ایک آدمی آیا تھا۔ مال فروخت کرتا تھا

اس کو، نقد ادھار پر ذرا سی تکرار ہو گئی۔ وہ باہر چلا گیا۔ مجھے

غصہ آ گیا کہ میں نے اس کے پیچھے آدمی دوڑائے وہ غائب

ہو گیا۔ پھر میرے آدمی واپس آ گئے۔ میں نے ان کو برا بھلا

کہا اور گالی بھی دی۔ بس پھر وہ مجھے مارنے لگے اور مار کر

چلے گئے۔ وہ پھر آ گیا اور اس نے بتایا کہ اناج کے گودام میں

آگ لگ گئی ہے اور ہر نام نے آگ لگائی ہے۔ ہر نام تو میرا

آدمی تھا، اس کے بعد ہر جگہ سے ایسی خبریں آ گئیں۔

سب جگہ میرے آدمیوں نے مجھے تباہ کیا۔“

پر تول رہے تھے۔ اس بازار کی یہی رونق تھی۔ گناہوں کی اس
نہستی کے طور پر نالے تھے۔ دن میں شریف نظر آنے والے
دل پھینک اپنی بیویوں سے بیزار مرد خاموشی سے یہاں
آتے ہیں..... اپنے اعمالوں پر کالک پوت کر خاموشی سے
چلے جاتے ہیں۔

مجھے پتہ ہے کہ گندہ عمل کرنے والا جتنا گندہ ہوگا،
عمل اتنا ہی اچھا ہوگا۔ گندے کام کرنے والے ہر طرح سے
خود کو پلید کرتے ہیں۔ ان کی غذا پلیدان کے عمل پلید، ان کی
زبان زیادہ گندی، یہ ان کی مجبوری ہے۔ یہ شیطانی عمل
کرتے ہیں اور شیطان جن چیزوں سے خوش ہوتا ہے۔ وہ
ان کو کرتا ہوتا ہے۔ اگر نہ کریں تو ان کے عمل میں تاخیر نہیں
ہوتی۔ رتنا گری جو کر رہا تھا۔ اس پر مجھے ذرا حیرت نہیں تھی۔
میں صرف اس کی ناپ تول کر رہا تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کون سا عمل کل رات کرے
گا۔ میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر لاولول کے پاس آ گیا۔
وہ گھر پر اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی
تھیں۔ نگاہیں چھت کو تک رہی تھیں۔ میں پہلے والے حلے
میں اس کے سامنے مجسم کھڑا تھا۔ پھر میں نے آواز دی۔

”کیا سوچ رہا ہے لاولول۔“ وہ میری آواز سن کر
چونک بڑا اور اٹھ کر بیٹھ گیا مگر آواز اس کے منہ سے کچھ نہ نکلی تو
میں نے پھر کہا۔

”کیا تیری آواز گرو نے بند کر دی ہے۔“

”تو کیسے آیا، دروازہ تو بند ہے۔“ وہ دروازے کی
طرف اشارہ کر کے بولا۔

”دروازے سے تیرا گرو آتا ہے وہ کسی ویشیا کے
ساتھ پڑا ہے تو کس پر بھروسہ کر رہا ہے۔ ارے نادلان! وہ تیرا
کیا ساتھ دے گا۔“ میں نے کہا۔

”وہ بہت شگنی والا ہے۔ ضرور ساتھ دے گا۔“ وہ
بولا۔

”اب تک اس نے کیا کیا ہے۔ اس کی تو سمجھ میں
خود کچھ نہیں آ رہا۔ وہ کرے گا کیا؟“ میں نے کہا۔

”تو میں کیا کروں، میں تو برباد ہو رہا ہوں۔“ وہ

کھولا تو رتنا گری کو دیکھ کر گڑ بڑا گیا۔ ”ارے گرو! تم ہو میں
سمجھا کوئی ارٹھی آگئی بے وقت۔“

”ہوٹن میں آ جا کالی تا تھا! تو نے نام تو کالی تا تھا رکھ
لیا ہے مگر کالی کا داس اب تک نہیں بن سکا۔“

”کیا تائیں گرو جی، نصیب کے بیٹے ہیں۔ بھاگ
میں تو باد لے بنا لکھا تھا، سو بن گئے۔“ وہ بولا۔

”سب کچھ نصیب کے کھاتے میں ڈال کے اپنی
جان چھڑالے، اب اتنی کھو پڑی اور یہ کٹریل شریر لے کر بھی تو
نرا گدھا ہے۔ ارے بے وقوف زندگی اتنی بے رحم نہیں ہے
کہ انسان آرزوئیں لے کر پیدا ہو اور پالیسیوں میں زندہ
رہے اور مر جائے تو نے کون سی زندگی بنانے کو کھنت کی ہے۔
خود رو پودے کی طرح پیدا ہوا ہے۔ ارے کسی کو گرو ماننا، اس
کی خدمت کرتا تو کچھ ہنر تیرے پاس ہوتا، یوں اس
اندھیرے گھر میں پڑا مردوں کا انتظار نہ کرتا۔ زندہ رہنے کو
بڑے باپ بیٹے پڑتے ہیں۔ بڑی کھٹانیاں بھونگی پڑتی ہیں۔
تب جا کے آدمی کچھ بنتا ہے۔ تو کیا بنا، ذرا سوچ اور میرا ایک
کام کر، کل شام تک مجھے ایک شریر چاہئے۔ پورا کا پورا میں
کل رات ٹھیک بارہ بجے آؤں گا۔ شریر مرد کا ہونا چاہئے۔
اچھا اب میں جاتا ہوں۔“

”گرو بات تو سنو، اگر کوئی ارٹھی نہ آئی تو میں کیا
کروں۔“ کالی تا تھا بولا۔

”تو پھر تجھے مرنا ہوگا، تجھے کل رات مجھے شریر دینا
ہے۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

اور اتنا گری پلٹ گیا، کالی تا تھا دروازے پر حیران
و پریشان کھڑا رہا۔ اب اس کا رخ پٹنے کے اس بازار کی طرف
تھا۔ جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ یہ جگہ درمیان
شہر ہے۔ بازار میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ
کون سی جگہ ہے۔ پھول گجرے کی دوکانیں پان سکرٹ کی
دوکانیں اور شراب کی سب دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ خرید و
فروخت بھی ہو رہی تھی۔ کوٹھڑوں کے اوپر حسین پھولوں کے
گلدستے اشادوں کی زبان میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ کچھ
اوپر سے نیچے آ رہے، کچھ اوپر جا رہے تھے، کچھ جانے کو

بولاً۔

”تو نے جمیل خان کو بر باد کیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ تو میں نے پھر سوال دہرایا۔

”ہاں میں قبول کرتا ہوں مجھ سے، یہ بھول ہو گئی

ہے۔“ وہ گردن جھکا کر بولا۔

”میں جانتا ہوں تیرا نقصان جمیل کے نقصان سے

زیادہ ہو چکا ہے۔ مگر تیرے پاس اب بھی اتنا ہے کہ تو پھر

کھڑا ہو سکتا ہے مگر جمیل کے پاس کچھ نہیں ہے تو اس کا

نقصان پورا کر سکتا ہے۔ اگر پورا کر دے تو تیری جان

چھوٹ سکتی ہے۔ اگر تو اپنے گرد پر اعتبار کرتا ہے تو بول۔“

میں نے کہا۔

”گرو نے میرا بہت مال کھایا ہے۔“ وہ بولا۔

میں نے اپنے کارندے کو اشارہ کیا اور وہ چلا گیا تو

میں نے کہا۔ ”تیرا دماغ بھی آتا ہے۔ اپنا حساب کر لیتا میری

بات کا جواب دے۔“

”میں جمیل کا نقصان بھرنے کو تیار ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور آئندہ اس کے ساتھ یا کسی کے ساتھ بے ایمانی نہیں

کرو گے اور کرو گے تو پھر سزا کو تیار رہنا۔ میں نے کہا۔

دروازہ کھلا اور گرو مادر زاد ننگا کمرے میں موجود تھا۔

حیران حیران نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا

۔ ”کیا دیکھ رہا ہے، نکلی رتا گری۔ تو نے بڑے نام کا سہارا

پکڑا تھا مگر کام صرف مدار یوں والے۔ کھیل تماشے دکھا کر تو

مہان جھکی دان تو نہیں بن گیا۔

کالی تانہ جیسے لوگوں پر تیرا عجب چل سکتا ہے۔

تیرے اندر تو کچھ نہیں، تو نے جو ڈھونگ رچایا تھا۔ وہ کمزور

اور نادان لوگوں پر چلتا تھا تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ تو یہاں

کیسے آ گیا۔“

وہ خاموش کھڑا تھا۔ زبان پر تالے پڑے تھے۔ اس

کی قلبی کھل گئی تھی۔ اب تک غرور اور طاقت کا جو کلف

چڑھا تھا، اتر چکا تھا۔ وہ بولتا تو کیا بولتا۔ میں نے پھر کہا۔

”تو نے جو گندگی اپنے شریر میں اتاری ہے وہ تجھے

چھین نہیں رہے دے گی۔ تو پھر وہی کرے گا جو تجھے

شیطان کہے گا۔ تم جیسے لوگ گندگی کے ڈھیر ہوتے ہو، یہ

گندگی بہت اندر تک پہنچ گئی ہے۔ اس کو صاف کرنا ناممکن

ہے۔ اس لئے اس گندگی کے ڈھیر کو آگ لگانا پڑتی ہے۔“

میری زبان سے یہ نکلتا تھا کہ میرے کارندے نے

عمل درآمد کر دیا اور وہ اس طرح چلتے لگا جیسے کاغذ اور چند

منٹ کے بعد زمین پر تھوڑی سی راکھ پڑی تھی مگر لائوٹل یہ

دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جلا اور پھر راکھ

بھی ہوا لے اڑی۔

”تیرا اگر دو تو گیا۔ تو نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا کر،

تیرے پاس جمیل آئے تو اس سے وہی سلوک کرنا، جیسا پہلے

کرنا تھا اور اسی میں تیری بھلائی ہے۔

منیر خان اور وزیر خان دو بھائی، دونوں کی رہائش

آگرہ شہر کے گاؤں رتھوئی، میں بڑے بھائی وزیر خان کی

سائیکل کی دکان میں روڈ پر لب سڑک تھی اور خوب چلتی تھی

وجہ یہ تھی کہ دور دور کوئی دکان نہ تھی۔ پھر تک لگوانے دور دور

سے لوگ آتے تھے۔ وزیر خان بڑے چرب زبان آدمی تھے

ان کی دکان میں ایک دفعہ اگر کوئی کسی کام سے آ گیا تو سمجھ لو

پکا گاہک بن گیا۔ اطراف کے دیہات اور شہر میں دودھ

پہنچانے والے گوالے تو ان کے یوں سمجھ لو کہ ان کے مرید

تھے وزیر خان کے ہی ہاتھ سے کام کر داتے تھے ستار زمانہ تھا

ایک روپے کا سولہ سیر گندم ملتا تھا۔ اس زمانے میں وزیر خان

کی آمدنی دو اور ڈیڑھ روپے روزانہ ہو جایا کرتی تھی بڑے

ٹھاٹ تھے برادری میں بڑا نام تھا۔

وزیرا خان نے آگرہ میں بھی مکان خرید لیا تھا، اس

مکان پر تین سو روپے مرمت میں خرچ کر دیا تھا۔ بہت بڑا

مکان تھا اور محلے کے لب سڑک تھا۔ بیوی نے ہر چند کہ بہت

زور لگایا کہ وزیر خان اس مکان میں آ جائیں اور اس میں

دکان کر لیں، مگر وزیر خان کپے لیکر کے فقیر آدمی تھے انہوں

نے اپنی بیوی اور اپنے سرکاریوں کی ایک نہ سنی اور آگرہ

شفٹ نہ ہوئے۔ مگر مکان کو تو آباد کرنا تھا ان کا چھوٹا بھائی

منیر خان گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اس کا زیادہ بڑا کنبہ نہ

تھا دو لڑکیاں تھیں لڑکا کوئی ہوا نہیں۔

وزیر خان نے اسی کو اس مکان میں رکھ دیا۔ اور چونکہ یہ مکان لب سڑک تھا اس لیے ایک بڑی سی دکان بھی بنا کر دے دی۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی سائیکلوں کے پرزے اور دیگر سامان بھی بھر دیا اور منیر خان نے بھی سائیکل مرمت اور کرائے کی سائیکل چلانا شروع کر دی، کام میں تو اتنے ماہر نہ تھے مگر بڑے بھائی نے ضروری ضروری کام سب بتا دیئے تھے۔ پھر لگانا اور ہوا بھرنا کون سا مشکل کام ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بھی کام سیکھتے گئے اور دکان بھی کھڑی ہونے لگی۔ دو سال میں ان کا کاروبار وزیر خان سے آگے نکل گیا۔ پوری سائیکل کا نیا سامان ان کے گھر میں بھرا ہوتا تھا کرائے پر الگ الگ بیس سائیکلیں چلتی تھیں۔ کام کرنے کو دو ملازم تھے، وہ تو گدی پر بیٹھ کر صرف گلے میں روپے ڈالتے رہتے۔

کاروبار بڑھا تو ان کی رہائش اور اخراجات میں بھی فرق پڑا۔ مولوی صاحب گھر آ کر لڑکیوں کو پڑھانے لگے۔ بیگم کے بھی چلن میں فرق پڑا۔ شلوار سے غراہ ہو گیا۔ اور گھر پر بھی کام کرنے والی آ گئی۔ گاؤں کے منیر خان اور شہر کے منیر خان میں بڑا فرق پڑ گیا۔ وزیر خان کا کاروبار جہاں تھا وہیں رہا کیونکہ وہ ایک محدود جگہ تھے، ان کے گاہک وہی تھے جو سالہا سال سے ان کے پاس آتے تھے اور کام کا جو ریٹ مقرر کر دیا تھا دے رہے تھے، اس لیے وزیر خان کی آمدنی ایک مقام پر کھڑی تھی۔ حالانکہ یہ آمدنی ان کے اخراجات سے کچھ زیادہ تھی مگر منیر خان کے گاہک نئے ہوتے تھے، اس سے وہ اپنی مرضی کے ریٹ وصول کرتے تھے۔

نیا سامان اور پرزے جات بھی ان کے پاس تھا، اس میں بھی کماتے تھے۔ کرائے پر جو سائیکلیں چلتی تھیں وہی دکان اور گھر کا خرچ پورا کر دیتی تھیں۔ منیر خان جو وزیر خان سے کمزور تھے، چند سالوں میں ہی وزیر خان کو میلوں پیچھے چھوڑ گئے۔

اب وزیر خان کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ انہوں نے بیوی کی بات نہ مان کر اپنے حق میں کتابرا کیا ہے۔

”تم نے میری نہ مانی پڑے رہے رتونی کے بچریا میں اور دیکھ لو تم نے جس کی مدد کر لی گھر دیا دکان دی اس نے دوسری حویلی کھڑی کر لی، اسی دکان سے کمائی کر کے، تم ہو کہ ابھی تک پتھر جوڑ رہے ہو اور وہ گدی پر بیٹھ بیٹھا ہے۔“ ایک دن وزیر خان کی بیوی حکمت بیگم نے وزیر خان کو سنا ڈالی۔

”یہ تو نصیب کی بات ہے میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو ضروری تو نہیں تھا کہ دکان اتنی ہی چلتی اس کی قسمت چکے کا یہ تو بہانہ تھا۔ اس میں چلنے کا کیا مطلب ہم اپنے نصیب کا کماتے ہیں، وہ اپنے نصیب کا اور پھر وہ کون غیر ہے میرا بھائی ہی تو ہے اگر کبھی مجھے ضرورت پڑی تو کیا وہ میرا ساتھ نہ دے گا۔“ وزیر خان بولے۔

”ہاں دے گا ساتھ خوب دے گا۔ میاں تم یہ بھول جاؤ، دنیا کا چلن بدل رہا ہے، سب اپنی اپنی دیکھ رہے ہیں، تم بھی دنیا کے ساتھ چلو آخر ہم بھی بال بچے دار ہیں۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“ وزیر خان نے کہا۔

”ارے لوجھ سے پوچھ رہے ہو، ارے تم کو نظر نہیں آیا۔ مکان تمہارا دکان تمہاری، کراؤ ان سے خالی۔“ حکمت نے کہا۔

”یہ بہت مشکل کام ہے، دنیا کیا کہے گی، بھائی کو گھر سے نکال دیا۔“ وزیر خان بولے۔

”تو پھر ایسا کرو اس مکان کی قیمت ان سے وصول کرو آج کے حساب سے۔“ حکمت نے مشورہ دیا۔

”اگر اس نے منع کیا تو اس کے ساتھ لڑوں، جھگڑا کروں، اری نیک بخت وہ میرا بھائی ہے۔“

میں بڑا ہوں اگر وہ میرا مال کھا گیا تو کیا ہوا، بھائی نے کھایا ہے، تو سن لے گا کھول کے، تو جو کہہ رہی ہے وہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔“ وزیر خان بولے۔

”اچھا تم کچھ نہ کرو میں بات کروں گی۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”ہاں تو کر لے بات مگر انسانیت سے بات کرنا کوئی

جھگڑا اٹھانہ کھڑا کر لیتا۔“ وزیر خان بولے۔

”نہیں کروں گی۔ جھگڑا قاعدے کی بات کروں گی، تم کو بچے نظر نہیں آتے مجھے تو نظر آ رہے ہیں۔ آخر ان سب کی شادی بیاہ بھی کرنی ہے، لڑکوں کو بسانا ہے اور اب میں گاؤں میں نہیں رہوں گی، وہاں پر میرے بچے رہے تو کنویں کے مینڈک بن جائیں گے۔ مجھے شہر میں رہنا ہے۔ تم اگر نہ رہو تو بھی رتنی میں پنچر لگاتے رہو میں آگرہ میں رہوں گی“ حکمت بیگم نے فیصلہ سنایا۔ اور ایک مکان کرائے پر لے کر وہ آگرہ کے غالب پورہ محلے میں آگئی۔

آنے کے دو چار دن کے بعد وہ منیر خان کے مکان پر جو کہ نانی کی منڈی میں تھا۔ چلی گئی۔ منیر خان بہت خوش ہوا۔

میں اس لیے آئی ہوں بھیا کہ اب ہم نے گاؤں چھوڑ دیا ہے تمہارے بھیا بھی جلدی آ جائیں گے۔ اب وہاں پر رہنا ہے کہ۔ منہکالی دن بد نہ بڑھ رہی ہے اور ان کی آدی اپنی جگہ کی کھڑی ہے۔“

”اب تم اپنا کوئی بندوبست کر لو اور یہ مکان خالی کر دو۔ میں غالب پورہ میں کرائے کے مکان میں پڑی ہوں۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”بھابی اس مکان میں میرا بہت سامان بھرا پڑا ہے۔ دکان بھی ہے میں اس کو خالی تو نہیں کر سکتا، مجھے پتہ ہے بھیا نے یہ مکان ڈھائی سو میں لیا تھا تو نا پھوٹا تھا۔ بھیا نے اس کی مرمت پر تین ساڑھے تین سو روپے خرچ کئے تھے۔ ان سب کام میں پابند ہوں، تم ایسا کرو کوئی اپنے مطلب کا مکان دیکھ لو میں اس کا سودا کر کے تم کو دے دوں گا۔“

”تم نے مجھے مکان دیا، اس کے بدلے میں تم کو دے دیتا ہوں۔ کم زیادہ کی فکر مت کرنا۔ اگر مکان مہنگا بھی ہوا تو بھی میں تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔“ منیر خان نے کہا۔

”نہیں بھیا یہ نہیں ہوگا۔ مکان تو میں اپنا ہی لوں گی۔“ حکمت بولی۔

”تو پھر بھابی میری بھی من لو میں نے تم سے مکان نہیں لیا تھا، میں جانو، اور بھیا جانیں تم ہمارے درمیان نہ آنا۔ بھیا جو کہیں گے میں مان لوں گا۔“

”حکمت بیگم واپس چلی گئی اور سیدھی گاؤں گئی۔“

”آخر ہو گیا نا بے ایمان میں نا کہتی تھی۔“ وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

”درمیان سے بات شروع کرتی ہو پوری بات بناؤں ہوا کیا ہے۔“

”تمہارے بھائی نے صاف انکار کر دیا، مکان دینے سے ہم کرائے کے مکان میں کب تک پڑے رہیں گے آخر۔“

”پوری بات نہ بتاتا۔“ وزیر خان بولے۔

”پوری بات یہ کہ وہ کہتا ہے دوسرا مکان پسند کر لو میں خریدوں گا۔ کم زیادہ بھی دے دوں گا مگر اس مکان کو نہیں چھوڑوں گا۔ بھیا نے سات آٹھ سو میں یہ مکان خریدا تھا۔ اس میں میرا مال بھرا ہوا ہے۔ تم مروت کرتے رہو۔ اپنے بچوں کا حق مارتے رہو، تمہارا بھائی تم پر رحم نہیں کرے گا۔“

حکمت بیگم نے کہا۔

”دوسرا مکان خرید کر دے تو رہا ہے اور تم کو کیا چاہئے۔“ وزیر خان بولے۔

”ارے تمہاری عقل تو گھسا چر نے گئی ہے، مجھے تو وہی مکان چاہئے بس۔“ بیگم نے کہا۔

”کیوں وہی کیوں چاہئے۔“ وزیر خان نے پوچھا۔

”وہ مکان بڑی برکت والا ہے، ان مکان میں آتے ہی منیرہ کے حالات بدل گئے۔“

”دکان چل نکلی۔ ہزاروں کا کاروبار ہو گیا۔ چلتی ہوئی دکان ہے۔“

”وہی دکان تم کرو گے تو تم کہاؤ گے۔ ذرا سوچو تو۔“

حکمت بیگم نے کہا۔

”تم نے جو پروگرام بنایا ہے کیا ایسا ہی ہوگا۔ ارے اللہ کی بندی، بندہ اپنے نصیب کا کھاتا ہے کتا ہے۔ جس گھر سے اور دکان سے اس نے کمایا ہے ضروری نہیں کہ میں

بھی کمالوں گا۔ مجھے میرے نصیب کا ملتا ہے عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ یہی بہت میرے مولا کا کرم ہے۔“ وزیر خان بولے۔

مگر حکمت ان کی بات سے ذرا بھی قائل نہ ہوئی۔ اس کی کھوپڑی میں بس ایک بات بیٹھ گئی تھی اور وہ اس مکان کو ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”تم پر تو ایسا لگتا ہے کہ الو کی لکڑی پھیر دی ہے، بھیا کی محبت میں اپنی اولاد کو بھی بھول گئے ہو مگر میں نہیں بھولی۔ وہ مکان میرے بچوں کا مستقبل ہے میں اس کو خالی کروا کر رہوں گی۔ تم میرے اور مزیدہ کے درمیان نہ آنا بس میں نے کہہ دیا ہے۔“

مزیدہ خان کو بھابی کی باتوں سے حسد کی بو آ گئی تھی۔ اس نے جورا ہے پر اس سے بہتر پوزیشن پر ایک دھوبی کے مکان کا سودا خاموشی سے کر لیا اور اس کو گرا کر نیچے بڑا سا گودام اور دکان بنانے کا کام شروع کر دیا۔

بھابی دو چار دفعہ آئی مگر بھیا نے ایک دفعہ بھی مکان کی بات نہیں کی۔

”دیکھو بھابی میں نے مکان بھیا سے لیا تھا۔ لیا بھی کیا تھا انہوں نے خود دیا تھا۔ تمہارا تو کوئی دخل نہ تھا، میں مانتا ہوں کہ یہ مکان بھابی کا ہے میں دینے سے انکار ہی بھی نہیں ہوں۔ بھیا مکان مانگیں گے میں دے دوں گا۔ اب تم مکان کی بابت نہ آنا۔“

حکمت کو تو یہ سن کر پچھتے لگ گئے۔ اب تو وہ مکان اس کی ضد بن گیا۔

”ارے میں کہتی ہوں آخر تم کو ننگے کیوں بن گئے ہو؟ خرب مکان خالی کرنے کو کہو گے۔“

حکمت، وزیر خان کی خاموشی سے چڑتی۔

”مجھے لگتا ہے تو جھگڑا کروائے گی۔“ وزیر خان بولے۔

”اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے تمہاری چیز ہے تم واپس مانگ رہے ہو۔“ حکمت نے کہا۔

”یہ بات تیری کھوپڑی میں نہیں آ رہی۔ اری نیک“

بخت اس نے اس جگہ اپنا کاروبار جمایا ہے۔ پھر وہ اتنی آسانی سے وہ جما جمایا کاروبار کس طرح ختم کر دے گا۔“ وزیر خان بولے۔

”مکان اس کا نہیں ہے۔ اس کو ختم کرنا پڑے گا۔ چار آدمی تمہاری طرف داری کریں گے۔ اس کی کوئی نہیں کرے گا۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”اچھا اتوار کو جاؤں گا۔ پھر بات کروں گا۔“

”اتوار دور ہے جدو کہ تم دکان نماز کے بعد بند کرتے ہی ہو جدو کہ بات کرو۔“ حکمت نے کہا۔

”چلو جدو کہ چلا جاؤں گا۔“ وزیر خان بولے۔

”میں ساتھ چلوں گی تم سے بات کرنا تو آتا نہیں، بھیا کو کچھ کر نہال ہو جاؤ گے۔“ حکمت نے کہا۔

”میں تیرے ساتھ تو جانے کا نہیں۔“ وزیر خان بولے۔

”کیوں میں کیوں نہ جاؤں۔“ حکمت نے کہا۔

”جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو کر ادے گی، میں کروں گا سب بات اور اگر تو گئی تو پھر تو ہی بات کرے گی۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ کان کھول کر سن لے۔“ وزیر خان نے کہا۔

”اے میرے اللہ کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے، الٹی سیدھی کچھ سمجھتا ہی نہیں۔“ حکمت نے کہا۔

”تو ہی حکیم لقمان کی چیلی ہے سب کچھ سمجھتی ہے، میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حکمت بیگم کا منہ جڑ گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

جدو کہ نماز کے بعد مزیدہ خان بھی دکان بند کرتے تھے گھر پر ہی تھے، بڑے بھائی کو کھانا کھل اٹھے۔ ”آؤ بھیا۔“

بہت دن میں شہر آئے۔ ”مزیدہ خان خوش ہو کر بولے۔“

”ارے میاں آئے کیا ہیں۔ بیجھے گئے ہیں، میں تو آنا نہیں چاہتا تھا مگر عورت ذات بڑی بد ذات ہوتی ہے۔ اس کی کھوپڑی میں جو بات گھس جائے پھر باہر نہیں آتی۔“

وزیر خان بولے۔

”میں سمجھ گیا بھیا میں نے بھابی کو کہہ دیا تھا کہ مکان میرے بھائی کا ہے میں ہر وقت مطالبے پر واپس کرنے کا

بڑھ گئی۔ منیر خان نے مکان بھی خالی کر دیا اور دکان کے اوپر مکان میں شفٹ ہو گیا۔

اس کے کاؤ بار میں فرق نہ آیا، اخلاق اچھا تھا اور شرح منافع بھی نہایت مناسب تھا۔ دور دور کے گاہک اس کے پاس آتے تھے۔

وزیر خان نے اپنی گاؤں کی دکان بند کر دی اور منیر خان والی دکان میں بیٹھ گئے۔ مگر منیر خان والی بات پیدا نہ ہو سکی، مرمت کا کام اور چھوٹا موٹا کام البتہ آتا رہا گھر کا گزارہ ہونے لگا۔ وزیر خان کے بچے بھی زیادہ تھے اور اخراجات منیر خان کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ ان کے دو لڑکے بھی دکان پر کام کرنے لگے تھے۔ مگر منیر خان نے زیادہ سرمایہ سے کاروبار شروع کیا تھا، دوسرے ان کی دکان چوراہے پر تھی، ہر طرف کا آدی نکراتا تھا، تاغوں کا اڈا بھی تھا ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔

وزیر خان تو خوش تھے کہ میرے بھائی کا کاروبار پھیل رہا تھا، وہ خوب کما رہا ہے، مگر حکمت بیگم کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اس کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ منیر خان اب بھی ہم سے زیادہ کیوں کما رہا ہے۔

حکمت بیگم کے ہاتھ وہ دولت آتے آتے رہ گئی جو منیر خان کما رہے تھے۔ وہی دکان وہی گھر اور منیر خان سے زیادہ تجربہ مگر پھر بھی وزیر خان پیچھے، حکمت بیگم اپنی جتنی دولت وزیر خان پر ہی اتارتی۔

”میں کہتی ہوں کیا فائدہ ہوا۔ ہم تو وہیں کھڑے ہیں۔ ارے میں تو کہتی ہوں تم ہی گھٹنوں کا مار ہو گئے ہو ارے اب تو وہ اور زیادہ کما رہا ہے، لڑکے بتا رہے ہیں تین تین ملازم دکان پر ہیں، ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے، نئی نئی گاڑیاں جوڑ کر بیچ رہا ہے اور ایک تم ہو کہ اب تک منیجر ہی لگا رہے ہو۔“ حکمت بیگم نے ناک سکود کر کہا۔

وزیر خان نے غصے سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”تو جل جل کر مر جائے گی۔ یاد رکھو جتنی اس کو دیکھو دیکھ کر جلے گی وہ اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا۔ تیری روز روز

پابند ہوں مگر وہ اتنی بے چین تھیں کہ کیا تاؤں تو میں نے کہہ دیا تھا کہ بھائی نے دیا ہے، بھائی پولیس گئے تو واپس کروں گا تم نہ آنا اس سلسلے میں۔“ منیر خان بولے۔

”عورت ذات کو مبرا کہاں۔ بات یہی ہے جو تم نے کہا ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے تم اپنا آرام سے انتظام کرو لو پھر بتا دینا۔“ وزیر خان بولے۔

”کم از کم ایک مہینہ تو لگ جائے گا۔“ منیر خان بولے۔

”کوئی فکر کی ضرورت نہیں اس سے زیادہ بھی لگ جائے تو بھی کوئی بات نہیں، اپنی بھائی کی بات کا برا نہ ماننا۔ میں عورت کے کہنے پر اپنے بھائی سے جھگڑا تو نہیں کروں گا۔“ وزیر خان بولے۔

منیر خان کا چوراہے والا مکان تیار تھا، رنگ سفیدی چونا ہو رہا تھا۔ مگر منیر خان نے نئی دکان کے بارے میں گاہکوں کو بتانا شروع کر دیا۔ زیادہ دور چوراہا نہ تھا اور کاروباری نقطہ نگاہ سے نئی دکان زیادہ مناسب جگہ پر تھی۔ اس نے ایک ماہ سے بھی کم وقت لیا اور دوکان کو نئے اور جدید طرز پر سجانا شروع کر دیا۔ بڑی بڑی کالچ کی الماریاں اور شوکیں بٹوائے گئے۔

نچلی منزل پر رہنے کا اس کا پروگرام نہ تھا، اس لیے بہت بڑے بڑے گودام نکال آئے تھے۔ اوپر جانے کا زینہ گلی کی طرف تھا۔

پھر اس نے اردو اور ہندی میں دکان کے اوپر بڑا سا بورڈ بھی لگا دیا تھا۔ ایک پرانی سائیکل کو رنگ روغن کر کے باہر اسٹینڈ پر لٹکا دیا تھا۔ اب اس کی دکان منیجر لگانے اور مرمت کا کام کرنے کی دوکان نہ تھی وہ مارکیٹ سے پوری نئی سائیکلیں اور پرزے خرید لایا تھا۔ مگر ایک کنارے اس نے ایک متری بھی رکھ دیا تھا۔ تاکہ چلنا ہوا کام بھی واپس نہ جائے۔ اس کے ریٹ بھی بہت مناسب تھے۔ اس کی ساکھ بھی تھی۔ پرانی دکان سے یہاں پر شفٹ ہونے میں اس کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی اور اس کی دکانداری پر اثر بھی نہیں پڑا۔ نئے سامان کی فروخت البتہ

کی بک بک میں نے بہت برداشت کر لی۔ تیرے پاس رہوں گا تو تو یا نہیں آئے گی، اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں واپس گاؤں جا رہا ہوں۔ تو نے مارے حسد کے مجھے یہاں پر بلایا تھا، مگر نادان عورت تو نہیں جانتی کہ تقدیر سب کی الگ الگ ہوتی ہے۔ میں منیر کی تقدیر کا نہیں لے سکتا۔ دکان مکی ہے دونوں لڑکے اس کو چلائیں گے میں اپنی پرانی دکان پر جا رہا ہوں اور کان کھول کے سن لے میرے پاس تو نہ آنا اور آئے تو واپسی کا ہرگز نہ کہنا۔“ وزیر خان نے ایک سانس میں سارا غبار نکال دیا۔

”ہائے ہائے تم کیا کہہ رہے ہو، میں اکیلی پڑی رہوں گی یہاں پر۔“ وہ بولی۔

”مجھے شہر میں رہنے کا بڑا شوق ہے۔ دوسروں کو کچھ کر جلتی رہ، میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، ابھی مکمل آٹھ من

تھی۔ چین سے کراہہ مہر ہا تھا مگر تیرے پیٹ میں تو منہ کو دیکھ دیکھ کر مر رہی ہو رہی تھی۔ دیکھ لیا مکان اور دکان لے کر لیا ہوا آج بھی وہ آگے ہے۔“

”ایکھو شہر کے ابا تم ہاں مکے مکہ میں نہیں ہاری۔ تم گاؤں نہ جاؤ بس خاموش مشاہدہ دیکھتے رہو۔“ حکمت نے کہا۔

”اب آگے تو کیا کرے گی یہ تو تازا۔“ وزیر خان بولے۔

”جو کروں گی تمہارے سامنے کروں گی۔ تسلی رکھو۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”مجھے اب تک عقل نہیں آئی۔“ وزیر خان نے کہا۔

”ارے میاں اب تو آئی ہے عقل اب تک تو میں تمہاری عقل پر چلتی رہی ہوں۔“ حکمت نے کہا۔

”ضرور کوئی نئی چال ہوگی، میں تیری کسی چال میں ساتھ نہیں ہوں، اس لیے گاؤں جا رہا ہوں، تاکہ اگر کچھ بدنامی ٹیک نامی ہو تو میرا تو کوئی نام نہ لے۔“ وزیر خان بولے۔

”دیکھو شہر کے ابا، تم نے زندگی میں صرف اتنا کمایا کہ پیٹ بھر گیا۔ میں اچھے دنوں کے انتظار میں ادھر ہو گئی۔

مگر تمہاری پرانی عادت پھر نہ گئی۔“ حکمت نے کہا۔

”اری ناشکری اللہ نے پیٹ بھر دیا کیا یہ کم ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ نے مجھ کے پیٹ اٹھایا مگر سلا یا نہیں۔“ وزیر خان بولے۔

”مگر میرے لیے یہ کافی نہیں ہے، تمہارے ساتھ کے لوگ کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے۔“ حکمت نے کہا۔

”میں کتنی بار تجھے بتاؤں کہ ہر آدمی اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے۔“ وزیر خان بولے۔

”انسان کو تدبیر بھی کرنا پڑتی ہے، پھر تقدیر بدلتی ہے۔“ حکمت بیگم نے کہا۔

”تو تدبیر کر میں گاؤں جا رہا ہوں، میں تیرے کروت کی جواب دہی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جو کچھ تو کر رہی ہو خود مدد ابھی ہوگی۔“

اور وزیر خان نے گاؤں کی پرانی دکان بھر کھول لی۔ حکمت بیگم اکیلی رہ گئی، لڑکے زیادہ بڑے نہ تھے، شہر پندرہ سال کا اور ظہور بارہ سال کا تھا۔ مگر دونوں نے دکان بند نہ کی۔

حکمت بیگم نے مینٹر ابدل لیا۔ منیر خان سے جیتنا بہت مشکل تھا۔ دوسرا اس کا شوہر ہی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اس کے اندر تو حسد اور جلن کی بجلی چل رہی تھی۔ منیر خان کے غائب دیکھ دیکھ کر اس کے سینے پر ساپ لوٹ رہے تھے۔

اب اس نے منیر خان کی بیوی الماس بیگم کے پاس جانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گاؤں میں اور اس کے بعد بھی اس نے بھی الماس کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس سے ملتی مگر اب جنگ کسی اور طریقہ پر لڑی جا رہی تھی۔

الماس بیگم کو ذرا اس کے آنے کا تعجب تو ہوا مگر اس نے غائب نہیں کیا۔

”اے بہن پانی پر لاٹھی مار دو تو کیا پانی جدا ہوتا ہے۔ بس بہت دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی، اب جا کے موقع ملا، تم جانو مگر کے بکھیرلوں سے فرصت کب ملتی ہے، حکمت خنس کر بولی۔

☆ (267) ☆

”ہاں تمہارے دیور نے داخل کرادیا ہے۔“ الماس

بولی۔

”لو یہ تو نئی بات ہوگئی، لڑکیاں پڑھنے جانے لگیں ہیں۔“ حکمت نے حسب عادت جلدی سے کہا۔

”کیوں اس میں کیا خرابی ہے، تم نے تو اپنے لڑکوں کو بھی نہیں پڑھایا۔ اپنی طرح ہی رکھا میری لڑکیاں میری طرح نہ رہیں، اس لیے میں نے ان کو اسکول بھیجا ہے۔“ الماس بولی۔

”اچھا ہے چلو خاندان میں کوئی تو پڑھا لکھا ہو۔“ حکمت نے پھر پلٹا کھایا۔

اب حکمت ہر دوسرے روز آنے لگی۔ دن میں آتی تو رات تک کھانا کھا کے جاتی، دن بھر پان دان سامنے رکھ کر پان چباتی رہتی۔“ الماس مروت میں اس کی خاطر کرتی اور وہ مویخ کی تلاش میں رہتی۔

حکمت نو لکھا بازار بھی روز جاتی وہاں پر ایک بوا عصمت تھیں ان پر سواری آتی تھی۔

بوا عصمت کا کمرہ اگر بتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، بوا ایک چوکی پر سر رکھ کر بیٹھی تھیں، ان کے چاروں طرف عورتیں بیٹھی تھیں، بوا کے سر کے بال کھلے تھے اور ان کا چہرہ ان میں چمپا ہوا تھا بوا جوان عورت تھیں، مگر سب ادب سے ان کو بوا کہتے تھے۔ سب عورتیں ایک ایک کر کے بوا کے پاس جا رہی تھیں، بوا کے کان میں اپنا مطلب بیان کر رہی تھیں اور بوا ان کی مشکل کا حل ان کو بتا رہی تھیں۔ پورے دو گھنٹے کے بعد حکمت جین کا بھی نمبر آ گیا۔

حکمت نے بوا کے کان کے پاس منہ لے جا کر کچھ کہا۔

بوا نے جلائی آواز میں کہا۔

”تو نے شوہر کو مجھ گادیا۔ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی، پہلے اپنا گھر تو دیکھ پھر دوسرے کام ہوں گے۔“

”تو بوا شوہر کو کس طرح لاؤں۔“ حکمت نے پوچھا۔

”ارے تو عورت کیسی ہے، میاں کو نہیں منا سکتی۔“

”بات تو ٹھیک ہے، مگر بلا وجہ تو کوئی نہیں آتا۔“

الماس نے کہا۔

”دیورانی اور جھٹانی کا ملنا بلا وجہ بھی ہو سکتا ہے، بس یاد آگئی اور میں آ گئی۔“

”آپا اتنے دنوں کے بعد آپ کو میرا خیال آ گیا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔“ الماس نے مسکرا کر کہا۔

”اری بہن اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں، لاکھ نہ ملیں دور رہیں مگر رشتہ داری تو قائم رہتی ہے۔ محبت بھی دل کے اندر ضرور رہتی ہے۔“ حکمت نے کہا۔

”پتہ نہیں آ یا آپ سچ کہہ رہی ہیں کہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہیں۔ میں گاؤں میں بھی تمہارے دیور کھیت میں کام کرتے تھے، اس وقت میرے پائلن نہ شہر سے نہ گاؤں سے کوئی نہیں آتا تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا کہ الماس بھی کوئی ہے۔ جب سے شہر آئی ہوں اور انکا کاروبار چکا ہے بہت رشتہ دار خود بخود پیدا ہو گئے ہیں، خیر خیریت پتہ کرنے روز آرہے ہیں۔“

الماس نے ایک تیز نشتر حکمت کو چھو دیا۔ حکمت نے الماس کی بات سنی وہ کٹ کر رہ گئی مگر عورت تھی اور کسی مطلب کو ذہن میں رکھ کر آتی تھی، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو الماس کی چٹیا اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اس نے مسکرا کر الماس کا نشتر برداشت کیا اور بولی۔

”بہن یہ وقت وقت کی بات ہے۔ تم مانو نہ مانو مگر اپنوں کا ایک مقام ہوتا ہے۔“

”ضرور ہوتا ہے آپ کا بھی ہماری نظر میں ایک مقام ہے۔“ الماس نے تیر پھر چلایا۔

الماس کے تیر حکمت کے سینے کے آر پار ہو رہے تھے۔ مکروہ برداشت کر رہی تھی۔

”یہ تمہاری لڑکیاں نظر نہیں آ رہی ہیں۔“ حکمت نے سست بدلی۔

”پڑھنے مٹی ہیں دونوں۔“ الماس نے کہا۔

”اے ہے کیا اسکول میں ڈال دیا ہے۔“ حکمت خیرت سے بولی۔

ہوائے کہا۔ ”کوئی ترکیب تو بتاؤ۔“ حکمت نے کہا۔

”میں نے جو سنا ہے وہی تم نے کہا ہے کہ کچھ اور کہا ہے۔ ذرا دوبارہ تو کہنا۔“

”ہاں جی میں منیرہ اور الماس کے پاس جا رہی ہوں، حیرت کیوں ہو رہی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”یہ تو پتھر میں جو تک لگ گئی، ایسا لگتا ہے۔“ وزیر خان بولے۔

”اب تو لگ ہی گئی ہے۔ اپنوں سے کون جدا ہوتا ہے۔“ حکمت نے کہا۔

”تم تو ان دونوں کا نام سننے کی روادار نہ تھیں، پھر ایک دم پلٹا کیسے کھالیا، میرے لیے بات حیرت کی تو ہے وہ جو کسی نے کہا ہے بیٹا رہ نمازی اس میں بھی جھلسا زی۔“ وزیر خان بولے۔

”تم بے شک جودل کرے ہو، آخر کہیں تا کہیں تو جھٹکنا پڑتا ہے۔ ہر جگہ تو سوکھی کلڑی نہیں بنا جاتا، میں کس سے ملوں میرے دیکھے والے ہزاروں کوس دور ہیں۔“ حکمت بولی۔

”ارے تو بس اس بات پر ناخوش تھوڑی ہوں، میں تو بہت خوش ہوں۔“

”حیرت اس لئے ہو رہی تھی کہ تم نے دیر میں سوچا مگر ٹھیک سوچا۔“ وزیر خان بولے۔

”اور ہاں تم بھی وقت نکال کے منیرہ سے مل لیا کرو۔ آخر تو وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ تم اس کے بزرگ ہو۔“ حکمت نے کہا۔

”آج چاند اور سورج دن میں نظر آ رہے ہیں اور قسم سے پہلے سے زیادہ چمپی نظر آ رہی ہو۔“ وزیر خان زور سے ہنس کر بولے۔

”اچھا اب بند کرو یہ چونچلے اب ہماری عمر ان کاموں کی رہی نہیں۔“ حکمت کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”کہتے ہیں گھوڑا اور مرد بوڑھا نہیں ہوتا۔“ وزیر خان بولے۔

”مگر عورت تو ہوتی ہے بوڑھی۔“ حکمت بولی۔

”اگر تعریف کا چارہ اس کو ملتا رہے تو ساٹھ سال کی

”بہت طریقے ہیں ذرا غور کر شوہر کس بات سے خوش ہوتا ہے یا ذکر تو اس کو خوش کرے گی تو وہ تیری خوشی کی خاطر سب کچھ کرے گا۔ پھر تیری دلی مراد پوری ہوگی۔“ ہوا نے کہا۔ اور حکمت وزیر خان کے پاس گاؤں روانہ ہو گئی۔

وزیر خان نے دیکھا تو ذرا حیران ہوئے۔

”آج کیسے یاد آ گئی۔“ وہ بولے۔

”تم بھول گئے تو کیا میں بھی بھول جاتی۔“ حکمت ہنس کر بولی۔

”عجب کی بات ہے۔“ وزیر خان بولے۔

”تم مجھے اب تک نہیں سمجھ سکے۔“ حکمت بولی۔

”شاید تم نے ٹھیک کہا ہے۔“ وزیر خان بولے۔

”بیوی بیٹی بھی ہو اس کی زبان کتنی ہی سچ ہو اندر سے میاں کو چاہتی ہی ہے تم بھی مجھے اوپر اوپر سے دیکھتے رہے ہو، کبھی اندر بھی جھانک لیا ہوتا۔ پھر شکایت نہ کرتے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

وزیر خان کے لیے یہ نئی بات تھی حکمت بیگم اور ایسی خوبصورت باتیں ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تم واقعی وہی ہو یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔“ وزیر خان بولے۔

”میں حکمت ہوں! اپنی زبان اور ہٹ دھرمی پر شرمندہ ہوں، اب تم میرے ساتھ چلو۔ دیکھو انکار نہ کرنا ورنہ میں رودوں گی۔“ حکمت ناز سے بولی۔

اور پھر شٹلے نے ایک آہ بھری اور آدم کے بیٹے کو پھر چکر میں ڈال دیا۔ اور وزیر خاں پھر بیگم کے ساتھ واپس آ گئے۔

اور دکان پر کام کرنے لگے۔ دوسرے ہی دن حکمت ناشتہ پر میاں سے بولی۔

”میں منیرہ اور الماس کی طرف جا رہی ہوں۔ شام تک آؤں گی۔“

وزیر خان نے حیرت سے سنا اور بولے۔

عورتیں آتی رہیں جاتی رہیں بوا ان کو مشورے دیتی رہیں۔ عورتیں ان کے ڈبے میں کچھ نہ کچھ ڈالتی رہیں اور پھر حکمت بیگم کا نمبر آیا۔

”تیرا مرد تجھ سے راضی ہو گیا۔“ بوائے نے پوچھا۔

”ہاں بوا اب تو خوش ہے۔“ حکمت نے کہا۔

”اب تو کیا جا رہی ہے؟“ بوائے نے پوچھا۔

”بوا میرے حالات منیر خان میرے دیورے سے زیادہ

خراب ہیں وہ ہزاروں کماتا رہا ہے میرا حیا بس دال روٹی

کھاتا ہے، میرے بدن بھی پھیر دے۔“ حکمت نے کہا۔

”تو بڑی بے وقوف عورت ہے اری اس کے نصیب

اس کے ساتھ اور تیرے تیرے ساتھ ہیں۔ انتظار کر آگے

اجھندن ضرور آئیں گے۔“ بوائے نے کہا۔

”تو پھر میں جلتی کر دیتی رہوں گی تم کچھ تو کرو۔“

حکمت نے کہا۔

بوائے لال لال آنکھیں اس کی طرف کیں اور

بولی۔

”کسی کا برا کرنا میرا کام نہیں ہے تم تو اپنی فطرت کو

بدلنے کی کوشش کر، کسی کو دیکھ کر حسد نہ کر، خود کو راہ راست پر

رکھ تو بے صبری عورت ہے، میرے پاس تیرے لئے کچھ نہیں

ہے۔ جا بھاگ جا اب دوبارہ کبھی نہ آنا۔“

حکمت گردن جھکا کر کمرے سے نکل آئی۔ یہ بہت

بڑی ناکامی تھی۔ اب میں کیا کروں ایک آسرا نظر آ رہا تھا یہ

بوا تو کچھ اور ہی نکلی۔

غالب پورے میں اس کی ایک پڑوسن تھی دوسرے

روز وہ اس کے پاس چلی گئی۔

”ارے آؤ آؤ حکمت بہت دن کے بعد آئیں۔“

مریم نے کہا۔

”اری بہن کیا بتاؤں گھر کے کھیرے کب آئے

دیتے ہیں۔“ حکمت نے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ مریم نے کہا۔ ”کیوں کیسے آنا ہوا۔“

”ارے وہ تو لکھا والی بوا کے چکر لگا رہی تھی آخر میں

انہوں نے دھماکتا دی۔“ حکمت نے کہا۔

بھی جوان بننے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔“ وزیر خان زور سے فٹ کر بولے۔

”ازے کچھ تو خیال کرو۔ آج تم کو ہوا کیا ہے۔“

حکمت نے کہا۔

”کچھ نہیں ہوا تم نے بہت دن کے بعد بڑی مقبول

اور عقل مند کی بات کی ہے، اس لیے پیارا رہا ہے۔“ وزیر

خان کھڑے ہو کر بولے۔

حکمت بیگم نے اپنی کامیابی پر زور کا قہقہہ لگایا اور

بولی۔ ”اب ہنسی۔“

☆.....☆.....☆

بوا کا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے عورتیں ان

کے قریب جا رہی تھیں۔ اور اپنی اپنی مشکلات بیان کر رہی

تھیں۔ بوا کبھی زور سے کسی کان میں ان کے مشکلات کا حل

بتا رہی تھیں، بوا کا چہرہ لال بمبوکا ہو رہا تھا۔ کمرے میں

لوہان کی خوشبو بھری ہوئی حکمت اپنی باری کے انتظار میں

بیٹھی تھی۔

ایک جوان لڑکی بوا کے قریب تھی، بوائے اس لڑکی

کی بات سننے کے بعد زور سے کہا۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ ”نہیں ہوگی نہیں ہوگی ضد

کرے گی تو نقصان تیرا ہی ہوگا۔“

لڑکی نے بوا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”بوا تم میری مدد کرو تو

ہو جائے گی۔“

”ہاں ہو تو جائے گی مگر وہ سخت ناکارہ ہے تجھے

زندگی بھر دلانے کا، تجھے جو نظر نہیں آ رہا مجھے تو نظر آ رہا ہے،

میں تیرے بھلے کو کہہ رہی ہوں کساں باوا کا کہنا مان لے کوئی

جھگڑا نہ مت کھڑا کر بہت بدنامی ہوگی اور تیرا بھلا پھر بھی

نہیں ہوگا۔ جا اب اس سے زیادہ اور کیا بتاؤں۔“ لڑکی

سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

پھر ایک عورت نے بوا کے کان میں کچھ کہا تو بوائے

جواب دیا۔

”تیرا مرد اتنا برا نہیں ہے۔ اس سے محبت سے پیش

آیا کر ٹھیک ہو جائے گا اب جا۔“

”ارے تو کام کیا تھا یہ تو پتہ چلے۔“ مریم نے پوچھا۔
 ”میرے میاں کا کاروبار دیور سے بڑھانے میں
 دیورانی کے سے شہات کردوں یہ تمنا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو
 دیور بھی میری طرح ہو جائے۔“ حکمت نے کہا۔

”بڑی خطرناک خواہش ہے تیری۔“ مریم نے کہا۔
 ”اب کیا کروں یہ تو ہے، تیرے پاس آئی ہوں۔ تو
 ہی بتا کوئی ایسا ہے جو یہ کام کر دے۔“ حکمت نے کہا۔
 ”تو بوا کو نہیں جانتی وہ اوپر سے جیسی باتیں کرتی ہے
 ویسی نہیں ہے۔ اس کے دوروپ ہیں دن کاروپ الگ اور
 رات کا الگ مگر یہ کسی کسی کو پتہ ہے تو میرے ساتھ رات کو
 اس کے پاس چل۔ پھر تو بوا کا اصل روپ دیکھ سکے گی۔ تو
 نے جو روپ دیکھا ہے وہ اصل نہیں ہے۔“

”لے تو نے تو فی چھوڑ دی۔“ حکمت نے کہا۔
 ”ابھی آنکھوں سے دیکھ لے گی پھر تو میری بات کا
 یقین کرے گی۔“ مریم نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے بول کب چلے گی۔“ حکمت نے
 پوچھا۔

”آج تو میں نہیں جاؤں گی۔ تو ایسا کرنا کہ کل رات
 کو مغرب کے بعد آ جا مگر عشاء سے پہلے اوہن کسی کو پتہ نہ
 چلے کہ تو کہاں جا رہی ہے۔“
 دوسرے دن مغرب کے ختم ہوتے ہی حکمت مریم
 کے گھر تھی مریم اس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مریم نے جلدی
 سے برقعہ اوڑھا اور اپنی لڑکی کو بولی۔

”میں ذرا منڈی جا رہی ہوں گھر کا خیال رکھیو، تیرا
 ابا آ جائے تو کھانا دیکھو اور پوچھو تو بتلا بھی دیجو۔“
 اور دونوں دروازے سے باہر آ گئیں اور تاٹکا پکڑ
 کے بوا کے گھر کی طرف روانہ ہوئیں، بوا کا آستانہ رات کو بند
 ہوتا تھا۔ مریم نے دروازہ بجایا تو ایک عورت نے دروازہ کھولا
 پوچھا کس سے ملنا ہے۔

مریم نے کہا۔ ”بوا سے ملنا ہے۔“
 عورت بولی۔ ”صبح آتا وہ رات کو نہیں ملتیں۔“
 ”تم ان کو کہو مریم نوکھا والی آئی ہے، ضروری کام
 ہے۔“

”یہ عورت آئی تھی بوا کے پاس انہوں نے حسب
 دستور ان کو شورہ دیا تھا مگر ان کا کام تو نہیں ہوا۔“
 ”تم کو پتہ ہے بوا کا تو یہی دستور ہے۔“
 ”آپ کا کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا۔“ مریم
 نے پوچھا۔

”نہیں تو جاؤں گی کہاں۔ بوا کا استقبال کرنے کی
 تیاری ہے یہ تو۔“ جہانی نے کہا۔
 ”بوا کا استقبال اس طرح۔“ مریم حیرت سے

ہولی۔

وہ تیار ہو جائے۔“

جہانی کے دروازے پر رات نو بجے دونوں موجود تھیں۔ کمرے میں جہانی دہن بنی موجود تھی، وہ دونوں اس کے سامنے پیٹھیں تو جہانی نے مردانی آواز میں کہا۔

”اب بول حکمت بیگم کیا معاملہ ہے۔“

”حکمت نے سب بتا دیا تو جہانی نے کہا۔

”ٹھیک ہے کام کروں گا مگر مجھے کیا ملے گا اس کام کے بدلے۔“

”آپ کو کیا چاہئے آپ بتائیں۔“

”اچھا میں پھر بھی بتاؤں گا مگر تم کو میرا کام پورا کرنا

ہوگا، اگر نہ کیا تو تمہارا حشر اور زیادہ خراب ہوگا، سوچ لو یہ

اندھا سودا ہے۔“ جہانی نے کہا۔

”تم جو مانگو گے میں دے دوں گی، مگر میرا کام

کرو۔“ حکمت نے کہا۔

”ٹھیک ہے اپنی بات پر قائم رہنا کل سے تیرے

کام کی ابتدا کرتا ہوں۔“ جہانی نے کہا۔

آج حکمت کی خوشی کا دن تھا۔ وہ بہت خوش خوش گھر

آگئی۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ منیر خان کا ملازم جودن بھری

بکری کی رقم رکھتا تھا سب مال لے کر بھاگ گیا ہے۔ اب

اس طرح کے نقصانات روز ہونے لگے۔ گھر میں آگ لگ

گئی۔ گودام میں چوری ہوگئی۔

ہر روز کچھ نہ کچھ ہونے لگا اور پھر ایک لڑکی پر دورے

پڑنے لگے۔ بیوی بیمار ہوگئی۔

اور منیر خان کا شیرازہ بکھرنے لگا ایک طرف کاروبار

کی بربادی دوسری طرف گھر کی تباہی، منیر خان جینی اور مالی

مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔

ایک سال کے اندر اندر ان کی حالت اتنی خراب

ہوگئی کہ وہ آگرہ چھوڑ کر جانے پر تیار ہو گئے۔

اور دلی جانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر

جانے سے پہلے وہ دلی کے حالات دیکھنے دلی آئے اور میری

ملاقات جمعہ کی نماز کے بعد ان سے ہوئی۔

ہاں بوا کوئی عورت نہیں ہے وہ میرا مرد بھی ہے۔ مگر تم کسی کو نہ بتانا ورنہ تمہارا گھر تک اکھاڑ کر پھینک دے گا وہ۔“

”عجب کی بات ہے ہم سب تو زانی سمجھتے تھے۔“

مریم نے کہا۔

”تم اب بھی یہی سمجھ لو۔ زبان پر بات آئی کہ تم پر

تجانی آہی۔ میری زبان سے نکل گیا ہے۔ تو سزا بھی مجھے

ملے گی، مگر میں تو اب عادی ہی ہوگئی ہوں تم اپنی فکر کرو۔“

”نہیں نہیں میری زبان پر تو تالے ہیں اور تم بھی سن

لو حکمت بیگم جہانی نے جو کہا ہے اس کو یاد رکھنا اب تم ہی اپنا

دکھڑایاں کرو۔“ مریم نے کہا۔

اور حکمت نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”اچھا اب تم جاؤ میں بوا سے کہہ دوں گی تم کل رات

نو بجے آ جانا جواب مل جائے گا۔“ جہانی نے کہا۔

”کام ہو تو جانے گا۔“ حکمت نے پوچھا۔

”ارے وہ تو ان کاموں کا ہی بنا ہوا ہے، اس کے

لیے کون سا مشکل ہے۔ فکر نہ کرو جاؤ۔“

”باہر آ کر حکمت نے کہا۔“ جہانی تو بڑی

خوبصورت عورت ہے دن میں تو ایسی نظر نہیں آتی۔ اس کا

چہرہ تو بالوں میں چھپا رہتا ہے، نظر کب آتا ہے۔“ مریم

نے کہا۔

”یہ بوا آخر کون ہے۔“ حکمت نے آہستہ سے

پوچھا۔

مریم نے منہ حکمت کے کانوں کے پاس کیا اور

بولی۔ ”یہ جہانی بیگم کا عاشق جن ہے۔ تو نے دیکھا نہیں کہ

کیسی تیاری کر رہی تھی اس کے استیصال کی۔“

”اور کیسے خوبصورت اور قیمتی زیورات اس کے

سامنے پڑے تھے۔“ حکمت نے کہا۔

”یہ سب وہی لا کر دیتا ہے، مگر ہمت ہے جہانی بیگم

کی۔“ یہ تو کہنا پڑے گا۔“ مریم نے کہا۔

”کل تو ایسا کرنا میرے پاس آٹھ بجے آ جاتا تھ

کر کے آتا میں اس میں تیرے ساتھ آ جاؤں گی اور عا کرنا

منیر خان نے اچانک ان کے کاروبار اور گھریلو حالات بگڑنے کی داستان سنائی۔

بات تھی بھی حیرت کی لاکھوں کا کاروبار ایک سال میں برباد ہو گیا۔ زندگی بھر کی محنت برباد ہو گئی اولاد کی طرف سے الگ فکر لگی ہوئی تھی۔

میں ان کو لے کر اپنے مطب میں آ گیا۔ یہاں پر رولوکا موجود تھا۔

میں نے سارے حالات رولوکا کو بتائے تو رولوکا نے کہا۔

”اگر یہ بربادی قدرت کی طرف سے ہے تو آپ کہیں بھی جائیں حالات درست نہیں ہوں گے اور اگر کسی نے شرارت کی ہے تو اس کو وہیں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ اپنا ٹھکانا یوں پھوڑتے ہو۔“

”میرا خیال ہے حکیم صاحب کہ ساری گڑبڑ کرائی گئی ہے۔ مگر کون ایسا کرے گا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ ساری مصیبت اچانک آئی ہے اور متواتر آ رہی ہے۔“

”اگر میں وہاں رہا تو ڈرے کہ اب مجھ پر میری اولاد پر بیوی پر آئے گی۔ کیونکہ مالی طور پر تو مجھ کو برباد کر دیا گیا ہے۔ اب ہماری زندگیوں کی باری ہے۔“

”آپ کا خیال درست ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا مگر آپ فکر نہ کریں، ہر مرض کا علاج ہے آپ بے فکر ہو کر جائیں، مجھے پتہ دے دیں میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا آپ میرا انتظار کریں اور کوئی قدم پہلے سے نہ اٹھائیں۔“ رولوکا نے کہا۔

اور منیر خان واپس آگرہ آ گئے۔

اب کیا ارادہ ہے ان کی بیوی الماس نے پوچھا۔

”ایک صاحب آنے والے ہیں ان کے آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔“ منیر خان بولے۔

”اور ان کے آنے تک میری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو۔“ وہ بولی۔

”اللہ پر بھروسہ کر نیک بخت سب ٹھیک ہو جائے گا، اچھے دن نہ رہے تو برے بھی نہیں رہیں گے۔“

منیر خان نے جواب دیا۔

”تمہاری بات تو ٹھیک ہے مگر بڑی کی حالت گرتی ہی جا رہی ہے۔ اچانک پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔“ الماس نے بتایا۔

”اب زرا صبر کرو بہت بڑے حکیم ہیں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔“

دو روز کے بعد رولوکا آگرہ آ گیا۔ اس نے آتے ہی لڑکی کا معائنہ کیا اور کچھ دوائیں دے دیں۔

میں نے لڑکی کو دیکھا تو کچھ بیمار نظر نہ آئی۔ مجھے اس وقت شک ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے میں نے دکان اور گھر پر پہرے لگائے اور رات کا انتظار کرنے لگا۔ رات میں کچھ نہ ہوا پھر پورا دن بھی گزر گیا۔ میرے ہر کارے نے بتایا کہ ایک جن گھر میں آنے کی کوشش میں تھا مگر پھر واپس چلا گیا میں اس کے ساتھ لگ گیا وہ ایک گھر میں چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

دوسرے دن رولوکا بوا کے آستانے پر موجود تھا۔ اس کے دو پہرے دار اس کے ساتھ تھے، آستانے کے باہر موجود ہے۔ رولوکا روپوشی کی حالت میں آستانے کے اندر چلا گیا۔ ایک عورت جس کے بال اس کے چہرے پر پڑے تھے وہ عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اور ان کو بظاہر بڑے نیک اور اچھے مشورے دے رہی تھی۔

عورتیں سب چلی گئیں تو وہ عورت گھر میں چلی گئی۔ رولوکا اس کے ساتھ روپوشی میں تھا اس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کپڑے بدلنے لگی۔

اور پھر رات کی تیاری کرنے لگی۔ رولوکا نے اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی۔ رات بارہ بجے ایک جوان اس کے پاس آ گیا اور بولا۔

”میرا خیال ہے تم تھک گئی ہو لیٹا کرو یہ آستانہ بند کر دو۔ مجھے کچھ خطرے کی بو آ رہی ہے۔ میرا تو کچھ نہیں ہوگا تم کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤ۔“

”تم سے بھی بڑا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تم تو پھدے کے پودے خطرہ ہی ہو۔“ عورت نے کہا۔

گے۔ ”جہانی نے پوچھا۔

”تم کو میں نہیں چھوڑ سکتا۔“ بوانے جواب دیا۔
”اچھا ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

جہانی نے کہا۔

”میں جانتا تھا تم کو بھی میری عادت پڑ چکی ہے تم
میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔“ بوانے جواب دیا۔

”بوا کو کہاں کا ارادہ ہے۔“ جہانی بیگم نے پوچھا۔

”باہر تو آؤ پھر بتانا ہوں۔“ بوانے خوش ہو کر کہا۔

جہانی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں دروازے کی طرف
چلے۔ مگر دروازے پر جا کر بوا کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ ”یہ تو بند
ہے۔“ وہ کھڑکی پر گیا اور پلٹ کر آ گیا جہانی نے پوچھا۔ ”
کیا ہوا۔“

”سب راستوں پر سخت پہرہ ہے اور پہرے دار بھی
نئے نظر آتے ہیں۔“ بوانے کہا۔

”تو پھر اب کیسے نکلیں گے۔“ جہانی نے پوچھا۔

”اب تو قید میں ہیں باہر جانا مشکل ہوگا۔“ بوانے
کہا۔

”تم تو خود اتنی بڑی طاقت کے مالک ہو کچھ
تو کرو۔“ جہانی نے کہا۔

”میں کس کے خلاف کروں کوئی نظر آئے تو کروں
اس نے تو اپنا کام کر دیا ہے میں اندر قید ہوں اگر کوئی سامنے
آئے تو بات ہو۔“

رولوکا نے پہرے داروں کو ہوشیار بننے کا اشارہ کیا
اور منیر خان کے پاس آ گیا۔

تین دن متواتر وہ جہانی کے گھر نہیں گیا۔ بوا کا
آستانہ بند ہو گیا۔

بوا اور جہانی ایک کمرے میں قید تھے، ان کے پاس
نہ غذا تھی نہ پانی تین دن کے بعد رولوکا اس کمرے میں

موجود تھا۔ جہانی کا چہرہ فنی تھا۔ ہونٹوں پر چربی جمی تھی۔
بھوک اور پیاس کی شدت سے اس قدر کمزوری تھی کہ کھڑا

نہیں ہوا جا رہا تھا۔

پھر ایک سراجی پانی اس کے سامنے اچانک آ گیا اور

”دیکھو جہانی ایک سے بڑھ کر ایک پڑا ہے میں
نے منیرہ خان والا کام کر کے محسوس کیا ہے کہ خطرہ میرے
بھی قریب آ رہا ہے۔ اس لیے کہتا ہوں آستانہ بند کرو اور
آگھرہ سے جانے کی تیاری کرو۔“ بوانے کہا۔

”دیکھو بوا تم جانتے ہو تو بلاؤ جب تمہارے لئے خطرہ
نہ ہو آ جانا میں تمہاری خدمت کو حاضر ہوں گی۔ مگر آگھرہ چھوڑ
کر میں نہیں جاؤں گی۔“ جہانی نے جواب دیا۔

”مجھ سے بے وفائی کرو گی۔“ بوانے پوچھا۔
”نہیں تم سے بے وفائی کا میں سوچ نہیں سکتی۔ تم

ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔“ جہانی بیگم نے کہا۔
”پھر تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں کیوں میرا ساتھ چھوڑ

رہی ہو۔“ بوانے پوچھا۔
”میں کہاں ساتھ چھوڑ رہی ہوں تم رہو میرے

ساتھ میں حاضر ہوں خدمت کو۔“ جہانی نے کہا۔
”مگر میرے لیے یہاں کے حالات بگڑتے نظر

آ رہے ہیں۔“ بوانے کہا۔
”تمہیں وہم ہو گیا ہے تم کو کون چھیڑے گا تم تو خود

بہت بڑی آفت ہو۔“ جہانی نے کہا۔
”تم کو پتہ نہیں ہے میں دو تین روز سے اپنے ارد گرد

کچھ محسوس کر رہا ہوں مگر مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا شے
ہے میں جب یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز ہے تو بتاؤ اس کا کیا

مقابلہ کروں گا۔“ بوانے کہا۔
”تو پھر اپنے کسی بڑے سے ملاقات کرلو۔ ان کو اپنی

مدد کو بلاؤ تم تو بہت ہو۔“ جہانی نے کہا۔
”آج کے دور میں سب اپنے اپنے کاموں میں

لگے ہیں، دوسری بات میرے بڑوں کو میرا تم سے ملنا
سخت ناپسند ہے، وہ میری کوئی مدد کرنے کی بجائے خوش

ہوں گے۔
میرے پاس سوائے فرار کے کوئی راستہ نہیں ہے،

میں تمہارے بغیر کہیں نہیں رہ سکتا، اس لیے تم کو میرے ساتھ
چلنا ہوگا۔“

”زبردستی کرو گے، اپنی محبت پر زبردستی تم کرلو

وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور اٹھا کر منہ سے سراجی کو لگالیا۔ پانی ٹھنڈا تھا پی کر اس کو بڑا سکون ملا۔ وہی سراجی اس نے بوا کی طرف بڑھا دی۔

بوانے سراجی ہاتھ میں پکڑی اور کہا۔ ”کون ہے تو۔“

کوئی آواز نہ آئی تو وہ پھر بولا۔ ”میں مانتا ہوں تو بڑی طاقت والا ہے پر تو کون ہے۔“

روڈو کا اس کے قریب کھڑا مسکراتا رہا۔ وہ سراجی سے سوالات کرتا رہا۔ اور پھر دیوانوں کی طرح کمرے میں چکر لگانے لگا۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دو دو کر اس کو اٹھایا اور کھول کر کھائے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

چلا گیا۔ اس نے جہانی کی طرف دیکھا بھی نہیں، اس کے جانے کے بعد آواز آئی۔

”تو بھی اب انسانوں سے دل لگا تیرا جوڑا صرف انسانوں سے ہے، سارے کھیل تماشے بند کر دے۔ یاد رکھ بھوک بہت بری چیز ہے، تو نے ذرا سا بھوک کا حرا چکھا ہے موقعہ بار بار نہیں ملتا تیرے لیے بھی یہ آخری موقع ہے۔ اور میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔“ رولو کا نے پھدی رو دنا سنا ڈالی۔

”تو پورا کے دل میں حسرت ہی رہی تمہارے دیدار کی۔“ میں نے کہا۔

”میں اس کے سامنے آ سکتا تھا مگر میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ صرف شوباز جن ہے۔ کھیل تماشے کرنے والا جم کر لڑنے والا نہیں ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔“ پھر دوبارہ وہ ایسی حرکت نہ کرے، اس کے لیے میں نے اس کو ایک کام میں مصروف کر دیا۔ اور تم نے کام بھی ایسا دیا کہ دن رات فرصت ہی نہ ملے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

رولو کا دور سے ہنس پڑا۔

منیر خان نے از سر نو پھر زندگی شروع کر دی اور بہت جلد ان کی دکان پھر سے اسی طرح چلنے لگی۔ وزیر خان کو بھائی کی برہنہ کی کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو کر مر گئے۔ ان کی بیوہ ایک کئے سے گر کر اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو گئیں۔ لڑکوں نے شادیاں کر لیں اور ان کی بیویوں نے ساس کو بھکاراں بیٹھایا۔

یہ قدرتی سزا نہیں ہیں کسی کی آہ کسی نہ کسی اثر ضرور کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے کئے گئے گناہوں کو بھول جاتا ہے۔ مگر اوپر جو رجسٹر ہے اس کا لکھا نہیں مٹایا جاسکتا۔

☆.....☆.....☆

آدی آلام و مصائب کا مقابلہ کرتا ہے اور کبھی کیا سکتا ہے، مگر مقابلہ اس صورت میں کر سکتا ہے کہ اس کو تمام صورت حال کا علم ہو اگر اس کی کیفیت بے یقینی والی ہو تو اس

پر گھبراہٹ سوار ہو جاتی ہے۔ اور وہ دلدل میں پھنسے آدی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور زیادہ دلدل کے اندر گھنس جاتا ہے۔ میں بھی اپنے بچپاؤ کی خاطر ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے کہ ڈوبنا میرا مقدر ہو گیا ہے۔ وہ اداسی سے بولے۔

میرے سامنے ایک بیس بائیس سال کا جوان بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر زردی اور نگاہوں میں ناامیدی صاف نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”آپ اپنی رواداد پوری سنائیں تاکہ پورا کیس ہمارے سامنے آ جائے۔“

رولو کا نے کہا۔ ”ہمارا طریقہ کار ذرا الگ سا ہے ہم ساری بات سننے کے بعد علاج کرتے ہیں۔

”ٹھیک ہے میں سنانے کو تیار ہوں۔“ دھولا۔

”میرا نام م مراری ہے، میں شیا م کمار زمیندار کا ناجائز بیٹا ہوں۔

شیا م کمار کی زمینداری اودھے پور کے آگے ہے۔ یہ ان کی خاندانی جاگیر ہے۔ یہ جاگیر ان کے بڑوں کو اکبر بادشاہ نے ان کی بہادری اور وفاداری کے بدلے دی تھی۔

پورے سات گاؤں کی زمینداری تھی اور اب تک ہے، شیا م کمار کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام منو ہر کمار اور چھوٹے کا نام شکر کمار ہے۔ اور میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔

شیا م کمار بڑے اصولوں کے آدی تھے۔ انہوں نے منو ہر اور شکر دونوں کو کہہ دیا تھا کہ مراری اور اس کی ماں کو کبھی کوئی پریشانی نہ ہونے دینا میں دونوں سے بہت چھوٹا تھا ان دونوں نے باپ کا کہا پورا کیا۔

ہم لوگ بہت دور کے گاؤں میں رہتے تھے۔ شیا م کمار نے تسلیم کر لیا تھا کہ میں ان کا بیٹا ہوں، مگر ان کی بچی ماں کی کٹر دشمن تھی، اگر شیا م کمار نہ ہوتے تو وہ شاید ہم دونوں کو مروا ہی دیتی۔

منو ہر کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ دلی میں پڑھتا تھا، وہاں سے آتا تھا تو بھی اس کے سامان میں کستائیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں شکر کھیل کود کی طرف زیادہ

دھیان دیتا تھا۔ گھڑسواری اور تیراکی اس کے پسندیدہ کھیل تھے۔ شکار کا بہت شوقین تھا۔

اپنی کم عمری کے باوجود وہ بہت اچھی صحت کا مالک تھا اور اس کی اٹھان بیانی تھی بلکہ وہ بڑا کڑیل جوان بنے گا۔ وہ منور سے پانچ سال چھوٹا تھا، مگر قد میں منور کے برابر تھا۔ وہ سارے دن اپنے گھوڑے پر دوڑتا رہتا تھا۔ اس کو ساتوں گاؤں والے جانتے تھے۔ منور بڑا تھا، مگر اس کو کم لوگ جانتے تھے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں گھر پر کم رہا کرتا تھا۔ شکر پڑھتا تھا مگر اس کا ایک وقت مقرر تھا۔ باپ کا اور ماں کا لاڈ لا بھی تھا۔

مگر اس نے کبھی کسی کو ناجائز تنگ نہیں کیا تھا۔ سب لوگ اس کو چاہتے تھے۔ میری ماں تو اس کو بہت پیار کرتی تھی۔

”ارے بھیا کیا تم دن بھر کمرے میں پڑے رہتے ہو کبھی تازہ ہوا بھی لے لیا کرو۔“ شکر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”پڑا کہاں پڑھ رہا ہوں۔“ منور نے جواب دیا۔
”اب اور کتنا پڑھو گے بھیا وکالت کر چکے زدا گھومو پھرو۔ یہ بھی تو ضروری ہے۔“ شکر بولا۔ جو جو ضروری ہے اس سب کی لسٹ بنا کر مجھے دے دے منور دس کہہ بولا۔
”بھیا بہت لمبی لسٹ ہو جائے گی۔“ شکر بولا۔
”اچھا تو پھر جو خاص ضروری ہو وہ لسٹ بنا دے۔“

منور نے کہا۔

”ایک ضروری بات تو ابھی لسٹ کے بغیر بھی بنا سکتا ہوں۔“ شکر نے کہا۔

”اچھا آپ کو یاد ہے بتائیے۔“ منور نے کہا۔
”بھیا آپ شادی کر لیں یہ گھر گرتی کے لیے ضروری ہے۔ آپ کی شادی ہوگی کتنا حزا آئے گا۔ بھابی آئے گی جو بلی میں رونق بڑھے گی اور جب کوئی بچا کہنے والا آئے گا تو میرا تو سراونچا ہو جائے گا۔“ شکر اڑکڑ بولا۔

”واہ واہ سنئے تم دن میں بھی دیکھنے لگے ہو۔“ منور نے کہا۔

”مگر بھیا یہ پتنا نہیں ہے یہ سب ہونے والا ہے۔“ شکر نے کہا۔

”اچھا یہ سب چھوڑ، تو گاؤں گیا تھا۔“ منور نے پوچھا۔

”ہر دوسرے دن جاتا ہوں کیوں۔“ شکر بولا۔
”مرا یہ کیسا ہے۔“ منور نے پوچھا۔

”ارے اب تو بڑا اثر رہی ہو گیا ہے۔ مجھ سے لپٹ جاتا ہے کہتا ہے جو بلی لے چلو۔“ شکر نے کہا۔

”اس کا حق ہے کہ وہ جو بلی میں رہے مگر ماتاجی کو کون سمجھائے وہ تو اس کا نام منٹا بھی گوارہ نہیں کرتیں، پتاجی کہہ چکے ہیں کہ وہ ان کا بیٹا ہے تو پھر باقی کیا رہا۔“ منور نے کہا۔

”آپ نے ٹھیک کہا بھیا مگر ہم ماتاجی کا سامنا بھی نہیں کر سکتے۔“ شکر نے کہا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے ماتاجی اپنی زندگی میں تو اس کو جو بلی کے اندر نہیں آنے دیں گی۔“ منور بولا۔

”لگتا تو یہی ہے مگر کیا پتا آگے کیا حالات ہوں۔“ شکر بولا۔

”اچھا اب کے تو جائے تو بتانا میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔“ منور نے کہا۔

”پرسوں سویرے چلتے ہیں، ایک گھنٹہ کا سفر ہے۔“ شکر نے کہا۔

دونوں بھائی اپنے سوتیلے بھائی کے پاس جا رہے تھے۔ شام بھر ان کے ایک گاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ مراہی کی ماں ان کی بیوی نہیں تھی۔ اس حساب سے اس کی اولاد کسی طرح شام کی جائیداد پر حق نہیں رکھتی تھی، مگر یہ شام کی شرافت تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں ہی مراہی کو اپنا بیٹا کہہ دیا تھا، اس نے بڑی دور اندیشی سے یہ اعلان کیا تھا، اس کے دونوں قانونی بیٹے اس کے فیصلے کو قبول کر چکے تھے اور وٹنی طور پر مراہی کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔

حالانکہ ان کی ماں نے ان کو اپنے خیالات پر چلانے کی کوشش ضرور کی مگر ان کا آئیڈیل انکا باپ

تھا۔ مراری کی ماں کو گاؤں میں شیام نے بہت اچھا مکان بنا کر دیا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی مگر ملازم اور جانور بھی تھے۔

مراری کی ماں اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ایک رات شیام کو اس گاؤں میں رہنا پڑ گیا اور اسی مکان میں شیام کا رکنا ہوا۔ کھانے کے بعد رات کا دودھ بستر پر دینے ایک نوجوان لڑکی آئی۔ لائین کی مدھم روشنی میں شیام نے دیکھا اس کے جسم کے مناسب اور دلکش نشیب و فراز اور چہرے کے نیچے نقش جلد کی کھلتی ہوئی سفیدی مائل رنگت گداز بدن کو ساڑھی میں چھپانے کا انداز بڑا دلنوا تھا۔ وہ مرد کی تنہائی میں اور مرد بھی ایسا جو اس گاؤں کا مالک مختار تھا۔ وہ خود کو نہ بچا سکی۔

”اب یہ کیا ہوگا زمیندار جی، تم تو چلے جاؤ گے مجھے یہ گاؤں وا۔“ کب چلیے دیں گے۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو، وہ جال میں جنسی ہرنی کی طرح بولی۔

”میرے ہوتے ہوئے تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں آتا ہوں گا۔ تیری حفاظت کو آدمی رکھ دوں گا۔“

اور شیام نے جو کہا تھا وہ کر دیا اور نو ماہ کے بعد مراری پیدا ہوا۔

شیام نے منوہر سے کہا۔ ”بیٹا آدمی بڑا ڈھیٹ جانور ہے۔ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا۔

اور اگر تسلیم کر بھی لے تو اس غلطی کی تو جہات پیش کرتا ہے اور خود کو حق پر ثابت کرنے کو ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ مگر میں دنیا کے اور تمہارے سامنے کوئی توجیہ پیش نہیں کروں گا۔ انسان کو زندگی میں بعض اوقات بڑے سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس وقت میں بھی ایسے ہی مرحلے پر ہوں تم میری اولاد ہو میں اپنی غلطی تمہارے سامنے قبول کر رہا ہوں، میں نے غلطی کی ہے۔ مراری کی ماں اور مراری بے قصور ہیں، میرے بعد بھی تم میری غلطی کی حفاظت کرنا، میں نے کسی بدنامی رسوائی کی پروا نہیں کی، اپنی زمینداری کی شان اور یہی کی تار اسکی عکس کی پروا نہیں کی اور اپنی غلطی مان لی ہے۔ اب تم

میری لاج رکھنا۔ کیونکہ میرے بعد تم ہی ہو، تم کو پورے حالات پتہ ہیں، مراری اور اس کی ماما کو کوئی تکلیف ہوئی تو میری آتما کو چھین نہیں ملے گا۔ شکر کو بھی تم میری مجبوری اور حالات ضرور بتاؤ گے۔“

منوہر نے باپ کی مجبوری اور غلطی دونوں پر خوب غور کیا۔ مرد کہاں کس مقام پر مجبور ہوتا ہے۔ بارود کو تیلی سے دور رکھتے ہیں، اگر دونوں اتفاق سے قریب آ جائیں تو دھماکے ضرور ہوتے ہیں۔ جذبات طوفان کی شکل اختیار کر لیں تو پھر باپ و بہن کے کھیزوں میں کون پڑتا ہے۔ منوہر نے باپ کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا۔ اور خود سے معاف بھی کر دیا تھا۔ شکر کو اس نے پوری طرح اپنی طرف کر لیا تھا، دونوں مراری کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ اور اس سے ملنے گاؤں بھی جاتے تھے۔ شیام خوش تھا کہ اس کے بیٹے اس کی بات سمجھ گئے ہیں۔ مراری کی ماما کو وہ بھی ماما جی کہتے تھے۔ اس کا احترام کرتے تھے۔ اور کبھی خالی ہاتھ ان کے سامنے نہیں جاتے تھے۔

ان کو دیکھ کر مراری اور اس کی ماما شافی بہت خوش ہوتے تھے۔

مگر شیام کی دھرم پتی منوہر اور شکر کی ماں کو یہ سب سخت ناپسند تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مراری اور شافی کو گاؤں سے نکال باہر کرتی، مگر اس کے اختیارات حویلی کے باہر نہیں چلتے تھے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ بری بات یہ تھی کہ اس کے بچے بھی اس کی طرف نہیں تھے۔ وہ بھی شافی اور مراری کا دم بھرتے تھے۔

”ماما جی آپ کی شادی کی تیاری کر رہی ہیں۔“ شکر نے منوہر کو بتایا۔

”تم کو کیسے پتہ چلا۔“ منوہر نے پوچھا۔

”ارے وہ جنا پار کے ماما جی آئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا وہ بتا رہے تھے۔“ شکر بولا۔

”کیا بتا رہے تھے یہ بتا۔“ منوہر نے پوچھا۔

”کہہ رہے تھے تیری بھالی کا بندوبست کر رہا ہوں۔“ شکر بولا۔

”یہ جتنا پار کے ماما جی وہی ہیں نا جن کی بہت سی لڑکیاں ہیں اور لڑکا کوئی نہیں۔“ منوہر نے پوچھا۔

”وہی ہیں اور مجھے لگتا ہے اپنی ہی کسی لڑکی کو جو ولی لانے کے چکر میں، چکر لگا رہے ہیں۔“ شکر نے کہا۔

”میں ان گنواروں میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔“ منوہر بولا۔

”مگر ماما جی ان کو لانا چاہ رہی ہیں پھر۔“ شکر نے کہا۔

”ماما جی کے خاندان والے سب گاؤں کے لوگ ہیں تعلیم نام کی چیز تو وہ جانتے ہی نہیں تو پھر ان کی لڑکیاں بھی ایسی ہی ہوں گی تم بتاؤ میں ان کے ساتھ گزارہ کر سکوں گا۔“ منوہر بولا۔

”پھر تو خیال ہے آپ کا گزارہ کسی گاؤں کی لڑکی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ آپ شہر کے تعلیم یافتہ وکیل ہیں، آپ تو کسی شہر کی پڑھی لکھی نانک سی لڑکی سے شادی کرنا۔“ شکر نے کہا۔

”میرا ارادہ بھی یہی ہے۔“ منوہر نے کہا۔

”مگر وکیل صاحب یہ جو ماما آرہے ہیں ماما جی کے جن چھوڑے ہیں۔ یہ کچھ نہ کچھ تو رنگ لائے گا۔ پھر آپ کیا کریں گے۔“ شکر نے کہا۔

”میں صاف انکار کر دوں گا۔“ منوہر نے کہا۔

”وکیل صاحب یہ اتنا آسان کام نہیں ہوگا۔“ شکر نے کہا۔

”آسان ہو یا مشکل میں یہی کروں گا اور تم میرا ساتھ دو گے۔“ منوہر نے کہا۔

”میں تو ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں پتا جی کا ووٹ بھی آپ کو دلوادوں گا۔ مگر یہ ماما جی بس کیا کہوں۔“ شکر بولا۔

”تم کچھ نہ کہو، میں پتا جی سے بات کر لوں گا۔“ منوہر نے کہا۔

مگر اس کے بات کہنے سے ہی پہلے شام نے ایک دن منوہر سے کہا۔

”پتا جی تم تعلیم سے فارغ ہو، عمر بھی شادی کی ہے اور رشتہ بھی موجود ہے، بتاؤ کیا کہتے ہو۔“

پتا جی آپ جو کریں گے وہ مجھے منظور ہے، مگر میں ماما جی کے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔“ منوہر نے فیصلہ سنا دیا۔

منوہر کا فیصلہ ماما جی تک پہنچ گیا۔ وہ غصے میں اس کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

”آ خر میرے خاندان میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں تم نے کیوں انکار کیا۔“

ماں کو دیکھ کر منوہر ادب سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”ماما جی آپ نے مجھے شہر میں پڑھایا وکیل بنایا۔ میرے خیالات اور طرز زندگی میں اور گاؤں کے

طرز زندگی اور یہاں کے لوگوں کے خیالات میں بہت فرق آچکا ہے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ شکر دن بھر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ مگر میں گھر کے اندر ہی رہتا ہوں کیونکہ میرے مزاج کا یہاں پر مجھے آدمی نہیں ملتا۔ میرا دم یہاں پر گھٹتا ہے۔ میں شہر میں رہنا چاہتا ہوں اور وہیں کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بے شک ناراض ہو جائیں مگر میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔“

”مگر میں تیرے ماما کو زبان دے چکی ہوں۔“ ماما جی نے کہا۔

”آپ نے زبان مجھ سے پوچھ کر نہیں دی۔“ منوہر نے جواب دیا۔

”مگر اس مجھ سے پردی ہے کہ تم میری اولاد ہو میرا کہا ٹھکراؤ گے نہیں۔“ ماما جی نے کہا۔

”ماما جی شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے مجھے اتنا تو اختیار دیں گی کہ میں اپنا اچھا برا سوچ سکوں۔“ انہوں نے کہا۔

”میں نے تمہارا اچھا ہی سوچا ہے۔ ماما جی کی دوسری لڑکی کرن بہت کھڑ لڑکی ہے۔ پاٹ شالہ نے ہماری پڑھی ہے، راما ن اور بھگوت گیتا خوب پڑھتی ہے روز مندر جاتی ہے میرا جی کہ بھجن بھی اس کو یاد ہیں، تمہارے من کو بڑا

شانت کر دے گی۔“ ماتاجی نے کہا۔

”میرے لئے اتنا کافی نہیں ہے ماتاجی وہ اتنی اچھی ہے تو اس کو اور بھی اچھے برل جائیں گے۔ آپ ماتاجی کو منع کر دیں۔“ منوہرنے کہا۔

”ذرا ہوش کر منوہر میرے دل کو تیرے باپ نے کم جلایا ہے کہ تو بھی جلائے لگا۔“

”آپ پتاجی کو درمیان میں نہ لائیں، میری بات کریں۔“ منوہرنے کہا۔

”تو نے میرے خاندان کو روک دیا، ذرا اپنے باپ کے خاندان کی طرف بھی دھیان کرنا وہاں پر بھی ایک سے ایک بڑا پانی تجھے نظر آئے گا۔“

”سوپ تو سوپ چھلنی بھی بولی جس میں ہزاروں چھید (سوراخ) میرے خاندان کو کبھی بھانہ کہنا کر لے تو شادی شہر میں مگر یاد رکھ، اپنے پتا کے خاندان میں بھی شادی تو نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو دکھ اٹھائے گا۔“ ماتاجی سخت غصے میں چلی گئیں، ماتاجی کو ناراض کر کے منوہر بھی اداس ہو گیا۔

شام کو شکر اس کے پاس آ گیا اور بولا۔ ”گھر پر بڑی اداسی چھائی ہے کیا بات ہے آج میرے پاس ماتاجی آئیں تھیں۔“ منوہرنے کہا۔

”اس میں اداسی کی کیا بات ہوئی۔“ شکر نے ہنس کر کہا۔

”تم جوان ہو رہے ہو مگر ابھی تک بچے بنے ہوئے ہو، ارے انہوں نے شادی کی بات کی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اور وہ ناراض ہو کر چلی گئیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ منوہرنے کہا۔

”بس اتنی سی بات نہیں ہے بھیا۔“ شکر نے کہا۔

”تو تم بتاؤ کتنی سی ہے۔“ منوہرنے کہا۔

”اب ماتاجی کا سارا غصہ پتاجی پر اتارے گا دونوں میں مہابھارت ہوگی۔“ شکر نے کہا۔

”تو پھر میں کیا کروں کرلوں ماتاجی کی پاٹ مثالہ پاس لڑکی سے شادی۔“ منوہر بولا۔

”میں نے یہ کب کہا مگر اس نئی مہابھارت کے کارن آپ ضرور بن گئے۔“ شکر بولا۔

”شکر انسانی زندگی میں شادی بار بار نہیں کرتا۔ یہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگر قدم غلط پڑ جائے تو زندگی بھر لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ ہمارے سامنے پتاجی کی مثال سامنے ہے۔ ان کے مزاج میں اور ماتاجی کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر ان کے مزاج ایک طرح کے ہوتے تو پتاجی سے کبھی وہ غلطی نہ ہوتی جو ہو گئی ہے۔

ماتاجی نے ان کی اس غلطی کو ان کی کمزوری بتایا ہے۔ وہ تو شکر ہے بھگوان کا کہ مراری کی ماں گاؤں میں رہتی ہے۔ اگر ہمارے قریب رہتی ہوتی تو زمیندار صاحب کی عزت ہر وقت سولی پر لٹتی رہتی۔ یہ صورت حال کس نے پیدا کی ہے۔“ منوہرنے کہا۔

”ماتاجی نے تو خود کو مظلوم بنا کر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ لی ہیں۔“ شکر نے کہا۔

”میں بھی کہتا ہوں کہ وہ ایک طرح سے مظلوم ہیں، مگر دوسری طرف دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ماتاجی نے پتاجی کو اگر بھر پور محبت دی ہوئی، ان کو اپنی طرف متوجہ رکھا ہوتا تو شاید وہ غلطی کرتے ہی نہیں۔“ منوہرنے جواب دیا۔

”ان کی تو گزر گئی تم اپنی بتاؤ کیا کرو گے۔“ شکر نے کہا۔

”میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔“ منوہرنے کہا۔

”بات یہ ہے بھیا کہ ماتاجی کو ناراض کر کے ہم لوگ خوش تو نہیں ہو سکتے کوئی ایسا طریقہ نکالو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی یعنی آپ بھی سلامت رہو۔“ شکر نے کہا۔

”تم مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہو۔“ منوہرنے پوچھا۔

”ارے آپ کے چار پیر کہاں ہیں آپ بکرا نہیں بن سکتے۔“ شکر نے ہنس کر کہا۔

”بات میری زندگی کی ہے تم مذاق کر رہے ہو۔“ منوہرنے کہا۔

☆ (280) ☆

”زندگی اگر مذاق مذاق میں گزرے تو اس کی سختیاں پہنچیں۔“ شکر نے جواب دیا۔
”مذاق اس کے ساتھ اچھا لگتا ہے جو ہم مزاج ہو، مذاق کو سمجھتا ہو۔“ منوہر نے کہا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے اب آپ یہ بھی بتادیں کہ وہ آپ کی ہم مزاج صاحبہ کون ہیں۔ تاکہ میں بھی ان کے درشن کر لوں۔“ شکر نے پوچھا۔
”تم بہت ہوشیار ہو گئے ہو تم نے آخر بوجھ ہی لیا۔“ منوہر نے کہا۔

”بھیا میں رہتا گاؤں میں ہوں مگر آپ کے ساتھ رہتا ہوں، پھر تارے علاقے میں ہوں، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا ہوں، بھانت بھانت کے کھل کھاتا ہوں ورزش کرتا ہوں، گھوڑی سواری کرتا ہوں، زیادہ نہیں مگر کچھ تو پڑھا لکھا ہوں آخر آپ کا بھائی ہوں۔“
شکر سینہ تان کر بولا۔

”واہ بھئی واہ میں تو تم کو گاؤں کا ایک بے وقوف سا لڑکا سمجھتا تھا تم میں تو بڑی خوبیاں ہیں اور یاد کر لو۔“ منوہر نے پوچھا۔

”بھائی یاد نہیں پھر بتادوں گا اس وقت تو میں اپنی سنڈری بھالی کے خیال میں ہوں۔ آپ بات کو اڑائیں نہیں، میں بھگوان کی سوغند کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ شکر نے پوچھا۔

”میں وقت سے پہلے بتانا نہیں چاہتا تھا۔“ منوہر نے کہا۔

”مجھے بتادیں میں تو آپ کا راسٹ پیٹھ ہوں۔ آپ کو فائدہ ہی ہوگا۔“ شکر نے کہا۔

”وہ میرے ساتھ کان میں پڑھتی رہی ہے۔“ منوہر نے کہا۔

”کیسی ہے، آپ سے تو اچھی ہوگی۔“ شکر نے پوچھا۔

”منوہر نے چھت کی طرف نظریں کیں اور بولا۔“
صبح کی سفیدی، شام کی شفق، برسات کی دھنک کو اگر انسانی

پیکر میں لایا جائے تو کا جل جلتی ہے۔“ منوہر نے کہا۔
”کا جل نام تو کالا ہے۔“ شکر نے کہا۔
”اے اس کا نام کا جول ہے مگر سب کا جل اس لیے کہتے ہیں کہ اس کو نظر نہ لگے۔“ منوہر نے جواب دیا۔
”آپ مجھے بھائی سے ملوانیں۔“ شکر نے کہا۔
”میں اس لئے نہیں بتا رہا تھا کہ تو پھیل جائے گا۔“ منوہر بولا۔

”کدے بھیا آپ کے کام ہی آؤں گا، کبھی کوئی کام پڑ گیا، کوئی پیغام پہنچانا ہوا۔“ شکر بولا۔

”تم کو پتہ ہے کہ میری زیادہ تر تعلیم بنارس میں ہوئی ہے۔ میں اور کا جول نے تین سال ایک ساتھ گزارے ہیں، وہ اودھے پور کی رہنے والی ہے اور اس کے پتا اودھے پور کے بڑے مشہور وکیل ہیں، ان کا نام گوپی چند ہے۔ میں کا جول کے ساتھ اودھے پور اس کے گھر بھی چاچا ہوں، گوپی چند اس کے پتا بہت اچھے آدمی ہیں۔ کا جول نے ان کو میرے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ ان کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو کا جول کی پسند پر اعتراض نہیں ہے۔ ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تم بتاؤ ماما جی کی پات شالہ پاس لڑکی جس کو میں نے بھی دیکھا نہیں، میں اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں، اگر ماما جی پر پتا جی نے کوئی ظلم کیا ہے تو وہ مجھ پر کیوں ظلم کرنا چاہتی ہیں، میں کیوں ان کا ایسا حکم مانوں جو میری زندگی کے رخ کو ایک دم بدل دے، میں نے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک پلان بنایا ہے میں گاؤں میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ یہ باپ دادا کی زمینداری تم کرو گے، میرا مزاج ہی زمینداروں والا نہیں ہے۔ پھر میں یہاں پر رہ کر کیا کروں گا۔“ منوہر نے کہا۔

”نہیں بھیا آپ شادی جہاں کرو مگر رہنا میرے پاس، آپ بڑے ہو آپ پہلے، میں بعد میں، یہ تو بھگوان نے بھی میرا نمبر آپ کے بعد رکھا ہے۔“ شکر نے کہا۔

”شکر میری بات یاد رکھنا۔ تو ہی پتا جی کا جائیں ہوگا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”کام بتاؤ! کیا کام ہے۔ میں سن رہا ہوں۔“ شیام نے کہا۔

”میرے ساتھ آئیں۔“ شکر نے کہا۔

”کہاں چلنا ہوگا بہت تھکا ہوا ہوں میں۔“ شیام نے کہا۔

”گھر سے باہر نہیں لے جاؤں گا۔“ شکر بولا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ شیام نے کہا۔

منوہر نے کمرے کے باہر ہی پتاجی کا استقبال کیا۔

”آئیے پتاجی۔ کچھ کام ہے مجھے۔“ منوہر بولا۔

”ارے مجھے کیا بتا، یہ لایا ہے مجھے تو۔“ شیام نے کہا۔

”ہاں بھیا میں لایا ہوں اندر تو آئیے۔“ اور سب کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

”ہاں شکر بول کیا بات ہے۔“ شیام نے کہا۔

”بات یہ ہے پتاجی کہ مجھے بھالی کی سخت ضرورت ہے، بھیا بھی راضی ہو گئے ہیں، بس آپ کی رضامندی چاہئے۔“ شکر نے کہا۔

”بہت خوب! تو تم وکیل صاحب کے وکیل ہو۔“ شیام نے ہنس کر کہا۔

”پتاجی آخر وکیل کو بھی تو وکیل کی ضرورت پڑتی جاتی ہے۔“ شکر نے کہا۔

”تو تم اپنے ماما جی کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہو۔“ شیام نے کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ شکر بولا۔

”میں نے منوہر سے پوچھا ہے۔“ شیام نے کہا۔

”میں ان کا وکیل ہوں جواب دے سکتا ہوں۔“ شکر نے کہا۔

”مگر مجھے یہ منظور نہیں، یہ آپ کا حق ہے۔“ شکر نے کہا۔

”ارے تو کیا پاگل آدمی ہے۔ دولت کی خاطر لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں میں تو خوشی سے تجھے سب کچھ سوچ رہا ہوں اور تو انکار کر رہا ہے۔“ منوہر نے کہا۔

”میری محبت میں بھیا کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جس پر آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔“ شکر بولا۔

”تو نے بڑی دور کی بات کی ہے مگر میرا جو فیصلہ آج ہے وہی زندگی بھر رہے گا۔“ منوہر نے کہا۔

”میں آپ کے فیصلے کا پابند نہیں ہوں قانون پابند نہیں ہے۔“ شکر نے کہا۔

”ذکیں ہوں میں اور قانون تو مجھے پڑھانے گا۔“ منوہر ہنس کر بولا۔

”میں آپ کو کیا پڑھاؤں گا سوچتا ہوں ایک آپ ہی تیبہ جن کے پاس آکر مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔“

ماتا جی کے پاس جاؤ تو ان کا موڈ خراب رہتا ہے۔

پتاجی گھر میں ہوتے نہیں۔ آپ بھی چلے گئے تو میں کس کے پاس جاؤں گا۔“ شکر ادا سی سے بولا۔

”ارے تو میں ابھی کہاں جا رہا ہوں تو تو ابھی سے سوکھ متانے لگا۔“ منوہر نے کہا۔

”اودھے پورے ایک گھنٹہ گھوڑے پر لگتا ہے میں روز سویرے تمہارے پاس آؤں گا۔“ شکر بولا۔

”ضرور آنا۔ مگر ابھی میں نہیں جا رہا، سوچتا ہوں پتا جی سے موقع دیکھ کر بات کر لوں۔ تاکہ اپنے ماما جی سے جان تو چھوٹے۔“ منوہر نے کہا۔

”موقع کا کیا ہے میں ان کو لے کر تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔“ شکر بولا۔

”مگر ذرا ان کا موڈ دیکھ لینا۔“ منوہر بولا۔

”ارے تم فکر ہی نہ کرو، ایسا موڈ بنا کر لاؤں گا کہ انکار تو وہ کریں گے ہی نہیں۔“ شکر نے کہا۔ کھانے کے بعد رات کو شکر نے پتاجی سے کہا۔

”پتاجی آپ سے کچھ کام ہے۔“

کی جاتی ہے۔“ شکر نے کہا۔

”ارے ارے تم ہی بولے جاؤ گے منو ہر کو تو بولنے دو۔“ شیام نے کہا۔

”پتا جی میں وکیل صاحب کا وکیل ہوں مجھے انہوں نے بولنے کا اختیار دیا ہے، اس لیے بول رہا ہوں۔“ شکر نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے میں نے گوپی چند کا نام سنا ہے میں ان سے ملاقات کروں گا۔“ شیام نے کہا۔

”یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے، بھابی کی ضرورت تھ ہے۔“ شکر بھن کر بولا۔

”منو ہر تو نے اپنا وکیل بڑا ٹھنڈا کیا ہے۔“ شیام نے زور سے بھن کر کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد منو ہر شکر سے لپٹ گیا اور بولا۔

”تو نے تو کمال کرویا۔ میں بھی شاید اتنی آسانی سے یہ سب نہ کہہ پاتا۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں وکیل بھڑا ہوتا تو مقدمہ جیتا جاتا ہے۔“ شکر نے کہا۔

دوسرے ہی روز شیام اودھے پورے کوئل گوپی چند کے سامنے بیٹھے تھے۔

گوپی چند نے پوچھا۔ ”کیسے آنا ہوا شیام جی۔“

”میں منو ہر کا باپ ہوں۔ آپ نے پہچانا نہیں۔“

منو ہر گوپی چند نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ”اچھا کاجول کے کلاس فیلو کے پتا۔“

”جی ہاں وہی ہوں۔“ شیام نے کہا۔

گوپی چند نے اٹھ کر ایک دفعہ اور ہاتھ ملایا اور بولا۔

”معاف کرنا میں اب سمجھا۔“

”بات یہ ہے گوپی چند جی کے جب معاملہ لڑا کڑا کی کے درمیان خود سے پایا جائے تو ہمارا کردار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔“ شیام نے کہا۔

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“ گوپی چند نے کہا۔

نے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ میرے بارے میں پتہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ میں خاندانی کھرا اچھوت ہوں۔“

”آپ کے بارے میں سب جانتے ہیں۔“ گوپی چند نے کہا۔

”اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو بھی میں اعتراض نہ کرتا، کیونکہ معاملہ لڑکے کی پسند کا تھا۔“ شیام نے کہا۔

”بہت خوب آپ کے خیالات نئے زمانے کے ہیں۔“ گوپی چند بولا۔

”وکیل صاحب ہمارا زمانہ ختم ہو رہا ہے، اب اس نئی نسل کا ہی دور آ رہا ہے تو پھر ہم کو ان کی پسند کا خیال تو رکھنا ہی ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ ہمیں اچھے ناموں سے یاد نہیں کریں گے۔“

شیام نے کہا۔

”بے شک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ گوپی چند بولے۔

شادی کا اعلان ہوتے ہی حویلی میں ایک بھونچال آ گیا۔

ماماجی کی آمد و رفت میں اضافہ ہو گیا۔ منو ہر کی ماما جی نے منو ہر کو طلب کر لیا۔

”آخر تم نے اپنے من کی کر لی۔ میری بات نہیں مانی۔“

”میں پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔“

”تم نے اپنے باپ کا کہنا مانا اور میرا نہیں مانا۔“

”میں نے صرف اپنے من کا کہنا مانا ہے۔“

”آخر تیری بھتیجی کو اس حویلی میں رہنا ہے۔“

”نہیں وہ اس حویلی میں نہیں آئے گی۔“

”اسکو آنا ہوگا۔ یہی بک رکھوں سے ہوتا آیا ہے۔“

”مگر اب نہیں ہوگا۔ میری شادی شہر میں ہوگی اور میں وہیں پر رہوں گا۔“

”تو ایک عورت کے لیے اپنے پر یوار کو چھوڑ رہا ہے۔“

”نہیں میں کسی کو نہیں چھوڑ رہا۔ اپنا پر یوار بنا رہا

ہوں۔“

”واہ بھیا کتنی آسانی سے آپ نے میرے سر پر سارا بوجھ ڈال دیا ہے۔“ شکر بولا۔

”ارے ہاؤلہ ہوا ہے زمین کی خاطر لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں تجھے تو میں خوشی سے دے رہا ہوں۔“ منوہر نے کہا۔

”اور میں نہیں لے رہا بھابی یہ گاؤں میں رہیں نہ رہیں زمیندار تو بیکار رہیں گے۔ میں ان کا کارندہ رہوں گا۔ وہ بھی ماما جی کی زندگی تک کیونکہ انہوں نے آپ کو گاؤں آنے سے منع کیا ہے، اس کے بعد آپ کو آنا ہوگا۔“ شکر نے کہا۔

”اور ان کی آتما جو میر اور تیری بھابی کا راستہ روکے گی جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔“ منوہر بولا۔

”آتما نے کس کا راستہ روکا ہے۔ اور اگر روکے گی تو آپ چھٹانہ کریں میں اس آتما کی جنتی کر لوں گا۔“ شکر نے جواب دیا۔

منوہر کے جاتے ہی ماما جی کی توجہ شکر کی طرف ہو گئی۔

شیام کمار نے کبھی ماما جی کو منہ نہیں لگا تھا۔ کیونکہ وہ ان کی فطرت کو جانتے تھے۔ ماما جی سخت قسم کے لالچی آدمی تھے۔ بہن کے پاس آتے تھے خالی ہاتھ، اور جاتے وقت ان کی گھوڑی لدی ہوتی تھی۔ شیام کمار کو سب پتہ تھا مگر انہوں نے جتنی کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا لا جوتی اپنے بھیا کا گھر بھرتی رہے گی، باز نہیں آئے گی۔ اس لیے انہوں نے جتنی کوشش دیا تھا کہ ”روپیہ اور اناج میری اجازت کے بغیر کسی کو نہ دیا جائے۔ چاہے وہ کوئی ہو۔“

ماما جی آتے تو پہلے منوہر کا پوچھتے تھے۔ اب شکر کا پوچھنے لگے۔

”شکر ان کو مل جاتا تو گلے لگا لیتے اور کہتے۔“

”ارے اب تو ہی تو رہ گیا ہے۔ تیرے کارن تو میں اتنا کشت اٹھا کر آتا ہوں۔“

”اور گھوڑی دونوں طرف سے ماری جاتی ہے،

ماما جی نے غصے سے کہا۔ ”کبھی اپنی جتنی کولے کر حویلی مت آنا میں مر جاؤں تو بھی نہ آنا، اگر وہ اس حویلی میں آئی تو میری آتما اس کا راستہ روکے گی۔“ منوہر نے کچھ جواب نہیں دیا۔

اودھے پور میں شیام نے اس کے لیے ایک بنگلہ خریدا اور بارات اسی بنگلے سے لگی، اور لہن ودار ہو کر اس بنگلے میں آ گئی۔

ماما جی اور ماما جی اس شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کے علاوہ تمام لوگ شریک تھے۔ سب سے زیادہ خوش شکر تھا۔

”بھابی میں آپ کا اکلوتا دیور ہوں۔ یوں تو ایک دیور آپ کا اور بھی ہے مگر ابھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ منہ جانے کیا کیا بکتا رہا اور کاجل خاموشی سے سستی رہی۔ منوہر نے کہا۔ ”تم اس کی باتوں پر زیادہ غور نہ کرنا یہ بہت بڑا وکیل ہے، میر اور تمہارا مقدمہ اس نے ہی لڑ کر جیتا ہے اور مرے کی بات یہ ہے کہ فری کا وکیل ہے۔“

کاجل نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیوں دیور جی یہ بات ٹھیک ہے۔“

”بھیا نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔“ شکر بولا۔

”تمہارے بھیا کیا سب ٹھیک کہتے ہیں۔“

کاجل بولی۔

”ہاں ٹھیک کہتے ہیں۔“ شکر بولا۔

”تم میرے پاس شہر میں رہو گے۔“ کاجل بولی۔

”بھیا شہر آگئے تو مجھے گاؤں میں رہنا ضروری ہو گیا ہے۔“ شکر نے کہا۔

”ہاں کاجل یہ آتے وقت کا زمیندار ہے اس کو وہیں رہنا ہوگا۔“ منوہر نے کہا۔

”مجھے زمینداری نہیں کرنا تھی اس لیے پڑھ لیا ہے۔ مگر کسی کو پتا جی کی گدی پر بیٹھنا بھی تو ہے۔ اور میں نے وہ گدی اپنی خوشی سے شکر کو دے دی ہے۔“ منوہر نے کہا۔

دکھاؤ۔“ لا جوتی نے کہا۔
 ”اچھا شکر کی عمر کیا ہو گئی ہے۔“ ماما بولے۔
 ”سترہ پورے کر کے اٹھا رہا میں لگ گیا ہے۔“
 لا جوتی نے کہا۔

”واہ لگتا تو بھر پور جوان ہے۔“ ماما بولے۔
 ”ارے تو کا لگے گا نہیں۔“ لا جوتی نے کہا۔
 ”میرا مطلب تھا کہ منور کے مقابلے میں شکر بہت
 بڑھیاں جوان ہے۔“ ماما نے کہا۔
 ”اس کو تو پڑھائی نے داب لیا تھا۔“ لا جوتی نے
 جواب دیا۔

”تم بھی کبھی میرے ہاں آتے جاتے رہو، اس کو
 کہہ دیا کرو آگے گا تو کچھ اس کے رجحان کا پتہ چلے
 گا۔“ ماما بولے۔
 ”تمہارا ارادہ کیا ہے تمہاری بڑی تو اس سے کئی
 سال بڑی ہے اس سے تو تم بھول جاؤ۔ اور اگر کسی کے ساتھ
 راضی ہوتا ہے تو دیکھا جائے گا۔“ لا جوتی نے کہا۔
 ”جی جی میری بڑی تمنا ہے کہ میری ایک تو حویلی
 میں آئے۔“ ماما بولے۔

”میرے تو دو ہی لڑکے ہیں ایک تو کنڈلی سے باہر
 نکل گیا، ایک بچا ہے میں ایک ہی لاسکتی ہوں۔ اور تم نے تو
 پوری سات لڑکیاں جمع کر لیں ہیں میں تمہاری کیا مدد کروں
 گی۔“ لا جوتی بولی۔

”ارے تم ایک ہی لے لو باقی سب کا راستہ بھی
 بنا لوں گا۔“ ماما نے کہا۔

شکر ماما کے گھر نہیں جاتا تھا۔ مگر اب ماں کا زور بھی
 اس پر پڑا اور وہ دو چہرہ کو ماما کے گھر چلا گیا۔
 دلاری، ماما کی بڑی لڑکی دوڑ کر اس کے پاس آگئی
 اور بولی۔ ”اوہو آج کدھر چاند نکل آیا۔“
 ”دن میں چاند نہیں سورج نکلتا ہے۔“ شکر نے
 جواب دیا۔

”تو سورج دیوتا بھٹا، داسی خدمت گزار کی کے
 لئے حاضر ہے۔“ دلاری بولی۔

آتے ہو تو کشت اس پر لادلاتے ہو اور جاتے ہو تو سامان لاد
 دیتے ہو۔ ارے ماما کچھ جانور کا خیال کرو۔“ شکر بس کر کہتا
 تو ماما کھینچا جاتے مگر ڈھین پن سے باز نہ آتے، کہتے۔
 ”ارے تیری مابھاری بازنہیں آتی، بچوں کو کچھ دے
 دیتی ہے تو کیا منع کروں۔“

”ارے ماما آتا ہوا مال کون چھوڑتا ہے۔ بہنوئی
 سے غنی نہیں تمہاری تو فقط بہن سے غنی ہے۔“ شکر نے کہا تو
 برا تو اس کو بہت لگا مگر بولے کچھ نہیں کیونکہ وہ تو کچھ اور ہی
 پروگرام دل میں بنائے ہوئے تھے۔ اتنا سننے پر بھی ان کے
 چہرے پر مسکراہٹ کبھی نہ ہوتی تھی۔ بولے۔

”بہت شرارتی ہو گیا ہے باتیں خوب کرتا ہے۔“
 ”وہ تو ہے ماما جی۔“ شکر نے کہا۔
 ”ارے کبھی ہمارے گھر بھی آ جا کر۔“ ماما نے کہا۔
 ”وہاں کیا کروں آ کر میرے ساتھ کون کھیلے گا
 سب تو لڑکیاں ہیں۔“ شکر نے کہا۔

”ارے تو کیا ہوا لڑکیاں ہی تو ہیں کوئی بھوتی تو نہیں
 ہیں سب یاد کرتی ہیں۔“ ماما بولے۔
 ”پتا جی سے پوچھوں گا پھر آؤں گا۔“ شکر بولا۔
 ”ارے تو کیا تو سب کام ان سے پوچھ کر کرتا ہے۔“
 ماما بولے۔

”مگر کچھ کام ضرور ان سے پوچھ کر کرتا ہوں۔“ شکر
 نے جواب دیا۔

”اچھا کل دوپہر کو آ جا بڑی بڑھیاں کھیر ملے گی۔“
 ماما نے کہا۔

”ماما میں کھیر نہیں کھاتا۔“ شکر نے کہا۔
 ”مجھے پتہ ہے خوب کھاتا ہے۔ اچھا کل آئے گا نا۔“
 شکر نے جان چھڑانے کو کہہ دیا آؤں گا۔ اور ماما
 بہن کے پاس چلے گئے، جاتے ہی بولے۔
 ”جی جی شکر تو ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ لگتا ہے جیجا جی
 کے کہنے میں ہے۔“ ماما بولے۔

”تم بھگوت رام اتنے ہوشیار بننے ہو ذرا پریم سے
 اپنی طرف کر دباپ کا اثر تو اس پر ہے مگر تم بھی تو کچھ کر تب

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں انسان ہوں انسان ہی رہنے دو۔“ شکر گھوڑے سے اتر آیا۔

”آج میری یاد کیسے آگئی۔“ دلاری اٹھ کر بولی۔
 ”تمہاری یاد نہیں آئی ماما جی ہمیشہ شکایت کرتے تھے ماما جی بھی کہتی ہیں اس کا رن آنا پڑ گیا ہے۔“ شکر بولا۔
 ”اچھا میں سمجھی تم کو میری یاد آگئی تھی۔“ دلاری مایوسی سے بولی۔

”تمہاری اکیلی کی یاد کیوں آتی ارے آتی تو ساتوں کی آتی۔“ شکر نے کہا۔
 ”آؤ اندر تو آؤ۔“ وہ شکر کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”اندر آتے ہی شور مچ گیا شکر آیا ہے۔ ارے چھوری غی زری تو نکال کھات پر ڈال دے جا تو دوڑ کے موئے میں پانی لے آ، اری تو کیا کھڑی مند کھیر ہی ہے جا کے گرم گرم دال کے منگوڑے (پکڑوے) بنا لے اور دودھ گرم کر کے چاول ڈال دے لڑکیاں دوڑ دوڑ کر کام کرنے لگیں اور ماما اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔
 ”کہو بھیا ٹھیک تو آ گئے۔“

”ہاں ماما پورا آ گیا ہوں۔“ وہ حسب عادت بولا۔
 ”جیسا تھا دیا یہی شرارتی ہے۔“ ماما نے کہا۔
 ”ماما تم نے سب کو کاموں میں لگا دیا۔“ شکر بولا۔
 ”وہ دیکھ پانی لائی ہے منہ ہاتھ دھو لے سر سے آیا ہے۔“ ماما نے کہا۔

”اچھا رکھ دے میں دھولوں گا۔“ شکر بولا۔
 میں ذرا کھیر دیکھ لوں ماما اٹھ کر چلی گئی۔
 دلاری سے چھوٹی کرن اس کے پیروں میں بیٹھ کر اس کے پیروں میں لگی۔

”ارے تم کیا کر رہی ہو، میں دھولوں گا۔“ وہ بولا۔
 مگر اس نے پنڈلیوں تک اس کے پیروں میں لگ کر شکر کے بدن میں سرسری سی ہوئی وہ پیروں میں لگا کر اس سے لگ کر بیٹھ گئی، اس کے جوان بدن کی خوشبو، شکر کے ہاتھوں میں جانے لگی۔ ایک نئے مزے کا احساس اس کو ہوا پھر وہ بولی۔
 ”تم تھک گئے ہو گے میں تمہارے کاندھے دبا دوں بڑا

آرام ملے گا۔“ آرام کا اندازہ شکر کو ہو چکا تھا وہ کچھ نہ بولا۔
 اور کرن نے کھڑے ہو کر اس کے کاندھے دبانے شروع کر دیئے۔

اس کا سارا وزن پیٹھ پر آ گیا اور شکر ایک انجانے مزے سے روشناس ہوا۔

شکر کو وقت کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ کرن کے آتے ہی کمرے میں کوئی اندر نہ آیا، کرن نے اس کو ایک ایسے سمندر میں ڈبو دیا جس میں وہ بھی نہیں اترتا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر طوفان اتنا شدید تھا کہ اس کے پاؤں اکھڑے گئے اور وہ کوشش کے بعد بھی سنبھل نہ سکا۔

اس کے سر پر محبت کا بھوت سوار تھا، وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ہاں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ اس نے کتنے وجہ لئے، شکر کو پتہ نہ تھا۔ وہ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے کرن بھی شباب کی بھر پور عمر میں تھی۔ اور شکر جذبات کے اندھے کنوئیں میں اتر چکا تھا۔

یہ کھیل پورے پروگرام سے ہوا۔ ماموں ممانی نے خود یہ کھیل رچایا تھا۔ انسان دولت کی خاطر کیا کیا کر گزرتا ہے۔ بھگوت رام ماما کی نظر ججائی کی پوری زمینداری پر تھی اندر اندر اس نے بہن سے جوڑ توڑ کر رکھا تھا۔

کھیل ختم ہوا تو کرن جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخ کر بولی۔

”ہائے رام تم نے کیا کر دیا۔ تم نے میری عزت لوٹ لی۔“

شکر گھبرا گیا بولا۔ ”میں نے کیا کیا تم خود ہی تو مجھ پر گری تھیں۔“

اس موقع پر ممانی کی انٹری تھی اس کو شکر دیکھتا تھا، مگر ایسا شور جس کی آواز گھر سے باہر نہ جائے، اس کے بعد ماما جی کی انٹری تھی اور شکر کو دبا تھا۔ سارا ڈرامہ پہلے سے تیار تھا۔

ایک کردار کے بعد دوسرا کردار آتا رہا اور شکر جو بڑا منہ پھٹ اور حاضر جواب تھا دہتا چلا گیا اور آخر اس کو اتنا

”ٹھیک ہے شکر تیری مرضی ہے تو ٹھیک ہے، میں بھگوت کی لڑکی اس جو بلی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر تیری وجہ سے مجبور ہوں۔“

اور بڑی دھوم دھام سے کرن دلہن بن کر حوٹلی آگئی بھگوت نے جو خرچ کیا وہ دیدی سے وصول کر لیا۔ گویا میاں کا جوتا میاں کے ہی سر مار دیا۔

اب اثر رسوخ اور بڑھ گیا۔ بھگوت پہلے ذرا ڈرتے ڈرتے آتے تھے اب آزادی سے آنے لگے۔ دلاؤ کو مشورے بھی دینے لگے۔ زمینداری کے قاعدے سختی، نرمی کے اصول بھی بتانے لگے۔ کرن کے ہاتھ پیر بھی پھیلنے لگے۔

دلاری کرن کے ساتھ ملی ہوئی تھی، کرن نے جو ڈرامہ کیا تھا اس کے بارے میں دلاری سب جانتی تھی۔ وہ ڈرامہ دلاری کو کرنا تھا، مگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ نہ کر سکی تھی۔ اور وہ پارٹ کرن کو دے دیا گیا اور وہ حوٹلی میں آگئی مگر دلاری نے اس کو چھوڑ نہیں دیا، وہ بھی بہن کے قریب لگی رہی۔

کرن دلاری کو جانتی تھی کہ یہ جان نہیں چھوڑے گی۔ دونوں نے ایک گھر میں ایک ساتھ زندگی گزاری تھی۔ دلاری بڑی ضدی اور پیٹ کی چٹکی تھی۔ اپنی چیز کسی کو نہیں دیتی تھی اور خود سب کی کھاتی تھی۔ ہاتھ پیر کی بھی سب سے زیادہ بگڑی تھی، سب کو دبا لیتی تھی۔ کرن اس سے ڈرتی تھی۔

کرن کے دل میں بھی چور تھا۔ وہ اس کو اپنے گھر آنے سے کیسے منع کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ شکر اس سے محبت نہیں کرتا، شکر کا شادی کا فیصلہ ایک جذباتی اور ڈر کا نتیجہ تھا۔ دلاری بڑی تھی مگر شکل و صورت اور صحت میں وہ کرن سے کئی گنا اچھی تھی۔ کرن شکر کی بیوی ضرور بن گئی تھی مگر اس کے سر پر دلاری کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کسی وقت بھی وہ تلوار اس کے سر پر گر سکتی تھی۔ دلاری سے ایک نہ ایک دن فیصلہ تو کرنا تھا۔ اس کو کسی کھونٹے سے تو باندھنا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”اماں اب دلاری کی فکر کرو۔“ اس نے اپنی ماں سے ایک دن جا کر کہہ دیا۔

”کیا فکر کروں ری۔“ اماں بولی۔

دبا دیا کہ وہ کرن سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔ کرن بھی اس سے دو سال بڑی تھی ماما جی نے گویا اس پر احسان کیا تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر چھوڑ دیا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ بہن کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ”دیدی کام ہو گیا۔ شادی کی تیاری کرو۔“ ”ارے کس کی شادی کروا رہے ہو۔“ لاجوٹی نے پوچھا۔

”کرن اور شکر کی اور کس کی۔“ بھگوت نے کہا۔ ”شکر مان گیا ہے۔“ لاجوٹی نے پوچھا۔

”بڑی خوشی سے مان گیا ہے۔ ارے دیدی دونوں ایک دوسرے کو من ہی من میں پریم کرتے ہیں، مگر تم جانو پریم کہیں چھپا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں، بس اب تم تیاری کرو۔“ بھگوت نے اصل بات نہیں بتائی۔

”چلو اچھا ہو۔ تم تیاری کرو، کچھ ہے تمہارے پاس۔“ لاجوٹی نے پوچھا۔

”تم زمینداری ہو میں تو معمولی آدمی ہوں، جو کچھ ہوگا کروں گا۔“ بھگوت بولا۔

”اچھا تم تیاری کرو جو ضرورت ہو مانگ لیتا۔“ ”شیام کمار کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی، شکر جو ماما کا مذاق اڑاتا تھا ان کے گھر نہیں جاتا تھا ایک دم سے ان کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔

”تم یہ بتاؤ اپنی خوشی سے شادی کر رہے ہو کہ تمہاری ماں نے تم پر زور ڈالا ہے۔ اگر کسی کے دباؤ میں کر رہے ہو تو مجھے بتاؤ۔“ شیام کمار نے شکر سے پوچھا۔

شکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ارے زبان کھولو یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔“ شیام کمار نے پوچھا۔

”میں خوشی سے کر رہا ہوں۔“ شکر آہستہ سے بولا۔

”تم کو پتہ ہے کہ تم سے عمر میں بڑی ہے۔ عورت بڑی ہوتی کچھ دن کے بعد تمہاری بن جاتی ہے۔“

شکر خاموش رہا۔ کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا وہ اندر کے چور سے ڈرتا تھا۔

”کیا اس کی شادی بیاہ نہیں ہوگی، مجھ سے بڑی ہے وہ۔“

”ارے یہ وہ اب نہیں کرے گی۔“ اماں بولی۔

”وہ کہتی ہے کہرنے اس کا حق مار لیا ہے۔“ اماں بولی۔

”میں نے کیا حق مارا ہے اس کا۔“ کرن نے پوچھا۔

”تو نے جو اس دن اس کی خدمت کی وہ دلاری کو کرنا تھی تو وہ تیری جگہ ہوتی۔“ اماں بولی۔

”تو میں نے اس کو دکھا تھا کیا کہ تو خدمت مت کرتی تھی اور باپ نے مجھے کہا تو میں نے کیا اس میں میرا کیا دوش ہے میرے مفکر کا مجھے ملاں کیا کروں۔“ کرن نے جواب دیا۔

”بات تیری بھی ٹھیک ہے، مگر اس کے من میں تو گناہ بیٹھ گئی ہے کہ تو نے اس کا حق مارا ہے۔“

”اب تم اس کو کبہ دو کہ ڈرامہ ختم ہوا۔ اب میری جان چھوڑ دے۔“ کرن بولی۔

”کہہ دوں گی مگر مجھے لگتا نہیں کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گی، بڑی ہٹ دھرم ہے۔“

بات بننے سے زیادہ بگڑ گئی۔ دلاری کو ماں کی بات سخت ناگوار گزری۔ دلاری نے اپنے ہتھیاروں کا ازسرنو جائزہ لیا۔ نئی نئی کمائیں اور تیر بنائے اور شکار کی تلاش میں حویلی آ گئی۔ شام کمار رات گئے تک حویلی سے باہر رہتے تھے۔ چنتی سے ان کی بپتی نہیں تھی۔ وہ مراری کے گاؤں میں رہتے تھے مگر رات کو آتے ضرور تھے۔ لاجونتی حویلی کے آخری سرے پر رہتی تھی۔ اس کے بعد کرن کے کمرے تھے مردانے کے ساتھ ہی ایک کمرہ دلاری نے لے رکھا تھا یا قبضہ کر رکھا۔

شکر رات نو دس بجے آتا تھا۔ کرن کے کمرے میں جانے کے لیے اس کو دلاری کے کمرے کے سامنے سے گزرتا پڑتا تھا۔ دلاری کے تن بدن میں جو لاکھی بھڑک رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے شکر کا انتظار کر رہی تھی اور پھر رات دس بجے شکر آ گیا۔ پوری حویلی پر سنائے کا راج تھا۔ شکر

☆.....☆.....☆

شیام کمار زمیندار روز ہی رات گئے آتے تھے، ایک رات اندھیرے میں کئی ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا اور شیام کمار مارے گئے۔

بھگوت نے ان کے مرنے پر بڑا سوگ منایا۔ منوہر نے سارے اختیارات شکر کو دے دیئے۔ ایک طرح سے پوری زمینداری اپنے بھائی کو دے دی اور پٹنہ چلا گیا۔

اب پوری حویلی اور زمینوں پر بھگوت کا راج تھا۔ سارے ہاری اور کسان بھگوت کے غلام ہو گئے۔

شیام کمار نے کبھی کسی ہاری کو تنگ نہیں کیا تھا۔ ان

کی ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔

نے اپنی لڑکیوں تک کی بلی چڑھا دی۔ اپنے بہنوئی کو مار ڈالا۔ بہن کو ختم کر دیا اور اب اپنے داماد کو بھی مار کر تم زمیندار بن گئے۔ مگر یہ زمینداری تم کو اس نہیں آئے گی۔ بڑی کھٹائیوں سے گزرنا ہوگا۔ مجھے تو خیر زمینداری سے لگاؤ نہیں ہے مگر یاد رکھنا ایک اور ہے جس کو پتا جی اپنا بیٹا مان چکے ہیں اور ہم دونوں نے اس کو اپنا بھائی تسلیم کر لیا تھا۔“ منوہر واپس پٹنہ چلا گیا۔

بھگوت مراری کے بارے میں جانتا تھا، مگر اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، ایک تو وہ حویلی سے دور تھا دوسرے سب تو اس کو نہیں جانتے تھے۔ اس کے خیال میں قانونی طور پر زمیندار شکر کی تمام دولت اور زمینوں کی مالک اس کی بیوی تھی۔

پندرہ سال گزر گئے۔ بھگوت زمینداری کرتا رہا۔ سب لڑکیوں کی شادی ہو گئی مگر دلاری اور کرن نے شادی نہیں کی۔ کرن کی تو بھگوت نے نہیں ہونے دی اور دلاری نے خود نہیں کی۔ حویلی میں جو عیش اس کو حاصل تھے وہ اس کو کہاں ملے۔ دلاری نے کچھ ایسے لوگوں سے رابطے کر لئے تھے جو کہ بھگوت کو بھی ڈرا دیتے تھے۔

پندرہ سال کے بعد زمینداری کا دعویٰ دار سامنے آ گیا اور وہ تھا مراری۔ اس نے سرکاری سطح پر دعویٰ کیا تھا۔ بھگوت ذرا حیران تو ہوا۔ مگر پھر مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اور مقدمہ چلنے لگا مراری اس کے مقابلے میں کمزور پڑنے لگا ایک تو وہ روپے بیسے میں کمزور تھا۔ دوسرے اس کے پاس جو گواہیاں تھیں وہ نہ معلوم کس طرح ٹوٹ رہی تھیں، کوئی گواہ عدالت نہیں جاتا تھا اور پھر وہ مقدمہ ہار گیا اور کرن مقدمہ جیت گئی اور بھگوت نے ایک بہت بڑا جشن منایا۔ اور مراری کو اس کے گاؤں سے بیدخل کر دیا۔ اور وہ نہ معلوم کس طرح دلی آ گیا اور پھر ہمارے سامنے تھا۔

ہر وہ داستان جس میں محبت کی چاشنی بھی تھی نفرت، لالچ سب کچھ تھا روٹو کا نے کہا۔ ”اب حویلی کے کیا حالات ہیں۔“

مراری نے کہا۔ ”بھگوت کی دونوں لڑکیوں کے

مگر اب بھگوت زمینداری کر رہا تھا، شکر پر اس کی دونوں لڑکیاں اس طرح پر پھیلا کر بیٹھی تھیں کہ وہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دونوں میں آپس میں کشمکش تھی مگر پھر بھی دونوں مل بانٹ کر کام کر رہی تھیں کیونکہ ان کے درمیان ان کا کھراٹ باپ آ گیا تھا۔ ”لڑومت سب تمہارا ہے ذرا سکون سے رہو اور بھتی جلدی ہو اس کو ٹھکانے لگاؤ۔ ذرا سی فرصت مت دو دھندوں میں لگائے رکھو اور زمینداری ہاتھ آتے ہی میں تمہارے لئے بڑے بڑھیاں لڑ کے تلاش کر دوں گا۔“ باپ کا پلان سن کر دونوں ذرا شانت ہو گئی تھیں، شکر کے لئے ان کے دل میں کوئی ہمدردی یا محبت نہ تھی۔ پھوپھی بھی ان کے لئے بے کار تھی۔ اور ایک دن وہ بھی پر لوک سدھا گئی۔

اب حویلی پر پورا راج بھگوت اور اس کی لڑکیوں کا تھا، شکر کا کاٹنا نکالنے کو اس نے ہر لڑکی کو آزادی دے دی تھی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی شکر کے لئے رہتی تھی۔ اس سے بھگوت کو دو فائدے تھے ایک تو شکر کو زمینداری کی طرف دھیان کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی دوسرے وہ شش شان گھاٹ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

مگر اس نے ایک کام یہ ضرور کیا کہ مراری کے نام پورے کاغذات، بنوا کر رجسٹری کرالئے اور ان کاغذات کو مراری کے حوالے کر دیا مراری چھوٹا تھا مگر اس کی ماں نے وہ کاغذات حفاظت سے رکھ دیئے۔ بھگوت خوش تھا کہ سارا کام اس کے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

وہ سات گاؤں کا مالک بننے والا تھا۔ شکر کے بعد اس کی بیوی ہی مالک تھی کیونکہ اولاد تو اس نے ہونے ہی نہیں دی تھی۔ کرن نے بہت زور بھی لگایا تھا۔

اور پھر دیئے کا تیل ختم ہوا اور وہ بھڑک کر بجھ گیا۔ زمیندار شکر جوانی میں مر گیا۔ منوہر دوڑ آیا۔ اس نے حویلی کے حالات دیکھے وہ سمجھ گیا کہ کیا کھیل کھیل گیا ہے۔ عملی طور پر بھگوت زمیندار تھا۔

”ماما تم نے آخر مراد پالی۔ اس مراد کے پانے میں تم

طاقت ہے، جھوٹ ہمیشہ نہیں جیتتا۔ ایک نہ ایک دن اس کو ہارنا پڑتا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”بے شک آپ نے درست کہا ہے۔“ منوہرنے کہا۔

”مقدمہ یہاں پر دلی کی عدالت میں کریں تو کیسا رہے گا۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”میرے خیال میں اودھے پور بہتر رہے گا، کیونکہ گواہوں کے آنے میں وہاں پر آسانی ہوگی، گاؤں کے لوگ لمبے سفر کرنے سے کتراتے ہیں۔“ منوہرنے رائے دی۔

”آپ نے درست کہا تو پھر مقدمہ اودھے پور میں دائر کریں۔“

میں تیاری کرتا ہوں۔ پندرہ بیس دن تو تیاری میں لگ جائیں گے۔“ منوہرنے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ تیاری کریں میں اودھے پور وہاں کے حالات جا کر دیکھتا ہوں۔ اور مراری تم دلی میں آرام کرو۔“

رولوکا اودھے پور روانہ ہو گیا۔

اودھے پور آتے ہی اس نے ایک نوجوان دیہاتی کاروپ دھار لیا۔ اور کام کی تلاش میں بھگوت کے پاس چلا گیا۔

بھگوت نے اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر بولا۔

”کہاں کا ہے رے تو اور کیوں آیا ہے۔“

”مزدوری کو آیا ہوں سر کار باکم گاؤں کا ہوں۔“

”ظہور ڈگر دیکھ لے گا ان کا دودھ نکال لے گا۔“

بھگوت نے پوچھا۔

”ہاں یہی کیا ہے اب تک۔“ وہ بولا۔

”تیرا کیا نام ہے۔“ بھگوت نے پوچھا۔

”نام تو بابو ناتھ ہے، مگر اب صرف بابوہر گیا ہے۔“

روا کا بولا۔

چاہنے والے ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے چاہنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو جادو سحر کرتے ہیں۔ میرے خلاف انہوں نے مقدمہ جیت تو لیا ہے میں صرف اس بات پر حیران ہوں میرے حق میں جتنے گواہ تھے کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اور میں مقدمہ ہار گیا۔“

”تم دلی میں رہو تمہارا کیس میں لڑوں گا۔ پٹنہ میں منوہر وکیل کو اطلاع کر دو کہ تم یہاں پر ہو۔ اور وہ تم کو یہاں پر آ کر ملاقات کر لے۔“

ایک ہفتہ میں منوہر مراری کے پاس آ گیا۔ رولوکا نے کہا۔ ”وکیل صاحب مراری کے پاس جو کاغذات ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔“

”شکر نے ساری زمین اور حویلی مراری کے نام کر دی ہے۔ گواہیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کاغذات کو شکر نے شادی کے بعد تیار کروایا تھا۔ اس میں اس نے ماما کے کردار کو ناقابل بھروسہ قرار دیا ہے۔ بیوی کو ماما کا آلہ کار بتایا ہے۔

میرے اور شکر نے خود کے بعد مراری کو حق دار بتایا ہے۔ کچھ ایسے گواہ بھی لکھے ہیں جن کے سامنے چٹائی نے مراری کو بیٹا مانا ہے۔ میں تو شکر کو لکھ کر دے چکا تھا کہ وہی میرے حصے کا مالک و خنجر ہے، اس کا بھی حوالہ دیا ہے، اتنا صاف کیس

مراری ہار گیا، اس میں بھی ضروری کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔“

منوہرنے کہا۔

”آپ ایسا کریں پھر سے یہ کیس دائر کر دیں۔“

رولوکا نے کہا۔

”کیس تو میں دائر کر دوں گا مگر جو امکانات ہیں ان پر پہلے سے غور کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ ماما بھگوت کا اثر

رسوخ پندرہ سال میں بہت بڑھ گیا ہوگا۔“

اس کے خلاف ہم کی گاؤں سے گواہی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ پندرہ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا ہوگا۔ کچھ لوگ مر چکے ہوں گے اور نئے لوگ تو بھگوت کو ہی زمیندار

مانیں گے۔ بہت سی پریشانیاں آئیں گی درمیان میں۔“

منوہرنے کہا۔

”سب تو اپنی جگہ ہے مگر ہمارے ساتھ بچائی کی

”ارے اوسو لگی ادھر تو آ۔“

ہونگا۔“ بوڑھا سونگی آہستہ سے بولا۔
”ارے چاچا تم نے کیا سنائی مجھے تو درگ رہا ہے۔“ رولو کا بولا۔

”ایک بوڑھا آدمی اس کے پاس آ گیا اور بولا حکم کر دو سرکار۔“

”بات یہ ہے بابو کہ یہ جو بھگوت ہے نا بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس سے زیادہ خطرناک اس کی دو چھوری ہیں، وہ دونوں حویلی میں رہیں ہیں ان کے پاس بڑے خطرناک آدمی آوے ہیں وہ آدمی کا ناش مار دیتے ہیں۔“ بوڑھا بولا۔

”روز مرے تھا کہ کام بہت ہے، لے لے یہ جوان رکھ اپنے پاس سب کام کر لے گا۔ تیرے اور زادھیان رکھنا تیا آدمی ہے۔ سمجھ گیا نا۔“ بھگوت بولا۔
”خوب سمجھ گیا سرکار۔“ بوڑھا بولا۔ اور بھگوت چلا گیا۔

”کیا بہت بد معاش ڈاکو ہیں وہ۔“ رولو کا بولا۔
”ارے نہیں سٹھی اور کالا جادو کریں ہیں۔ بھگوان ان سے بچائے۔“ بوڑھا بولا۔

”بوڑھے سونگی نے رولو کا کوکھ کر اور بولا کہ تیرا نام کیا ہے۔“ رولو کا بولا ”بابو میرا نام۔“

”چاچا سونگی میں تو برا پھنس گیا اب میں کیا کروں۔“ رولو کا بولا۔
”قوب کام کر، جانے کی مت سوچنا، تیرا نام لکھ لیا گیا ہے زیادہ دور نہیں چپائے گا۔“

”تو سن بھی پابو تیرا کام تو بہت ہے یہ ساری بھینس گائے نظر آ رہی ہیں ان کا دودھ نکالنا اور پھر وہ دودھ حویلی کے دروازے پر پھینچا نا۔ وہاں پر شہر کی گاڑی آوے ہے پھر یہ دودھ شہر چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد نیپاں کی صفائی کرنا ہے۔ چارہ پانی گوبندی کرتا ہے۔ گوبر بوجی لے جاتی ہے۔“ بوڑھا بولا۔

”کام۔“
”مگر تو فکر نہ کر اگر میرے پاس رہے گا تو آرام سے رہے گا۔“ سونگی نے کہا۔

”ارے اب میں کس قابل ہوں کہ کروں۔“
”نہی کو ہاتھ پیر ایک دم نہیں ڈال دینے چاہئے۔“

”اور اب کہاں جاؤں گا، اب تو آپھنسے کی رام رام ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔
”میرا تو فکر نہ کر اگر میرے پاس رہے گا تو آرام سے رہے گا۔“ سونگی نے کہا۔

”نہی کو ہاتھ پیر ایک دم نہیں ڈال دینے چاہئے۔“
”چاچا۔“ رولو کا نے کہا۔

”دن بھر رولو کا کام کرتا رہا، رات کو اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور اندر سے کندھی لگالی اور روپوشی کی حالت میں باہر آ گیا حویلی کی طرف چلا، دروازے پر ایک لٹھ بندر سے اونچا لٹھ لئے کھل رہا تھا بڑا دروازہ بند تھا اور چھوٹا دروازہ کھلا تھا، رولو کا اس کے سامنے سے گزر کر حویلی کے اندر چلا گیا۔ حویلی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ مگر اتنی کم کہ وہ روکا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ رولو کا نے جس جس کمرے میں روشنی تھی ان کو چیک کرنا شروع کر دیا۔

”نہی کو ہاتھ پیر ایک دم نہیں ڈال دینے چاہئے۔“
”چاچا۔“ رولو کا نے کہا۔

”ایک بڑے کمرے میں بھگوت بیٹھا تھا اس کے سامنے نیک جوان عورت بیٹھی تھی۔
ظاہر ہے یہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ بھگوت کے

”تیری بات ٹھیک ہے کہ نا تو پڑتا ہے کچھ نہ کچھ یہ وہ زمیندار نہیں جو بغیر کسے کا ایک نوالہ بھی منہ میں ڈال دے۔ زمیندار تو تنگ تھا اس کا باب تھا۔ کبھی کسی کو ستایا نہیں اور کسی حق رکھا نہیں۔ سب کو بیت بھر کر دیا، آڑے وقت میں کام بھی آیا، ارے اب کیا رکھا ہے۔ بیگار ہے جو ہم سب کر رہے ہیں، نہ کریں تو بھی مارے جائیں۔“ بوڑھا بولا۔
”مارے جائیں یہ کیا بات ہوئی کام کریں گے مزدوری لیں۔“ بھگوت نے کہا۔
”ارے اب میں کس قابل ہوں کہ کروں۔“

”ایک بڑے کمرے میں بھگوت بیٹھا تھا اس کے سامنے نیک جوان عورت بیٹھی تھی۔
ظاہر ہے یہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ بھگوت کے

”نہی کو ہاتھ پیر ایک دم نہیں ڈال دینے چاہئے۔“
”چاچا۔“ رولو کا نے کہا۔

سامنے دو گلاس رکھے تھے اور دونوں شراب سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک بوتل بھی رکھی تھی۔

بھگوت اس عورت کے قریب چلا گیا اور بولا۔
 ”اب زیادہ غرہ نہ کر۔ بہت دن کے بعد آئی ہے، عورت نے چاروں طرف نظریں گھا کر کہا۔
 ”میں کیسے تیرے پاس آ گئی میں تو اپنے گھر بیٹھی تھی۔“

”اب آ گئی ہے تو مزرے کر لے۔ میں ہوں زمیندار بھگوت موج کرے گی موج۔“

”مجھے گھر جانے دے میں بال بچے دار عورت ہوں۔“ عورت نے کہا۔

”جلی جانا روک کون رہا ہے، مگر کچھ ہمارا بھی خیال کر لے، چتا مت کر تیرے خصم کو ذرا کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ وہ سویرے تک سوتا رہے گا۔“ بھگوت نے کہا۔

”میں نے تیرا کیا لگاؤ ہے میری عزت کیوں خراب کر رہا ہے تو۔“ عورت بولی۔

”خراب کہاں کر رہا ہوں، قدر کر رہا ہوں، تو خالی ہاتھ نہیں جانے لگی کچھ لے کر ہی جائے گی۔ اب زیادہ دیر نہ کر تجھے کوئی بچانے آئے گا یہ تو بھول جا۔ آ جا اب آ جا۔“

عورت کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بھرے تھے، اس کے ہاتھ پیردوں میں لرز اطاری تھا اور ہونٹ کپ کپارہے تھے۔

بھگوت اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ عورت کو پکڑے مگر درمیان میں ردولکا آ گیا۔ اس نے عورت کو پوری طرح اپنی آڑ میں کر لیا اور ایک بھیا تک شکل بھگوت کے سامنے آ گئی۔ اتنی بھیا تک کہ بھگوت اس کو دیکھ کر چیخ پڑا اور ہائے رام کہہ کر زمین پر گر پڑا ردولکا نے عورت کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کے باہر آ گیا۔ عورت حویلی کے باہر آتے ہی ایک طرف دوڑ گئی اور ردولکا پھر حویلی کے اندر تھا۔

بھگوت کی آواز سن کر کئی آدمی اس کے کمرے کی طرف دوڑے، بھگوت زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ شراب

کے دونوں گلاس پورے پڑے تھے۔ بوتل البتہ الٹ گئی اور شراب فرش پر بہہ رہی تھی۔

ان آدمیوں نے بھگوت کو اٹھا کر بڑے سے پلنگ پر ڈال دیا اور ایک نے صراحی سے پانی بھر کر بھگوت کے منہ پر چھینٹے مارے، کچھ ہی دیر میں بھگوت ہوش میں آ گیا۔

ہوش میں آتے ہی بولا۔
 ”وہ کون تھا۔ چلا گیا کیا۔“

”یہاں تو کوئی نہیں ہے سرکار۔“ ایک آدمی نے جواب دیا۔
 ”ارے کیا تھا وہ ایسا بھیا تک تو میں نے کبھی دیکھا نہیں۔“

”یہاں تو کوئی نہیں ہے سرکار، آپ نے سپنا دیکھا ہوگا۔“ ایک نے کہا۔
 ”مجھے جھوٹا بنانا ہے پانھنڈی۔“ بھگوت غصے سے بولا۔
 سب نوکر خاموش ہو گئے۔ بھگوت نے ایک گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا دو چار گھونٹ لیکر بولا۔
 ”وہ حرام زادی کہاں گئی۔“
 سب خاموش رہے تو وہ دہاڑ کر بولا۔ ”ابے کیا گو نگے ہو گئے ہو جواب دو کہاں گئی۔“
 ”ہم جب اندر آئے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، آپ زمین پر پڑے تھے اور کمرہ خالی تھا۔“ ایک آدمی ڈرتے ڈرتے بولا۔
 ”تو کیا وہ ہوا میں اڑ گئی۔ ارے کوئی چڑیا تھی، عورت تھی اس کا نام جاگتی تھی۔ گولوی گھر والی، جاؤ دوڑ کے اور پٹنیا سے پکڑ کر لے آؤ۔“ بھگوت بولا۔
 تینوں دروازے کی طرف دوڑے مگر حویلی کا دروازہ باہر سے بندھا موٹی لکڑی کا بنا ہوا بھاری دروازہ۔ دروازے کے باہر کا پہرے دار زمین پر خرائے لے رہا تھا۔ اندر کے کسی شور کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پھر انہوں نے بڑا بھاری دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی باہر سے کدہ لگا ہوا تھا۔ صبح تک کوئی اندر کا آدمی باہر نہ آ سکا۔ بھگوت تلملتا رہا۔

رولو کا اس کے قریب ہی رہا۔
 دوپہر بارہ بجے اس کے پاس ایک آدمی آیا۔
 اس آدمی کے کالے کپڑے تھے۔ سر گھٹا تھا۔ جسم
 دبلا پتلا تھا مگر آنکھیں بڑی چمکدار اور سرخ تھیں۔ وہ آتے
 ہی بولا۔

”ڈرگے کیا رات کو، ارے ہمارے ہوتے ڈرگے
 ہم تو خود سبلاؤں کے بلا ہیں۔“

”سو تو ٹھیک ہے مگر وہ کون تھا کیا بتائیں اس کا چہرہ
 کتنا ڈراؤنا تھا۔“

”میرا تو خیال ہے تمہارے خیال میں ضرور کوئی چہرہ
 ہوگا وہی تمہارے ذہن سے نکل کر سامنے آ گیا اور تمہاری
 گھٹی بندھ گئی۔“

”ارے نہیں سو کی مہاراج ایسا ہرگز نہیں ہوا۔
 ہمارے ساتھ تو ایک بڑی بڑھیاں سندری تھی۔ ارے وہی
 جاگتی گولی کی عورت ہم اس کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اس کی
 جگہ وہ نکل آ گئی اور ہم گھسے اٹا غفل۔“ بھگوت نے کہا۔

”اچھا تم آرام کرو میں دیکھتا ہوں اگر کوئی ہے تو
 سمجھ لو پھنس گیا اور سو کی مہاراج کمرے سے باہر آ گیا۔“
 رولو کا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

سو کی ایک کمرے میں بغیر آواز دینے اندر چلا گیا۔
 اندر پٹنگ پر ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔ مگر اس کے
 چہرے پر خراشت پن صاف ظاہر ہوتا تھا۔ سو کی مہاراج اس
 کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”دلاری جی ہم آپ کے پاس کب سے آ رہے
 ہیں۔ ذرا بتاؤ تو۔“

”اس کی ضرورت کیوں پڑ گئی مہاراج۔“ دلاری
 نے اٹھ کر کہا۔

”اس لئے پڑ گئی کہ ایک نئی بات سامنے آ گئی۔
 حویلی میں ہمارے علاوہ بھی کوئی شخصتی ضرور ہے۔ مگر خیر دیکھ
 لیں گے تو جو بھی ہے سن رکھو غور سے۔“

سو کی مہاراج کے چہرے پر خباثت پوری طرح
 مساوی تھی۔ آنکھوں میں مکاری، شیطانی عروج پر تھی۔
 کی کر دی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اب اگر کچھ عزت قائم رہ سکتی ہے تو دولت اور اقتدار سے ہی رہ سکتی ہے۔ اس کو قائم رکھنے کو ہر جتن وہ کر رہی تھی، کرن اس کے سامنے دوسرے درجے پر تھی، حالانکہ زمینداری اس کے نام تھی، مگر عملی طور پر دلاری ہی حاکم تھی، بھگوت بھی اس کی مرضی کا غلام تھا۔ کیونکہ اس پر سو کی مہاراج کا ہاتھ تھا۔

رولوکا کرن کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ کرن کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کا جسم بھد اور بے حساب پھیلا ہوا تھا۔ اس کی جوانی کتنی تیزی سے اس سے بھاگ رہی تھی دلاری کے مقابلے میں یہ جلدی بوزھی ہو رہی تھی۔ انسان کتنا بے وقوف ہے اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس عورت نے کیا کھو یا اور کیا پایا۔ رولوکا نے سوچا۔

اور وہ اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ دلاری کا کمرہ بند تھا مہاراج سوئی اندر سو رہا تھا۔

رولوکا ری کے کمرے کے اندر چلا گیا۔ دلاری جاگ رہی تھی۔ رولوکا نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

”تیرے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔“ دلاری نے چونک کر چاروں طرف دیکھا کہ آواز کہاں سے آئی۔ مگر کچھ نظر نہ آیا کمرہ روشن تھا، دن کا وقت تھا۔

رولوکا نے پھر کہا۔ ”تیرا باپ بھگوت سب بڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔“

وہ پھر گھبرا کر اور ادھر دیکھنے لگی اور جانتی تھی کہ سو کی مہاراج کو اٹھانے کے وہ پھر بولا۔ اس کو نہ بتانا یہ بھی اس سے ملا ہوا ہے۔“ اور رولوکا یہ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

رات کے بوجھن کے بعد بھگوت نے پوچھا۔ ”مہاراج کچھ پیہ چلا کیا گزریڈے۔“

”تو یہ بتا تو نے کوئی نیا نوکر جو ملی میں تو نہیں رکھا۔“ سو کی نے پوچھا۔

”نیا نوکر ہاں ایک گوالہ رکھا تو ہے۔“ بھگوت نے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے وہی نیا آدمی آیا ہے۔“ سو کی

نے کہا۔ ”ذرا اس کو بلا کے تو لا۔“

”ابھی بلائے دیتا ہوں۔“ اور اس نے رولوکا کو بلانے آ دی دوڑا دیا۔

رولوکا کو پٹھری میں تھا وہ باہر نکلا اور بولا۔ ”کیا بات ہے کیوں بلا رہے ہو۔“

”میرا نام باپو ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں ہم ہی باپو ہیں اب آگے بول۔“ رولوکا نے کہا۔

”زمیندار جی بلا رہے ہیں جلدی چل۔“ وہ بولا۔

”ارے کام تو ہم سب کئے ہیں پھر کا ہے ضرورت پڑی۔“ وہ بولا۔

”کچھ گزریڈے ہے مہاراج بھی ان کے ساتھ ہیں۔“ آ دی بولا۔

”مارے گئے باپو اب کیا کریں۔“ رولوکا بولا۔

”ارے جلدی کر تیرے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔“ وہ بولا۔

اور دونوں تیز تیز قدموں سے اندر آ گئے۔ باپو بھگوت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”یہ ہے مہاراج۔“ بھگوت نے کہا۔

مہاراج نے اپنی تیز اور چمکیلی نگاہوں سے رولوکا کا جائزہ لیا اور ایک زور کی ہول کی اور بولا۔ ”تو یہ سب تو کر رہا ہے۔“

”میں کیا کر رہا ہوں میں تو مزدوری کر رہا ہوں سرکار۔“ رولوکا بولا۔

”ارے تو میری نظر سے نہیں چھپے گا۔ پاتل تک دیکھتا ہوں میں۔“ مہاراج بولا۔

رولوکا کو اندازہ ہوا کہ دشمن کو کچھ نہ کچھ اس پر شک ضرور ہو گیا ہے۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔ ”میں نے کیا کیا ہے سرکار کیوں ناراض ہو۔“

”ارے تو نے اب تک جو کرتب دکھائے ہیں ذرا میرے سامنے تو دکھا پھر جانوں۔“ مہاراج نے کہا۔ رولوکا اس کے پاس بیٹھ گیا اور روئے لگا، مر گئے باپو تاحہ آج بے

موت مارے گئے۔“

”ہم تو سمجھے بابو ناتھ تم گئے کام سے پر بھگوان کی کرپا ہو گئی پتہ ہے وہ ہم سے کیا کیا پوچھتے رہے ہم بھلا کیا جانیں، خاموش ہی رہے۔“ رولو کو لگانے کہا۔

”چل تیری جان بچ گئی یہ مہاراج بڑا ہی خراب آدمی ہے اور یہ زمیندار تو پورا دل ہے دلال۔“

ارے بے خیرت اتنا ہے کہ اس کی چھوڑیوں کے ساتھ وہ مہاراج موج کرے ہے اور یہ دیکھتا رہتا ہے نہ تو چھوڑیوں کو روکے ہے نہ مہاراج کو۔“ سوئی بولا۔

”ہم تو برے نہیں گئے پتہ ہوتا تو کیوں آتے اس آفت میں۔“ رولو کانے کہا۔

”اڑے تو فکر مت کر آرام سے رہ یہ نوکر ہیں بس
تماشا دیکھیں گے۔ اپنی ٹانگ نہ پھنسا ئیں گے۔“ سونکی
نے کہا۔

رات کو روکو کا دلاری کے کمرے میں گیا، وہ بیٹھی بناؤ سنگار کر رہی تھی۔ وہ باہر آ گیا اور بھگوت کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں بھگوت موجود تھا اور اس کے سامنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ اور وہ عورت گولوی بیوی خانی تھی۔ آج وہ بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔ اس کے سامنے شراب کا بھرا گلاس رکھا ایک گلاس بھگوت کے سامنے بھر رکھا تھا۔

”پیو میری جان آج تو تم چمک رہی ہو۔“ بھگوت نے کہا۔

روڈ کا کوئی اندازہ ہو گیا کہ عورت کسی کے اثر میں ہے، اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اس کو جو کرنے کا کہا جا رہا ہے وہ کر رہی ہے۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہی۔

رولو کا نے اس کے منہ کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔
عورت ایک دم اثر سے باہر آ گئی اور چونک کر اس نے
چاروں طرف دیکھا اور حیرت سے بولی۔

”میں کہاں ہوں تو زمیندار ہے ارے تو کیوں میری عزت کا دشمن ہوا ہے ناش پیٹے کیوں بار بار مجھے بلاوے ہے۔“

بھگوت جو ذرا پہلے بڑا خوش تھا ایک دم غصے میں آ گیا اور زور سے بولا۔ ہمارے تیری اور تیری عزت کی ایسی

”ارے میں کہتا ہوں کچھ تو کر تیرے کس بل میں بھی تو دیکھوں۔“ مہاراج بولے۔

”ہم تو نوکر ہیں تمہارے ہمارے کس بل کیا ہیں۔“
وہ بولے۔

”اچھا رک ابھی پتہ کرتے ہیں، تیرے اندر کیا ہے۔“

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر مہاراج بولا..... ارے یہ تو خالی ڈبہ ہے۔ چل اٹھ بھاگ جا۔

بابو پھرتی سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا! اور ایک لمحے کے بعد وہ روپوشی میں کمرے کے اندر تھا۔ بھگوت نے پوچھا۔ کیا وہاں راج۔

”تیرا لڑکا تو وہ نہیں ہے جو ہم سمجھ رہے تھے۔ کوئی اور ہے۔“

”تو اس کا کچھ پائے تو کرو نہیں تو روز روز وہ کچھ کرتا رہے گا۔“ بھگوت نے کہا۔

”کرتے ہیں مرا کیوں جا رہا ہے۔“ مہاراج نے کہا اور دلاری کے کمرے میں آ گئے۔ ”دلاری بولی کچھ پتہ چلا کون ہے۔“

”تو بھی مری جا رہی ہے تیرا پتا بھی مرا جا رہا ہے۔
یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو سب نہ کر لیتے بڑی جلدی ہے تم
سب کو۔ مہاراج غصے سے بولا۔

”جلدی نہیں ہے مہاراج ڈرلگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کون سی ٹھکتی ہے۔“ دلاری نے کہا۔

”کوئی ہو ذرا بھٹک لگ جائے پھر تو ہم اس کا نام منادیں گے۔“ مہاراج بولے۔

دوسرے دن وہ سوئی سے بولا۔
 رو لو کا باہر آ گیا اور اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

”چاچا حویلی میں کچھ گزبڑ ہو رہی ہے تم کو پتہ ہے۔“

”نہی مجھے تو یہ نہیں ارے ہاں یاد آیا تجھے مہاراج
نے بلایا تھا کیا بات تھی۔“ سولنگی نے بوجھا۔

تمیسی کروں۔“ اور جھپٹ کر عورت کی طرف بڑھا۔ مگر درمیان میں رولوکا موجود تھا اور ایک بار پھر وہ خوفناک چہرہ اس کے سامنے تھا۔ بھگوت کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ ہائے رام کہہ کر دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ عورت نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ حویلی کا باہر کا دروازہ رولوکا پہلے ہی کھول چکا تھا۔ وہ حویلی کے باہر چلی گئی۔

مہاراج دلاری کے کمرے میں پڑے رہے اور ان کے کسی پیر نے ان کو کیا ہوا نہیں بتایا۔ سویرے ان کو سارے حالات بھگوت نے بتائے تو وہ بولے۔

”میں نے جاگ کر ایک پیر لگا دیا تھا وہ اس کے دماغ کو قابو کئے تھا، تم نے دیکھا وہ خود چل کر تہارے پاس آ گئی تھی۔ یہاں آ کر میرا پیر اس کو چھوڑ کر کیوں بھاگا یہ سمجھ نہیں آ رہا۔ پیر کے بھاگتے ہی وہ ہوش میں آ گئی اور نکل گئی۔“

مہاراج نے کہا۔

”اور وہ میرے اور اس کے بیچ ایک بھیانک صورت آ رہی ہے وہ کون ہے۔ حویلی کا دروازہ بند تھا، اس پر پیرے دار تھا وہ کس نے کھولا اور پیرے دار بے ہوش پڑا ہار۔“

”مہاراج کھوپڑی کا مٹ نہیں کر رہی تم کچھ سوچو۔“

بھگوت نے کہا۔

”میں بے فکر نہیں ہوں میرے سارے پیر کام کر رہے ہیں، مگر کسی کو اب تک کچھ نظر نہیں آیا۔ کریں تو کس کے خلاف کریں۔ کس کو پکڑیں کوئی تو سامنے ہو۔“ مہاراج بولے۔

”لوٹناؤ تم جیسے ہشتی والے ایسی بات کریں، تعجب کی بات ہے۔“ بھگوت بولا۔

”تم نہیں جانتے ہشتی ہشتی میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایسی ہشتی نہیں دیکھی۔ جیسی یہ ہے۔

ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ نہیں پا رہے، میرے سارے پیر مجبور ہیں۔ میری کوئی نہیں چل رہی، مگر میں ہار نہیں مانوں گا پیر ضرور کروں گا۔“

دس دن تک رولوکا نے ان کو اسی طرح چنی پریشانی میں مبتلا رکھا اس سے رولوکا کا مقصد کیس پر اپنی گرفت

مضبوط کرنا تھا۔ ابھی بھگوت اس چنی خلفشار سے باہر نہیں آیا تھا کہ عدالت کا نوٹس اس کو ملا۔ اور وہ دوڑا دوڑا مہاراج کے پاس پہنچا اور بولا۔

”مہاراج یہ نئی مصیبت آ گئی۔“

مہاراج نے پوچھا ”اب کیوں مرا جا رہا ہے۔“

”مہاراج عدالت کا نوٹس آیا ہے۔“

”عدالت کا نوٹس کس بات کا۔“ مہاراج نے پوچھا۔

”وہ دو کوڑے کے مراری نے پھر دوبارہ دعوئی کر دیا ہے۔“ بھگوت بولا۔

”وہ قصہ تو پندرہ سال پہلے میں نے ختم کر دیا تھا۔“

مہاراج نے کہا۔

”پھر کچھ جمع کر لیا ہوگا عدالت اور وکیلوں پر خرچ کر لے گا تو چین سے بیٹھ جائے گا۔ مگر مہاراج اب کے کچھ ایسا کرو کہ اس کا ثنا ہی ختم ہو جائے۔“ بھگوت بولا۔

”ہو جاوے گا تو فکر نہ کر آنے دے نوٹس، تو اپنی تیاری کر، کرن کی شادی کے سب گواہوں اور کرن کو تیار رکھ عدالت تو اس کو بھی جانا ہوگا۔

رولوکا سمجھ گیا کہ منوہر نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ وہ فوراً مراری کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔

”تمہارے پاس ایسے گواہ ہیں جن کے سامنے شام کمار نے تم کو اپنا بیٹا مانا تھا۔“

”گواہ تو ہے مگر اس نے پہلے ہی گواہی نہیں دی تھی۔“

مراری نے کہا۔

”مجھے اس کے پاس لے چلو وہ گواہی دے گا۔“

رولوکا نے کہا۔

”تم کو پتا ہے کہ شکر نے ساری زمین اور حویلی مراری کے نام کی تھی اس کے کاغذات کس وکیل نے تیار کیے تھے اور رجسٹریشن کرائی تھی۔ اس کو بھی گواہوں میں شامل کروان کاغذات پر گواہوں کے دستخط بھی ہوں گے ان کے گھر میں مجھے لے چلو۔ تم فکر نہ کرو وہ سب گواہ دیں گے اگر ان میں سے کوئی مر گیا ہے تو بھی اس کا نام نہ

چڑھا دی۔ اپنے بھئی کو مروا دیا، بہن کو زہر دے دیا۔ تو کس کا ہے تو کسی کا نہیں ہے تو تیرا کون ہوگا۔،، مہاراج نے کہا۔
”مہاراج میں نے یہ سب تمہارے مشورے سے تو کیا تھا۔،، بھگوت نے کہا۔

”میں جو مشورہ کسی کو دیتا ہوں اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہوں مجھے تیری دونوں چھوڑیاں نظر آرہی تھیں میں تیرے ساتھ لگ گیا۔“

”اب تو تم ہی سہارا ہو۔ کچھ تو کرو۔ عدالت نے فیصلہ مراری کے حق میں دے دیا تو ہم سب کا کیا ہوگا۔ یہ تو سوچو۔“ بھگوت بولا۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر عدالت نے تیرے خلاف فیصلہ دے دیا تو بتا تو کہاں جائے گا۔“ مہاراج نے کہا۔

”میں جتنا میں ڈوب مروں گا مارے شرم کے۔“ بھگوت بولا۔

”تو اتنا شرم دار کب سے ہو گیا۔“ مہاراج بولے۔
”اس کے سوا میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“ بھگوت بولا۔

”تو مراری کے پیروں میں گڑ پڑنا۔ شاید وہ معاف کر دے۔“ مہاراج بولے۔

”میں تو سب کچھ کروں گا مہاراج تم اتنی شکتی کے مالک ہو بڑی بڑی تمہاری باتیں تمہیں اب کہاں گئی تمہاری شکتی۔ کچھ تو چسکا دکھاؤ۔ دیکھو کون کے دماغ ٹھماؤ، گواہوں کی آواز دباؤ۔ ارے ہمارا گواہ گونگا ہو گیا تم دیکھتے رہے کس کام کی تمہاری شکتی۔“ بھگوت جھنجھلا کر بولا۔

”تجھ جیسے بے وقوف دنیا میں بہت ہیں اور ہمارے لئے عیش کے سامان بھی بہت ہیں۔ رہی ہماری شکتی تو وہ اپنی جگہ ہے۔“ مہاراج نے کہا۔

”تو پھر اس کو وہیں پر دھری رہنے دو حرام کا مال تم نے میرا کھایا اور۔۔۔“ بھگوت رک گیا۔

”کہہ دے زبان پر آئی بات اندر مت لے جا۔“ مہاراج نے کہا۔

رہے گا۔،،
منوہر نے تاریخ پر گواہوں کو لانے کی تاکید کر دی تھی اور رول کو اس کام پر لگ گیا تھا۔

بھگوت کے سارے گواہ موجود تھے۔ اور تاریخ پر آنے کو راضی تھے بھگوت نے ان کے منہ روپوں سے بند کر دیے تھے۔

پہلے بھگوت کے گواہوں کے بیانات ہوتا تھے دس بجے عدالت کی کارروائی شروع ہوگئی مگر عین وقت پر پہلے گواہ کے گلے میں خراش پڑ گئی اور چند منٹ میں ہی اس کی آواز بند ہوگئی۔ اور وہ گواہی نہ دے سکا۔

اس کے بعد اس پنڈت نے بیان دیا جس نے کرن اور شکر کے پھیرے کرائے تھے۔ بظاہر بھگوت کا کیس پھر مضبوط نظر آتا تھا مگر اب مراری کے گواہوں کی باری تھی۔ منوہر نے اس وکیل کو بھی پیش کر دیا جس نے تمام کاغذات تیار کیے تھے ساری زمینداری مراری کو دے دی تھی اس پر منوہر کے بھی دستخط تھے۔ اس کے بعد پیشی پڑ گئی باقی گواہ اگلی پیشی پر بیانات دیں گے۔

”ارے مہاراج یہ کیا ہو رہا ہے نیا ڈولتی نظر آرہی ہے۔ بھگوت نے کہا۔

”تو بڑا کمزور دل کا ہے ارے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا فکر ہی نہ کر۔،، مہاراج نے کہا۔

”مہاراج تم یہی کہتے ہو گے اور میں ڈوب جاؤں گا۔“ بھگوت بولا۔

”تیرے باپ کی یہ زمینداری بے جائے گی تو تیرا کیا جاوے گا۔ تو نے تو پندرہ سال عیش کرے اب اور کیا کرنے کا مفت کا زمیندار بنا بیٹھا رہا۔،، مہاراج نے ماتھے پر ہل ڈال کر کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو مہاراج میں نے تم پر بڑا مان کیا ہے۔ تم کو کتنی عزت دی اور تم۔۔۔!“

”بس کر بھگوت! مہاراج بات کاٹ کر بولے۔

”تو نے سب اپنے بھلے کو کیا تو نے کسی کی بھلائی نہیں کی تو دولت اور زمینداری کی خاطر اپنی اولاد کی ملی

”کچھ نہیں کروں گا غلامی کروں گا تمہاری۔“

بھگوت بولا۔

”اور تیرا گورو بھاگ گیا کہ ہے۔“ مراری نے

پوچھا۔

”مجھے پتہ نہیں وہ میرا گورو نہیں ہے۔ بھگوت بولا۔

”رولوکا ایک آدمی کے ساتھ اندر آ گیا اور بولا۔“

”یہی ہے نا بھگوت تیرا گورو۔“ بھگوت نے کہا۔ ”یہی ہے وہ

بد معاش اس نے ہی مجھے سب غلط راستے بتائے تھے۔“

بھگوت بولا۔

”اور تم اتنے سیدھے تھے کہ اس کے بتائے

راستوں پر چل پڑے۔ رولوکا نے کہا۔ دونوں خاموش

رہے تو رولوکا بولا۔

”میں جانتا ہوں تم دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہیں

آؤ گے۔ تم دونوں نے بہت بڑے گناہ کئے ہیں۔ انسانوں

کو مارا ہے۔ ان کو کوئی طور پر پریشان کیا ہے۔ تم کو سزا تو ملے

گی۔ تو بتاؤ اسے بڑے گناہوں کی کم سے کم سزا کیا ہو سکتی

ہے۔“ دونوں خاموش تھے۔

”تم دونوں سڑکوں پر بھیک مانگو گے۔ کیونکہ تم

دونوں اندھے ہو۔“ پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک تیز ہوا کا

ریلہ آیا اور دونوں زمین پر گر گئے اور تپنے لگے۔ دونوں کی

آنکھیں پانی بن کر بہنے لگی تھیں۔

”مرادی تم کو مبارک ہو۔۔۔ تم ایک کام یہ ضرور کرنا

کہ دلاری اور کرن کی شادی کسی سے کرو۔ اور مجھے اب

اجازت دو۔۔۔“

انسان ہر کام اپنی مرضی سے نہیں کرتا، وہ جو کچھ کرنا

چاہتا ہے نہیں کر پاتا اور حالات اس کو کسی ایسے کام پر

لگا دیتے ہیں کہ وہ ان سے بچا بھی چاہے تو نہیں بچ پاتا۔ ہر

انسان کے دل میں دولت اور شہرت کی آرزو ہوتی ہے، ہر

آدمی اپنی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی نظر صرف اپنی طرف

ہوتی ہے اور جب وہ صاحب اولاد ہو جاتا ہے تو وہ اپنی

نام تمام آرزوؤں اور خواہشات کو اولاد کے ذریعہ پوری کرنے

کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات عجیب و غریب طریقوں پر

”میں نہیں کہہ سکتا۔ میں نے تم کو سمجھا نہیں۔ یہ

میری غلطی ہے۔“ بھگوت بولا۔

”دولت کی خاطر کیا کیا کھیل ڈھائے پر۔۔۔“

مہاراج بولے۔

”تو نے بھی تو عورت کی خاطر اور دولت کی خاطر

میرا ساتھ دیا۔ یہ بھی تو کہہ۔“ بھگوت بولا۔

”میرا تو یہ کام ہی ہے میرے پاس کیا ہے

ذرا سی شہیدے بازی ہے۔ مگر تیرے جیسے مجھے ملتے

رہتے ہیں اور زندگی بیش سے گزر رہی ہے۔“ مہاراج

بولے۔

”تو تیرے پاس شہیدے نہیں ہے۔“ بھگوت بولا۔

”تھے تھے میسوں کو بچنے وقف بنانے کی شہادت ہے۔“

مہاراج بولا۔

”تیرا انجام بھی اچھا نہیں ہوگا۔“ بھگوت بولا۔

دوسری پیشی پر بھگوت کی ساری توجہ کھل گئی۔ جس

زمین پر وہ زمینداری کرتا تھا اس کھرنے سے پہلے شکر مرادی

کے نام کر چکا تھا اور حویلی بھی مرادی کے نام تھی۔

عذالت کا فیصلہ آئے کے بعد منوہر نے بھگوت

کو کہا۔

”ماں تم نے پندرہ سال زمینداری کر لی۔ تمہارے

نصیب میں اتنی ہی لکھی تھی۔ اب عزت سے حویلی خالی کر دو

اور جتنا پار چلے جاؤ۔“

”تو بھی میرا دشمن ہو گیا۔ بھگوان برا وقت کسی پر نہ

ڈالے۔ اپنے پرانے جو جانتے ہیں۔ ارے تم میرے

بھانجے ہو اور تم بھی میرے دشمن ہو گئے۔“ بھگوت نے

اداکاری کی۔

مرادی بولا۔ ”اب بس کرو ماں بھائی نے جو کہا ہے اس

پر عمل کرو۔“

”ارے میں تم سب کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا، ایک

کونے میں چار ہوں گا۔“ بھگوت بے حیائی سے بولا۔

”اور اس کونے میں سازش کے جرائم پیدا کرتا

روں گا۔“ منوہر نے کہا۔

چل پڑا ہے۔

گھن اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ لڑکیاں بھی چھوٹی تھیں تو پھر رہ گئی بیوی۔ وہی بچاری قدیر خان کے ساتھ لگی رہتی اگر وہ قدیر خان کا ساتھ نہ دیتی تو قدیر خان ایک چھری تک نہ بنا پاتے۔ دونوں میاں بیوی کی برابر کی محنت تھی۔

نادیہ چودہ سال کی ہوئی تو وہ ماں کی مدد کرنے لگی، دونوں ماں بیٹی باری باری گھن چلاتی رہتیں اور قدیر خان اوزار بناتے رہتے۔

شام تک ان تینوں کو فرصت نہ ہوتی۔ قدیر خان شام کو کام بند کر دیتے اور اوزاروں پر جہاں جہاں پالش کی ضرورت ہوتی خود کرتے رہتے اور سب سامان ایک طرف کرتے اور بنا ہوا مال ایک پوری میں ڈال کر بیٹے کی دکان پر لے جاتے اور دے کر پیسے لیتے اور کچلے خریدتے ہوئے گھر آ جاتے۔ گھر آ کر نہاتے اور پھر جو بیوی پکاتی کھاتے اور پھر قریب کے قبرستان میں تو لے شاہ کے مزار پر چلے جاتے۔ تو لے شاہ کے مزار پر ہر روز تو الیاں ہوتی تھیں۔ پونے شہر کے قوال یہاں آتے تھے پورے میرٹھ والوں کو پتہ تھا مگر سوائے جمہرات کے، تو الیاں رات بارہ بجے ختم کر دی جاتی تھیں۔ تو لے شاہ کون تھے کہاں کے تھے کسی کو پتہ نہیں تھا۔ ان کا حراز کچا تھا، اس حراز کے چاروں طرف دو تین فٹ کی دیوار تھی، قبر پر ہرے رنگ کی چادر پڑی رہتی تھی اور اس چادر پر پھول پڑے ہوتے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا اور اس درخت کا پورا سایہ مزار پر رہتا تھا۔

یہ مزار قبرستان کے ایک کنارے پر تھا رات بارہ بجے تک یہاں پر رونق رہتی تھی۔ دو چار دکانیں بھی لگ جاتی تھیں، رات میں صرف مردوں کو یہاں آنے کی اجازت تھی، کوئی عورت رات میں مزار کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ دن میں عورتیں آتی رہتی تھیں، مسلمان عورتوں کے علاوہ ہندو عورتیں بھی عقیدت سے آتی تھیں۔ مگر سب مزار کی چار دیواری کے باہر ہی رہتی تھیں۔ اس مزار کی دیکھ بھال گورکن کا خاندان کرتا تھا، یہ خاندان بھی بہت قدیم تھا۔

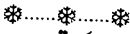
قدیر خان میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا مکان محلہ شکلا پٹی میں تھا۔ ان کا مکان کیا تھا باپ دادا کے زمانے کا مکان تھا۔ قدیر خان بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ان کے دادا کے دادا اس فوج میں شامل تھے جس نے 1857ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی اور ان کو دلی میں پھانسی دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور انگریزوں نے اس خاندان کو بہت نقصانات پہنچائے۔

قدیر خان کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بڑی لڑکی کا نام نادیہ اور اس سے چھوٹی کا نام فائزہ تھا۔ لڑکا دونوں سے چھوٹا تھا اس کا نام شبیر خان تھا۔ قدیر خان لوہار کا کام کرتے تھے، ان کے بگڑے حالات اور انگریز دشمنی نے ان کو کسی قابل نہیں چھوڑا تھا وہ گھر میں بی بیٹھی پردن بھر آگ کے سامنے جلتے رہتے اور شام تک جو کچھ بنا پاتے دکاندار کو دے آتے، اس کے بدلے ان کو جو کچھ ملتا وہ بھی پانچ جانوں کے لئے کافی ہوتا تھا، مگر کرتے تو کیا کرتے، دوسرا کوئی بہران کو آتا نہیں تھا۔ لڑکا چھوٹا تھا۔ لڑکیوں سے محنت مزدوری تو کروائیں سکتے تھے۔

دونوں لڑکیاں بارہ سال پار کر چکی تھیں اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکی تھیں۔ جوانی امیری غریبی نہیں دیکھتی جب آتی ہے تو نہ صرف جسمانی طور پر تبدیلیاں لاتی ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی انسان میں تبدیلی آ جاتی ہے، جوان ہوتے انسان کو بڑے سہانے خواب آنے لگتے ہیں، روکھی سوکھی کھا کر بھی وہ مست ہو کر سوتا ہے اور خوابوں کی دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ یہ عمر کے تقاضے ہوتے ہیں۔ نو جوانی کا دور بڑا حسین دور ہوتا ہے۔ امنگوں بھرا، ہر وقت ہنسنے کا دور، اس دور میں آئندہ زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسی بنیاد پر پوری زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

قدیر خان دن بھر سخت محنت کرتے تھے۔ بھی پر لوہا گرم کر کے سرخ کرنا اور پھر اس کو کسی اوزار کی شکل دینا آسان کام نہیں ہے، یہ کام وہ اکیلے تو نہیں کر سکتے تھے اگر گھن مارنے کو آدمی رکھیں تو اس کو مزدوری دینا پڑتی، لڑکا بھی

اندھیرے میں ضرور نظر آتی رہتی تھیں۔



نادیہ بھرپور جوان ہو گئی تھی۔ دن بھر گھن چلا کر اس کے بازو اور غدوخال بڑے نمایاں ہو گئے تھے، اس کا قد بھی ماں سے اونچا ہو گیا تھا۔ جوانی کے دلکش آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ گھن چلاتے وقت اس کا چہرہ سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ قدیر خان گھر کے اندر کام کرتے تھے اگر کسی دکان یا کھلی جگہ کام کرتے ہوتے تو شاید وہ کام نہ کر پاتے کیوں کہ نادیہ کو دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نادیہ کی ماں کو اندازہ تھا اس لئے وہ چھوٹی کو بھی باپ کے ساتھ گھن چلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔ مگر فائزہ بھی بہن کے نقش قدم پر جوانی کی سڑک پر بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی اور بہن سے صرف چند قدم ہی دور تھی۔ ان دونوں کے مقابلے میں لڑکا دن بدن سکرتا ہی جا رہا تھا۔

گھن تو دونوں میں سے کسی کو چلا نا ہی تھا۔ دونوں اس کام سے خوش نہ تھیں۔ غربت ہو تو پھر کوئی قریب نہیں آتا۔ اپنے، پرانے ہو جاتے ہیں، غربت سب عزیزوں کو دور بھگا دیتی ہے۔

قدیر خان کے عزیز تو ہوں گے مگر نہ کسی نے ان سے ملنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی کے پاس جانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ اور ان کے بچے اکیلے تھے سب کچھ خود کرنا تھا۔

قدیر خان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ محنت کرنے پر بھی وہ پیٹ بھر روٹی اپنے خاندان کو نہیں کھلا سکتے تھے۔ بیوی بھی مختن تھی ان کے ساتھ برابر محنت کرتی تھی۔ لڑکیاں بھی کرتی تھیں مگر لڑکیوں کا اس طرح کام کرنا قدیر کو ذرا اچھا نہیں لگتا تھا مگر مجبوری تھی گھن کے بغیر لوہا سیدھا نہیں ہوتا اس پر چوٹ ضروری ہے۔ نادیہ اور فائزہ کی گھن کی چوٹ سے سرخ لوہا دب جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ قدیر خان کے دل پر ایک نشان بھی چھوڑ جاتا تھا۔

جمعرات کو مزار پر ذرا زیادہ بارش ہوا کرتا تھا۔ قوال بھی زیادہ آ جاتے تھے کیونکہ اس دن پروگرام لمبا ہوتا تھا۔ جلو

جلو بھائی بہت بوڑھے ہو گئے تھے، وہی مزار کے بنادر تھے، سارے چڑھاوے وہی وصول کرتے تھے۔ دن بھر میں ایک دو روپے کے چڑھاوے تو آ ہی جاتے تھے۔ جلو بھائی گورکن کا کام نہیں کرتے تھے ان کے لڑکے اور پوتے کرتے تھے ان کا مکان قبرستان کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ان کے بچے قبروں پر کھیل کر جوان ہوئے اور پھر قبریں کھودنے لگے۔ لوگ قبرستان سے ڈرتے ہیں مگر جلو کے بچے قبرستان میں آکھ بچوئی کھیلتے تھے اور راتوں کو قبروں کے اندر چھپ جاتے تھے۔ قبرستان ان کے گھر جیسا تھا۔

جلو بھائی تو لے شاہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کے دادا کے زمانے میں تو لے شاہ زندہ تھے، کہاں کے تھے کسی کو پتہ نہیں، وہ میرٹھ میں اس قبرستان میں نیم کے بیڑ کے نیچے پڑ گئے۔ لوگ ان کے پاس آتے، وہ ان کے لئے دعا کرتے، جہاں پر ان کا مزار ہے اسی جگہ سوتے تھے، وہ کسی کا دیا نہیں کھاتے تھے، کیا کھاتے تھے کسی کو پتہ نہ تھا اور رفع حاجت کب کرتے، کوئی نہیں جانتا، انہوں نے ایک لال اینٹوں کا چوڑا بنا لیا تھا اس پر وہ نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا اور اسی قبرستان میں پردہ کر لیا اور میرے دادا کو یہ جگہ بتادی کہ یہاں پر میری مچکی قبر بنادی جائے۔ جلو کی بات کتنی درست تھی کتنی جھوٹ کیا پتہ۔

قدیر خان اور ان جیسے بہت سوں کی تفریح یہاں ہو جایا کرتی تھی۔ دن بھر سخت محنت کرنے والے لوگ اس مزار پر آ جاتے تھے۔ عشاء کے بعد محفل شروع ہو جاتی تھی۔ قوال کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں لوگ بیٹھ جاتے تھے ان کے بیٹھنے کا انتظام جلو اور اس کے بچے کرتے تھے، انہوں نے پانی چمڑک چمڑک کر محفل سماع والے مقام کو پختہ کر دیا تھا لوگ اس پر بڑے آرام سے بیٹھ جاتے تھے اور رات بارہ بجے اپنے اپنے گھر دوں کو لوٹ جاتے تھے، جلو بھائی بھی گھر آ جاتے تھے اور قبرستان پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ بیاں بند کر دی جاتی تھیں اور مزار پر جلتی اگر بقیات رات کے

ہیں۔“ قدر نے پوچھا۔

”سب پتہ چل جاتا ہے تو مت پوچھ ہم کسی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو کچھ ذرا بچ بھی رکھتے ہیں، تو آہم کھا بیڑوں کی گھنٹی مت کر۔“ فقیر بولا۔

وہ فقیر کو لے کر گھر آ گیا اور نادیر کو فقیر کے سامنے کر دیا۔ فقیر نے سر سے پیر تک اس کو دیکھا اور بولا۔

”تو لے شاہ کی سواری تھ پر آنے والی ہے۔ تجھے جو کرنا ہے میں تجھے بتانے دیتا ہوں، تیری ماں پورے محلے میں بتائے گی اور میں پورے میرٹھ کو بتاؤں گا، تیرے پاس عورت مرد آئیں گے، تو ان کی بات سننے کی اور بھاری آواز میں بات کرے گی۔“

تین دن تک وہ فقیر قدر خان کے ساتھ آتا رہا اور نادیر جو بھٹی کی گرمی اور گھن چلانے کی محنت سے بیزار تھی اس آسان کام پر راضی ہو گئی۔ تو لے شاہ تو پہلے ہی مشہور تھے۔ اب ان کی سواری نادیر پر آنے لگی اور وہ لوگوں کو ان کی مشکلات کے حل بتانے لگی۔ شروع شروع میں کم لوگ آئے مگر پھر آہستہ آہستہ تعداد بڑھتی گئی اور تو لے شاہ کا آستانہ آباد ہوتا گیا۔ فقیر نے پورے میرٹھ میں نادیر کو مشہور کر دیا ہر روز تو لے شاہ کے مزار پر لوگ نادیر کا ذکر کرنے لگے اور آستانے پر آنے لگے۔..... جلو بھائی کی آمدنی میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔

آستانہ کی آمدنی پوری قدر خان کی نہیں تھی، فقیر کا حصہ الگ کیا جاتا تھا۔ قدر خان کی جان بھٹی اور لوہے سے چھوٹ گئی۔ گھر میں پہلے روز وال چٹنی ہوتی تھی۔ اب گوشت پکھنے لگا۔ قدر خان آستانے پر لوگوں کی خاطر پس کرتے نظر آتے، بوی عورتوں کو ایک بعد ایک تو لے شاہ کے درو رو پیش کرتی رہتی۔ قدر خان کے حالات بہتر ہونے لگے۔

چہرے پر کچھ تازگی نظر آنے لگی۔ بوی کے کپڑے بھی صاف نظر آنے لگے اور گھر میں بھی بہتری ہونے لگی۔ فائزہ بھی بہن کے ساتھ لگی رہتی اور بہن کے طور طریقے دیکھتی رہتی۔ نادیر پہلے ذرائع اور گھبراہٹ کی لگتی تھی مگر پھر

بھائی کا کام بھی زیادہ ہوتا تھا اور چڑھاوے بھی زیادہ ہوتے تھے۔ محلے کے علاوہ دور دور سے بھی لوگ آ جاتے تھے۔ کچھ پیر فقیر بھی مزار کے ارد گرد نظر آ جاتے تھے۔ ایک دو دکانیں بھی اور لگ جاتی تھیں۔ بیڑی سگریٹ پان کے خوانچے بتائے رہوڑی کے ٹھیلے بھی آ جاتے تھے ہار پھول بیچنے والے بھی آوازیں لگانے لگتے تھے۔

عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ قدر خان قبرستان کے ساتھ گھر کی مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے۔

”کب تک جلتے گا.....“ ان کے کانوں میں یہ آواز قریب سے آئی۔

قدر نے آواز کی سمت نظر میں اٹھا کر دیکھا تو ایک فقیر کھڑا تھا۔ قدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو فقیر کی تیز آواز پھر آئی۔ ”کب تک جلتے گا۔“

اب قدر خان کو جواب دینا پڑ گیا بولے۔ ”کب تک میرے نصیب میں جلنا ہے میں خود سے تو نہیں جلتا میرے حالات جارہے ہیں۔“

”تیرے برے دن زیادہ نہیں مگر تجھے عقل سے کام لینا ہے۔“ فقیر بولا۔

”میری عقل بھٹی کے سامنے کام کرنے سے جل گئی ہے تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔“ قدر نے کہا۔

”تیرے گھر تو لے شاہ آنے والے ہیں۔“ فقیر نے کہا۔

”تو لے شاہ اور میرے گھر کیوں آئیں گے؟“ قدر نے تعجب سے پوچھا۔

”ارے بے وقوف! ان کو تم پر رحم آ گیا ہے۔ ان کی سواری تیری ہستی پر آئے گی مگر پہلے تو مجھے اپنی بیٹی سے بات کرو تاکہ میں کچھ سکون کیونکہ کچھ پابندیاں لڑکی پر ہوں گی۔ اگر وہ پابندی برداشت کر سکتی ہے تو تو لے شاہ اس پر مہربان ہو جائیں گے اور تیری مشکلات کے دن ختم ہو جائیں گے، تیری عورت اور لڑکیاں گھن چلانے سے بچ جائیں گی۔“ فقیر نے کہا۔

”آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ میری لڑکیاں گھن چلاتی

اس میں چٹنگی آتی گئی اور وہ مکمل تو لے شاہ بن گئی۔

جو لوگ تو لے شاہ کے مزار کو جانتے تھے وہ تو لے شاہ سے ملاقات کو، نادیر کے پاس آنے لگے اور قدیر خان کی آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔
آستانے کا ماحول فقیر نے ایسا بنادیا تھا کہ ہر آنے والا متاثر ہوتا تھا۔

نادیر کا چہرہ چھپا رہتا تھا وہ کسی مرد عورت کے سامنے نہیں آتی تھی اس کی آواز ہی ان تک آتی تھی۔ کمرے میں اتنی روشنی ہوتی تھی کہ اندھیرا نہ لگے۔ نادیر جس جگہ ہوتی تھی اس کے پیچھے دیوار پر کالے کپڑے کا پردہ پڑا رہتا تھا اور روشنی پورے کمرے کے مقابلے میں قدرے کم تھی اس لئے کسی نے نادیر کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

کسی کی مراد پوری نہ ہوتی تو وہ بھی شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لاتا تھا اور جس کی پوری ہوتی وہ لوگوں سے تو لے شاہ کی تعریف کرتا۔
جس دن سے آستانہ پر تو لے شاہ کی آمد شروع ہوئی تھی کبھی تاخیر نہیں ہوا۔ بارش ہو طوفان آئے آستانہ ہر روز وقت پر کھلتا تھا۔

فائزہ بھی پوری طرح کاروبار کو سمجھ چکی تھی۔ ڈول ڈول میں وہ نادیر کی طرح ہی تھی۔
کسی نے نادیر کا چہرہ روشنی میں نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھار بڑی آسانی سے وہ نادیر کی گدی پر بیٹھ کر تو لے شاہ کا پارٹ ادا کر دیا کرتی تھی۔

گھر کے حالات اب بہت بہتر تھے۔ گھر کو مرمت بھی کرا لیا گیا تھا۔ چونا سفیدی جو ایک زمانے سے نہیں ہوا تھا وہ بھی کرا لیا گیا تھا۔ اب قدیر خان کے چہرے پر بھی رونق نظر آنے لگی تھی کچھ اور قریب کے رشتہ دار بھی پیدا ہو گئے تھے۔

قدیر خان اور بیوی دونوں خوش تھے۔ خوش حالی انسان کی شکلیں بدل دیتی ہے۔

فقیر نے اپنا جولا بدل لیا تھا۔ سارا پالان اور طریقہ کار تو دین محمد کا ہی تھا۔ فقیر کا نام دین محمد تھا۔ آدمی آمدنی قدر

خان اس کو رہے تھے۔

دینو بڑا ہوشیار تھا ہر چیز پر نظر رکھتا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی نظر دونوں لڑکیوں پر بھی تھی۔ مگر قدیر خان بے خبر تھے وہ تو روز نوٹ لگتی کرتے تھے اور بیوی کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ ان کے دل میں دونوں کی شادی کا خیال بھی نہیں آ رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں بھرپور جوان تھیں ان کی شادی ہو جانی چاہئے تھی مگر ماں باپ نوٹ کن رہے تھے۔

دینو نے ایک دن قدیر خان سے پوچھا۔
”اب بولو کیا چاہتے ہو میں نے تمہاری جان بھٹی سے چھڑادی۔“
”ہاں تم نے میرے ساتھ نیکی ہے۔“ قدیر خان بولے۔

”تو پھر تم بھی ایک نیک کام کرو کیونکہ نیکی کو آگے بڑھانا چاہئے۔“ دین محمد بولا۔

”میں کیا کروں تم بتاؤ۔“ قدیر نے کہا۔
”نادیر کی شادی کر دو۔“ دین محمد نے کہا۔
”شادی کر دوں تو آستانہ بند ہو جائے گا۔“ قدیر نے کہا۔

”آستانہ فائزہ چلائے گی۔ بند نہیں ہوگا۔“ دین محمد نے کہا۔
”ٹھیک ہے ایسا لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔“ قدیر نے کہا۔
”تلاش کی ضرورت نہیں ہے میں حاضر ہوں۔“

دین محمد بولا۔

”تم عمر میں بہت بڑے ہو۔“ قدیر نے کہا۔
”مگر میں نے اب تک مجرد زندگی گزاری ہے کوچہ کوچہ پھرتا رہا ہوں اب ذرا سکون ملا ہے۔ میں اپنی گزشتہ بنانا چاہتا ہوں۔“ دین محمد بولا۔

”ٹھیک ہے تم اصرار کرتے ہو تو میں تم کو منع نہیں کر سکتا کیونکہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔“

”کہو بنگا کج کر دو گے۔“ قدیر نے پوچھا۔
”مجھ کو تیاری کر لو۔ میں نکاح کر دوں گا۔“ دین

محمد بولا۔

اور فقیر دین محمد کا نکاح نادیدہ سے ہو گیا اور نادیدہ دین محمد کے ساتھ چلی گئی۔ مگر یہ بات صرف گھر کے افراد کو ہی پتہ تھی۔ آستانہ آباد تھا فائزہ اسی طرح آستانے پر موجود تھی اور آمدنی برابر ہو رہی تھی۔

انسان اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں رہتا ہے وہی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ قدیر نے جو ماحول دیکھا تھا وہی اس کی پسند بن گیا تھا۔ غلطی کے چکر میں وہ نہیں تھا۔ بہت سے پیشوں کی طرح پیسہ کمانے کا یہ بھی ایک پیشہ تھا۔

دین محمد میرٹھ سے چل کر علی گڑھ آ گیا۔ اور ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ نادیدہ نے ایک دن دینو سے کہا۔

”گھر میں دن بھر کیا کرتے رہتے ہو، کچھ کام دھندہ کرو، آخر ہماری پوچھی کتنے دن اور چلی گی۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ دینو نے جواب دیا۔
”ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا اب اور کتنا سوچ بچار کرو گے۔“ نادیدہ نے پوچھا۔

”سوچ رہا ہوں تم نے بھی کسے سامنے گھن چلایا کرو وقت کی روٹی نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے کسی اور کی زمین پر تیز دھوپ میں ہل چلایا مگر پیٹ نہ بھر سکا ہر طریقہ اختیار کیا مگر کچھ نہ ہوا میرے حالات نہ بدلے، یہی حال تمہارے باپ کا ہوا، پھر میں گوالیار سے نکل گیا اور شہرؤں شہروں پھرنے لگا اور میرا روپ خود بخود ایک فقیر کا ہو گیا۔ وقت کے تیز دھکوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ دنیا میں زندہ رہنے کو جو دوسرے کر رہے ہیں وہی کرنا ضروری ہے۔ جو نہیں کرتا وہ میری طرح رہتا ہے، محنت کرتا مگر اس کی محنت اس کا پیٹ نہیں بھرتی، اس کا فائدہ کوئی اور اٹھاتا ہے۔ میں کسی کی زمین پر محنت کرتا تھا مگر اس کا پھل اس کو ملتا تھا مجھے تو میرے اٹھائے پھل بھی نہیں ملتے تھے۔

تو اور تیرا باپ آگ کی بھیٹی کے سامنے دن بھر

چلتے تھے تو لڑکی ہو کر گھن چلائی تھی۔ اگر دو چار سال اور گھن چلا لیتی تو کونکہ ہو جاتی اور کونکہ ایک نہ ایک دن راکھ ہو جاتا ہے اور راکھ زمین کی مٹی میں مل جاتی ہے۔ میرٹھ میں، میں نے تجھے دیکھا تیرے باپ کو دیکھا اور میں تیرے باپ کا پیچھا کرتے کرتے تو لے شائے کے مزار تک چلا گیا اور پھر میں نے اپنے بہروپ سے فائدہ اٹھایا۔ میرے استاد نے کبھی سبق پڑھا یا تھا کہ جو حالات ہوں اس کے مطابق کام کرو، یہ دیکر خود فریب کی دنیا ہے۔ جو جتنا بڑا بے ایمان بے انتہائی بڑا آدمی ہے۔ جھوٹ اتنی شدت سے بولو کہ وہ سچ بن جائے یہ دنیا جھوٹ اور فریب کی دنیا ہے کون ہے جو سچائی سے کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، وکیل سب نے جھوٹ کا سہارا لیا ہوا ہے، سرکاری ادارے رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ غریب انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے اس دنیا کے اسکول میں جو پڑھا ہے وہی کروں گا تو میں نے درویشی بھی کی اور عیاری بھی کی۔ دوستی بھی کی اور دغا بازی سے بھی باز نہیں آیا اور میرے ذہن میں ایک طریقہ آیا اور میں نے تیرے باپ کی مدد سے اس پر عمل کر ڈالا اور کامیاب ہو گیا قدیر خان کے حالات میں بھی سدا ہار آ گیا اور میری جیب میں بھی کچھ آ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ تو میرے حصے میں آ گئی۔“

”میں تیرا مطلب سمجھ رہی ہوں دینو مگر ایک شے ہوتی ہے ایمان، انسان کتنا ہی گیا گزرا ہو مگر اس کو چاہئے کہ اپنے ایمان کو داغ داند نہ کرے، کسی مجبور کی آہ نہ لے، کسی مجبور کی مجبوری کا فائدہ نہ اٹھائے، دینو میں نے گھن چلایا، محنت کی مگر میرے دل میں کبھی کسی اور طرح پیسہ کمانے کا دھیان نہیں آیا، مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں آستانے پر بیٹھ کر مکر و فریب کی دکان کھول رہی ہوں۔ اگر مجھے پتہ ہو بھی جاتا تو بھی میں شاید انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی میں تم کو مورد الزام نہیں سمجھتی میرے حالات ہی ایسے تھے میرے خاندان پر انگریزوں نے بڑے ظلم کیے تھے ان کو اقتصادی طور پر اس قدر ماز دیا

تھا کہ وہ بھیک تک کو آ پہنچے تھے۔ میرے باپ نے تیرا کہا مان لیا، ڈوبے کو بٹکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ مگر وہ تنکا کشتی بن گیا، تیرا بھی فائدہ ہوا اور میرے باپ کے بھی حالات بدلے۔ مگر میرا ضمیر مجھے روکتا ہے اب تم مجھے اس طرف مت لے جاؤ۔“ نادینے کہا۔

”تو نے اب تک اس ضمیر کو کالا ہوا ہے۔ یہی ہے ساری خرابیوں کی جڑ۔ کچھ نہیں کرنے دیتا یہ، اس کی طرف دھیان مت دے بھوکا مار دے گا۔ بھیک منگوائے گا۔ یہ اس دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے کسی مشورے پر عمل مت کرنا۔ میں نے بہت پرکھا ہے اس کو کچھ نہیں ملا۔ میں گرتا ہی گیا اور اگر کچھ روز اور اس کی بات سنتا تو مر گیا ہوتا۔“

”تم اتنی آسانی سے نہیں مردے دینو، ہماری دو جان ہیں گزارہ کر لیں گے۔“ نادینے کہا۔

”میری نظریں کل پر ہیں تم آج کی بات کرتی ہو۔ کیا ہم دو ہی رہیں گے۔ ہماری اولاد نہیں ہوگی۔ آج کسی طرح گزارہ کر لو گی کل کیا ہوگا اس سے بہتر یہ نہیں کہ آج کل کے لئے انتظام کر لیا جائے۔ میں نے دنیا کے بازار میں جو سیکھا ہے اس کا فائدہ میری آنے والی نسل کو ہو۔“ دینو نے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو بتاؤ۔“ نادینے کہا۔

”وہ تو میں بتا دوں گا، تم یہ بتاؤ تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے۔“ دینو نے پوچھا۔

”اتنا ہے کہ تم کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکتے ہو۔“ نادینہ بولی۔

”ٹھیک ہے پہلے ایک مکان خریدتے ہیں پھر کاروبار کریں گے۔“ دینو نے کہا۔

”مکان خریدنے کے بعد کیا بچے گا کہ کاروبار کر سکو گے۔“ نادینہ بولی۔

”تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔“

اور دینو نے خواجہ روڈ پر ایک بڑا سا مکان خرید لیا۔ مکان ادھورا بنا ہوا تھا۔ اس لئے کم دام میں مل گیا۔ دینو نے اس کو اپنے قابل بنالیا اور عین روڈ کے کنارے ایک بڑا سا کمرہ بنالیا اور اس کو اپنے مطلب کا سجایا اور اس پر

ایک بورڈ لکھوایا۔ ”آستانہ تولے شاہ میرٹھ والے“ اور ایک بار پھر نادینہ پر تولے شاہ کی سواری آنے لگی۔ دینو تو ان کاموں کا ماہر تھا۔ اس نے کچھ عورتیں رکھ لیں اور وہ گھر گھر تولے شاہ کی تعریفیں کرنے لگیں اور عورتیں آستانہ پر آنے لگیں۔ مگر یہاں پر دینو نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا دن دس بجے سے ایک بجے تک اس کے بعد تولے شاہ نہیں ملتے تھے۔ آہستہ آہستہ آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ دینو نے ایک بیٹی کرے میں رکھ دی تھی، کسی سے کچھ مانگا نہیں جاتا تھا اپنی مرضی سے نذر نیاز کو اس بیٹی میں عورتیں مرد ڈال دیا کرتے تھے۔ آنے والوں کی شربت، چائے سے مہمان نوازی کی جاتی تھی ایک دو ملازم عورتیں بھی تھیں۔

میرٹھ کے آستانہ پر جو نہ تھا وہ دینو نے یہاں پر کیا تھا۔ آستانہ کی شہرت بڑھ رہی تھی۔ تولے شاہ مشہور ہو رہے تھے۔ نادینہ کا انداز وہی میرٹھ والا تھا۔ اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے انداز میں بھی مہارت آگئی تھی۔ آمدنی خوب ہو رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں نئے مہمان کی آمد بھی تھی۔ دینو بہت خوش تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ آستانہ ولادت کے بعد چالیس دن بند رہے گا۔

آستانہ تولے شاہ پورے علی گڑھ میں مشہور ہو گیا تھا۔ عورتوں کے علاوہ مرد بھی آنے لگے تھے۔ خواجہ اور بلند شہر سے بھی عورتیں آ رہی تھیں۔ نادینہ کے دن قریب آگئے اور پھر آستانہ بند ہو گیا۔ نادینہ کے ہاں ایک لڑکے کی ولادت ہو گئی۔ دین جھ کو مبارک بادیں آنے لگیں۔

چالیس دن کے بعد دوبارہ آستانہ کھل گیا اور کھلتے ہی ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ گئی اور صندوق میں نوٹ بھرنے لگے۔

اس طرح تین دفعہ آستانہ بند ہوا اور نادینہ دولڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں بن گئی۔ اور وقت کا پھیپہ سات سال آگے بڑھ گیا۔ دینو میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ نماز روزے کا پابند ہو گیا۔ مگر اس کا کاروبار وہی رہا۔ اس نے لوگوں کو

ان کا کاروبار چلتا تھا۔ ان کے پاس کوئی بڑی دویا نہیں تھی۔ اس کی ضرورت ان کو اس لئے نہیں پڑی تھی کہ مندر ان کے پرکھوں نے بنایا تھا ذات کے برہمن تھے اور اپنے اصولوں پر سختی سے کار بند تھے۔ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے اور نہ کسی کی دخل اندازی ان کو پسند تھی۔

ان کا کنبہ بڑا تھا۔ لڑکے نئی روشنی کی پیداوار تھے۔ مندر کی طرف آتے بھی نہیں تھے۔ مگر اخراجات ان کے بہت تھے اور وہ اخراجات ماں سے وصول کرتے تھے۔ مندر کی آمدنی اور پنڈت کی جھاڑ پھونک کی کل آمدنی بھی اب کم ہو رہی تھی۔ بیوی سے روز روز نوک جھونک ہوتی تھی۔ بیوی کہتی۔

”میں کہوں تم کچھ اور کرو اب مندر میں کیا رکھا ہے۔“
”اری بھانگوان کسی بات کرے ہے کیا ناستک ہو گئی ہے۔“ پنڈت کہتا۔

”ارے تو اور کیا کہوں..... اب تو خرچ تک پورا نہیں ہو رہا۔“ بیوی کہتی۔

”اب اتنی بھی کم آمدنی نہیں کہ گھر نہ چلے۔ مگر تیری اولاد کے خرچ بڑھ گئے ہیں۔ پرکھوں کے کام بھول رہے ہیں کم ذاتوں کے ساتھ بھرت ہیں۔ ارے میری گلدی کیا خاک سنھالیں گے میرے بعد مندر بند ہو جاوے گا۔ پرکھوں کی آتما اور میری آتما دکھی ہوگی کہ نہیں۔“ پنڈت جل کر کہتا۔

”میری سمجھ میں تو ایک بات آئی ہے۔“ بیوی بولی۔
”جو سمجھ میں آئے کبھی رہ.....“ پنڈت کیدار ناتھ نے جواب دیا۔

”مندر میں تو صرف ہندو عورتیں مرد تمہارے پاس پرارتھا کرانے آتے ہوں گے۔“ بیوی بولی۔

”اری عقل مند اور کن آوے گا مسلمان تو آنے سے رہا۔“ پنڈت بولا۔

”تو پھر یہ بتاؤ ہندو کیوں مسلمان کے پاس جاوے ہے پرارتھا کر۔“ بیوی بولی۔

پنڈت یہ سن کر دھک سے رہ گیا۔ یہ صدمہ اس کے

متاثر کرنے کو اپنا بہرہ پ بدل لیا وہ بڑا ہوشیار تھا اس کا دماغ مکر و فریب کے کاموں میں خوب چلتا تھا۔ اس نے آستانے پر عرس کروانے کا سلسلہ شروع کر دیا اور بڑے دھوم دھام سے تو لے شاہ میرٹھ والے کا عرس وہ کرتا اور سارے دن راہ گیروں کو لنگر کھلاتا تو لے شاہ میرٹھ سے زیادہ یہاں پر مشہور ہو گئے۔

دینو کا مکان بن گیا۔ ایک بہت بڑی بیٹھک بنا کر یہاں پر آستانہ بنادیا گیا۔ آنے والوں کے لئے آرام کا کمرہ الگ بنادیا گیا۔ دوسرے شہروں سے آنے والوں کا بھی الگ کمرہ بنادیا۔ دینو نے ایک ماہر کی طرح ہر کام کیا۔

نادیہ نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اب یہ کام نہ کرے مگر دین محمد نہ مانا۔ ایک دن نادیہ نے کہا۔ ”اب تمہارے پاس اتنی دولت ہے کہ تم کوئی بھی کاروبار کر سکتے ہو۔“

”کاروباری تو کر رہا ہوں۔“ دینو نے جواب دیا۔
”دینو! یہ کاروبار نہیں ہے ریا کاری ہے فریب کاری ہے۔“ نادیہ بولی۔

”دنیا میں اور کیا ہے تم یہ بتاؤ۔ سب یہی کر رہے ہیں۔ کون سچائی سے اپنا پیشہ کر رہا ہے۔ آدمی وہی کام تو کرے گا جس کا وہ ماہر ہوگا۔ میں بھی وہی کر رہا ہوں۔“ دینو نے کہا۔ ہر بار دینو نے نادیہ کو قائل کر لیا اور وہ آستانہ آباد کرنے پر مجبور ہو گئی۔

پنڈت کیدار ناتھ علی گڑھ کے پرانے رہائشی تھے اور چونا منڈی میں ان کے بزرگوں کا بنایا ہوا بھوانی دیوی کا بہت بڑا مندر تھا۔ پیڑی در پیڑی ان کے خاندان میں سے اس مندر کے پجاری ہوتے آئے تھے۔ اس مندر کی آمدنی اتنی تھی کہ ان کے پورے خاندان کا گزارہ بڑی آسانی سے ہو جایا کرتا تھا۔ ہندو عورتیں دیوی کے درشن کے علاوہ اپنے مسائل پجاری کے در پر بھی بیان کرتی تھیں پجاری ان کی مشکلات سن کر جھاڑ پھونک کر دیا کرتا تھا اس کے بدلے اس کو دان دکھنا مل جاتی تھی۔

کیدار ناتھ جی بھوانی کے بھگت تھے اس کے نام پر ہی

جاری ہے۔“ کیدار ناتھ بولا۔

”ضرور کوئی چسکار ہوگا۔“ کاشی ناتھ کے لب پہلے۔

”ارے پورا ڈھونگی ہے۔ تو لے شاہ کوئی نہیں ہے۔

مگر آدی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے ایسا ڈرامہ کیا ہے کہ پورے علی گڑھ میں گھر گھر مشہور ہو گیا ہے۔ مسلمان تو مسلمان ہندو عورتیں بھی اپنے کاموں کو آستانے پر جاری ہیں۔ تو لے شاہ کی سواری اس کی جو روپر آتی ہے اور وہ ہی عورتوں سے بات کرتی ہے۔“ کیدار ناتھ بولا۔

”اور اس کا مرد کیا کرتا ہے۔“ کاشی نے پوچھا۔

”وہ دیکھ بھال کرتا ہے آستانے کی، وہ تو سامنے آتا

ہی نہیں، سامنے اس کی عورت بھی نہیں آتی۔ سنا ہے جہاں وہ بیٹھتی ہے وہاں اندھیرا ہوتا ہے کسی کو وہ نظر نہیں آتی۔ کسی کے آنے پر پابندی نہیں ہے کوئی ذات ہو سب آوے ہیں اور کسی سے کچھ نہیں لیا جاتا ہے۔ اپنی خوشی سے صندوق میں ڈال دو چاہے نہ ڈالو۔“ کیدار ناتھ نے بتایا۔

”آدی ایک نمبر کا چنٹ لگتا ہے۔“ کاشی نے کہا۔

”تو زرا اس کے اندر باہر تو دیکھ کچھ ٹھنکی ہے کہ نہیں۔“

کیدار ناتھ نے کہا۔

”جیسا تو ہے خاندانی پنڈت ایسا ہی میں ہوں بھجن

کیرتن کر کے دان دکھشنا کمانے والا میں کیسے پتہ کروں گا۔“

کاشی نے جواب دیا۔

”ارے یار کسی کو پکڑ جو خرچ ہوگا اس کا جو کسم میں

اٹھالوں گا۔“ کیدار ناتھ نے کہا۔

”پتہ تو کرنا ہی ہوگا کیوں کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ

تو لے شاہ صرف نام ہے اور اگر صرف نام نہ ہو ادا بھی ہوا تو

پھر ہمارا کیا ہوگا مارے نہیں جائیں گے۔ باندی کوئی جانا

ہوگا۔ وہاں پر ایک آدی ہے مگر سنا ہے بڑا لالچی آدی ہے

پہلے لینے دینے کی بات کرتا ہے۔“ کاشی نے جواب دیا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں خرچ کروں گا پہلے کاروبار میں

لگانا پڑتا ہے۔“ کیدار ناتھ نے کہا۔

”اب تو پنڈت سے بنیابن گیا۔ کاروبار کرے گا۔“

کاشی ناتھ ہنس کر بولا۔

لئے بڑا تھا کہ اس کے گاہک مسلمان کے پاس جا رہے تھے اور وہ بھی اس مکار اور فریبی کے پاس۔ بیوی کے ذرا سے اشارے نے اس کی آنکھیں کھول دیں، پنڈت کی ودیا کم تھی وہ صرف خاندانی پنڈت تھا۔ مگر جتنی بھی ودیا اس کے پاس تھی اس سے اس کو پوری طرح اندازہ تھا کہ تو لے شاہ ایک فرضی کردار ہے اور دینو کے پاس کچھ نہیں ہے مگر آدی شاطر ہے اپنی چالاکی سے کمار ہے۔

پیشہ ورانہ رقابت پنڈت کے دل میں پیدا ہو گئی کیونکہ دونوں ایک ہی سطح کے تھے۔ دونوں کے کمانے کے انداز ایک تھے دونوں لوگوں کی کمزوریوں سے مالی فائدہ حاصل کرتے تھے۔ مگر اس کے لئے یہ بڑی دھک کی بات تھی کہ ہندو عورتیں بھی اس کے آستانے پر جا رہی تھیں۔

ان کو روکنا ہوگا پنڈت نے فیصلہ کیا مگر کس طرح ان کو روکا جائے کہ وہ آستانے پر جانے کے بجائے مندر میں آجائیں۔ بہت غور کیا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ اپنے ایک پرانے دوست کے پاس بلند شہر چلا گیا۔

”کیسے آگیا رے اپنی دکان بند کر کے۔“ پنڈت کاشی ناتھ نے سوال کیا۔

”تو بڑا بدھی مان ہے اس لئے آیا ہوں۔“ کیدار ناتھ

نے جواب دیا۔

”تم تو تو بھی نہیں پر بول کیا بات ہے۔“ کاشی ناتھ

نے پوچھا۔

”مندر کی آمدنی کم ہو رہی ہے، گزارہ کرنا بھاری پڑ

رہا ہے، اوپر سے اولاد نکلی ہے، مندر سے دور دور ہے ہیں

اور خرچ ان کے پورے ہیں۔“ کیدار ناتھ بولا۔

”کاشی گڑھ کے لوگ کہیں اور کسی مندر میں جانے

لگے ہیں۔“ کاشی ناتھ نے پوچھا۔

”پو جا پات کو جو آدی ہیں وہ تو پورے ہیں پر اصل

آمدنی تو جھاڑ پھونک کی ہے۔ وہ کم ہو رہی ہے۔“ کیدار

ناتھ نے جواب دیا۔

”تو کارن کیا ہے۔“ کاشی ناتھ نے پوچھا۔

”کارن ہے ایک آستانہ ارے ہندو عورت بھی وہاں

”ارے باپ رے، یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور سو روپے جو دینے تھے کیا سب خرچ ہو گئے۔“ کیدار نے پوچھا۔

”ارے وہ تو چور بن گئے ایک خرچ ہو تو بتاؤں اب تم بتاؤ کیا کروں منج کروں سوچ لو آستانہ کا معاملہ ہے بہت خاموشی سے کام کرتا ہے، علی گڑھ میں مسلمان زور پر ہیں۔ ذرا بھنگ لگ گئی تم آستانہ کے خلاف کچھ کر رہے ہو تو یاد رکھو تمہاری دیوی بھی تم کو نہیں بچائے گی معاملہ بڑا خراب ہو جائے گا۔“ کاشی رازداری سے بولا۔

”ان باتوں کا تو مجھے اندازہ ہے، پتی سے کچھ پکڑ لوں گا کچھ ادھار کر لوں گا اور پورا کروں گا۔ وہ کب آئے گا۔“ کیدار نے جواب دیا۔

”وہ تو کل ہی آ جاوے گا اور ہاں ذرا عزت سے بات کرنا، کم ذات تو ہے مگر شکست تو ہے اس کے پاس کچھ دیر کو مطلب نکالنے کو مونچھ نیچے کر لیں گے تو ہمارا کیا جائے گا۔“ کاشی ناتھ بولا۔

”نام کیا ہے اس کا؟“ کیدار ناتھ نے پوچھا۔

”اس کا نام جاگنی داس ہے بڑا ماہر ہے کالے کا، بہت بیریں قابو میں۔“ کاشی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے بات کچی، میں پورے پانچ سو دوں گا، وہ تو لے شاہ کا آستانہ بند کر دواوے بس۔“ کیدار ناتھ نے دووں ہتھیلیاں مل کر کہا۔

”تو فکری نہ کر بس سمجھ لے کہ تو لے شاہ واپس میرٹھ بھاگے۔“ کاشی ناتھ نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا یہ جاگنی داس کہاں رہے گا۔ علی گڑھ میں۔“

”ارے تیرے مندر میں تو رہنے سے رہا کر لے گا بندوبست اپنی ذات برادری میں تو اس کی فکر نہ کر، میں نے بات کر لی ہے، تیرا مندر کا نام تک نہیں آئے گا۔ دھرم کی عزت کا ہم سب کو خیال رکھنا ہوگا۔ دوسرے یہ کام مسلمانوں کے خلاف ہے ذرا بھنگ ان کو مل گئی تو تیرا علی گڑھ میں رہنا مشکل ہو جاوے گا مجھے ان سب باتوں کا احساس ہے، اس لئے میں پہلے ہی جاگنی داس سے بات

”اب اور کیا کریں گے ہمارے کام کوئی اور کرے گا ہم بھی تو کچھ کریں گے۔“ کیدار ناتھ نے جواب دیا۔

”تو پھر نکال سو روپے کل ہی باندی کوٹی جاتا ہوں۔“ کاشی ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔

”سو روپے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔“

”زیادہ ہیں تو نہ دے میرا دھندہ تو تجھ سے بھی گیا گزرا ہے میں تو خرچ کر نہیں سکتا۔“ کاشی ناتھ نے کہا۔

”ارے یار تو ناراض نہ ہو۔“ اور دھوتی کے بل میں سے سو روپے پکڑے دیئے اور بولا۔

”ذرا دھیان سے خرچ کرنا..... پتی سے بچا کر جوڑے ہیں۔“

”اور بھی جوڑنا تیرے کام آئیں گے۔“ کاشی نے ہنس کر جواب دیا۔

”اچھا تو تم خود علی گڑھ آ کر خوش خبری دو گے۔“ کیدار ناتھ نے پوچھا۔

”ہاں میں آؤں گا۔ ضرورت پڑی تو دونوں آویں گے۔“ کاشی ناتھ بولا۔

اور کیدار ناتھ علی گڑھ واپس آ گیا۔

پندرہ دن کے بعد کاشی ناتھ علی گڑھ آ گیا اور بولا۔

”ارے بڑا اڑیل آدمی ہے یہی۔“

”کیا منج کر دیا؟“ کیدار ناتھ نے ڈر کر پوچھا۔

”منع تو نہیں کیا، پر وہ کم ذات آدمی ہے۔ خرچے تو کرے گا۔“ کاشی نے جواب دیا۔

”کہتا کیا ہے کچھ بتاؤ تو؟“ کیدار ناتھ نے بے تابانہ سے پوچھا۔

”کہے گا کیا، میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا لچی ہے۔ کہتا ہے علی گڑھ آؤں گا تو پورا خرچ تمہارا ہوگا، میری محنت کے پیسے الگ ہوں گے، سوچ لو خرچ زیادہ ہو جائے گا۔“ کاشی نے جواب دیا۔

”ارے تو آخر کتنا مانگتا ہے۔ پتہ تو چلے۔“

”سب ملا کے پانچ سو کے لگ بھگ خرچ ہو جائے گا۔“ کاشی ناتھ نے کہا۔

کر چکا ہوں کہ کام اس طرح کرے کہ کوئی سمجھ نہ سکے، کیا ہو رہا ہے، دینو کچھ سمجھ نہ سکے اور اس کا آستانہ اجڑ جائے۔“ کاشی ناتھ نے کہا۔

”ارے بس اس سے آگے کچھ نہ کرے، دینو رہے اس کی گھر والی رہے بچے رہیں مگر تو لے شاہ نہ آئیں۔ بس اتنا کام کرو۔“ کیدار ناتھ بولا۔

”تو پکی بات کل شام جاگنی داس آجائیں گے اور آتے ہی ان کو لکشی کے درشن کرانا ہوں گے۔ اگر درشن نہ ہوئے تو آدنی الٹی کھوپڑی کا ہے۔ ارے سرے کی کھوپڑی کیا الٹی ہے۔ کم ذات ہے تم جانو کم ذات تو اپنا رنگ دکھا دے ہے اوپر سے اس کے پاس کچھ شستی بھی ہے، وہ نہیں اکڑے گا تو کون اکڑے گا، اس لیے اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کا کہا پورا کر دیں گے تم پورے پانچ سو کا بندوبست رکھنا۔“ کاشی ناتھ بولا۔

”ارے وہ تو کولوں گا مگر اس کو مندر میں نہ لے آنا۔“ ”ایسا پاگل نہیں ہوں میں تیرے پاس اکیلا آؤں گا۔ پیسے لینے، ایک دودن جتنے دن اس کو رکھنا ہو گا وہ انتظام خود کرے گا اور میں تیرے پاس رہوں گا۔“ کاشی بولا۔

دوسرے دن جاگنی داس آ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا وہ اور اس کے خاندان والے جوتے بنانے کا کام کرتے تھے۔ مگر چار چھ سال سے اس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا اور وہ دیرانوں میں در بدر پھرتا رہتا تھا سفلی اور کالے جادو گروں سے اس کے رابطے تھے۔ وہ پیسے کی خاطر کچھ بھی کام کرنے پر راضی ہو جایا کرتا تھا۔

آستانہ تو لے شاہ کے گرد اس نے ایک چکر لگایا اور بولا۔ ”بول کاشی ناتھ اس کا کیا کرتا ہے، اندر تو کچھ نہیں، خالی ڈبے ہیں۔“

”مہاراج کسی کو مارنا نہیں ہے بس اتنا کرتا ہے کہ یہ اجڑ جائے کوئی عورت مرد اس طرف نہ آئے۔“

”ٹھیک ہے کل سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ جاگنی داس نے کہا۔

دوسرے دن دینو نے حسب دستور آستانہ کھول دیا۔

☆ 308 ☆

عورت مرد آنے لگے۔ دس بجے تک چار چھ مرد عورت آ جاتے تھے آج بھی آ گئے۔ مگر وقت مقررہ پہنچا دیا اپنی جگہ نہ آ سکی۔

عین وقت پر اس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہوگئی اور وہ درد سے بے کل ہوگئی اور سب سالنوں کو نامراد واپس جانا پڑا، شام کو اچانک نادب ٹھیک ہوگئی۔

”یہ کیسی تکلیف تھی کہ اچانک شروع ہوئی اور اچانک ختم ہوگئی۔“ نادب نے کہا۔

”ہاں میں خود حیران ہوں بچے بھی پریشان ہو گئے تھے۔“ دینو نے کہا۔

دوسرے روز پھر ایسا ہوا اور پھر روز ایسا ہوتا رہا۔

”میرا خیال ہے یہ کوئی اور چکر ہے۔ تم ہر وقت ٹھیک رہتی ہو آستانے میں جاتے ہی تمہاری حالت بگڑ جاتی ہے۔“ دینو نے کہا۔

”میرا تو خیال ہے اب آستانہ بند ہی کر دیں تو اچھا ہے۔“ نادب نے کہا۔

”مگر اس طرح تو ڈر کر بند کرنا ہوگا۔“ دینو بولا۔

”تم میں کچھ ہے تو کرو کچھ۔“ نادب نے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کسی نے تم پر کچھ کر دیا ہے۔ ہمارے سب تو دوست نہیں ہیں۔“ دینو نے کہا۔

”ہم نے کسی کے خلاف کچھ کیا بھی نہیں ہے آس امید ہی دلاتے ہیں اس کے بدلے کچھ مانگا بھی نہیں ہے۔ اگر کسی نے اپنی مرضی سے دیا تو لیا ہے۔“ نادب نے کہا۔

”تیری بات درست ہے مگر حاسد بھی ہیں۔ کیا پتہ کون ہے۔“ دینو نے کہا۔

”کوئی بھی ہو، میں تو کہتی ہوں آستانہ بند ہی کر دو، یہ کام تھا تو کمزور فریب کا۔ دھوکا تو ہم دے رہے تھے اس دھوکے کی روٹی کھا رہے تھے۔ مجبوری کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر اب تو مجبوری نہیں ہے بند کر دو اور اعلان کر دو کہ تو لے شاہ نے اب آنا بند کر دیا ہے کیونکہ میری زوجہ کی صحت خراب ہے۔ بورڈ بھی اتار دو اور کوئی ڈھنگ کا کام تلاش کرو۔“

جو میرا ہوا۔ بلاوجہ خطرہ مول لیا گا تھ کا پیسہ خرچ کیا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔“ کیدار ناتھ غصے سے بولا۔

”تم لوگوں کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرجیس ڈال دو اور لوٹ لو۔ تم سے صبر نہیں ہوتا ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، مرے جا رہے ہو سات سو کیا گئے تم تو ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے۔“ بیوی بولی۔

”چل آخری دفعہ تیری یہ بات مانے لیتا ہوں تیل کو خوب دیکھتا ہوں اور اس کی دھار کو بھی دیکھتا ہوں۔“ کیدار ناتھ جل کر بولا۔

”صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ بیوی بولی۔
”مگر یہ تو بتا دے کہ صبر کا پھل کتنے دن کے بعد میٹھا ہوتا ہے کیدار ناتھ نے منہ بنا کر کہا۔

”اب جلے پھولے پھوڑے ہو، ارے ہمت کرو نقصان ہوا ہے تو فائدہ بھی ہو جاوے گا۔“ بیوی نے تسلی دی۔

”تیرے مشورے سے کسی فائدے کی امید ہرگز نہیں ہے مجھے۔“ اور کیدار ناتھ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اس کی آمدنی نہیں بڑھی۔ اس کے اخراجات تو اس کی بیوی اور بچوں نے اس قدر بڑھائے تھے کہ اس کے سر پر قرض کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ لڑکے نئے زمانے کی باتیں کرتے تھے دان دکھنا لیتا ان کو گوارہ نہ تھا جو کما تے تھے وہ ان کی جیب خرچ ہراڑ جاتا تھا۔

گھر کا خرچ پورا پورا تھا لوگوں نے مندر میں آنا کم کر دیا تھا۔ قریب قریب نی اور مندر کھڑے کر لئے تھے مندر بنا کر آمدنی حاصل کرنے کا کاروبار بہت سے لوگ سمجھ چکے تھے۔

جب کچھ سمجھ نہ آیا تو کیدار ناتھ باندی کوٹی جاگی داس کے پاس چلا گیا۔

بڑھا جاگی داس بھی اپنے دھندے میں بہت تیز تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ برہمن کی انگلی دہی ہوئی ہے۔ اسی کارن بھاگا ہوا آیا ہے۔ بولا۔ ”کیا بات ہے پنڈت تیرا کام تو میں نے کر دیا تھا۔ پھر کیوں کشت اٹھایا۔“

”نادیہ تم کہتی ہو تو اب میں تمہارا ہی کہنا مانوں گا وہی کروں گا جو تم نے حکم دیا ہے مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں اپنے ان دشمن کا دیدار تو کروں جس نے بے وجہ یہ کیا ہے۔“ دینو نے کہا۔

”دنیا میں دل کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی کچھ اندر ہی رہ جاتی ہیں۔ تم بھی سوچ لو کہ یہ ایسی ہی خواہش ہے کوئی آستانہ بند کرنا چاہتا تھا بند کر دیا بات ختم ہوگئی۔“ نادیہ نے کہا۔

”میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔“ دینو نے کہا۔
”تم نے اپنے آپ میں جو تبدیلی کی ہے اس کو برقرار رکھو تم مسلمان ہو اور صاحب اولاد بھی ہو گئے ہو تم جو کرو گے اس کا اثر بچوں پر پڑے گا۔ اب تم صرف یہ کرو کہ اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی طلب کرو اور حلال روزی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔“ نادیہ نے کہا۔
”میں نے اپنی لگام تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے۔“ دینو نے کہا۔

تو لے شاہ میرٹھ والے کا آستانہ بند ہو گیا۔ جاگی داس کے مقابلے پر کوئی نہیں تھا بڑی آسانی سے کام ختم ہوا۔ جاگی داس واپس باندی کوٹی چلا گیا۔ آستانہ بند ہونے کے بعد بھی کیدار ناتھ کی آمدنی میں کوئی خاص فرق نہ پڑا سات سو روپے الگ انٹے سے نکل گئے، یہ صدمہ الگ اٹھانا پڑا۔ اب کیا کریں وہ جانتا تھا کہ کاشی ناتھ اس کا دوست ہے مگر پورے تو اس نے جاگی داس کو نہیں دیئے ہوں گے اپنا خرچ بھی نکالا ہوگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بیوی پر اس کو غصہ نہ تھا آستانے کو بند کرنے کا مشورہ بیوی نے ہی دیا تھا۔

ایک دن سخت ٹیش میں بیوی سے بولا۔ ”اب بول بند ہو گیا آستانہ مگر میرے پاس اس کے بند ہونے سے کچھ اثر نہیں پڑا۔“

”اگرے ذرا صبر کرو پڑے گا اثر بھی۔“ بیوی بولی۔
”عورت کے کہنے پر چلنے والوں کا بھی حشر ہوتا ہے۔“

پنڈت کو اس کا انداز گفتگو اچھا تو نہیں لگا اس کو تو اپنی بڑی ذات کا گھمنڈ تھا اگر کوئی اور وقت ہوتا تو اس چمار کے دس جوتے لگوا دیتا مگر اس وقت موقعہ محل کے اعتبار سے اس کے ہونٹوں پر بڑی دفریب مسکراہٹ آگئی اور وہ بولا۔

”کیا بتاؤں مہاراج آپ نے تو کام چوکھا کر دیا تھا مگر آستانہ بند ہونے کے بعد بھی میرا مندر تو سونا ہی رہا، میرے دھندے میں ذرا فرق نہ پڑا، میں تو دونوں طرف سے مارا گیا، رقم بھی گئی اور کچھ نہ ہوا۔“

”تو میں کیا کروں، میں نے اپنا کام تو کر دیا تھا۔“ جاگی داس بولا۔

”ارے تو میں تم کو دوش نہیں دے رہا ہوں۔“ پنڈت جلدی سے بولا۔

”تو پھر اب کیوں آیا ہے۔ رقم تو تیری گئی۔“ جاگی داس نے کہا۔

”رقم کا کیا ہے مہاراج اتنی جاتی ہے۔ اب کے کچھ بھاری کام ہے۔ مگر بے ذرا خفیہ جس تم اور میں جانوں کیونکہ معاملہ راجو حکم کا ہے۔“ پنڈت آہستہ سے بولا۔

”پوری بات بتا پھر میں فیصلہ کروں گا کہ میں کروں کہ نہیں۔“ جاگی داس بولا۔

”جس گھر میں آستانہ تھا وہ گھر بڑے موقعہ کا ہے اور ہے بھی بڑا بھاگوں کچھ ہی دنوں میں آستانہ چمک گیا تھا، میں چاہتا ہوں دینو اور اس کا پر پوار وہ گھر چھوڑ جائے اور میں اس میں پھر سے آستانہ بنالوں۔“ پنڈت نے کہا۔

جاگی داس زور سے فہس پڑا اور بولا۔

”ارے کیا پاگل ہوا ہے پنڈت، تو مندر کا آدمی، آستانہ کیا بنائے گا۔ تجھے کیا پتہ آستانہ کیا ہوتا ہے اور پھر مسلمان تیری ٹانف پر اتنے جوتے لگائیں گے کہ مندر میں تیری دیوی بھی ناراض ہو جائے گی۔ تو کس ہوا میں ہے پنڈت۔ تو تو مارا اسی جائے گا۔ میرے ساتھ میری بھی خیر نہیں ہوگی۔“ جاگی داس نے کہا۔

”میں اتنا بڑا گدھا نہیں ہوں کہ کچا کام کروں۔“

پنڈت بولا۔

”تو پھر بتاؤ تم کتنے بڑے گدھے ہو۔“ جاگی داس بولا۔

یہ سن کر پنڈت تمللا گیا مگر انگلی دبی ہوئی تھی پی گیا غصہ کو، ہونٹوں پر ایک لفظ نہ لایا۔ جیسے اس نے جاگی داس کی بات سنی ہی نہیں۔ مسکرا کر بولا۔

”میں اور تم دونوں کسی حالت میں سامنے نہیں ہوں گے تم بھی چھپ کر دار کرو گے اور میں تو تمہارے اور دینو کے قریب بھی نہیں آؤں گا۔ جب وہ ڈر کر بھاگ جائے گا تو پھر اس گھر کو خریدوں گا اور کسی مسلمان کو ٹھیکے پر دے دوں گا وہ آستانہ بنائے گا اور مجھے ادا کرے گا میں تو بھی ادھر جاؤں گا بھی نہیں۔“ پنڈت نے پلان بتایا۔

”دینو نے اس مکان پر بہت خرچ کیا ہے بڑے ڈھنگ کا اس نے بنایا تھا۔ مہنگا طے۔ تیرے پاس اتنی رقم ہے کہ خرید لے۔“ جاگی داس نے پوچھا۔

”مہاراج کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے رہیں گے۔“ پنڈت بولا۔

”میرا کیا حصہ ہوگا۔ آمدنی میں۔“ جاگی داس بولا۔

”حصہ! تم تو اپنی محنت کے پیسے لے ہی لو گے پھر حصہ کیا۔“ پنڈت بولا۔

”کانٹے میں کانٹوں اور بیر تو کھائے۔ بہت بڑھیا پنڈت۔“ جاگی داس بولا۔

”تو پھر تم جو کرو گے اس کا کچھ نہیں ملے گا۔ دونی تمہارا حصہ دینے کو تیار ہوں۔“ پنڈت بولا۔

”دونی دے کر بھی کیا کرو گے پورا مال ہضم کر لو۔“

دونوں ہاتھ میں لٹو بڑے ہوشیار ہو پنڈت اور ہم تو ہیں پر لہو رے کے بے وقوف۔“ جاگی داس بولا۔

”کم ہے تو چوٹی دے سکتا ہوں۔“ پنڈت بولا۔

”اور اس کے ساتھ ہزار روپے الگ سے لوں گا کام کرنے کے منگور ہے بول نہیں تو جا۔“ جاگی داس بولا۔

”تو کب کام شروع کرو گے۔“ پنڈت نے پوچھا۔

”یہ تو تم پر ہے تم رقم ابھی ادا کر دو اور جو بات ہوئی

گھر میں ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں، رات ہوتے ہی عجیب عجیب قسم کے جانوروں کی آوازیں ڈر کے مارے پورے گھر کا برا حال ہو گیا۔ بیوی کی حالت گرتی ہی گئی۔ بچے بھی لب دم ہو گئے۔ پھر ایک آدمی اس کے پاس آیا اور بولا۔

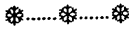
”ارے کیا سب کو مار ڈالے گا۔“

دینو حیران ہو کر بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”ہم جو بھی ہیں تیرے ہمدرد ہیں، اس مکان کو چھوڑ دے نہیں تو سب مارے جاؤ گے۔“ اجنبی نے کہا۔

”میں کہاں جاؤں گا پھر۔“ دینو نے پوچھا۔

”دوسرا مکان کرائے پر لے لے، یہاں سے جلدی چلا جا اب تیرے پاس وقت کم ہے یاد رکھا ابھی تو بیمار ہیں مرے نہیں ہیں اگر تو نے مکان فوراً نہ چھوڑا تو مر جائیں گے، تین دن کا وقت ہے تیرے پاس ہم تیرے ہمدرد ہیں، بتا دیا ہے مان نہ مان تیری مرضی اب چلتے ہیں۔“ اور اجنبی چلا گیا۔



دینو نے زندگی بڑی بے قدری سے گزاری تھی۔ مگر نادیدہ سے نکاح کرنے کے بعد اور پھر بچوں کی پیدائش کے بعد اس کو زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے کیل کے اوٹ کو نادیدہ نے ایسے غیر محسوس انداز میں کیل ڈالی تھی کہ وہ نادیدہ کی نظر نہ آنے والی ڈوری سے بندھ گیا تھا۔

اس نے دوسرے ہی روز ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور اس میں چلا گیا۔ وہاں جاتے ہی اجنبی کا کہا پورا ہو گیا اور بیوی بچے تندرست ہو گئے۔

دو دن کے بعد اس کے پاس وہی اجنبی پھر آ گیا

اور بولا۔

”اب بول اس مکان کا کیا کرے گا تیرے لئے تو وہ منحوس ہے تو اس گھر میں گیا اور آتی مصیبت تیرے لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے اپنی جان چمڑا لے۔“ بچہ دے فوراً اس کو میں تو تیرا ہمدرد ہوں اس لئے بتا رہا ہوں۔“ اجنبی نے کہا۔

ہے لکھ کر دے دو کل سے کام شروع کر دوں گا۔“ جاگتی داس بولا۔

”تم کام شروع کرو تمہاری رقم گلے گلے پانی میں بھی دوں گا اور رہی تمہاری بات تو میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ پھر دل کا نہیں۔“ پنڈت بولا۔

”تم پر بھروسہ میں نہیں کرتا۔ بات صاف ہے۔ پیسہ دو کام ہو گا نہیں دو گے نہیں ہو گا۔ چونی حصہ بھی تم کو لکھ کر دیتا ہو گا۔“ جاگتی داس بولا۔

پنڈت کی ہوشیاری دھری رہ گئی۔ ذرا ذلت کا احساس بھی ہوا۔ یہ چہار بار بار بے عزتی کر رہا تھا اور اس کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر کیا کرتا۔

”ابھی میری انٹی میں ہزار نہیں ہیں کل دے جاؤں گا اور کاغذ بھی لکھ دوں گا پھر تو کام ہو گا۔“ پنڈت کے منہ سے بڑی مشکل سے یہ نکلا۔

”جب رقم پہنچا دو تو پھر کام شروع کر دوں گا۔ پنڈت برانہ ماننا لگا اور ہوتا تو شاید میں رقم لئے بغیر بھی کام شروع کر دیتا مگر تم پنڈت ہو اور پچاڑی ہو مندر کے، تم لوگ صرف لینا جانتے ہو۔ تم کسی کو کچھ دے نہیں سکتے اس لئے پہلے لے رہا ہوں، کیا پتہ بعد میں کیا حالات ہوں۔“ جاگتی بولا۔

”تم جودل کرے کو ہمارا راج ملی جب بھیگ جاتی ہے تو جو ہے موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں اور اکڑتے ہیں یہ تمہاری بات نہیں پرکھوں کی کہادت ہے۔“ پنڈت نے کہا۔

دوسرے دن پنڈت نے سینے پر پتھر باندھ کر ہمت کی اور جاگتی داس کو ہزار روپے دے آیا اور کاغذ بھی لکھ دیا۔

پھر جاگتی داس نے موتا چماری کی ایک بیرو دینو کے گھر پہنچا دیا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اس کے گھر کو گندہ کرے اور بیماریاں پھیلانے۔

پہلے دینو کے بچے بیمار ہوئے وہ ان کے علاج میں لگا تو بیوی بیمار ہو گئی۔ دینو سب کی دیکھ بھال کرتا رہا وادارو کرتا رہا۔ مگر کسی دوائے اثر نہیں کیا۔ گھر میں گندگی کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ بد بو اس قدر ہو گئی کہ دینو پریشان ہو گیا۔ تینوں بچے بیمار بیوی بیمار، سخت الجھن اور پریشانیوں میں گھر گیا۔

”آپ کون ہیں۔ یہ بتائیں۔“ دینو نے کہا۔
 ”یہ مت پوچھ بتانے کی اجازت نہیں ہے بتائیں
 گے تو تیرا نقصان ہو جائے گا۔“ اجنبی بولا۔
 ”میں اس مکان کو فروخت نہیں کر سکتا۔“ دینو
 نے کہا۔

”فروخت نہیں کر سکتا اس کی وجہ سے کیا ہے؟“
 اجنبی بولا۔

”وجہ بتانے کی ضرورت نہیں میرا دل نہیں کرتا
 بس۔“ دینو نے کہا۔
 ”تو اس کو آدھ نہیں کر سکتا۔“ اجنبی نے کہا۔
 ”نہ کروں مگر تم کیوں اس کی فروخت پر اصرار کرتے
 ہو۔“ دینو نے کہا۔

”اس مکان پر بہت بڑا اثر ہے میں اس کو آباد کروں گا
 اور اس اثر کو غالبہ کروں گا۔“ اجنبی نے کہا۔
 ”میں تم کو کرائے پر دے سکتا ہوں۔“ دینو نے کہا۔
 ”چلو ٹھیک ہے کرائے پر دے دو۔“ اجنبی نے کہا۔
 اور دینو نے مکان کرائے پر دے دیا۔

کرایہ دار نے مکان کو از سر نو سفیدی چونا کر دیا اور
 رہائش اختیار کر لی دو چار روز کے بعد آستانہ جہاں تھا وہیں
 پر ایک بورڈ لگ گیا۔ ”آستانہ تو لے شاہ میر ٹھہ والے۔“

دینو نے بورڈ دیکھا تو اس کی سمجھ میں پورا ڈرامہ
 آنے لگا۔ وہ کڑیوں سے کڑیاں ملاتا چلا گیا اور بات پوری
 طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ آستانہ تو
 اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ دوسرے وہ بے علم آدمی
 تھا اس کے سامنے علم والا تھا اس نے دینو کو ڈرا کر خوف زدہ
 کر کے مکان حاصل کر لیا تھا اور خود آستانہ کھول لیا تھا۔

آستانہ تو پہلے ہی مشہور تھا صرف یہ بتانا تھا کہ دوبارہ
 آستانہ کھل گیا ہے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے اور آہستہ
 آہستہ آمدن بڑھ رہی تھی۔ لیاقت کی بیوی پر تو لے شاہ
 میر ٹھہ والے کی سواری آتی تھی اور وہ خود لوگوں کے دکھ
 پریشانی بیان کر دیتی تھی۔ اس کے لئے اس نے کچھ ذرائع
 رکھے تھے کچھ تو جاگی داس مدد کرتا تھا اور کچھ اس نے اس

قسم کی عورتیں رکھی تھیں جو سب حالات مسائل سے پہلے
 ہی پتہ کر لیتی تھیں اور وہی حالات لیاقت کی بیوی بتول
 بیان کر دیا کرتی تھی اور سب حیران ہو جاتے تھے۔ اس
 نے مکر و فریب کو اور زیادہ جدید انداز میں پیش کر دیا تھا اور
 مسائل تو لے شاہ کی کرامات کا قائل ہو جاتا تھا۔

پنڈت کیدار ناتھ نے لیاقت اور اس کی بیوی کو چونی
 کا حصہ دار بنایا تھا۔

اس طرح جاگی داس اور لیاقت کو دینے کے بعد بھی وہ
 آدھے کا مالک تھا۔ وہ خود آستانہ میں نہیں آتا تھا اس کا
 ایک آدمی صندوق کھولتا تھا اور سب کا حصہ الگ الگ کر دیا
 کرتا تھا۔ جاگی داس بھی کبھی آستانے پر نہیں گیا تھا۔
 آستانے کا ماحول وہی رکھا تھا جو پہلے تھا۔ کسی کو ذرا شک
 نہیں تھا کہ انتظامیہ بدل چکی ہے۔

آستانے پر پھر عورتوں اور مردوں کی بھیڑ ہونے
 لگی۔ صندوق میں کھٹا کھٹ روپے گرنے لگے اور دینو کے
 دل پر چوٹ پڑنے لگی۔ جس ڈرامے کا وہ راسخ ڈرائیکٹر تھا
 اس ڈرامے کو کوئی اور اسٹیج پر پیش کر رہا تھا اور نہایت
 کامیاب تھا۔

دینو نے تین مہینے بڑا صبر کیا اور پھر لیاقت کو مکان
 خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ لیاقت تو صرف ایک چہرہ تھا
 دماغ تو پنڈت کیدار ناتھ اور جاگی داس کے تھے۔ دونوں سر
 جوڑ کر بیٹھے اور مشورہ کرنے لگے۔ پنڈت نے کہا۔

”لو پھر اس کے پیٹ میں مروڑا ٹھہ رہی ہے۔“
 ”تو کیا ہوا اب مکان ہمارا ہے اس کے اچھے بھی
 مکان خالی نہیں کر سکتے۔“ جاگی داس بولا۔

”مہاراج قانونی طریقہ پر تو وہی مالک ہے۔“
 پنڈت نے کہا۔

”ہوگا مالک مگر اس کو وہ مکان ملے گا نہیں۔“ جاگی
 داس بولا۔

”تو پھر تم ایسا کچھ کر کہ وہ سر بھی نہ اٹھائے۔“ پنڈت
 نے کہا۔

”تو فکر نہ کر کر دیں گے اس کا پورا پورا بندوبست۔“

جائی داس بولا۔

”مکان خالی نہیں ہوا تو پھر.....“

دینو لیاقت کے پاس گیا اور بولا۔ ”میں نے کچھ کہا تھا تم نے اپنا بندوبست کر لیا۔“

”مجھے خالی کرنا ہوتا تو بندوبست کرتا۔“ لیاقت بولا۔

”مکان کی ضرورت ہے۔“ دینو نے کہا۔

”تو اور خرید لو۔ میں تو اسی میں رہوں گا۔“ لیاقت بولا۔

”دیکھو لیاقت تم نے مکان رہنے کو لیا تھا۔ مگر تم نے

آستانہ بنالیا اور اسی نام سے بنایا جس سے میرا آستانہ تمہاری

نہ میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ دینو بولا۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں تم کو کرایہ دیتا ہوں آستانہ

بناؤں یا بکریاں پالوں تم منح نہیں کر سکتے، دوسری بات یہ

کہ تو نے شاہ کی سواری صرف تمہاری بیوی پر کیوں آئے

گی کسی پر بھی آ سکتی ہے، تم نے جھوٹ اور فریب کا کھیل

کھیلنا تھا، خوب کمالیا اب میری باری ہے، تم نے اگر

میرے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالی تو یاد رکھو بیاریاں

پھر تمہارا گھر دیکھ لیں گی۔ تم لاکھ علاج کرنا فائدہ نہیں ہوگا

اور مجھے تم اکیلا نہ جانا، میرے سر پر بڑے بڑوں کا ہاتھ

ہے۔ تم پھر کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ اس سے پہلے میں نے تم کو

بتا دیا ہے۔“ لیاقت بولا۔

”اچھا میں کچھ نہیں کرتا تم یہ تو بتا دو کہ تمہارے سر پر

کس کا ہاتھ ہے۔“ دینو نے کہا۔

”میں یہ نہیں بتاتا۔ صرف تم کو یہ بتا سکتا ہوں کہ تم

اب کبھی اس مکان کی ملکیت کے بارے میں کچھ نہ کہنا ورنہ تو

جو ملتا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا اور تو کچھ نہیں کر سکے گا۔“

لیاقت بولا۔

”یہ تو وہی بات ہوئی جبر مارے اور رونے بھی نہ

دے۔“ دینو بولا۔

”ہاں یہی بات ہے اب تو جا کر ایہ میں پہنچا دوں گا

تیرے گھر۔“ لیاقت بولا۔

اور دینو نا امید کی کیفیت میں گھر آ گیا۔ اس کی

بیوی نادیا نے اس کا اترا چہرہ دیکھا تو بولی۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان ہو۔“

”کچھ کیا بہت پریشان ہوں۔“ دینو بولا۔

”بتاؤ تو.....“ نادیا نے پوچھا۔

”زندگی میں ایک مکان بنایا تھا کہ بچوں کو کچھ تو

دوں میں نے تو زندگی خانہ بدوش کی مانند گزار دی ان کو تو

ایک ٹھکانہ میسر آ جائے مگر لگتا ایسا ہے کہ وہ مکان گیا ہاتھ

سے تو لے شاہ کا آستانہ وہاں پر زور و شور سے چل رہا ہے

اور سواری بھی آ رہی ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ وہاں پر کچھ

تبدیلی آئی ہے۔ مرد و عورت اسی طرح آ رہے ہیں اور

صندوق میں بڑی رقم آ رہی ہے۔ درخت ہم نے لگا یا

پھل کوئی اور کھا رہا ہے۔ میں دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر ہنس

ہو رہا ہوں۔“ دینو بولا۔

”بے شک تم نے درخت لگایا تھا مگر تمہارے نصیب

میں پھل نہیں تھے یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں تم صبر کرو اور بھول

جاؤ آستانہ کو۔“ نادیا نے کہا۔

”اس کو بھولنا بہت مشکل ہے۔“ دینو بولا۔

”تو کیا ان سے لڑو گے۔ جھگڑا کرو گے۔“ نادیا نے

پوچھا۔

”میں وہ بھی نہیں کر سکتا اکیلا ہوتا تو بھڑچاتا مگر بچوں

اور تمہاری وجہ سے میں کمزور ہوں میں نے ذرا بھی ان کے

خلاف کچھ کرنے کی کوشش کی تو پھر بیاریاں آن دیو جنس گی

میں بچوں کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ مگر آستانہ کو ان کے

حوالے کرنا بھی نہیں چاہوں گا۔“ دینو نے کہا۔

”تو پھر ایسا کرولی گڑھ سے چلو کسی اور شہر میں رہیں

گے نہ تمہارے سامنے آستانہ ہوگا اور نہ تمہارا خون کھولے گا

دیکھ کچھ کر۔“ نادیا نے کہا۔

”میں اس پر فوکر دل گا۔“ دینو نے کہا۔

.....

دینو کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تو وہ دلی روانہ ہو گیا۔

اور اس نے اپنی مشکل کسی کو بتائی اور وہ دلی کا باشندہ اس کو

لے کر میرے مطلب میں آ گیا۔ رولو کا کیس جو جڈکی میں دینو

محمد عرفہ بیٹو کی ساری روداد میں نے سنی پھر میں نے کہا۔

روپیہ کمانے کا ذریعہ تھا میں نے وہ راستہ اختیار کر لیا۔ بے شک میں نے گناہ کیا ہے میں اقرار کرتا ہوں مگر اب نہیں کروں گا۔“ دینو نے کہا۔

”تم نے اقرار کر لیا اور اپنی غلطی کا احساس کر لیا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر آئے والے وقت میں تم جیسے اور لوگ ہوں گے جو یہی کریں گے اور عوام ان کے آستانوں پر جائے گی۔ ان کو روکنا اور عوام کو تسلیم کرنا جن لوگوں کا کام ہے وہ کیوں خاموش ہیں؟“ میں نے کہا۔

”حکیم صاحب آپ اور میں اگر یہ سوال اٹھائیں گے تو بات دور تک چلی جائے گی ہر شخص اپنی طرف دیکھ رہا ہے وہ چاہے پنڈت ہو، مولوی ہو، ڈاکٹر ہو، وکیل ہو یا حکیم ہو۔“

”یہ شخص اگر آئندہ اس تہہ کی خرافات میں نہیں پڑتا تو میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ رولوکانے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں محنت کروں گا اور حلال روزی پیدا کروں گا میں یہ آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی طے کر چکا تھا آپ میری مدد نہ بھی کریں تو بھی میں یہی کروں گا مکان ملنے لے۔“ دینو نے کہا۔

”شاہاں اپنے عہد پر قائم رہتا جو لوگ نیکی کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہیں نیکی ان کی طرف کئی قدم بڑھاتی ہے۔ انسان اگر سیدھی سادی زندگی گزارنا چاہیے تو بڑی آسانی سے کسی بھی الجھن کے بغیر گزار سکتا ہے مگر انسان لالچ اور حد میں الجھن جاتا ہے دوسروں کو دیکھ کر خود بھی ایسا بننا چاہتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو دیکھ کر وہ اس کی برابری کرنا چاہتا ہے وہ کون ہے اس کے وسائل کتنے ہیں وہ کیا قابلیت رکھتا ہے اگر ناجائز طریقہ پر دولت کما رہا ہے تو اس سے دوری اچھی ہے اگر جائز طریقہ پر دولت کما رہا ہے تو ضرور اس میں کوئی ہنر ہوگا۔ علم و ہنر میں اس کی برابری وہ لالچی آدمی نہیں کرتا اور غلط انداز اپنا لیتا ہے تم نے بھی یہی کیا ہے مگر تم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“ رولوکانے کہا۔

”میاں تم نے جس بے ایمانی سے فریب کا درخت لگایا تھا اس کا پھل تم نے خوب کھایا پھر تم سے بھی بڑے تمہارے جیسے نے وہ درخت تم سے حاصل کر لیا اور اب اس کے پھل کھا رہا ہے تو کھانے دو۔“

”بات آپ کی درست ہے غلط کام کی ابتدا میں نے کی مگر اب میں نہیں کروں گا میرا مکان مجھے مل جائے میں آستانہ بند کر دوں گا۔“ دینو نے کہا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

میں اسی مکان میں کوئی چھوٹا موٹا کام کروں گا۔ آستانہ ہرگز نہیں بناؤں گا۔“ دینو بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ تو کہ یہ تو لے شاہ میرٹھ میں کوئی ہیں؟“

میں نے کہا۔

”بات یہ ہے کہ میرٹھ کے قدیم قبرستان میں ایک کچا مزار تو ہے کسی نے اس کا نام تو لے شاہ رکھ دیا۔ تو لے شاہ کون تھے کیا کرتے تھے ان کا کیا مقام تھا کسی کو پتہ نہیں مجھے تو یہ نام ہی فرضی لگتا ہے۔ میں جب علی گڑھ آیا تو یہ نام میرے ذہن میں تھا کارنامے میرے بھی اچھے نہیں۔ میں نے آدہنی کا ایک ذریعہ بنایا اور آستانہ بنا ڈالا اور تو لے شاہ کی سواری آنے لگی کسی نے مجھ سے کچھ سوال نہ کیا سب نے مان لیا اور آدمی ہونے لگی۔“ دینو بولا۔

”یہ کمزوری علم والوں کی ہے جاہل کو تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ اگر تم سے آستانہ قائم کرنے ہی میں باز پرس کر لی جاتی تو تم اس کمزور فریب کے گناہ سے بچ جاتے۔“ میں نے کہا۔

”غریب آدمی روزی روٹی کی تلاش میں رہتا ہے اس کو پوری طرح علم نہیں ہوتا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے وہ کچھ بھی کرنے لگتا ہے میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں۔“

میری بیوی نے البتہ کبھی کبھی مجھے روکا تھا مگر میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا یا روپے کے لالچ نے مجھے نہیں سوچنے دیا، میں تو جاہل آدمی ہوں، میری نظروں کے سامنے میرے مسائل تھے اور ضرورت تھی اور ایک آسان

”تو دین محمد تم اپنا پتہ دے دو۔ ہم تمہارے پاس خود آ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔
اور دینو واپس علی گڑھ آ گیا۔

دوڑ آتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ میرٹھ کے لوگوں کے مسائل نہیں ہیں اور اگر ہیں تو پہلے ان کا حق ہے کہ آپ ان کے کام آئیں مگر آپ میرٹھ چھوڑ کر علی گڑھ دوڑے آتے ہو یہ کیا بات ہے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے، تجھے اس سے کیا غرض تو اپنی بات کر نہیں کرتا تو جا پھر میرے پاس نہ آنا بھی۔“ عورت نے ناراضگی سے کہا۔

”تو لے شاہ میں جاؤں گا اور تم بھی جاؤ گے میرٹھ۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تیری قسمت خراب ہوتی نظر آرہی ہے۔“ عورت بولی۔

”تجھے تو میری مشکل بھی نظر نہیں آرہی تو کیا دیکھے گا۔“ رولو کا نے کہا۔

”تو کیوں اپنی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے، تو لے شاہ کو تو نہیں جانتا ہم جہاں بڑی بناتے ہیں تو بکا ز بھی سکتے ہیں ڈر اس وقت سے جب ہم کو جلال آ جائے۔“ عورت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

”تو لے شاہ تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ جا رہا ہوں مگر پھر ضرور آؤں گا۔“ اور رولو کا باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے روپوشی اختیار کر لی اور پھر اندر چلا گیا۔
”یہ کون آ گیا تھا آج میں تو گھبرائی گئی تھی۔“ عورت نے لیاقت سے کہا۔

”مگر تو نے تو کمال کر دیا میں تو حیران ہو رہا تھا۔“ لیاقت بولا۔

”یہ پھر آئے اس کو روکنا ہوگا ورنہ تو لے شاہ مارے جائیں گے۔“ عورت نے کہا۔

”تو فکر مت کریں میں صبح ہی جا چکی واں اور پنڈت کیدار ناتھ کے پاس جاؤں گا اور اس کا پورا پورا بندوبست کرادوں گا۔“ لیاقت نے کہا۔

رولو کا لب وہاں کوئی کام نہ تھا اس ڈرامے کے اصل کردار تھا تا کاس کو پتہ چل گیا تھا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد میں نے رات کی رواداد

تین دن کے بعد رولو کا اور میں دونوں علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ دلی سے چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے اسٹیشن سے تانگا پکڑا اور دینو کے مکان پر پہنچے تو دینو بہت خوش ہوا۔

اس نے ہمارے قیام کے لئے پہلے ہی ایک کمرہ تیار کر لیا تھا۔ شام ہو گئی تھی اس دن تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا مگر رولو کا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہم کمرے میں سوئے آ گئے تو رولو کا نے کہا۔ ”حکیم صاحب آپ آرام کریں، میں ذرا علی گڑھ کی سرکراؤں۔“
میں کچھ گیارہ رولو کا ڈیوٹی پر ہے اور رولو کا روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

زیادہ رات نہیں ہوئی تھی آستانہ پر اس وقت بھی چند عورتیں اور مرد موجود اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ رولو کا روپوشی کی حالت میں نہیں بلکہ وہ ایک ضرورت مند کے جھیس میں تھا اس کا نمبر آخری تھا۔ ایک ایک کر کے مرد عورتیں اندر جاتی رہیں اور ایک گھنٹے کے بعد اس کا نمبر آ گیا۔ وہ بھی ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ بڑا تھا مگر صرف ایک لائٹن روشن تھی اور ایک عورت تخت پر بیٹھی تھی اس کے دونوں طرف لوہان جل رہا تھا۔ عورت کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اس کے دائیں طرف ایک مرد کھڑا امور چھل کا پکٹھا کر رہا تھا۔ رولو کا نے کمرے کا جائزہ ایک منٹ میں لے لیا، کمرے میں کوئی خاص بات نہیں تھی عورت اور مرد عام سے تھے ان کے اندر اور باہر کچھ نہیں تھا۔

رولو کا عورت کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو عورت نے پوچھا۔ ”کیا ضرورت ہے بے کیوں آیا ہے؟“
”مجھے جو ضرورت ہے تو خود پتہ کر لے مجھ سے مت پوچھ۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”کر لوں گا پتہ تو خود بتا دے تو اور اچھا ہے۔“ عورت نے کہا۔

”تو لے شاہ تمہارا حراز میرٹھ میں ہے اور تم روز اتنی

رولوکا سے پوچھی تو وہ بولا۔ ”کوئی جاگتی داس اور پنڈت کیدار ناتھ ہیں وہ دونوں آستانے کے سرپرست ہیں مگر پردے میں ہیں اور ان کی شہ پر ہی یہ آستانہ چل رہا ہے مجھے لگتا ہے لیاقت اور اس کی بیوی صرف چہرے ہیں جو لوگوں کے سامنے ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے تمہارا اندازہ درست لگتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آج لیاقت، جاگی داس اور پنڈت کے پاس جائے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے جاگی داس اور پنڈت کا پتہ چاہئے میں اپنے طریقہ پر پتہ تو چلا لوں گا مگر اس سے کچھ وقت برباد ہو جائے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

میں نے دینکو بلایا اور اس نے دونوں کا پتہ بتادیا۔ رولوکا روانہ ہو گیا۔ پہلے رولوکا پنڈت کے مندر میں گیا آج وہ روپوشی میں تھا دس بجے کا وقت تھا مندر میں کوئی نہیں تھا۔ مندر کے پیچھے ہی پنڈت کی رہائش تھی۔ وہ وہاں چلا گیا۔

لیاقت اس سے پہلے ہی پہنچا ہوا تھا۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ بھال کے آیا ہے نا، کسی نے اندر آتے دیکھا تو نہیں۔“

”پنڈت جی ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں آخر اتنے دنوں سے آستانہ چلا رہا ہوں بتاؤ ذرا کسی کو شک ہوا۔“ لیاقت نے کہا۔

”سو تو تم آدی سمجھ دار ہو یوں کیوں آئے ہو۔“

”کل ایک آدمی آستانے پر آیا تھا اس نے تو لے شاہ کے بارے میں بڑے میڑھے سوال کئے۔“ نظر تو بے وقوف سا آتا تھا مگر باتیں بڑی خطرناک کر رہا تھا۔ ”لیاقت بولا۔

”کیا کہتا تھا آخر.....“ پنڈت نے پوچھا۔

”کہتا تھا تو لے شاہ تم کو میرٹھ جانا پڑے گا۔ تم روز کیوں آتے ہو میرٹھ کے مسائل حل کرو، علی گڑھ کیوں آتے ہو۔ بس اسی قسم کی باتیں۔“ لیاقت بولا۔

”ارے ہوگا کوئی خدائی فوجدار بننے کا شوقین تو فکر نہ

کر اپنا کام کرتا رہ میں جاتا ہوں جاگی داس کے پاس تو اب جاہ نہ آتا آئے تو ذرا خیال رکھنا اور دن میں ہرگز نہ آنا۔“ پنڈت بولا۔

لیاقت چلا گیا اس کے جانے کے بعد پنڈت جاگی داس کے پاس روانہ ہوا اور رولوکا اس کے ساتھ تھا۔ جاگی داس پنڈت کو دیکھ کر بولا۔

”پتھارو پنڈت..... ضرور کوئی ضرورت میری پڑ گئی ہے۔“

”ہاں ضرورت تو ہے آخر تم بھی تو چونی کے حصہ دار ہو۔“ پنڈت نے کہا۔

”یہ بتانا ضروری تھا کیا۔“ جاگی داس بولا۔

”ذمہ داری تو برابر ہے اگر آستانہ بند ہو تو سب کا نقصان ہوگا۔“ پنڈت نے کہا۔

”ارے کون ہے سو رہا جو آستانہ بند کرانے گا۔“ جاگی داس بولا۔

”ایک سر پھرا آیا تھا وہ لیاقت کو دھمکا کر گیا ہے کہتا تھا تو لے شاہ میرٹھ جاؤ وہاں کے کام کرو یہاں کیوں آتے ہو، لو بھلا آتے ہیں تو اس کو کیا کہتے ہیں، وہ کون ہے روکنے والا تو لے شاہ کیوں میرٹھ چلے جائیں۔“ پنڈت نے کہا۔

”ارے ہوگا کوئی ڈھونڈ، تو فکر نہ کرو دوڑا دوں گا منٹ بھر میں۔“ جاگی داس بولا۔

”وہ پھر آنے کا کہہ گیا ہے جانے کب آجائے۔“ پنڈت بولا۔

”ارے تو کیوں مرا جا رہا ہے، لگا دیتے ہیں پہرہ، وہ آوے گا تو دیو بوج لیا جائے گا۔“ جاگی داس بولا۔

اور پنڈت بے فکر ہو کر واپس چل دیا۔ مگر رولوکا جاگی داس کے قریب ہی رہا اور اس کی ٹاپ تول کرتا رہا۔ اچھی طرح ٹاپ تول کے بعد وہ واپس آ گیا۔

شام کو چار بجے سے آستانہ مکمل جاتا تھا۔ رولوکا اس کے کھلنے سے بھی پہلے وہاں پر تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک سفلی کا گندہ حیر دروازے پر کھڑا تھا مگر رولوکا کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

رولو کا اس کے قریب گیا اور اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ دے مارا اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا مگر کچھ نہیں دیکھ سکا۔ رولو کا اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ زور کرنے لگا اور جھوٹا ہونے لگا۔

اور پھر وہ اتارہ گیا کہ اس کو جیب میں رکھا جاسکے۔ رولو کا نے اس کو جیب میں ڈال لیا اور آستانے کے کمرے میں چلا گیا۔ لیاقت کی بیوی گدی پر آگئی تھی ایک عورت اپنا کھڑایان کر رہی تھی۔ اس کا بیان ختم ہونے پر لیاقت کی بیوی کو بولنا تھا مگر وہ کوشش کے بعد بھی ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی۔ لیاقت قریب کھڑا تھا اس کے اشارہ کرنے پر اس کی بیوی نے اشارے سے بتایا کہ اس کی آواز بند ہے۔ وہ بول نہیں سکتی۔ یہ سن کر تو لیاقت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس نے کوشش کرنے کا اشارہ کیا مگر اس کی بیوی کو ناکامی ہوئی اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ لیاقت نے اعلان کر دیا کہ تو لے شاہ واپس چلے گئے ہیں سب لوگ جائیں اب کل ملاقات کریں۔ سب مسائل مایوسی کے عالم میں واپس چلے گئے اور لیاقت اندر بیوی کے پاس دوڑا۔

اندر جاتے ہی بولا۔ ”اری نیک بخت کیا ہوا تھا بولتی کیوں نہ تھی۔“

”میں کیا کرتی جب کوشش کرتی تھی تو لگتا تھا کوئی میرا گلہ دبائے ہوئے ہے۔“ بیوی بولی۔

”اور اب کیسا لگتا ہے۔“ لیاقت نے پوچھا۔

”اب ٹھیک ہوں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

مگر آستانہ بند ہو چکا تھا اور سب عورت مرد جا چکے تھے۔ اب لیاقت کیا کرتا اس کی دوڑ تو پنڈت کیدار ناتھ تک ہی تھی وہ دوڑا مگر راستے میں خیال آ یادوں میں آنے کو پنڈت نے منع کیا تھا اب کیا کرے ملنا بھی ضروری تھا۔ رات کو ملنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل بھی آستانہ بند کرنا پڑے گا وہ پھر گھر آ گیا اور ایک بیٹی پرانی چادر پڑی تھی، پا جامہ اتار کر اس کو باندھ لیا اور پرانا سا کرتہ پہن لیا اور ایک رومال لے کر چلا مندر کی طرف، مندر کے قریب

آنے پر اس نے رومال سر پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا چہرہ بھی اس میں چھپ گیا۔

مندر میں پوچھا پٹ کو اکا دکا آدی آرہے تھے اور کیدار ناتھ مورتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کیدار ناتھ کے قریب جب کوئی نہ رہا تو اس نے منہ سے کپڑا اٹھادیا۔ ”پنڈت تعجب سے بولا۔“ ارے تو کیسے آیا اس وقت۔“

”پنڈت جی بات بڑھ گئی ہے۔ اس لئے چھپ کر بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔“

”بتاؤ کیا ہوا۔“ پنڈت نے پوچھا۔

”سویرے آستانہ کھولا تھا سائل بھی بہت تھے۔ مگر پھر بند کرنا پڑا۔“ لیاقت نے بتایا۔

”ارے کیوں بند کرنا پڑا۔ یہ مت بتانا۔“ پنڈت ناک سکڑ کر بولا۔

”وہی بتا رہا ہوں پہلی ایک عورت تھی اس نے اپنا کام بتایا۔ میری بیوی سب سنتی رہی اس کے بعد اس کو عورت سے کچھ کہنا تھا مگر اس کی آواز بند ہو گئی اس نے کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس کا گلہ کسی نے دبوچ رکھا ہے، اب میں کیا کرتا آستانہ بند کر دیا اور اعلان کر دیا کہ تو لے شاہ چلے گئے کل ملاقات کریں گے۔ میں آستانہ بند کر کے اندر گیا تو دیکھا بیوی ٹھیک تھی اور آواز بھی کھل چکی تھی۔ بھلا بتاؤ حیرت کی بات ہے کہ نہیں۔“ لیاقت نے اپنی بات ختم کی۔

”میرا خیال ہے تیری جو رو کے گلے میں کوئی پھندہ وندہ پڑ گیا ہو گا وہ گھبرا گئی اور تو نے بڑی عقل مندی یہ کی کہ تو لے شاہ کی واپسی کا اعلان کر دیا اور آج کی آمدنی ماری گئی۔“ پنڈت بولا۔

”یہ پھندہ نہیں تھا۔ پنڈت جی یہ ضرور کوئی چکر ہے۔ ارے ایسا پھندہ کہ اندر جاتے ہی گلا کھل گیا۔“ لیاقت نے حیرت سے کہا۔

”تیری جو رو کو وہم ہو گیا ہو گا۔ اب ذرا سی بات کو لے کر میں پھر جاؤں گی اس کے پاس جاؤں۔“ پنڈت بولا۔

”پنڈت جی آپ سمجھ نہیں رہے، بات چھوٹی نہیں

ہے ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔“ لیاقت بولا۔

”چل ٹھیک ہے میں ذرا مندر سے فارغ ہوں تو جاتا ہوں جاگنی داس کے پاس مگر تو اب حرام خوری مت کر شام کو آستانہ کھول لینا۔“ پنڈت نے کہا۔

لیاقت واپس آ گیا مگر رولوکا مندر میں پنڈت کے ساتھ لگا رہا۔ پنڈت نے پوجا کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور مندر سے باہر آ گیا اور گھر کی طرف چلا اور اندر چلا گیا، رولوکا بھی اس کے ساتھ تھا پنڈت کی بیوی نے پنڈت کو دیکھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے آج جلدی اٹھ گئے۔“

”کیا بتاؤں میری جان کو تو سوچ کر رہی ہیں۔“ پنڈت نے بولا۔

”اب کیا فکر پڑ گئی۔“ عورت نے بولی۔

”ارے آستانے والا لیاقت آیا تھا کہتا تھا۔ اس کی عورت کی آواز بند ہو گئی اور آستانہ بند کرنا چاہتا تھا تو لگتا ہے حرام خوری پر اصرار آیا ہے۔“ پنڈت نے کہا۔

”تم کیا کرو گے اب۔۔۔۔۔“ عورت نے پوچھا۔

”جاتا ہوں جاگنی داس کے پاس، اس کے کچھ مشورہ کروں گا آخر کو وہ بھی تو جونی کا خمد دار ہے وہ بھی تو کچھ کرے۔“ پنڈت نے جواب دیا اور گھر سے باہر آ گیا۔

جاگنی دروازے پر ہی کھڑا تھا کہیں جانے کی تیاری میں تھا، پنڈت کو دیکھ کر بولا۔ ”پھر کوئی انجمن لے کر آئے ہو گے بولو کیا بات ہے زیادہ سے زیادہ میرے پاس نہیں ہے جانا ہے ایک جگہ۔۔۔۔۔“

”تم خوب گھومو پھر دو بج کر دو اور سارے دکھائے میرے حصہ میں ڈال دو۔“ پنڈت بولا۔

”پوری بات تو بتاؤ تم تو ہری مریج کھا کے آئے ہو شاید۔“ جاگنی داس بولا۔

”آستانہ میں مشکل ہو رہا ہے اب۔“ پنڈت بولا۔

”اب کیا مشکل آگئی۔“ جاگنی داس بولا۔

”لیاقت کی بیوی کی آواز آستانے میں آتے ہی بند ہو گئی اور گھر میں جاتے ہی کھل گئی۔ ارے گھر میں بند ہو جاتی اور آستانے میں کھلی رہتی تو نقصان تو نہ ہوتا۔“

پنڈت نے کہا۔

”میں نے تو ایک بڑا ہنگامی والا پہرے دار وہاں چھوڑ دیا تھا۔“ جاگنی داس بولا۔

”مجھے بھلاوے کی بات تو تم کرو نہیں میں نہیں ماننا۔“ پنڈت نے جواب دیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں پنڈت میری بات کا یقین کرو۔“ جاگنی داس بولا۔

”تو میرے، ایسا لگتا ہے نشے کا عادی ہو گا پی کے پڑا ہو گا کی مانی میں۔“ پنڈت نے جواب دیا۔

”دیکھو پنڈت مجھے غصہ نہ دلاؤ میں بہت برا آدمی ہوں اپنی پر آ جاؤں تو تمہیں بھانگے کو راستہ نہیں ملے گا۔ مگر میں تمہاری بات کی کھوج کروں گا آخر میرا بھر کہاں گیا۔“

جاگنی داس بولا۔

”میں بھی تو سچی کہتا ہوں۔“ پنڈت نرم لہجے میں بولا۔

”تم جاؤ میں بھی اب جہاں جا رہا تھا نہیں جاتا پہلے

مجھے اپنا پتہ بتا کر آنا ہے۔“ جاگنی داس بولا۔

پنڈت واپس روانہ ہو گیا اور جاگنی داس گھر کے اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے ایک تھیلا اٹھایا اور گھر سے باہر آ گیا۔ اور ایک طرف پیڈل ہی چل پڑا۔ وہ نہیں جانتا تھا

کہ ایک غیر مرئی طاقت ایک دکھائی نہ دینے والا وجود اس کے ساتھ ساتھ تھا، جاگنی داس شہر کی حدود سے باہر آ گیا تھا

اس کی حال اتنی تھی کہ عام آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اب اس کا رخ رو دیا کی طرف تھا شام کے سائے آنے لگے تھے۔

سورج کا سفر تمام ہونے کو تھا۔ ہر طرف تنہائی تھی دور دور کوئی آدمی یا جانور نظر نہیں آتا تھا اب اس کا رخ مرگھٹ کی طرف تھا مرگھٹ میں چاروں طرف سکوت نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ ہر طرف ہیبت طاری تھی پانی کے بہنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

مرگھٹ میں جگہ جگہ گردور دور چوہرے بے ہوئے تھے۔ ان چوہروں پر لاشیں جلائی جاتی تھیں۔ جاگنی داس

جاگکی داس زور زور سے رونے لگا اور اس کے ساتھ مرگھٹ کی سینکڑوں روحیں آہ وزاری کرنے لگیں۔ آسمان پر بجلی کووندی رسی مگر زمین پر کچھ نہ ہوا اور جاگکی داس پانی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ آتماؤں کی آوازیں آہستہ ہوتی گئیں اور پھر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دن کا اجالا پھیل گیا۔

رولوکا واپس روانہ ہوا اور پنڈت کیدار ناتھ کے پاس پہنچ گیا۔ پنڈت پوچا کے کمرے میں تھا۔ رولوکا اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

”جاگکی داس مر گیا۔ اب تیری باری ہے۔“

پنڈت نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ جاگکی داس کو بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جاگکی داس کو اس کی شگتی کے غرور نے دریا میں بھسم کر دیا اور تجھے تیرا لالچ ڈبوئے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے معاف کر دو میں کوئی لالچ نہیں کروں گا۔“

پنڈت بولا۔

”دینو کا مکان کب خالی کرے گا۔ بول۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”کل ہی کر دوں گا۔“ پنڈت جلدی سے بولا۔

رولوکا دینو کے پاس آ گیا اور حکیم کے بہروپ میں بولا۔

”تمہارا مکان کل خالی ہو جائے گا تم وہاں جا سکتے ہو مگر تم کو وعدہ کرنا ہوگا کہ تم وہاں پر کمر و فریب کا کوئی کاروبار نہیں کرو گے۔“

”میں دل و جان سے وعدہ کرتا ہوں، میں محنت کروں گا اور حق حلال کی روزی پیدا کروں گا۔“ اور رولوکا اور میں واپس روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

رولوکا نمبر 3

قیمت :- 150/- روپے

تیری چھتری سوئی پڑی ہے، ذرا ان کو بلانے کی کوشش تو کر، تجھے خود اندازہ ہو جائے گا۔“ رولوکا اطمینان سے بولا۔ جاگکی داس کا چہرہ پتلا پڑ گیا اور وہ فوراً کنڈل کے باہر آ گیا اور چوترے سے نیچے اتر آیا۔ نیچے آتے ہی اس کے پیروں میں نظر نہ آنے والی رسی لپٹ گئی اور اس کے پیر بندھ گئے۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ اس بندھن کو ڈٹے لے مگر نام کام ہوا تو مگر گڑا کر بولا۔

”معاف کر دو گرو، میں پہچان نہ سکا۔“

”تم نے مجھے کب دیکھا تھا کہ پہچان لیتے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”میں مانتا ہوں اپنی شگتی کے بھروسے میں مارا گیا۔“

جاگکی داس بولا۔

”میں جانتا ہوں تو کیا ہے اور تیرے پاس کتنی شگتی ہے۔ تو معصوم لوگوں کو تک کر سکتا ہے ان کو بیمار کر سکتا ہے مگر ہار کو اچھا نہیں کر سکتا اس لئے کہ تیرے گرو شیطان کو یہ سخت پسند ہے۔ مگر تیرے بیمار کو میں ٹھیک کرتا ہوں میرے گورو کو پسند ہے۔“

دنیا میں تیری موجودگی انسان کے حق میں ایک زہر دو چشم سے کم نہیں۔ تو مجسم ہدی ہے۔ تیرے وجود کی

بت سے انسان ہمیشہ نقصان اٹھائے گا۔ میں جانتا ہوں اپنی حرکتوں سے ہار نہیں آئے گا۔ تیرا گرو تجھے ہار نہیں

نے دے گا۔ دیکھ لے تیرا گورو تجھے مصیبت میں دیکھ کر نا تیری مدد کو نہیں آ رہا تو نے اس کی پوجا کی جو تیرا نہیں تھا۔

نہ آگے تیرا ہوگا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں تو بہ کرتا ہوں تیری بات مانوں گا۔“ جاگکی داس بولا۔

”میں جانتا ہوں جاگکی داس یہ سبق بھی تیرے گورو کا ہے مگر فریب تمہارا ابتدائی سبق ہوتا ہے۔ مگر جن کو یہ سب پتہ

نہ تم ان کو فریب نہیں دے سکتے۔ اب رات ختم ہونے والی ہے۔ تمہاری زندگی کا سفر بھی ختم ہونے کو ہے کل کا دن رے تا پاک وجود سے پاک ہوگا۔“

اور پھر رسیاں اس کو دریا کے اندر لے جانے لگیں،